بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱۰۰)

سو
عظیم
مُسلمان

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ اقرا سنٹر اردو بازار لاہور

سعد پبلی کیشنز فرسٹ فلور میاں مارکیٹ اردو بازار لاہور

کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور کالج روڈ بورے والا

کشمیر بک ڈپو تلہ گنگ روڈ چکوال

بنگش بک ڈپو اردو بازار سیالکوٹ

مسلم بک لینڈ بینکنگ روڈ مظفر آباد

مکتبہ رشیدیہ نیو جنرل چکوال

ضیاء القرآن پبلشرز اردو بازار کراچی

ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی

نیو وہاڑی کتاب گھر مین بازار وہاڑی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

رحمٰن بک ہاؤس اردو بازار کراچی

بک سنٹر علامہ اقبال چوک سیالکوٹ

الکریم نیوز ایجنسی گول چوک اوکاڑہ

منیر برادرز مین بازار جہلم

شائلہ لائبریری محلہ چوہدری پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ

احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ راولپنڈی

بلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ میاں چنوں 662650

اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار لاہور

مکتبہ العلم ۱۷- اردو بازار لاہور

چوہدری بک ڈپو مین بازار دینہ

میاں ندیم مین بازار جہلم

اسلامک بک سنٹر اردو بازار کراچی

دارالادب تلمبہ روڈ میاں چنوں

ضیاء القرآن پبلشرز گنج بخش روڈ لاہور

اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

فرید پبلشرز نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

شمع بک ایجنسی فیصل آباد

کتاب گھر علامہ اقبال روڈ راولپنڈی

ہاشمی برادرز کتب و رسائل گوردت سنگھ روڈ کوئٹہ

نیو الیاس کتب محل کچہری بازار جڑانوالہ

رضا لائبریری شاہ کوٹ

ادریس کتاب محل مین بازار منڈی سمبڑیال

الاخوان القادری مسندی کارنر اندرون بوہڑ گیٹ ملتان

عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ سرائے عالمگیر 653057

نیو نفیس بک ڈپو مین بازار میانوالی

(۱۰۰) عظیم مسلمان

تحقیق و تالیف

یاسر جوّاد

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹

دیدہ زیب اور
خوبصورت کتب کا
واحد مرکز

تزئین و اہتمام
محمد نذیر طاہر نذیر

اشاعت دوم	۲۰۰۵ء
سرورق	عبید اللہ
اہتمام	محمد نذیر طاہر نذیر
کمپوزنگ	الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور
مطبع	حافظ جمیل پرنٹنگ پریس لاہور

انتساب

والدین کے نام

فہرست

چوتھا حصہ

آئمہ کرام

پانچواں حصہ

صوفیاء و اہل ریاضت

چھٹا حصہ

فلسفی، مورخ، شعراء

ساتواں حصہ

سائنسدان' سیاح' محقق

آٹھواں حصہ

سپہ سالار، فاتح، ریاست کار

دو حرف

دنیا میں ہر بڑی تحریک نے پہلے سے موجود چیزوں کو بدلا' ان میں ترمیم کی' کچھ نئی چیزیں پیدا کیں اور پھر انجام کار خود بھی ارد گرد کے اثرات کا شکار ہو کر نئی صورت اختیار کی۔ یہ "نئی صورت" ہمہ گیر ہرگز نہیں ہوتی بلکہ متعدد نئی صورتوں کا ایک متضاد عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کے متضاد پہلوؤں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ان میں کوئی ہم آہنگی ڈھونڈنا نہایت مشکل ہو۔ اسلام کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہے۔ رسول اکرمؐ نے ابتدائی ساتویں صدی میں عرب معاشرے اور روایات کو نئے اور محکم اصولوں کے ساتھ تبدیل کیا۔ تبدیلی کی ایک لہر نے دور دور تک ارتعاش پیدا کیا جو آنحضرتؐ کی وفات تک جاری رہا۔ پھر دور خلافت آیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے دور میں متعدد فتنوں کا سامنا کیا۔ حضرت عمرؓ کی اصول پسندی اور منکسر حاکیت نے نو مولود اسلامی ریاست کی حدود کو وسعت دی مگر آپؓ کو شہید کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ سامنے آیا۔ حضرت علیؓ کے دور میں حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ لوگ دین کی راہ بھی بھلا بیٹھے اور آپؓ انہیں دوبارہ راہ راست پر لانے کی کوششیں ہی کرتے رہے۔ لیکن آپ کو بھی سازش کے تحت شہید کر دیا گیا۔ امیر معاویہؓ کے دور میں خلافت نے بادشاہت کی شکل اختیار کی اور حکومت موروثی بن گئی۔ یزید کے دور حکومت میں آل رسولؐ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی تاریخ شاہد ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے ساتھ ہی اسلام میں ملوکیت کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ تبدیلی کی لہر کا جو رد عمل شام' مصر' فارس' کوفہ' بغداد سے سیاسی طور پر ظاہر ہوا تھا اب فکری صورت میں بھی ظاہر ہونے لگا۔

بابل و نینوا کی قدیم تہذیبوں سے مسلمان صوفیاء کا ایک پورا گروہ ساتویں سے نویں صدی کے دوران سامنے آیا۔ اور دسویں صدی کی ابتداء میں حسین بن منصور حلاج کے قتل کے نتیجہ میں تصوف کی یہ لہر دب کر رہ گئی۔ ان صوفیوں نے استبداد' ظلم و زیادتی اور عیش و عشرت کے جواب میں دنیا سے لاتعلقی' وجدان' توکل' فنائے ذات' سخت ریاضتوں اور "خاموشی" کا پرچار کیا۔ اس کے علاوہ عرب و فارس میں علم و استدلال نیا آغاز بھی آٹھویں صدی سے شروع ہوا اور بارہویں صدی میں ابن رشد تک فلسفہ کو نئی نئی راہیں ملیں۔ مترجمین نے ارسطو سقراط اور دیگر یونانی فلسفیوں کی کتب ترجمہ کر کے شرحیں لکھیں اور پھر اس فلسفہ کو عربی۔ اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔ یورپ کو

علم کی روشنی انہی مسلمانوں کی تصانیف تراجم اور شرحوں سے نصیب ہوئی۔

اسلام نے ہندوستان میں پہنچ کر بھی نئے تضادات کا سامنا کیا اور اپنا عربی رنگ کھو بیٹھا۔ اسی طرح روم' فارس اور دیگر ممالک میں بھی ہوا۔ نئے مسلمان ہونے والے افراد اپنے مذہبی اعتقاد کو تو بھول سکتے تھے لیکن خون میں رچی بسی روایات اور تہواروں کو نہیں۔ اسی لئے آج مسلمانوں کا ایک گروہ بہت سے صوفیاء کو مسلمان نہیں مانتا' لیکن پھر بھی ہمارے ہاں تقریباً 95 فیصد مسلمان کسی نہ کسی صوفی بزرگ کے ساتھ روحانی وابستگی کے دعویدار ہیں۔ حتی کہ اس وابستگی میں کبھی کبھی شرک کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ لہذا لازمی ہے کہ اس کتاب میں شامل شخصیات پر بھی مختلف حضرات کو مختلف اعتراضات ہوں گے۔ مثلاً معتزلہ کے بانی واصل بن عطاء کو ہی لیجئے۔ انہیں شامل کرنے پر مختلف دینی اور عقائدانہ حوالوں سے سوال اٹھایا جا سکتا ہے لیکن تیمور لنگ تاتاری پر کوئی معترض نہیں ہو گا جس نے فتوحات کے شوق میں کسی قوم اور مذہب کے افراد کو نہیں بخشا۔ یہاں تفصیلی بحث مین جانے کی بجائے محض اپنا معیار بیان کر دینا کافی ہو گا۔

ہم نے "آنحضرت" "خلفاء" اور "بلند مرتبت خواتین" کے بعد ہر اس قابل قدر صوفی' زاہد' فلسفی' مورخ' شاعر' سائنسدان' سیاح' محقق' سپہ سالار' فاتح اور ریاست کار کو شامل کیا ہے جو خود کو مسلمان قرار دیتا تھا یا آج جسے کوئی مخصوص طبقہ مسلمان سمجھتا ہے۔ اگر مختلف اہل فتوی کے معیاروں کو سامنے رکھا جائے تو سو کیا دس بارہ شخصیات پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکے۔ خود کوئی قطعی کسوٹی اس لئے قائم نہیں کی کیونکہ وہ بھی فتووں کا ایک نیا سلسلہ بن جاتی۔ لہذا یہ کتاب ایک رنگا رنگ پھولوں سے بھرا ہوا باغ ہے' جو جس پھول سے عقیدت رکھتا ہے وہی اس کے لئے ہے۔ تاہم' ان "مسائل" سے بالاتر قاری کو ہر ایک رنگ اور خوشبو سے فائدہ اٹھانے کا موقع زیادہ میسر آئے گا۔

یہ امر بھی قابل بحث ہے کہ کیا ہم مختلف قوموں کے 1400 سال سے زائد دور میں پیدا ہونے والی شخصیات کو ایک عنوان کے تحت جمع کر سکتے ہیں؟ مثلاً پاکستان کے اسلام اپنی موجودہ شکل میں (بنیادی عقائد کے علاوہ) دیگر ممالک کے اسلام سے کافی مختلف ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے۔ یہ اختلاف مخصوص قومی اور ثقافتی عناصر کی وجہ سے ہے۔ یہ اور اوپر بیان کردہ معیار کا مسئلہ باہم منسلک اور ایک دوسرے کی توجیہہ ہیں۔

"سو عظیم مسلمان" میں رسول اللہؐ' خلفاء' حضرت عائشہؓ' جلال الدین رومی' واصل بن عطاء' لال حسین مادھو' موارث شاہ' مرزا غالب' سلیمان عالیشان' محمد علی جناح' امیر تیمور' پر یعنی سولہ مضامین راقم الحروف کی تصنیف ہیں۔ جبکہ تقریباً پندرہ مضامین کو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا۔

دیگر کو مختلف کتب سے لے کر ایڈٹ کیا۔ لہٰذا اسلوب میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ تصنیف کردہ مضامین میں کوشش کی گئی ہے کہ متعلقہ شخصیت کے ان سماجی و سیاسی حالات کو تفصیلاً پیش کیا جائے جنہوں نے اس کی ذہنی نشوونما میں حصہ ڈالا۔ ترجمہ کردہ مضامین مختلف پی ایچ ڈی حضرات کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ پانچویں حصے میں شامل زیادہ تر شخصیات کے خیالات عموماً روایات اور واقعات کی صورت میں ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کی اپنی تصانیف یا تو تھیں ہی نہیں یا ہم تک پہنچتے پہنچتے کھو گئیں۔ لہٰذا جو کچھ تذکروں میں مل سکتا ہے وہی پیش کر دیا گیا۔ اس میں سے مختلف نتائج اور آراء اخذ کرنا ذہین قاری کا کام ہے۔

اگرچہ مشاہیر اسلام کے موضوع پر بہت سی کتب موجود ہیں لیکن ان میں دانشور، علماء اور صوفیاء کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے' یا سرے سے موجود ہی نہیں۔ لہٰذا ہم نے آٹھ حصوں کو مختلف عنوانات دے کر شخصیات کو زمانی ترتیب میں پیش کیا۔

ایک مرتبہ پھر اصرار کے ساتھ یہ کہنا بر محل ہو گا کہ زیر نظر کتاب میں شامل شخصیات کے انتخاب میں ذاتی یا کسی ایک طبقہ فکر کی پسند و ناپسند کو ہرگز مد نظر نہیں رکھا گیا' بلکہ مسلمانوں کے ہر ایک فکری پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی' اس کا انحصار پڑھنے والے کی غیر جانبدار رائے پر ہو گا۔

یاسر جواد

نومبر 1998ء

پہلا حصہ

انسانِ کاملؐ

رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(571ء ----- 633ء)

چھٹی صدی عیسوی کے آخری اور ساتویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جب دنیا نے ایک نئے معاشی و سماجی' اور مذہبی نظام کا احیاء ہوتے دیکھا تو اس وقت تک دنیا کی متمدن ترین اقوام تنزل وانتشار کے دور سے گذر رہی تھیں۔ ان متمدن اقوام میں ہندوستانی' بابلی' سومیری' اشوری' مصری' یونانی اور رومی شامل ہیں۔ تنزل کے اس دور میں عیسائیت اور دین ابراہیمؑ کو بھی استحکام و رفعت نصیب نہ رہی۔ فارس میں زرتشت' بابل میں نبوکدرضر' یونان میں سقراط و فیثا غورث' ہندوستان میں گوتم بدھ اور مہاویر' جبکہ چین میں کنفیوشس جیسے علماء و صوفیا تقریباً 500 سال قبل مسیح میں ہی اپنی اپنی بات کر کے چلے گئے۔ پھر سکندر اٹھا اور مشرق قریب کو فتح کرتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ آدھی دنیا سکندریائی بادشاہت کا حصہ بن گئی۔ کارتھیجیوں اور مقدونیوں کے ساتھ طویل لڑائی میں سلطنت روما کو فتح ہوئی اور مصر بھی اس کا حصہ بن گیا۔ ظہور عیسائیت کے بعد روم مسلسل اندرونی اور بیرونی جنگوں کا شکار رہا۔ چوتھی صدی کے آخر تک دنیا میں کوئی قابل ذکر متمدن قوم موجود نہیں تھی۔ روم اور فارس کی سلطنتوں نے باہم ٹکرا ٹکرا کر اپنی رہی سہی قوت اور تمدن کا بھی خاتمہ کر لیا۔ یہ وہ تاریخی اور عالمی پس منظر تھا جس میں خدائے برتر نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے اپنے آخری نبیؐ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اقوام عالم کو وحدانیت کے جھنڈے تلے جمع کریں اور شرک و کفر کو روند ڈالیں۔

عرب صرف جزیرۃ العرب میں ہی آباد نہ تھے بلکہ یہ ان کی آبادیوں کا مرکز تھا۔ جنوب مغربی ایشیاء میں یہ ایک اقلیم ہے جس کے شمال میں صحرائے شام' مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان' جنوب میں بحر ہند اور بحر احمر واقع ہیں۔ اس میں بارہ ماہ بہنے والی نہریں نہیں البتہ کچھ ایسی وادیاں ہیں جن میں کبھی پانی بہنے لگتا ہے اور کبھی خشک ہو جاتی ہیں۔ اس کا بڑا حصہ وسطی علاقہ میں صحرا ہے۔

جزیرہ عرب کا مغربی حصہ دو صوبوں پر مشتمل ہے' شمال میں حجاز اور جنوب میں یمن۔ حجاز کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہ وہ پہاڑی سلسلہ ہے جو تہامہ کو نجد سے الگ کر دیتا ہے۔ حجاز کی اہمیت اس تجارتی راستہ پر واقع ہونے سے پیدا ہوئی جو یمن کو شمالی شہروں سے ملاتا ہے۔ اسلام سے قبل یہودی اس طرف بڑھے اور خیبر اور مدینہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کر لیں۔ اس کا مشہور ترین شہر مکہ ایک بے آب و گیاہ وادی ہے۔ اس میں چاہ زمزم کے علاوہ پانی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس جزیرہ کے لوگ عرب کہلاتے ہیں۔ ان کے ارد گرد وادی فرات' وادی نیل کے لوگ مہذب ہو گئے لیکن معاشی بناء کی بنیاد پر عربوں پر بدویت غالب رہی کیونکہ یہ لوگ پہاڑوں اور سمندروں میں گھرے ہوئے بارشوں کے موسموں کا انتظار کرتے اور کل کائنات یعنی عورتوں اور اونٹوں کو لے کر چراگاہوں کی تلاش میں نکل پڑتے۔

جزیرہ عرب میں شام اور بحر ہند کے درمیان دو بڑے تجارتی راستے تھے۔ ایک حضر موت سے بحرین تک اور دوسرا حضر موت سے بحر احمر تک کنارے کنارے صحرائے نجد کو چھوڑتا ہوا ساحل سمندر کی پہاڑی اور دشوار گزار چٹانوں میں سے گزرتا تھا۔ اس دوسرے راستہ پر یمن اور بطرہ کے درمیان نصف راستہ پر مکہ واقع تھا۔ قدیم زمانوں سے تجارت اہل یمن کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن بالآخر حجاز کے عربوں نے تجارت پر قبضہ کر کے اہمیت اختیار کر لی۔ یہاں کا سب سے بڑا قبیلہ قریش تھا۔ اس کا نام تقرش یعنی تجارت سے ماخوذ بھی بتایا جاتا ہے۔ مکہ میں رومی تجارت خانے قائم تھے اور بہت سے حبشی لوگ بھی رہتے تھے۔ جغرافیائی محل وقوع نے قریش کو بلند مرتبہ عطا کیا۔ اہم تجارتی راستہ کے عین درمیان میں واقع ہونا اور زمزم کا چشمہ اہم ترین خصوصیات تھیں۔ پھر قریش کعبہ والے تھے جس کی تقدیس تمام عرب میں مسلم تھی۔ جزیرہ عرب کے اطراف میں دو عظیم ترین تہذیبیں ایران اور روم (مشرق و مغرب) میں واقع تھیں۔ رومی اور ایرانی عربوں کی جنگجوئی کی وجہ سے انہیں زیر نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے سرحدات پر مستقل آبادیاں بسانے کے لئے وہاں کھیتی باڑی کو فروغ دیا۔ جس کے نتیجہ میں ایران کی سرحد پر حیرہ اور روم کی سرحد پر غسانیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ حیرہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو نصرانیت کی بشارت اور دعوت دیتے تھے۔ غسانی عقلی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے کیونکہ انہیں یونانی ثقافت اور رومی تہذیب کی قربت حاصل تھی۔ (احمد امین مصری)

اسلام سے قبل یہودیت جزیرہ عرب میں کافی پھیل چکی تھی۔ وہاں یہودی آبادیاں قائم ہو چکی تھیں جن میں مشہور ترین آبادی یثرب تھا جسے اسلام کی روشنی کے بعد مدینہ کہا گیا۔ یثرب کے

یہود تین قبائل بنو نضیر' بنو قینقاع اور بنو قریظہ پر مشتمل تھے۔ حیرہ میں نصرانیت کا غلبہ تھا۔ لیکن نصرانیت کا اہم ترین مرکز نجران تھا (یاقوت معجم کے مطابق نجران کا ایک وفد رسول اللہؐ سے ملنے آیا تو آپؐ نے ان سے مباہلہ کرنا چاہا لیکن وہ تیار نہ ہوئے اور صلح کر لی۔ حضرت عمرؓ نے نجران کے نصرانیوں کو جلاوطن کر کے ان کی جائیدادوں اموال کی قیمت ادا کر دی تھی۔)

مسیحیت نے بھی اپنی تعلیمات عربوں میں پھیلائیں اور رہبانیت و ترک دنیا کو فروغ دیا۔ عیسائی اور راہب عرب کے میلوں میں آتے' لوگوں کو نصیحتیں کرتے' بشارتیں دیتے اور مذہبی عقائد کے تذکرے کرتے تھے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات نے ان کے اقوال کو جھٹلا کر ان کے مذہب کا ابطال کیا۔ تجارت سرحدات پر قائم شدہ مدنیتیں اور سلطنتیں اور یہودیت و نصرانیت عربوں میں گردونواح کی دیگر مدنیتوں اور تہذیبوں کے پھیلنے اور اثرو نفوذ کا ذریعہ تھیں۔

عرب کے لوگ اپنے زمانہ جاہلیت میں زیادہ تر بادیہ نشین تھے اور بادیہ نشینی کا دور ایک ایسا طبعی اجتماعی دور ہوتا ہے جس سے تمام قومیں تمدن و حضارت تک پہنچتے ہوئے گذرتی ہیں۔ لیکن اس دور کے کچھ طبعی و عقلی مظاہر بھی ہوا کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اہل عرب میں خرافات اور کہانیاں موجود تھیں جن کی کوئی عقلی توضیح ممکن نہیں۔ اسلام سے پہلے ان لوگوں میں حادثات کی وجوہ جاننے کا سلیقہ ہی نہیں تھا اور وہ مسببات اور اسباب کے مابین کوئی محکم رابطہ پیدا نہیں کر سکتے تھے' تو پھر بھلا خالق مطلق اور اس کی تخلیق کردہ دنیا کے درمیان کیا رشتہ قائم کرنے اور سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ لوگ گذشتہ اور آئندہ حادثات کا پتہ چلانے کے لئے فال گیری کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ اس کے لئے کسی خاص منطق کی ضرورت نہ پڑتی۔ بعض مستشرقین کے خیال میں عقل عربی طبعاً اشیاء کی طرف اس نگاہ سے نہیں دیکھتی جسے عمومیت اور احاطہ کے ساتھ دیکھنا کہا جا سکتا ہو۔ جاہلی دور میں یہ چیز اس کی استطاعت میں تھی ہی نہیں۔ یہی بات بعض قدیم مسلمان مورخین مثلاً شہرستانی' نے محسوس کی۔

جاہلی عرب میں معاشرہ کی بنیاد قبیلہ واری نظام پر تھی۔ لوٹ مار ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا جس نے قبیلہ کی حمایت کو اس قدر بلند مرتبہ دے دیا کہ اس میں ذرا سی کوتاہی کرنے والا شخص بھی ذلت کا نشان بن جاتا۔ اسی شاؤنسٹ حمایت نے انسانی جان کو اسقدر ارزاں کر دیا تھا۔ شجاعت وفاداری' عفو درگذر ان کے ہاں بڑے فضائل شمار ہوئے۔ یہی حال ان کی حیات عقلیہ یعنی دانشورانہ زندگی کا تھا۔ انصاف' ظلم' خیر' شر کے قابل مذمت اور قابل مدح ہونے کا فیصلہ اسی لحاظ سے ہوتا تھا کہ وہ قبائلی طور پر کس چیز کے عادی ہیں۔ (رسول اکرمؐ نے اس معیار کو بدل کر صرف تقویٰ کو لبدی

اساس مقرر کیا) جاہلیت کا لفظ اس "جہل" سے ماخوذ نہیں جو علم کی ضد ہوتا ہے' بلکہ اس جہل سے' مشتق ہے جس کے معنی بیوقوفی' غصہ اور عصبیت کے ہیں۔ جبکہ سلام کے معنی مسالمت کے ہوتے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے۔ رسول اکرم کا ظہور انہی جاہلانہ اقدار کی سرکوبی اور تردید وبطلان کا آئینہ دار ہے۔

اب ہم اسلام سے پہلے کے عرب میں بت پرستی اور مشرکین کے انداز واطوار و مذہبی رسومات کا مختصر جائزہ لیتے چلیں تو بہتر ہو گا۔ تاریخ طبری' تاریخ ابن خلدون' اور ابن ہشام کے مطابق رسول اکرمؐ کی پیدائش سے پہلے عربوں میں بت پرستی سے بیزاری کا رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ جس طرح رسول اکرمؐ سابقہ انبیاء کی شریعتوں کے خاتم ہوئے اسی طرح آپؐ نے پہلے سے موجود رجحانات کو ترمیم' تجدید اور تنسیخ کے ذریعہ قانون خداوندی کے مطابق بنایا۔

ابن اسحٰق کے قول کے مطابق نزار بن معد کے چار بیٹے تھے : معز' ربیعہ' اغار اور ایاد۔ معز کے دو بیٹے الیاس اور عیلان ہوئے ان کی والدہ قبیلہ جرہم سے تھی۔ پھر الیاس کے تین بیٹے مدرکہ طابخہ اور قمعہ ہوئے۔ ان کی ماں خندف یمنی تھی۔ (مدرکہ اور طابخہ کا اصل نام عامر اور عمرو بتایا جاتا ہے) الیاس کے تیسرے بیٹے قمعہ سے ایک لڑکا لحی پیدا ہوا اور لحی سے عمرو اور خزاعہ نے جنم لیا۔ عمرو سے عرب میں بت پرستی کی بنیاد پڑی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے دین اسماعیلؑ کو تبدیل کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اکثم سے کہا "میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو دیکھا ہے کہ اس کی انتڑیاں آگ میں گھسیٹی جاتی تھیں۔" ابن ہشام نے بعض اہل علم کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمرو بن لحی کسی ضرورت کے واسطے شام کو گیا۔ جب بلقاء کی زمین میں ایک مقام ماب پر پہنچا تو وہاں کے باشندوں "عمالیق" کو بتوں کی پرستش کرتے پایا۔ (یہ عمالیق عملاق یا عملیق کی اولاد ہیں جو لاوذ بن سام بن نوح کی اولاد سے تھا) عمرو نے ان بتوں کی کرامات دریافت کرنے کے بعد ایک بت ان سے مانگا۔ انہوں نے بت دے دیا جس کا نام ہبل تھا۔ اس نے یہ بت لا کر مکہ میں نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی عبادت و تعظیم کا حکم دیا۔ ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ جب شروع میں مکہ میں بنی اسماعیلؑ نے پتھروں کی عبادت شروع کی تو ان کا قاعدہ تھا کہ سفر پہ جاتے وقت کوئی پتھر ساتھ لے جاتے اور اسے اپنی قضائے حاجات کا وسیلہ خیال کرتے اور جہاں ٹھہرتے وہاں اس پتھر کو نصب کر کے اس کے گرد طواف کرتے۔ لیکن زحمت کی وجہ سے آہستہ آہستہ انہیں ساتھ لے جانا بند کر دیا اور جس جگہ جاتے وہیں کوئی خوبصورت پتھر ڈھونڈ کر اس کی عبادت کر لیتے۔ یہاں تک کہ وہ ابراہیمؑ کا اصلی دین بھول گئے تاہم چند باتیں ابراہیمؑ مناسک کی ان میں باقی رہیں : مثلاً بیت اللہ کی تعظیم' طواف خانہ کعبہ' حج'

98346

عرفہ میں کھڑے ہونا وغیرہ۔ قوم نوحؑ بھی بت پرستی کیا کرتی تھی۔ قریش کا بت ہبل تھا۔ اس کے علاوہ قریش اور بنی کنانہ کا ایک بت عزا تھا اور اس کے مجاور اور دربان شیبان بن سلیم کی اولاد تھی جو بنی ہاشم کی فریق مخالف اور خاص طور پر ابو طالب کیخلاف تھی۔

مشرکین کا قاعدہ تھا کہ جو اونٹنی دس مادہ بچے جنتی "سائبہ" اسے آزاد کر دیتے اور اسے کسی بھی لحاظ سے استعمال کرنا منع کر دیتے۔ جب کوئی بکری پانچ حمل میں دس مادہ بچے متواتر جنتی اسے "وصیلہ" یعنی کمال یافتہ قرار دیتے۔ کسی سانڈ سے دس مادہ بچے متواتر جنوائے جاتے تو اس کو آزاد کر دیتے۔ اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھاتے۔ اسے "حام" کہا جاتا تھا۔ "بحیرہ" اس اونٹنی کو کہتے تھے جس کا کان چیر ڈالا جاتا اور اس پر سواری کی جاتی اور نہ اس کے بال کترے جاتے۔ اسلام نے ان رسوم کو جاری نہ رکھا: "بحیرہ سائبہ وصیلہ اور حام سے فائدہ اٹھانا خدا نے تو حرام نہیں کیا۔"

ابن خلدون کے مطابق خدا پرستی کسی قدر جاہلی عرب میں موجود تھی اور یہ دو قسم کی تھی۔ ایک تو کسی غیر معلوم اور پوشیدہ قدرت کو مانتے اور اسے اپنے وجود کا خالق قرار دیتے تھے۔ ان کے باقی عقائد لامذہبی کی طرف مائل تھے۔ دوسرا گروہ خدا کو برحق جانتا تھا۔ قیامت' نجات' حشر' بقائے روح اور اس کے جزا و سزا کا قائل تھا۔ کچھ لوگ لامذہب تھے یعنی نہ تو وہ بت پرست تھے اور نہ کسی کتاب اور الہامی مذہب کے پابند۔ وہ خدا اور حشر کے منکر تھے اسی لئے جزا اور سزا کے بھی قائل نہ تھے اور دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ صابئی مذہب والے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ہمارا مذہب الہامی ہے اور ہم ادریسؑ کے پیروکار ہیں۔ ان کے ہاں سات وقت کی نمازیں اور ایک قمری مہینہ کا روزہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سبع سیارہ (ساتوں ستاروں) کی پرستش کرتے تھے اور غالباً انہی کی مناسبت سے حج کے دوران خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کیا کرتے تھے۔ (یہودی اور عیسائی مذہب کا تذکرہ پیچھے آچکا۔) یہاں اس سماجی پس منظر کا طائرانہ جائزہ ہم ختم کرتے ہیں جس میں رسول اللہ کی بعثت ہوئی۔

آپؐ کے ظہور کا ذکر سابق آسمانی صحائف توریت و انجیل میں موجود ہے۔ آپ 571 سن عیسوی میں اس دنیا میں ظہور پذیر ہوئے۔ آپ کا شجرہ نسب محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن مناف ہے اور چالیس پشتوں تک جاکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق آپؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب اور زبیر ابو طالب ایک ہی ماں فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم کے بطن سے تھے۔ حضرت عبدالمطلب بن ہاشم سقایت اور افادت کے متولی ہوئے اور اپنے بزرگان کی مانند ان خدمات کو بطریق احسن سرانجام دے کر ساری قوم میں بے

مثال عزت و شرف حاصل کیا۔ ساری قوم ان کی مطیع اور محب تھی۔ قبیلہ جرہم کے لوگ مکہ سے جاتے وقت چاہ زمزم کو مٹی سے پر کر کے زمین کے برابر کر گئے تھے۔ ابن اسحاق کے مطابق ایک شخص نے خواب میں حضرت عبدالمطلب کو کنواں دوبارہ جاری کرانے کی ہدایت کی۔ آپ اپنے حرث کے ساتھ کنواں کھودنے گئے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے کامیابی ہونے پر تکبیر کہی۔ لیکن اہل قریش بھی کنوئیں پر حق جتانے لگے۔ قبل ازیں انہوں نے کنواں کھودنے پر اعتراض کیا تھا کیونکہ کنوئیں کا مقام دو بتوں اساف اور نائلہ کے درمیان تھا اور بت پرست قریش وہاں قربانیاں کیا کرتے تھے۔ کھدائی کے دوران کنوئیں میں سے دو سونے کے بت اور دیگر سامان بھی نکلا۔ چنانچہ جھگڑا بڑھا تو سب سے بڑے بت ہبل کے سامنے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ قرعہ ڈالنے والا قرعہ ڈالنے میں مصروف ہو اور حضرت عبدالمطلب ذکر الٰہی میں مشغول ہوئے۔ ابن اسحاق سے ہی روایت ہے کہ قریش کے ساتھ جھگڑا ہونے پر حضرت عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے ہاں دس لڑکے ہوئے اور وہ جوان ہو گئے تو ان میں سے ایک کو خدا کی نذر کروں گا۔ نذر کرنے کا وقت آیا تو تمام بیٹوں کو جمع کر کے قرعہ نکالا جو حضرت عبداللہ کے نام کا نکلا۔ لیکن اللہ کو یہ کیسے منظور ہو سکتا تھا لہٰذا حضرت عبدالمطلبؓ نے لوگوں کے کہنے پر حضرت عبداللہ کے عوض سو اونٹ نذر کر دیئے۔ قربانی کے بعد وہ اپنے بیٹے عبداللہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کعبہ سے واپس جانے لگے تو بنی اسد کی ایک عورت ام قتال بنت نوفل کے پاس سے ان کا گزر ہوا جس نے حضرت عبداللہ کے چہرے کو دیکھ کر کہا "تم کہاں جاتے ہو' جس قدر اونٹ تمہارے فدیہ میں ذبح کئے گئے ہیں وہ میں تم کو دیتی ہوں' تم اسی وقت مجھ سے ہم بستر ہو جاؤ۔" حضرت عبداللہ نے کہا' میرے ساتھ میرے والد ہیں میں ان کی خلاف مرضی کوئی بات نہیں کروں گا اور نہ ان سے جدا ہونا چاہتا ہوں۔

حضرت عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب سے کر دی جو بہ اعتبار شرافت نسب اور مرتبہ تمام قریش میں افضل ترین خاتون تھیں۔ آپ ہی کے شکم میں سرور دو عالم نے پرورش پائی۔ انسانی جان کی قربانی اور بدکاری کی دو قبیح رسوم کی تردید کے نتیجہ میں ہی آپ کا ظہور ممکن ہوا یعنی خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے دادا اور والد کو رسوم جاہلیت سے دور کرنا شروع کر دیا تھا۔ روایت ہے کہ جس عورت نے آپؐ کے والد کو دعوت گناہ دی تھی اس نے ان کی پیشانی میں ایک نور دیکھا تھا۔ اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کی وجہ سے وہ بھی نصرانی علوم پر دسترس رکھتی تھی۔ لہٰذا اس نے یہ چاہا کہ یہ نور اسے مل جائے۔ ارباب سیر کے مطابق حضرت عبداللہ نے اسے جواب دیا تھا

:"حرام ہو نہیں سکتا۔ اس سے موت بہتر ہے اور حلال کی یہ شکل نہیں۔ لہٰذا جو تم چاہتی ہو وہ بات کیسے ہو"

مذکورہ بالا واقعات بیان کرنے کا مقصد ایک طرف تو یہ نشاندہی کرنا تھا کہ رسول اللہؐ کے والد اور دادا مروج برائیوں سے پاک تھے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ اہل قریش میں بہت سے لوگ سابق انبیاء کی شریعت پر عمل پیرا تھے' لہٰذا ان میں برائیاں صنم پرست عربوں کی نسبت کم تھیں۔ تیسرے یہ کہ مشکل کے وقت خدا سے مدد مانگنے (لیکن بتوں کے توسط سے) کا طریقہ موجود تھا۔ ابن خلدون رقمطراز ہے کہ عرب کے کاہنوں اور منجموں نے قبل از نبوتؐ یہ کہنا شروع کر دیا کہ عنقریب عرب میں ایک نبی ہونے والا ہے۔ اسی طرح اہل کتاب یہود و نصاریٰ توریت و انجیل کی بشارتیں دیکھ دیکھ کر آپؐ کی نبوت کی خبر دینے لگے اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی نشانیاں ظاہر کرنے لگا۔ مثلاً اصحاب فیل نے شکست کھائی اور پھر حبشہ کی حکومت یمن سے سیف بن ذی یزن کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ اسی سیف نے حضرت عبدالمطلب کو خوشخبری سنائی کہ وہ جلیل القدر نبیؐ تمہاری اولاد میں سے ہو گا۔ انہیں ایام میں رجم شیاطین بھی ہوا اور وہ زمانہ آ گیا کہ اظہار نبوتؐ سے ظلمت دور کی جائے۔

آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو آپؐ کی والدہ ماجدہؓ نے عبدالمطلبؓ کے پاس خبر بھیجی کہ آپ کے ہاں پوتا ہوا ہے آ کر اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ حضرت آمنہ نے ایام حمل میں جو واقعات دیکھے تھے اور نام رکھنے کے متعلق جو حکم ملا تھا عبدالمطلب سے بیان کر دیا۔ عبدالمطلب آپؐ کو گود میں لے کر خانہ کعبہ میں آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر واپس آ کر دودھ پلانے کے لئے کسی عورت کی جستجو کی۔ حلیمہ سعدیہ نامی خاتون کو یہ مبارک خدمت تفویض ہوئی۔ دو سال کی عمر میں آپؐ خاصے مستعد تھے۔ حلیمہ سعدیہ نے آپ کو اپنے پاس ہی رکھنے پر اصرار کیا تو حضرت آمنہ نے اجازت دے دی۔ چند ماہ بعد آپؐ اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرا رہے تھے۔ (ابن ہشام نے حلیمہ سعدیہ کا یہ بیان نقل کیا ہے) کہ آپ کا رضاعی بھائی اچانک دوڑتا ہوا آیا اور خبر دی کہ آپ کو دو سفید کپڑوں والے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ حلیمہ سعدیہ اور ان کے شوہر نے آپ کو ڈھونڈ کر واقعہ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "سفید کپڑے پہنے ہوئے دو آدمیوں نے مجھ کو لٹا کر میرا سینہ چاک کیا اور اس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگے۔ پتہ نہیں وہ میرے سینے میں کیا ڈھونڈتے تھے"۔ اس حوالے سے مختلف روایات ہیں کہ فرشتوں نے آپ کے دل میں کیا ڈھونڈا۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ فرشتوں نے ایک قطرہ نکال کر کہا کہ یہ حصہ شیطان کا تھا۔ بہر حال یہ واقعہ "شق صدر" کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن میں شرح صدر کا ذکر ہے۔

چنانچہ اس واقعہ کے بعد حلیمہ سعدیہ نے اس خوف سے آپ کو واپس حضرت آمنہ کی
سپردگی میں دیدیا کہ کہیں آئندہ کوئی ایسا واقعہ ہوا تو انہیں جوابدہ ہونا پڑے گا۔ چھ سال کی عمر تک
آپؐ اپنے دادا اور والدہ کی حفاظت میں پرورش پاتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی والدہ نے رحلت
فرمائی۔ آپؐ کے والد آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ دادا نے پرورش کا ذمہ
لیا۔ حضرت عبدالمطلب کے واسطے خانہ کعبہ کے سایہ میں مسند بچھائی جاتی تھی، جس پر احترام کے
باعث اور کوئی نہ بیٹھتا۔ لیکن آپؐ ان کے ساتھ جا بیٹھتے۔ چچا نے آپؐ کو منع کیا تو حضرت عبدالمطلب
نے فرمایا کہ "میرے اس فرزند کو منع نہ کیا کرو کیونکہ یہ بہت ہونہار اور صاحب شان ہے۔" دو سال
ہی گذرے تھے کہ یہ سایہ شفقت بھی آپؐ کے سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ آپؐ اپنے حقیقی چچا ابو طالب
کے زیر سایہ آگئے۔ ایک مرتبہ ابو طالب قریش کے قافلہ تجارت کے ساتھ شام جانے لگے تو
روانگی کے وقت آپؐ ان سے لپٹ گئے۔ اس پر ابو طالب نے کہا "خدا کی قسم میں اسے بھی اپنے ساتھ
لے جاؤں گا اور اب آئندہ کبھی اپنے سے علیحدہ نہ رکھوں گا۔" راستہ میں قافلہ نے پڑاؤ ڈالا تو قریب
ہی بحیرا راہب کی خانقاہ تھی۔ اس نے آپؐ کے سر پر بادلوں کی ٹکڑی اور درختوں کو جھکتے دیکھ کر تمام
اہل قافلہ کو دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ بھی دعوت میں شریک ہوئے۔ کھانے کے بعد راہب آپ
سے مختلف سوالات کرتا اور آپؐ کے جوابات کو ان صفات کے عین مطابق پاتا جو اسے معلوم تھیں۔
پھر اس نے مہر نبوت بھی دیکھی جو آپ کی پیٹھ پر دونوں شانوں کے بیچ تھی۔ اس نے ابو طالب سے
کہا: "اسے فوراً گھر لے جاؤ اور یہودیوں سے اس کی حفاظت کرنا۔ اگر انہوں نے بھی یہ نشانیاں
شناخت کر لیں تو اس کے درپے ہو جائیں گے۔ یہ بہت رفیع الشان انسان ہونے والا ہے۔" یہ سن کر
ابو طالب آپ کو واپس مکہ لے آئے۔

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا متواتر سلسلہ چلا آتا ہے۔ جنگ فجار ان میں
سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک ہے۔ کوئی ایسا نظام عدل موجود نہ تھا جو قوی اور ضعیف دونوں کے
لئے یکساں اطمینان بخش ہو لہٰذا جنگیں اور لڑائیاں معمول تھیں۔ فجار کا معرکہ قریش اور قیس قبیلہ
کے درمیان ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی کے بقول قریش اس لڑائی میں برسر حق تھے اور خاندان کے ننگ و
نام کا معاملہ تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی مگر کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ طٰہٰ حسین
نے لکھا ہے کہ آپؐ تیر چن چن کر اپنے چچاؤں کو دیتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر 14 برس
تھی۔ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھر تباہ کر دیئے تو کچھ معاملہ فہم اور دور اندیش لوگوں
کو اصلاح کی تحریک ہوئی۔ ابن خلدون کے مطابق بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو اسد بن عبدالعزیٰ، بنو زہرہ

اور بنو تمیم نے عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہو کر حلف لیا کہ مکہ میں جو مظلوم آئے گا اس کی حمایت کی جائے گی اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ آنحضرت ﷺ اس معاہدہ "حلف الفضول" میں شریک تھے۔ چنانچہ بعد میں آپ ان کا ذکر تعریف و تحسین کے انداز میں فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عہد نبوت میں ارشاد فرمایا: "اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا اور آج بھی اگر کوئی ایسے معاہدے کے لئے بلائے تو میں حاضر ہوں۔"

ابن طبری نے حضرت علیؓ سے روایت کردہ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جو باتیں لوگ ایام جاہلیت میں کیا کرتے تھے ان کے کرنے کا میں نے دو مرتبہ قصد کیا مگر ہر مرتبہ اللہ میرے اور اس بات کے درمیان آگیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی کسی برائی کا ارادہ تک نہیں کیا۔" یہ دو واقعات بچپن میں شادی کا جلوس دیکھنے کی دو مرتبہ خواہش تھی۔

آپؐ 25 سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت لے کر دوسری مرتبہ شام گئے۔ حضرت خدیجہؓ نہایت مالدار تاجر خاتون تھیں۔ دوسرے لوگ ان کا مال تجارت بیچ کر منافع میں سے کچھ حصہ لے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی راست گفتاری' امانت اور نیک کرداری کا علم ہوا تو درخواست کی کہ آپؐ ان کا مال تجارت شام لے جائیں' اور منافع بھی زیادہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس مرتبہ میسرہ راہب نے آپ کو پہچان لیا اور آپؐ کے نبی ہونے کی پیشگوئی کی۔ آپؐ تجارتی سفر سے واپس آئے تو حضرت خدیجہؓ کو دوچند نفع ہوا۔ حبشی غلام نے انہیں میسرہ راہب کی بات بھی بتائی۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بلوا کر شادی کی تجویز پیش کی۔ آپؐ نے اپنے چچا سے مشورہ کیا جنہوں نے رضامندی ظاہر کی۔ یوں حضرت خدیجہؓ آپؐ کی پہلی زوجہ محترمہ ہوئیں۔ ان کے بطن سے آپؐ کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ تینوں بیٹے قبل از نبوت ہی انتقال کر گئے۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے راہب کی پیشگوئی کا ذکر کیا۔ ورقہ بن نوفل نے بت پرستی ترک کر کے نصرانیت اختیار کر لی تھی اور ممتاز علما میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا: "اگر یہ باتیں حق ہیں تو اے خدیجہؓ! محمدؐ ضرور اس امت کے نبی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ ضرور اس امت میں نبی ہونے والا ہے...... میں شدت سے اس کا منتظر ہوں" پھر یہ شعر بھی پڑھا (ترجمہ) "وہ خبر یہ ہے کہ محمدؐ عنقریب ہم میں سردار ہوں گے اور جو ان سے مقابلہ کرے گا اس کو مغلوب کریں گے۔" ایک شعر میں یہ بھی کہا کہ میں اس دین میں داخل ہوں جس کو قریش برا سمجھیں گے۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے دس سال بعد قریش نے کعبہ کو مسمار کر کے دوبارہ بنایا۔ آپؐ کی عمر اس وقت 35 سال تھی۔ حجر اسود کو دوبارہ نصب کرنے کا موقع آیا تو ہر قبیلہ نے مطالبہ کیا کہ یہ شرف صرف اسے ہی نصیب ہو۔ ایک بوڑھے نے تجویز دی کہ اس جھگڑے کا فیصلہ اس شخص سے کرایا جائے جو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو۔ یہ پہلے شخص رسول اللہؐ تھے' چنانچہ آپ نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ حجر اسود ایک چادر میں رکھ کر سب قبیلوں کے نمائندے اسے نصب کرنے کے لئے لے چلیں۔ ایسا ہی ہوا اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو نصب کیا۔

ابن ہشام نے ابن اسحٰق سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ کی عمر شریف چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت العالمین اور تمام لوگوں کے واسطے بشارت دینے والا مبعوث فرمایا۔ اس زمانے میں آپؐ ہر سال ایک ماہ غار حرا کے اندر خلوت کے واسطے تشریف لے جاتے تھے حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ پر وحی کی ابتدا اچھے خوابوں سے ہوئی۔ جو آپ کو صبح روشن کی طرح نظر آتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کے دل میں عزلت و تنہائی کی رغبت ڈالی گئی۔ چنانچہ آپؐ غار حرا میں کئی کئی راتیں مسلسل عبادت میں بسر کرنے لگے۔ پھر گھر آکر اتنی مدت کے لئے کھانا لے جاتے جو آپ کو غار میں بسر کرنا ہوتی۔ یہاں تک کہ ماہ رمضان کی وہ رات آئی جس میں آپ رسول اللہ ﷺ ہوئے۔ آپ فرماتے ہیں: "میں سو رہا تھا کہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور ریشم کے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک کتاب ان کے پاس تھی۔ مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا کیا پڑھوں؟ جبرائیل نے مجھ کو بھینچا یہاں تک کہ میں سمجھا دم نکل جائے گا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھ۔ میں نے کہا کیا پڑھوں؟ اور میں یہ اس واسطے کہتا تھا تاکہ وہ پھر میرے ساتھ وہی سلوک کریں جو پہلی بار کیا ہے۔ تب انہوں نے کہا پڑھو (ترجمہ) پڑھ اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے انسان کو منجمد خون سے' پڑھ اور تیرا رب وہ شان والا ہے جس نے قلم کے ساتھ سکھلایا۔ انسان کو وہ باتیں سکھلائیں جو وہ نہ جانتا تھا۔" حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو پڑھا اور جبرائیلؑ میرے پاس سے چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی (ابن ہشام)۔

اس واقعہ کے بعد آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور انہیں ماجرا سنایا۔ اپنی علمی قابلیت کی بناء پر انہیں آپؐ کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ اور پھر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ انہوں نے کہا' بے شک وہ اس امت کے نبی ہیں۔ تو جا کر ان سے کہہ کہ ثابت قدم رہیں۔ حضورؐ غار میں اپنے دن پورے کر چکے تو حسب دستور خانہ کعبہ میں جا کر طواف کیا۔ وہیں آپؐ سے ورقہ بن نوفل بھی ملے اور عرض کیا: "اے میرے بھائی کے فرزند مجھ کو آپ سنائیے کہ آپؐ نے کیا دیکھا

اور کیا سنا۔" آپؐ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ انہوں نے پھر آپ کے نبی ہونے کی بات دہرائی اور کہا "بے شک لوگ تم کو جھٹلائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے اور تم سے لڑیں گے اور تم کو نکال دیں گے۔ اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو خدا کے دین کی مدد کروں گا۔" لیکن ورقہ بن نوفل اس دن سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔

اس کے بعد وحی آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آپؐ نے ایمان و تصدیق کے ساتھ اس کے بوجھ کو اٹھایا۔ حضرت جبرائیل نے آپ کو نماز اور وضو کا طریقہ سکھایا اور سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے ایمان لا کر آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ ایمان لائے اور آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر متعدد افراد اسلام لائے۔ لیکن ابھی تک آپؐ اپنی قوم اور قبیلہ سے پوشیدہ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چند مشرکوں نے دیکھ لیا اور برا بھلا کہا تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک مشرک کا سر پھوڑ ڈالا۔ یہ پہلا خون تھا جو خدا کی راہ میں جہاد کے دوران بہایا گیا۔ آہستہ آہستہ اسلام کا ذکر پھیلا اور ہر جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ تین سال تک خاموشی سے تبلیغ اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا: "آپ حق و باطل کا فرق بیان کیجئے اور مشرکوں کی تکذیب کی کچھ پرواہ مت کیجئے۔" خدا کے حکم پر جب آپؐ نے اعلانیہ تبلیغ شروع کی اور مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہا تو وہ آپ کے خلاف ہو گئے۔ قریش نے جب آپ کی استقامت اور یہ دیکھا کہ حضرت ابو طالبؓ بھی آپ کو منع نہیں کرتے تو انہوں نے اشراف قریش میں سے چند نمائندے ان کے پاس بھیجے۔ انہوں نے آ کر ابو طالبؓ سے کہا 'یا تو تم اپنے بھتیجے یعنی آنحضور کو منع کرو کہ ہمارے بتوں کو برا بھلا اور ہمارے باپ دادا کو جاہل اور گمراہ نہ بتائے' ورنہ ہمیں اجازت دو کہ اس سے خود سمجھ لیں۔ ابو طالبؓ نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور حضورؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم میری اور اپنی جان کے ہلاک کرنے کی بات نہ کرو اور ایسے کام کی مجھ کو تکلیف نہ دو جس کی مجھ میں طاقت نہیں۔ پس حضورؐ نے جب دیکھا کہ چچا اب ان کی مدد کرنے سے معذور ہو رہے ہیں تو جواب دیا: "اگر یہ لوگ میری دائیں طرف سورج اور بائیں طرف چاند بھی لا کر رکھ دیں تب بھی اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا......" (راوی کہتا ہے) پھر رسول اللہ ﷺ کے آنسو نکل آئے۔ ابو طالب نے آپ کو آواز دی کہ "اے بھتیجے ادھر آؤ" اور کہا "دیکھو جو تمہارا جی چاہے کہو میں ہرگز تم کو نہ چھوڑوں گا اور سب سے سمجھ لوں گا۔" اس کے بعد ابو طالب آپؐ کے لئے سپر بن گئے۔ رفتہ رفتہ رسول اللہ ﷺ اور قریش کے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے انہوں نے آپؐ سے قطع علیحدگی اختیار کی اور آپؐ کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں معاہدے کئے' ایک دوسرے کو برانگیختہ کیا اور دوسری مرتبہ

ابو طالب کے پاس جاکر کہا کہ حضورؐ کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن ابو طالبؓ نے دستبرداری سے صاف انکار کر دیا۔

حج کے دن قریب آئے تو قریش کے چند آدمیوں نے ایک ضعیف شخص ولید بن مغیرہ کے پاس جمع ہو کر حضورؐ کے خلاف منصوبہ بندی کی۔ مخالفانہ پراپیگنڈہ کے لیے تجاویز میں ایک نے انہیں کاہن مشہور کرنے کا خیال پیش کیا تو دوسرے نے مجنوں قرار دینے کا۔ تیسرے نے کہا کہ ہم انہیں شاعر کہیں گے۔ چوتھے نے زبان کھولی کہ نہیں ساحر کہنا زیادہ درست ہو گا۔ لیکن وہ سب خود ہی ایک دوسرے کی تردید بھی کرتے رہے کہ نہیں ان میں فلاں بات کی علامت موجود نہیں۔ بہر حال وہ گلی کوچوں میں زبان بد دراز کرنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے آپس میں طے کیا کہ ہر قبیلہ اپنے ایسے آدمیوں کو قتل کر دے جو حضورؐ کی حمایت کرتے اور ان کی بات مانتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی عمل ہونے لگا۔ یہ مسلمانوں پر بڑی تکلیف اور سخت آزمائش کا وقت تھا۔ آپؐ نے صالحین کو حبشہ چلے جانے کا حکم دیا مگر خود وہیں رہے۔ نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت کی۔

چنانچہ شدید مخالفت اور ایذاء رساں باتوں کے باوجود آپؐ نے دین کی تبلیغ جاری رکھی۔ عروہ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا کہ قریش نے اپنی عداوت کے اظہار میں سب سے زیادہ سخت بات کیا کی تھی۔ اس نے کہا' میں قریش کے ساتھ موجود تھا۔ ان کے اشراف ایک دن حجر میں جمع تھے اور آپس میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف دریدہ دہنی کرنے لگے۔ اتنے میں حضورؐ آتے دکھائی دیئے تو انہوں نے آپؐ پر طنزاً آوازے کسے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے جب آپؐ ان کے پاس سے گذرتے تو وہ زیادہ سے زیادہ بد گوئی کرتے۔ آخر کار تیسرے چکر پر آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اے معشر قریش! اچھی طرح سن لو' اس ذات کی قسم جس میں محمدؐ کی جان ہے' میں تمہارے لئے قتل و ذبح لے کر آیا ہوں۔ یہ جملہ سن کر سب حواس باختہ ہو کر سہم گئے۔ سب سے زیادہ بری باتیں کہنے والا ہی آپؐ کی خوشامد کرنے لگا۔ لیکن اگلے روز بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ایک گستاخ نے آگے بڑھ کر آپ کی رداکا دامن پکڑنے کی جسارت کی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکر صدیقؓ آپؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور روتے ہوئے کہا: "خدا تم کو ہلاک کرے۔ کیا تم اس شخص کو اس لئے برا کہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔" یہ سن کر وہ پلٹ گئے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ قریش کا ایک سخت واقعہ حضور کو ایذا رسانی کا مجھ تک یہ پہنچا ہے کہ ایک روز ہر گستاخ فرد بشر نے آپ کو برا بھلا کہا اور اذیت پہنچائی۔ آپؐ واپس گھر چلے آئے اور سخت رنجیدگی کی حالت میں منہ لپیٹ

کر لیٹ رہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (ترجمہ) "اے منہ لپیٹنے والے کھڑے ہو اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ۔"

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آپ کو حق و صداقت کا علم بلند رکھنے کا حکم دیا تو دوسری طرف آپ کو مضبوط بھی کیا۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے میں قریش کو اپنی ہار نظر آئی۔ تب عبداللہؓ بن مسعود نے پہلی مرتبہ قرآن کی علانیہ تلاوت کی۔ قریش نے ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور آپ کو گفتگو کے ذریعہ لالچ دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ کہا "اگر تمہارا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم اپنے مال اس قدر تمہاری نذر کرتے ہیں کہ ساری قوم میں تم امیر ہو جاؤ گے اور اگر سردار بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو سردار بناتے ہیں۔" رسول اللہ ﷺ نے جواب فرمایا: "ان میں سے ایک بات (کی خواہش) بھی مجھ میں نہیں۔ مجھ کو خدا نے رسولؐ بنا کر بھیجا...... اور یہ حکم فرمایا ہے کہ میں تمہارے واسطے بشیر و نذیر ہو جاؤں۔ میں نے تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے...... اگر تم قبول نہ کرو تو میں اس وقت تک صبر کیے ہوئے ہوں جب تک کہ خدا مجھ میں اور تم میں فیصلہ فرمائے۔" لالچ اور خوف نے جب آپؐ پر کوئی اثر نہ کیا تو مخالفین بیہودگی پر اتر آئے۔ حتیٰ کہ نماز کی حالت میں آپ پر بکری کی اوجھڑی ڈال دی۔ نماز میں آپؐ پر سنگباری کی جاتی۔ حضرت عمرؓ نے جب اسلام قبول کیا تو اسلام کو کافی تقویت حاصل ہوئی۔ عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہم کعبہ کے پاس نماز نہ پڑھ سکتے تھے' لیکن ان کے قبول اسلام کے بعد ہم کھلم کھلا نماز پڑھتے تھے۔

نبوت کے ساتویں سال (عام الحزن) میں حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی۔ حضرت ابو طالبؓ رسولؐ اللہ کے لیے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی وفات سے آپؐ کے مصائب میں بہت اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ کسی مردود نے آپؐ کے سر مبارک میں مٹی ڈال دی۔ چنانچہ آپ بنی ثقیف سے مدد لینے طائف گئے تو مشرکین نے انکار کر دیا اور آپ کے پیچھے پڑ گئے۔ آپؐ نے اس موقع پر دعا کی: "خداوند میں اپنی کمزوری اور لوگوں کے مقابلہ میں تجھ سے شکایت کرتا ہوں...... تو کمزوروں کا رب ہے...... اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو ان مصائب کی مجھے پروا نہیں۔ تیری حمایت میرے لئے بہت زیادہ وسیع ہے......" آپؐ ثقیف کی طرف سے مایوس ہو کر طائف سے مکہ آنے لگے راستے میں جن آپؐ پر ایمان لائے اور آپ کی مدد پر کمر بستہ ہوئے۔ آپؐ نے ایک شخص کے ذریعہ مکہ پیغام بھیج کر مطعم بن عدی کے پڑوس میں پناہ حاصل کی۔ آپ کو دیکھ کر ابو جہل نے کہا "اے بنی عبد مناف یہ تمہارے نبی ہیں۔" اس پر عتبہ بن ربیعہ نے کہا "مگر اس بات

سے کیوں انکار کیا جائے کہ ہم میں کوئی نبی یا بادشاہ ہو" اس کی اطلاع ملنے پر آپؐ قریش کے پاس آئے اور کہا "عتبہ بن ربیعہ تم نے یہ بات اللہ اور اس کے رسول کی حمایت میں نہیں بلکہ غرور قومی میں کہی ہے اور اے ابو جہل بن ہشام کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ تو ہنسے گا کم اور روئے گا زیادہ۔ اور اے قریش بہت جلد مجبوراً یا دل نخواستہ تم اس دعوت میں شریک ہو گے جس سے اب تک انکار کرتے ہو۔" (طبری)

آپؐ نے تبلیغ دین کا کام پھر زور و شور سے شروع کر دیا۔ بنو کندہ' بنی کلب' بنی خیفہ' بنی عامر نے دعوت اسلام رد کر دی۔ حج کے موقع پر بنو خزرج کی ایک جماعت نے آپؐ کی بات غور سے سنی۔ یہودی ہونے کی وجہ سے وہ اللہ کے نبیؐ کو پہچان گئے اور تصدیق نبوت کر کے اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اب مدینہ کے ہر گھر میں رسول اللہ کا ذکر ہونے لگا۔ اگلے سال حج کے موقع پر انصار کے بارہ آدمیوں نے آپؐ کے ہاتھ پر التوائے جنگ کی شرط پر بیعت کی۔ (تب تک جہاد فرض نہیں ہوا تھا) مکہ میں اسلام کی راہ میں مشکلات پیدا ہوئیں تو خدا نے حق کے لئے مدینہ کے دروازے کھول دیئے۔ مشرکین نے اسے اپنی شکست جان کر سختیوں میں اضافہ کر دیا۔ قریش انصار کے در پے ہو گئے۔ چنانچہ آپؐ نے انہیں مدینہ ہجرت کی اجازت دی اور پھر خود بھی روانہ ہو گئے۔ اسی موقع پر خدا نے کھلم کھلا جہاد کا حکم دیا: "تم ان سے اسقدر لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سب اللہ کے مطیع ہو جائیں۔" مدینہ میں آپؐ بنی سالم بن عوف کے پاس پہنچے کہ جمعہ کا وقت آ گیا۔ اس مقام پر اس روز ایک مسجد بنائی گئی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ ہے جو رسول اللہؐ نے ادا کیا۔ اس موقعہ پر اپنے خطبہ میں آپ نے فرمایا: "میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں جو اس کا منکر ہے اس سے اپنی عداوت کا اعلان کرتا ہوں...... تم صدق نیت سے آخرت کے لئے اللہ کے خوف کو پیش نظر رکھ کر نیک اعمال کرو......"

مدینہ میں آپؐ نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر قیام فرمایا۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ اہل مدینہ کی عورتوں نے گھروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو کر اور دف بجا کر گیت گاتے ہوئے آپ کا استقبال کیا تھا۔ سات ماہ بعد مسجد نبویؐ اور متصل حجروں کی تعمیر مکمل ہوئی تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا۔ مہاجرین مکہ دین اسلام اور پیغمبر عالم کی خاطر اپنا تمام مال اسباب پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔ اگرچہ انصار مدینہ نے اپنا سب کچھ ان کو پیش کر دیا لیکن مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ لہذا آپؐ نے مہاجرین و انصار میں رشتہ مواخات قائم کر دیا۔ اس کے بعد یہود سے معاہدہ کیا اور ایک عہد نامہ لکھ کر دے دیا جس میں انصار و مہاجرین اور یہود کے حقوق کی شرائط تحریر کی گئیں۔ یہ

"میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہے جس کا خلاصہ علامہ شبلی نعمانی نے یوں دیا: (1) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔ (2) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ (3) یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ (4) یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا ۔(5) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔ (6) مدینہ پر کوئی حملہ ہو گا تو دونوں فریق شریک یک دگر ہوں گے (7) کسی دشمن سے ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہو گا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہو گی۔

قریش یثرب سے دور تھے لیکن آپ کو امن و سکون سے زندگی گذارتے اور دین اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہذا یہودیوں کو آپؐ کے خلاف اکسانے لگے۔ مکہ میں رہ جانے والے اہل ایمان پر بھی ظلم و تشدد کی حد کر دی۔ ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ ابھی ہجرت کو ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ قریش کی طرف سے شر کا اظہار ہونے لگا۔ انہیں آپؐ کے یثرب میں مقیم ہونے سے اس بات کی بھی فکر اور اندیشہ تھا کہ اب یثرب کے راستے شام سے ان کی تجارت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اب اسلام اور کفار و منافقین کے مابین کھلم کھلا جنگ کا موقع آیا۔ غزوہ ابواء آپ کا پہلا غزوہ تھا۔ پھر سریہ عبیدہ بن حرث' سریہ حمزہ' غزوہ بواط' غزوۃ العشیرہ' سریہ سعد بن ابی وقاص' غزوہ سفوان' سریہ عبداللہ بن جحش اور غزوہ بدر ہوئے۔ مسلمانوں نے ابوسفیان کے قافلے' جو شام سے واپس مکہ جا رہا تھا' کو لوٹ کر مال غنیمت حاصل کیا اور یوں کفار کی تکالیف کو نامنظور کرنے کا اعلان کیا۔ اہل مکہ اپنے قافلے کے لٹنے کا سن کر جنگ پر آمادہ ہوئے۔ مسلمانوں کا جوش جہاد دیکھ کر آپؐ نے انہیں فتح کی بشارت دی۔ اس جنگ میں ابو جہل اپنے انجام کو پہنچا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتولین کو ایک کنوئیں میں ڈالنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا "اے کنوئیں والو' جو وعدہ تمہارے رب نے تم سے کیا تھا اسے تم نے ٹھیک پایا اور بے شک جو وعدہ میرے رب نے مجھ سے کیا تھا اسے میں نے سچا پا لیا۔"

جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی پر یہود رنج و حسد کرنے اور کہنے لگے: "حضرت محمدؐ کو اچھے لڑنے والوں سے سابقہ نہیں ہوا' اگر ہم سے مقابلہ کرتے تو ان کو معلوم ہوتا۔ یوں انہوں نے آپؐ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے بنی قینقاع کے یہود کو بازار میں جمع کر کے مشرکین کے جنگ بدر والے انجام سے ڈرایا لیکن وہ ہٹ دھرمی کرتے رہے۔ چنانچہ بدر اور احد کے درمیان جنگ ہوئی جو غزوہ بنی قینقاع کے نام سے مشہور ہے۔ یہود کو شکست

فاش ہوئی۔ بچ جانے والوں کو آپؐ نے جلاوطن کر دیا۔ 3 ہجری میں غزوہ کدر اور غزوۃ السویق میں آپ نے مشرکین کو شکست دی۔ جنگ بدر کے بعد اہل قریش میں حضورؐ کی مخالفت کا خیال ترقی پذیر ہو گیا۔ وہ خاصا مال جمع کر کے اپنے حلیفوں اور دوستوں کے ساتھ شوال 3 ہجری میں آپؐ سے لڑنے کے لیے روانہ ہوئے اور احد کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ تین ہزار کی جمعیت میں 700 زرہ پوش، دو سو گھوڑے اور پندرہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہ عورتیں دف بجا کر یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں:

(ترجمہ) اگر تم لڑائی میں پیشقدمی کرو گے تو ہم تمہیں گلے لگالیں گی اور تمہارے لیے بستر بچھادیں گی اور اگر لڑائی سے بھاگو گے تو ہم متنفر ہو کر تم سے جدا ہو جائیں گی۔ لشکر کفار کا سپہ سالار ابو سفیان تھا۔ دوسری طرف آپؐ ایک ہزار صحابیوںؓ کو لے کر مدینہ سے نکلے۔ جنگ شروع ہونے سے آپؐ نے مسلمانوں کو جو حکمت عملی سمجھائی تھی وہ بھلادی گئی اور ادھوری فتح کو مکمل سمجھ کر مال غنیمت جمع کرنے لگے۔ کفار نے پلٹ کر حملہ کیا اور مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا۔ ابو سفیان نے پہاڑی پر چڑھ کے یہ آواز بلند کہا: "لڑائی ختم ہو گئی۔ یوم احد یوم بدر کے برابر ہو گیا۔ ہبل اپنا دین ظاہر کر۔ آئندہ سال پھر تمہاری لڑائی کا وعدہ ہے۔" یہ کہہ وہ واپس ہو گیا۔

4 ہجری میں غزوہ خندق (غزوہ احزاب) ہوا۔ اس غزوہ کا سبب یہ ہے کہ آپؐ نے جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا تو ان میں سے چند لوگ مکہ چلے گئے اور وہاں لوگوں کو آپؐ کے خلاف ابھارا۔ اس کے بعد بنو غطفان پہنچے اور انہیں بھی آمادہ کرنے کے بعد دس ہزار کی جمعیت جمع کر کے مدینہ کا رخ کیا۔ حضور نے مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا اور تین ہزار مسلمانوں کے ہمراہ مقابلہ پر آئے۔ بنو قریظہ بد عہدی کر گئے۔ بنو حارثہ اور بنو سلمہ نے بھی یہ کہہ کر جنگ کرنے سے انکار کیا کہ ان کے گھر خندق سے باہر تھے۔ جنگ شروع ہونے کے کچھ دیر بعد تیز ہوا نے قریش و غطفان کا مال و اسباب اور خیمے الٹ دیئے۔ نیز قریش اور بنو قریظہ میں بھی نا اتفاقی پیدا ہوئی اور کفار واپس چلے گئے۔ آپؐ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا اور انہیں مدینہ لا کر انجام کو پہنچایا۔

آنحضورؐ 6 ہجری میں عمرہ و حج کا قصد کر کے مکہ کو روانہ ہوئے اور آپ نے مدینہ سے ہی احرام باندھ لیا تھا لیکن اہل قریش آپ کو روکنے پر تل گئے۔ حدیبیہ کے مقام پر آپ کا ناقہ بیٹھ گیا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپ نے مسلمانوں سے ساتھ دینے کی بیعت لی۔ نامہ و پیام کے بعد طے پایا کہ اس سال قربانی کر کے واپس چلے جائیں اور آئندہ سال مکہ میں آپؐ اور صحابہ بلا ہتھیار داخل ہوں اور تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ یہ شرائط نامہ صلح حدیبیہ دس سال تک کے لئے مقرر کیا گیا۔ معاہدہ کرنے سے پہلے حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اس معاہدے کا مطلب

دین کے معاملے میں اپنی کمزوری تسلیم کرنا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: "سنو! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ ہر گز اس کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا اور وہ میری بات کبھی نہیں بگاڑے گا" حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ صلح کے تصفیے کے بعد آپؐ نے انہیں بلایا اور کہا "لکھو! یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمدؐ بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے۔ آج سے دس سال تک ہم میں باہم کوئی لڑائی نہ ہو گی۔ اس مدت میں ہر شخص مامون ہوگا اور کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا۔ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آجائے گا رسول اللہ ﷺ اسے اس کے اولیا کے پاس بھیج دیں گے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہیوں میں سے اگر کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا تو وہ اسے آپؐ کے پاس واپس نہ بھیجیں گے۔ اب ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں رہی...... جو جس کے ساتھ مرضی مل جائے......" ابن طبری نے لکھا ہے کہ امن کی خاطر آپؐ نے معاہدے پر رسول اللہؐ کی بجائے اپنا نام لکھوایا تاکہ صرف اس وجہ سے معاہدہ خطرے میں نہ پڑے جائے۔ بہر حال لوگوں کو امن مل گیا اور وہ باہم ملنے جلنے لگے۔ دین کو سمجھ لینے والے مسلمان ہوتے گئے۔ آئندہ دو سال کے دوران بے شمار لوگ اسلام لائے۔

6ہجری میں آپؐ نے چھ صحابہ کرامؓ کو اپنے قاصد کی حیثیت سے مختلف فرمانرواؤں کے پاس بھیجا' جن میں شاہ مصر مقوقس' شاہ قسطنطنیہ ہرقل اور والئی دمشق منذر شامل تھے۔ حاطب نے مقوقس تک آپ کا مبارک نامہ پہنچایا۔ اس نے آپ کو چار باندیاں نذر کیں۔ ابن طبری کے مطابق ان باندیوں میں حضرت ماریہؓ بھی شامل تھیں جن سے حضرت ابراہیم بن رسول اللہؐ پیدا ہوئے۔ وحیہ بن خلیفتہ الکلبی الخزرجی کو ہرقل قیصر روم کے پاس بھیجا۔ اس نے اپنے کوتوال کو بلا کر حکم دیا کہ شام کے چپے چپے میں کوئی ایسا شخص تلاش کرو جو رسول اللہؐ کی قوم کا ہو۔ وہ ابو سفیان کو غزہ میں سے آکر ساتھ لے گئے۔ ابو سفیان سے مروی ہے کہ ہرقل نے آپؐ کے پیروکاروں کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کمزور' غریب' نوجوان بچے اور عورتیں ان کے پیرو ہیں۔ یہ بات بلاشبہ ہرقل کے لئے حیرت انگیز تھی جس کی سلطنت کی بنیاد طبقہ اشراف پر قائم تھی۔ ہرقل نے کہا کاش میں ان کی خدمت میں ہوتا اور ان کے پاؤں دھوتا۔ پھر اس نے دربار لگا کر آپؐ پر ایمان لانے کی تجویز امراء کو پیش کی مگر وہ بہت برہم ہوئے۔ ہرقل نے بھی مسلمان ہونے کا ارادہ بدل دیا اور قسطنطنیہ چلا گیا۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ آپؐ نے شجاع بن وہب کو منذر رئیس دمشق کے پاس بھیجا۔ منذر نے خط سن کر کہا وہ کون ہے جو میری ریاست مجھ سے چھین سکتا ہے۔ میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جواب سن کر فرمایا: اس کی ریاست برباد ہوئی۔ شاہ حبشہ نجاشی نے خط ملنے کے بعد اسلام قبول کر

لیا۔

شاہ فارس کسریٰ ابھی تک شاید اپنی سلطنت کے شاندار ماضی کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا۔اس نے رسول اللہ ﷺ کا پیام ملنے پر غرور کے عالم میں اسے پارہ پارہ کر دیا اور کہا کہ میری رعایا نے ہی مجھے خط لکھا۔جب آپ کو اس حرکت کی اطلاع ملی تو فرمایا "اسی طرح اس کی حکومت کے پرزے ہو جائیں گے"۔کسریٰ نے اپنے والئی یمن باذان کو حکم دیا کہ وہ اپنے دو دلاور آدمی حجاز بھجوا کر آپ کو گرفتار کرے۔صاف داڑھی اور بڑھی ہوئی مونچھوں والے باذان کے دو نمائندے آپؐ کے پاس آئے اور مدعا بیان کیا۔آپؐ نے اگلے روز بات کرنے کے لیے کہا۔اسی رات کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی۔آپؐ نے اگلی صبح باذان کے نمائندوں کو یہ حقیقت بتائی اور فرمایا: "اسے (باذان کو) یہ جا کر کہہ دو کہ میرا دین اور میری حکومت بہت جلد کسریٰ کی تمام سلطنت میں پھیل جائے گی اور وہاں تک پہنچے گی جہاں تک اونٹ اور گھوڑے جاتے ہیں۔"

7ہجری کے ماہ محرم میں آپؐ 1400 پیادے اور 200 سواروں کی جمعیت لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔بنو غطفان نے خیبر کے یہودیوں کا ساتھ دینا چاہا لیکن لشکر اسلامی کو دیکھ کر ڈر گئے۔جس وقت آپ خیبر کے نیچے پہنچے تو دیکھا کہ لوگ ہل وغیرہ سامان زراعت لے کر باہر آ رہے ہیں۔لیکن لشکر کو دیکھ کر قلعے کے اندر جا چھپے۔مسلمانوں نے ایک ایک کر کے قلعے فتح کرنا شروع کیے۔قلعہ حصن القموص سے بہت سے قیدی ہاتھ آئے جن میں ام المومنین حضرت صفیہؓ بھی شامل تھیں۔ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے گھریلو گدھوں کے گوشت پکائے تو رسول مقبولؐ نے ان کے کھانے سے ممانعت فرما دی۔آپؐ نے انہیں چار باتوں سے منع کیا: (1) حاملہ عورت کے پاس نہ جائیں' (2) گھریلو گدھے کا گوشت نہ کھائیں' (3) کسی درندے کا گوشت نہ کھائیں اور (4) مال غنیمت کے تقسیم ہونے سے پہلے اسے فروخت نہ کریں۔ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح کر لئے گئے۔اہل فدک نے درخواست کی کہ انہیں جلاوطن کر کے تمام املاک لے لیں اور جان بخشی کر دیں۔آپؐ نے یہ درخواست قبول فرمائی۔فدک کو آپؐ نے خاص اپنے اخراجات کے لئے رکھا تھا کیونکہ یہ لشکر کشی کے بغیر فتح ہوا تھا۔مصالحت کی شرائط میں اہل خیبر نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ ان زمینوں کی نصف پیداوار کی ادائیگی پر ہم سے معاملہ کر لیں کیونکہ ہم دوسروں کے مقابلہ میں ان سے زیادہ واقف ہیں اور بہتر طریقے پر ان کو آباد رکھیں گے۔آپ نے زمینیں ان کے پاس رہنے دیں اور یہ شرط کر لی کہ جب ہم چاہیں گے تم کو ان سے بے دخل کر دیں

گے۔ اہل فدک نے بھی اسی شرط پر صلح کی۔ اس غزوے میں کچھ مسلمان عورتیں بھی شامل تھیں۔ آپ نے اگرچہ مال غنیمت میں ان کو حصہ نہیں دیا مگر مفتوحہ علاقے کی پیداوار میں ان کو شریک کیا۔ ابن ہشام کہتے ہیں جس دن خیبر فتح ہوا اسی دن حضرت جعفرؓ بن ابی طالب دیگر صحابہؓ کے ساتھ حبشہ سے واپس آئے۔ حضرت جعفرؓ کو دیکھتے ساتھ ہی آپؐ نے گلے لگا لیا اور پیشانی پر بوسہ دے کر فرمایا:
”میں نہیں جانتا کہ مجھ کو کس بات کی زیادہ خوشی ہے خیبر کے فتح ہونے کی یا جعفرؓ کے آنے کی۔“

8 ہجری کے ماہ ذی القعدہ میں آپ عمرہ قضا کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ آپؐ نے اس سفر میں حالت احرام میں میمونہؓ بنت حارث سے نکاح کیا۔ اس سال عمروؓ بن العاص، خالدؓ بن ولید، اور عثمانؓ بن ابی طلحہ جیسے اہم قریشی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے لشکر ترتیب دے کر زیدؓ بن حارث کو سالار بنایا اور شام کی طرف روانہ کر دیا۔ شاہ روم ہرقل نے بھی بہت بڑی فوج جمع کر کے مقابلہ کی تیاری کر لی۔ موتہ کے مقام پر دونوں لشکروں کا ٹکراؤ ہوا۔ زیدؓ بن حارث اور پھر حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد خالدؓ بن ولید نے سالاری سنبھالی اور فتح حاصل کی۔

صلح حدیبیہ کے وقت بنو خزاعہ حضور کے ساتھ مل گئے تھے اور قریش کے گروہ میں بنو بکر شامل تھے۔ زمانہ جاہلیت سے ہی ان دونوں میں شدید عداوت چلی آ رہی تھی۔ انہی کی دشمنی کے باعث معاہدہ امن خطرے میں پڑ گیا۔ بنو خزاعہ کے کچھ افراد نے آپ کے پاس آکر بنو بکر کی زیادتیوں کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے ان سے امداد کا وعدہ فرمایا۔ ابو سفیان نے تجدید معاہدہ کی بھرپور کوشش۔ پہلے اپنی بیٹی ام المومنینؓ ام حبیبہ کے پاس آئے مگر انہوں نے بات ہی نہ کی۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ابو سفیان کی بات کا جواب نہ دیا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے درخواست بھی لاحاصل رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ جانے کا فیصلہ کیا اور روانہ ہوئے۔ راستے میں کدید کے مقام پر روزہ افطار کیا اور مر الظہر ان میں فروکش ہوئے۔ قریش کو آپؐ کے لشکر کی نقل و حرکت کا علم نہ تھا۔ حضرت عباسؓ بن عبد المطلبؓ چاہتے تھے کہ خونریزی کے بغیر ہی کوئی راہ نکل آئے۔ چنانچہ وہ جا کر ابو سفیان سے ملے اور انہیں منا کر آپؐ کے پاس لے آئے۔ اگلی صبح ابو سفیان حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوئے تو آپ نے فرمایا: ”اے ابو سفیان کیا تیرے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو میری رسالت کا اقرار کرے؟“ ابو سفیان نے پس و پیش دکھائی۔ ابن عباسؓ نے اس موقع پر کہا کہ اے ابو سفیان اگر عمرؓ آ گئے تو تیری خیر نہیں۔ ابو سفیان نے گواہی دی اور اسلام قبول کر لیا۔ پھر ابو سفیان دوڑے دوڑے مکہ گئے اور اہل قریش کو پکار کر کہا: ”اے قریش محمدؐ آ گئے ہیں۔“ یہ سن کر ہندہ بنت

عتبہ نے ان کی مونچھ پکڑلی اور قریش سے کہا "اس مضبوط موٹے فربہ پہلوان کو قتل کر دو کہ یہ ذرا سے لشکر کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا" لیکن ابو سفیان نے کہا: "اے اہل قریش، تم اس کے دھوکے میں آکر اپنی جان نہ کھونا۔ جو شخص میرے گھر، مسجد حرام یا اپنے گھر میں بند رہے گا اسے امن ہے" یہ سن کر بہت سے لوگ گھروں کو بھاگ گئے۔ مکہ میں کوئی بھی قائد نہ رہا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی کامیاب جنگی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ لہذا جب لشکر اسلام مکہ میں داخل ہوا تو مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ حضورؐ مسجد حرام میں داخل ہوئے، کعبہ کا سات مرتبہ طواف کیا۔ اگلے دن باب کعبہ پر کھڑے ہو کر رسوم جاہلیت، مجاورت بیت اللہ و سقایۃ الحجاج کو برقرار رکھا اور خطبہ میں فرمایا: "کان کھول کر سن لو، ہر رسم، یا خون یا مال جس کا جاہلیت میں دعوی کیا جاتا تھا میرے پیروں کے نیچے ہے...... یاد رکھو قتل خطا قتل عمد کی طرح ہے خواہ کوڑوں سے ہو یا لاٹھیوں سے دونوں کی دیت سنگین ہے...... سب سے زیادہ متقی ہی اللہ کے زیادہ نزدیک ہے۔" یکم شوال کو جب لشکر اسلام واپس جا رہا تھا تو وادی حنین میں چھپے ہوئے لشکر کفار نے رات کے وقت حملہ کر دیا۔ پہلے حملہ میں بظاہر مسلمانوں کو شکست ہوئی لیکن معرکہ ان کے حق میں رہا۔ 9 ہجری میں قسطنطنیہ کے بادشاہ ہرقل کے ساتھ غزوہ تبوک واقع ہوا اور اسلام کا علم بلند رہا۔

احمد امین مصری نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ کو سب سے زیادہ مشکل کا سامنا جاہلیت کی اقدار کو بدلنے میں ہوا۔ اور اس میں کامیابی ہی ان کی دیگر فتوحات کی بنیاد بنی۔ جاہلی عقلیت ہی کے باعث آپؐ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ مگر اسلام یا بہ الفاظ دیگر نئی عقلیت اس وقت پھیلی جب حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نے قریش کو فوجی حیثیت سے شکست دی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو نزاع اولا رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین تھا، دوسرے درجے میں یہ مکی اور مدنی لوگوں کا نزاع بن گیا اور اس کے بعد نو مسلموں اور غیر مسلموں کا نزاع بنا رہا۔ یہ درحقیقت دو عقلیتوں کے درمیان کا نزاع تھا۔ ایک طرف بت پرستانہ عقلیت تھی جس میں لذائذ و نعائم مباح ہوتے تھے۔ ہر شخص کو بڑی حد تک آزادی حاصل تھی اور خاص خاص پیمانوں کے مطابق ہی اس میں اخلاق و عادات کے اندازے قائم کیے جاتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی عقلیت میں بتوں کو روندا جاتا۔ لذائذ و نعائم اس میں بھی حلال تھے مگر ایک خاص حد تک۔ خاص اوقات میں عبادتیں مقرر تھیں ملکیت کا احترام کیا جاتا، اخلاق کی قیمت یکسر بدل دی گئی۔ ان نئی عقلی اقدار کی جھلک ہمیں 10 ہجری میں خطبہ حجتہ الوداع میں بھی واضح نظر آتی ہے۔ آپ نے فرمایا: (1) قیامت تک کے لئے تمہارا خون اور مال اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح کہ آج کے دن اور اس مہینے کی حرمت ہے (2) تم

اپنے رب سے ملو گے اور وہ تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا' (3) جس کے پاس کوئی امانت ہو اسے چاہئے کہ وہ امانت رکھوانے والے کو واپس کر دے' (4) ہر قسم کا سود ساقط ہے' (5) جاہلیت میں جتنے خون ہوئے ان کا ہرگز انتقام نہ لیا جائے' (6) اپنے دین کی حفاظت کے لیے شیطان سے ڈرتے رہو' (7) تمہاری بیویوں پر تمہارا اور تم پر ان کا حق ہے' (8) ہر مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

اذا جاء نصر اللہ والفتح والی پوری سورۃ میں آپؐ پر اپنی وفات کی خبر منکشف ہو چکی تھی۔ ابن ہشام کے مطابق 11 ہجری کے آخر صفر یا شروع ربیع الاول میں آپ کی علالت شروع ہوئی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "جس وقت آپؐ میرے پاس تشریف لائے تو آپ کے سر میں شدید درد تھا۔ دوشنبہ کے روز صبح کے وقت نماز ہو رہی تھی کہ آپ پردہ اٹھوا کر حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے تو مسلمان آپ کو تندرست دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔" حضرت عائشہؓ سے ہی روایت ہے کہ اسی روز جب آپؐ مسجد سے واپس تشریف لائے تو میری گود میں لیٹ رہے..... آپؐ نے مسواک کی' پھر میں نے دیکھا کہ نبی کریم کا بدن بھاری ہو گیا ہے اور یکایک آپؐ نے اوپر نگاہ کر کے فرمایا: بل الرفیق الاعلی من الجنتہ پھر رسول اقدسؐ کا وصال ہو گیا۔

حضرت علیؓ' حضرت عباسؓ' فضل بن عباس' قثم بن عباسؓ' اسامہ بن زید اور شقران مولے نے آپ کو لباس سمیت غسل دیا۔ حضرت علیؓ کہتے جاتے تھے: "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپؐ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں کس قدر پاک صاف ہیں۔"

ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی صلعم دوشنبے کو پیدا ہوئے' دوشنبے کو ہی آپ کو نبوت ملی' دوشنبے کو آپ نے حجر اسود اٹھایا دوشنبے کو ہجرت کی' دوشنبے کو مدینہ پہنچے اور دوشنبے کے دن وفات پائی۔ وصال کے وقت آپ کی عمر 63 برس تھی۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نہ دراز قامت تھے اور نہ کوتاہ قامت۔ سر اور چہرہ بڑا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں بڑی تھیں پنڈلیاں موٹی اور رنگ سرخ تھا۔ چلتے وقت لمبے لمبے قدم بھرتے۔ آنکھیں نہایت سیاہ' بال سیاہ' رخسار نرم اور داڑھی گھنی تھی۔ ہنسلی سے لے کر ناف تک بال تھے۔

آپؐ نے 27 غزوات میں حصہ لیا جبکہ چھوٹے اور بڑے 38 لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے۔ جابر سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے تین حج ادا کیے۔ ہشام بن محمد اپنے باپ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے پندرہ عورتوں سے نکاح کیا' تیرہ کے ساتھ مباشرت کی' ایک وقت میں گیارہ موجود ہیں اور نو کر چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس تین گھوڑے' ایک خچر' بیس دودھ دینے والی اونٹنیاں' سات

بکریاں، تین تلواریں، تین نیزے، تین کمانیں اور دو زرہیں تھیں۔

نوٹ :۔ اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا: (1) سیرت النبیؐ از ابن ہشام، (2) سیرت النبی از علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، (3) تاریخ ابن خلدون، (4) تاریخ طبری، (5) اسلام منزل بہ منزل از طہ حسین، (6) فجر الاسلام از احمد امین مصری، (7) عرب از ول ڈیورانٹ، (8) ہسٹری آف عربز از فلپ کے حتی، (9) لینڈ لارڈ اینڈ پیزنٹ ان ارلی اسلام از ضیاء الحق۔

دوسرا حصہ

خلفاء

حضرت ابو بکر صدیقؓ

(573ء------637ء)

ایام جاہلیت میں حضرت ابو بکرؓ کا نام عبداللہ ابن ابی قحافہ تھا' اسلام لانے کے بعد حضرت محمدؐ نے عبداللہ تجویز فرمایا۔ صدیق و عتیق دونوں لقب ہیں۔ ابو بکرؓ کنیت ہے جس نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ نسبتاً قریشی تیمی ہیں۔ چھٹی پشت میں مرہ بن کعب پر پہنچ کر آپؓ کا نسب رسول اکرمؐ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ عام الفیل کے اڑھائی برس بعد پیدا ہوئے یعنی آغاز سن ہجری سے پچاس برس چھ ماہ قبل۔ ایام جاہلیت میں بھی قریش کے رؤسا میں سے تھے۔ مدینہ میں رہتا تجارت ذریعہ معاش تھی۔ بالغ مردوں میں آپ سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔

10ھ میں اپنی وفات سے قبل پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ علالت کے زمانہ میں ایک روز مسجد میں تشریف لائے اور کچھ گفتگو کے بعد کہا کہ جس قدر مکانوں کے دروازے صحن مسجد میں ہیں وہ بند کر دیئے جائیں' مگر ابو بکرؓ کے گھر کا دروازہ بدستور رہے اور پھر فرمایا: "میں کسی کو نہیں جانتا جو میرے نزدیک رفاقت میں باعتبار احسانات کے ابو بکرؓ سے افضل ہو' پس اگر میں کسی کو قلبی دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکرؓ کو بناتا" رسول اللہؐ نے اپنی علالت کے آخری ایام میں حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ نماز ادا کی۔ آپ نے 12 ربیع الاول کو 11ھ میں وفات پائی۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ سخ میں تھے اور آپ کی وفات کی خبر سنتے ہی روانہ ہو گئے ان کی عدم موجودگی میں کسی کو آپ کا چہرہ مبارک کھولنے کی جرات نہ ہوئی۔ ابو بکرؓ نے آکر آپ کا چہرہ کھولا۔ پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا کہ آپؐ پاک جیئے اور پاک فوت ہوئے۔ اس کے بعد خلیفہ منتخب کرنے کا سوال پیدا ہوا تو حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں سے کہا کہ تم عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں سے جسے چاہو امیر بنا لو میں اس پر خوش ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ تم میں سے کون شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اس شخص کو موخر کرے جسے رسول اللہؐ نے مقدم کیا۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی بعض انصار نے کہا کہ ہم حضرت علیؓ کی بیعت

کریں گے۔ ابن الجبیر سے مروی ہے کہ ابو سفیان نے علیؓ سے کہا کہ یہ کیا ہوا کہ حکومت قریش میں سب سے کم تعداد قبیلے میں چلی گئی۔ خدا اگر تم چاہو تو میں ایک زبردست فوج بھیج کر حضرت ابو بکرؓ سے حکومت چھین لوں۔ اس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ اے ابو سفیان تم ہمیشہ سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن رہے مگر تمہاری دشمنی سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہم نے ابو بکرؓ کو حکومت کا اہل سمجھ کر ان کی بیعت کی۔ سقیفہ میں حضرت ابو بکرؓ کی بیعت عام ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے تقریر میں کہا: ''لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے حالانکہ میں تمہارا بہترین فرد نہیں ہوں۔ اگر میں نیکی کروں تو تم میری اعانت کرنا اور اگر میں برائی کروں تو مجھے سیدھا کر دینا...... جب تک میں رسولؐ اور اللہ کی پیروی کروں تم میری اطاعت کرنا اور اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کروں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں''

حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بننے سے قبل تجارت کرتے تھے اور اس وقت آپ کا مکان سخ میں تھا' مگر پھر مدینہ آ گئے بیعت خلافت کے بعد چھ ماہ تک سخ میں ہی مقیم رہے اور ہر صبح کو مدینہ پیدل آتے رہے اور کبھی کبھار گھوڑے پر آجاتے۔ ان کے جسم پر ایک تہمد اور پرانی چادر ہوتی۔ مدینہ میں لوگوں کو نماز پڑھا کر واپس چلے جاتے۔ ان کے پاس بکریوں کا ایک ریوڑ بھی تھا۔ اکثر خود اسے چرانے چلے جاتے۔ آپ قبیلے والوں کی بکریوں کا دودھ بھی دوہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ایک لڑکی نے کہا'' اب ہمارے گھر کی بکریاں نہیں دوہی جائیں گی'' اس کی یہ بات سن کر آپ نے فرمایا ''ہاں! خدا میں تمہاری بکریاں ضرور دوہوں گا اور مجھے امید ہے کہ اس منصب سے میری سابق عادات میں کوئی تغیر واقع نہ ہوگا'' چنانچہ خلیفہ ہو کر بھی آپؓ قبیلے کی بکریوں کا دودھ دوہتے رہے۔ سخ کے قیام کے زمانہ میں چھ ماہ تک یہی آپ کا طرز عمل رہا۔ پھر مدینہ آکر تجارت ترک کر دی اور بیت المال میں سے اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کے لئے روزانہ خرچ لینے لگے۔ لوگوں نے آپ کے ذاتی مصارف کے لئے سالانہ چھ ہزار درہم کی رقم منظور کی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا دور خلافت بہت ہی ہنگامہ خیز تھا۔ آپ ہی کے زمانے میں فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے عرب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی منکرین زکواۃ نے بھی ملک بھر میں انتشار پھیلایا۔ ریاست اسلامیہ کی گوناگوں ذمہ داریوں اور امت کی قیادت کا بار بھی آپؓ کے کاندھوں پہ آن پڑا تھا۔ اس طوفانی دور میں بھی آپؓ نے کسی قیمت پر رسول اللہؐ کے احکامات سے ذرا بھی روگردانی نہ کی۔ بیعت خلافت کے بعد آپؓ کو جو سب سے پہلا مسئلہ درپیش ہوا جیش اسامہؓ کی روانگی کا تھا۔ رسول اللہؐ نے اپنی وفات سے قبل اہل مدینہ اور حوالی مدینہ سے ایک مہم

مقرر کی تھی جس میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ اسامہؓ بن زید کو آپ نے مہم کا سربراہ مقرر کیا۔ ابھی یہ مہم پوری طرح خندق کو پار نہیں کر چکی تھی کہ آپؐ کی وفات ہو گئی۔ اسامہؓ سب کے ساتھ ٹھہر گئے اور حضرت عمرؓ کو بھیجا کہ خلیفہ سے واپسی کی اجازت لے کر آئیں کہ کہیں پیچھے سے مشرک مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے آکر مدعا بیان کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے خفا ہو کر فرمایا: "جس شخص کو رسول اللہ نے روانہ کیا ہے تم مجھ سے کہتے ہو کہ اسے علیحدہ واپس بلالوں" پھر آپؓ خود مدینہ سے اس مہم کے پڑاؤ میں آئے اور دس باتوں کی نصیحت کی: "یاد رکھو خیانت نہ کرنا' نفاق نہ برتنا' بد عہدی نہ کرنا' جسم کے اعضا نہ کاٹنا' کسی بچے' بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا' کسی کھجور کے درخت کو نہ کاٹنا اور نہ جلانا' کسی ثمر دار درخت کو نہ کاٹنا' بیکار کسی بکری گائے اور اونٹ کو ذبح نہ کرنا' تارک الدنیا لوگوں سے تعرض نہ کرنا' اگر کچھ لوگ تمہارے لئے کھانا لائیں تو اس میں سے کچھ کھانا اللہ کا نام لے کر کھانا" پھر حضرت عمرؓ کو اپنے پاس رکھ لیا اور فوج کو ہدایت کی کہ رسول اللہ کی طے کردہ حکمت عملی پر عمل کرنا۔ اسامہؓ نے ایسا ہی کیا اور کامیابی پائی۔ اس مہم کے وقت حالت یہ ہو چکی تھی کہ تمام عرب قبائل یا تو سب کے سب مرتد ہو چکے تھے یا ان میں سے کچھ لوگ مرتد تھے۔ بہر حال کوئی قبیلہ پورا مسلمان نہیں رہا تھا۔ اب یہود و نصاریٰ للچائی ہوئی نظروں سے مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ تمام امراء نے اپنے اپنے مستقر سے اطلاع بھیجی کہ ہر جگہ فتنہ ارتداد برپا ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں ذرائع سے ان کا مقابلہ شروع کیا جو رسول اللہؐ استعمال کر چکے تھے' یعنی مراسلت۔ پھر مرتدین نے رات کے وقت مدینہ پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں پر ظلم کرنے لگے۔ تین قبائل نے اسلام کی حمایت کا اعلان کیا۔ حضرت اسامہؓ کی فوج واپس آئی تو حضرت ابوبکرؓ نے گیارہ جمعتیں تیار کر کے مرتدین کے مقابلہ کے لئے انہیں گیارہ نشانوں پر روانہ کیا اور اپنا ایک خط بھی ان کے نام بھیجا جس میں ان سے دین کی طرف واپس لوٹ آنے کا کہا۔ اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے' لیکن فتنوں کا سلسلہ جاری رہا اور سرکوبی کا بھی۔ عمان' بحرین' یمن' نجد حضر موت میں فتنے برپا ہوئے۔ آپؓ کے دور میں اسود عنسی' طلیحہ' علقمہ بن علاثہ' سجاح' مسلیمہ کذاب قیس بن یغوث اور اشعث نے نبوت کا دعویٰ کیا جن سے آپ بہ طریق احسن نمٹے۔

11ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو قاضی مقرر کیا جس عہدے پر وہ ان کی وفات تک قائم رہے۔ خالد بن ولیدؓ کو عراق اور ایران میں مختلف مہمات پر روانہ کیا۔ 13ھ میں شام کی طرف فوجیں بھیجنے کا فیصلہ کیا اور خالد بن سعیدؓ کو پہلا امیر بنایا لیکن پھر انہیں معزول کر کے یزید بن سفیان کو امیر بنا کر روانہ کیا۔ خالد بن سعیدؓ پر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو شبہ تھا۔ لیکن پھر بھی جب ابوبکرؓ نے

مرتدین کی سرکوبی کے لئے افسران فوج منتخب کیے تو ان میں خالد بن سعیدؓ بھی شامل تھے اور انہیں تیما میں امدادی دستے پر متعین کر دیا۔ میدان جنگ میں خالد بن سعیدؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی ہدایات پر عمل نہ کیا اور شکست کھائی لیکن آپ نے انہیں معاف کر دیا۔

آپ کی حکومت کی بنیاد قرآن و حدیث تھی۔ اگر کسی مسئلہ کا حل قرآن یا حدیث میں نہ ملتا تو اہل الرائے صحابہ کرام کے مشورہ سے فیصلہ کرتے۔ بیت المال کی آمدنی تقسیم کرتے وقت سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرتے۔ گورنر مقرر کرنے میں آپ کا اصول تھا کہ جو گورنر رسول اللہؐ کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہے انہیں ہی تعینات کیا۔ معرکہ یمامہ میں جب بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ لیکن آپ اس وجہ سے متامل تھے کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہ کیا وہ کیسے کریں۔ مگر پھر غور و خوض کے بعد یہ مشورہ مان لیا۔ چنانچہ آپؓ نے قرآن مجید کو لکھوا کر اسلام کی بنیادیں مضبوط کیں۔ حضرت ابو بکرؓ سے 142 احادیث مروی ہیں۔ فقہ کے متعلق آپ نے اجتہاد کا قاعدہ مقرر کیا جو سارے مجتہدین کا دستور العمل بن گیا۔

آپ خوابوں کی تعبیر میں بھی بڑے ماہر تھے۔ سب سے اول تصفیہ و تزکیہ باطن کے واسطے کلمہ طیبہ کا طریقہ ذکر حضرت ابو بکرؓ نے تلقین کیا۔ شاہ ولی اللہ نے تصوف صدیقیؓ کے ذیل میں حضرت صدیق اکبرؓ کے ان تمام اوصاف کی تفصیل دی ہے جو اساس تصوف ہیں۔ مثلاً توکل' احتیاط' تواضع' خدا کی مخلوق پر شفقت' رضا' خوف الٰہی۔ حضرت ابو بکرؓ نے ایک روز درخت پر چڑیا دیکھی تو حسرت سے فرمایا: "اے پرندے خوش حال ہے تو پھل کھاتا ہے' درخت کے سایہ میں زندگی بسر کرتا ہے' حساب کتاب کا کچھ کھٹکا نہیں۔ کاش ابو بکرؓ تجھ جیسا ہوتا" سلسلہ نقشبندیہ حضرت امام جعفر صادق کی وساطت سے حضرت ابو بکرؓ تک پہنچتا ہے۔

بے شمار خطیبوں نے کروڑوں مرتبہ ابو بکر صدیقؓ کے "افضل البشر بعد الانبیا بالتحقیق" ہونے کا اعلان کیا ہے۔ فضائل صدیقی کی بنیاد تین شہادتوں پر ہے (1) آیات کلام مجید' (2) احادیث نبوی اور (3) اقوال صحابہ کرام و اہل بیت۔ "نیز آنحضرتؐ نے آپؓ کے جنتی ہونے کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا: "قیامت کے روز سب سے اول میری قبر کشادہ ہوگی پھر ابو بکرؓ اور پھر عمرؓ کی۔ میری امت میں سب سے اول ابو بکرؓ جنت میں داخل ہوں گے" اس کے علاوہ اسلام میں سب سے پہلے مسجد آپ نے بنائی۔

روایات کے مطابق آپ کا بدن چھریرا اور رنگ نہایت ہی گورا تھا رخسار بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور تمام صحابہ کرامؓ سے زیادہ فصیح البیان تھے۔ آپ کا عرصہ خلافت دو

سال چار ماہ مگر چار دن کم تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے متعلق ایک بیان طبری نے یہ لکھا ہے کہ آپ کو یہودیوں نے دھوکے سے چاول یا دلیے میں زہر ملا کر دیدیا تھا جس کا اثر ایک سال بعد ظاہر ہوا تھا۔ چنانچہ ایک سال بعد جب آپ شدید بیمار ہوئے تو کسی نے طبیب کو بلانے کا مشورہ دیا مگر آپ نے فرمایا: "وہ مجھے دیکھ چکا ہے...... اس نے کہا ہے کہ میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں" ایک اور زیادہ مستند مانی جانے والی روایت کے مطابق آپ نے سردی میں غسل کیا اور بخار میں مبتلا ہو گئے۔ اس دوران حضرت عثمانؓ آپ کی تیمارداری کرتے رہے۔ آپ اس مکان میں اقامت پذیر تھے جو آنحضرتؐ نے آپ کو دیا تھا۔ مرض الموت میں آپ نے یہ اشعار پڑھے: (ترجمہ) "ہر دولتمند کا مال میراث میں بٹ جائے گا اور ہر سامان والے سے اس کا سامان چھوٹ جائے گا۔ ہر غائب ہونے والا واپس آجاتا ہے مگر مر کر غائب ہونے والے کبھی واپس نہیں آتے"

محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وفات سے قبل حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو تخلیے میں بلایا اور ان سے کہا "لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ عہد نامہ ابو بکر بن ابی قحافہ نے مسلمانوں کے نام لکھا ہے۔ امابعد!......" اس کے بعد آپ پر غشی طاری ہو گئی اس لئے حضرت عثمانؓ نے لکھ دیا "امابعد میں تم پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں......" پھر آپ ہوش میں آگئے اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ سناؤ تم نے کیا لکھا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے پڑھ کر سنایا تو آپ نے تکبیر پڑھی اور فرمایا: "میں سمجھتا ہوں کہ شاید تمہیں یہ اندیشہ ہوا ہو کہ اگر اس غشی میں میری روح پرواز کر گئی تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا" حضرت عثمانؓ نے کہا' ہاں میں نے یہی خیال کیا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ بولے: "خدا تم کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے" اور مضمون کو برقرار رکھا۔ جب طلحہ بن عبید اللہ نے حضرت عمرؓ کی سختی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نامزدگی پر اعتراض کرنا چاہا تو آپ نے کہا: "یاد رکھو جب میں خدا کے سامنے جاؤں گا اور وہ مجھ سے باز پرس کرے گا تو میں کہوں گا میں نے تیری مخلوق پر ان میں سے بہترین شخص کو خلیفہ بنایا"

حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عبد الرحمٰن سے تین چیزیں کرنے کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا: "کاش میں اشعث کی گردن مار دیتا کاش میں نے خالدؓ کو مرتدین کے مقابلہ کے لئے روانہ نہ کیا ہوتا اور کاش میں نے خالد بن الولیدؓ کو جب شام کی طرف بھیجا تھا تو اس وقت عمر بن الخطاب کو عراق کی طرف بھیج دیتا۔" آپؓ نے رسول اکرمؐ سے تین باتیں پوچھنے کی آرزو بھی کی: "کاش میں پوچھ لیتا کہ امارت کس کو ملنی چاہئے تاکہ پھر کسی کو نزاع کا موقع نہ ملتا کاش میں آپ سے پوچھ لیتا کہ انصار کے لئے

اس حکومت میں کچھ حصہ ہے اور کاش میں آپ سے آپ کی میراث کے متعلق دریافت کر لیتا کیونکہ میرے دل میں اس کے متعلق کچھ بے اطمینانی ہے۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا۔ میں نے کہا تین کپڑوں میں۔ آپؓ نے کہا تم لوگ میرے یہ دونوں کپڑے دھولو (وہ دونوں کپڑے پھٹے ہوئے تھے) اور ایک کپڑا میرے لئے خرید لو۔ میں نے کہا' ابا جان ہم لوگ تو خوشحال ہیں۔ آپؓ نے فرمایا اے بیٹی مردے کی بہ نسبت زندہ آدمی نئے کپڑے کا زیادہ مستحق ہے اور یہ دونوں کپڑے پرانے اور بوسیدہ ہونے والوں کے لئے مناسب ہیں۔"

آپ کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے: "بار الہا! مجھ کو حالت اسلام موت دے اور مجھ کو صالحین کے پاس پہنچا دے" جب آپؓ کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا کہ "بیت المال کا جو کچھ سامان ہمارے پاس ہے سب واپس کر دو کیونکہ میں اس میں سے کچھ اپنے ذمہ نہیں رکھنا چاہتا" چنانچہ زمین' ایک اونٹنی' ایک قلعی گر غلام اور پانچ ہزار درہم کا کچھ غلہ یہ سب چیزیں حضرت عمرؓ کو دیدی گئیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ابوبکرؓ نے اپنے بعد والوں کو کس قدر مشکل میں مبتلا کر دیا ہے" آپؓ نے 63 سال کی عمر میں 637ء میں وفات پائی۔ آپ اسی پلنگ پر اٹھائے گئے جس پر آنحضرتؐ کو اٹھایا گیا تھا۔ نماز جنازہ حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں پڑھائی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کو وصیت کی تھی کہ انہیں رسول اللہؐ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ کا سر رسول اللہؐ کے شانہ مبارک کے قریب اور لحد کو رسول اللہ کی لحد سے ملحق رکھا گیا۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ

(590ء ---- 647ء)

دوسرے خلیفہ راشد سیدنا حضرت عمرؓ ابن الخطاب اندازاً 590ء میں پیدا ہوئے یعنی عربوں کی دوسری بڑی لڑائی "فجار اعظم" کے آغاز سے چار سال قبل۔ آپؓ کی کنیت ابو حفص یعنی ابو الاسد ہے۔ آپ فاروق کے لقب سے مشہور ہیں' جو مستند راویوں کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب "حق و باطل میں انصاف کرنیوالا" ہے۔

بعثت نبویؐ کے سال میں 25 سالہ حضرت عمر روئیں تن' قوی الجثہ اور دلاور جوان قریشی تھے' اور آپ کو بس ایک متوسط الحال قریشی جوان کی سہولتیں تو میسر تھیں' ناز و نعم سے سابقہ نہ ہوا تھا۔ اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اپنے حد درجہ شعلہ مزاج والد کی سختیوں کا شکار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ مکہ سے قریب ایک جگہ ضجنان سے گزر رہے تھے کہ فرمایا: "وہ دن بھی کبھی تھے کہ میں اس جگہ اپنے والد خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور اس کام کے انجام دینے میں مجھ پر کیا کیا سختیاں نہ ہوتی تھیں۔ اور ایک آج کا دن بھی ہے کہ روئے زمین پر اللہ کے علاوہ کوئی مجھ سے زیادہ صاحب اقتدار نہیں۔" عبداللہ بن ثعلبہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ 45 مردوں اور 21 خواتین کے بعد مسلمان ہوئے۔ آپؓ بہت مضبوط ڈیل ڈول کے مالک تھے۔ لوگوں کے درمیان چلتے تو یوں لگتا جیسے کسی پہ سوار ہوں۔ آپ بعثت نبوی ﷺ کے چھٹے سال اسلام لائے آپؓ کا اسلام لانا جائے خود ایک فتح و نصرت تھا۔ آپؓ کا مدینہ جانا اسلام کے لیے زبردست اعانت ثابت ہوا۔ مدینہ میں آپؓ نے خود کو رسول اللہ اور مسلمانوں کا سب سے بڑا خیر خواہ اور خیر اندیش ثابت کیا۔

ایک بات جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کی شخصیت بیک وقت سخت گیری اور رقت و نرمی کا مظہر تھی۔ ہمیں اس بارے میں علم نہیں کہ جاہلیت میں آپ کبھی روئے ہوں لیکن اسلام کے بعد جلد گریہ طاری ہو جاتا۔ قبیلہ قریش کی سفارت کے فرائض بھی آپؓ کے ذمہ تھے۔ قبیلوں کے باہمی

فیصلے کرنے اور جھگڑے نمٹانے کے لیے آپؓ کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ فصاحت وبلاغت میں کوئی ثانی نہ تھا۔ مردانگی اور رعب وہیبت کا یہ عالم تھا کہ ہجرت کا سفر بھی چھپ کر نہ کیا' بلکہ پہاڑی پہ چڑھ کر قریش کے سرداروں کو چیلنج کیا: "اسلام کے دشمنو! جان لو' عمر مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر رہا ہے۔"

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مرض الموت کے زمانہ میں ہی حضرت عمرؓ کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد اگلی صبح حضرت عمرؓ (شداد کی روایت کے مطابق) منبر پر چڑھے اور فرمایا کہ "عربوں کی مثال ایسی ہے جیسے نکیل میں بندھا ہوا اونٹ جو اپنے قائد کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ لہذا قائد کا فرض ہے کہ سوچ سمجھ کر قیادت کرے اور قسم ہے رب کعبہ کی' ان کو سیدھے رستے پر لے چلوں گا" جب آپؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو مسلمان آپؓ کو اس طرح پکارتے تھے: "اے خلیفہ' رسول اللہؐ کے خلیفہ!" آپؓ نے فرمایا کہ اس طرح خطاب بہت طویل ہو جائے گا' تم مومنین ہو اور میں تمہارا امیر ہوں۔" اس طرح آپ کو "امیر المومنین پکارا جانے لگا۔"

اب تک انسانیت نے تجربہ اور آزمائش کی کتنی ہی منازل طے کر لی ہیں۔ حکومت اور تشکیل حکومت کے سلسلہ میں ترقی اور تجربہ کی پرواز اونچی سے اونچی چوٹی تک پہنچی۔ لیکن کیا ان تجربات کے بعد بھی ایک ایسے نظام حکومت کی تشکیل میں کامیابی ہوئی جس میں سیاسی اور سماجی انصاف کے تقاضے ٹھیک اسی طرح پورے ہوتے ہوں جیسے ابوبکرؓ اور عمرؓ اپنے اپنے عہد میں پورا کرنا چاہتے تھے؟ حضرت عمرؓ کی پالیسی کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ تمام انسانوں کو سچا اور بے لاگ انصاف مل سکے۔ خلافت کا بار سنبھالنے پر اور جنگ وصلح کے دور کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بعد حضرت عمرؓ میں بعض ایسی صفات نمودار ہوئیں جو اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھیں۔ ابھی تک حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کی ایک تلوار تھے جسے آپؐ جب چاہتے بے نیام فرماتے۔ ایسے ہی خلیفہ اولؓ کے دور میں بھی آپؓ ایک ایسی شمشیر خلافت تھے جسے ضرورت کے وقت بے نیام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بار خلافت سنبھالتے ہی آپؓ نے ایک ایسا احساس ذمہ داری اپنے پر مسلط پایا جو احاطہ تحریر میں آئی ہوئی عالمی تاریخ کا کوئی خلیفہ یا حاکم اپنے اندر پیدا نہ کر سکا تھا۔

ایک چیز جس سے آپؓ بے حد خائف تھے' وہ یہ خیال تھا کہ کہیں خدا کے نزدیک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ آپؓ نے خود کو عام لوگوں سے ممتاز مانا ہے اور اپنی ذات کو دوسروں کے مقابلہ میں قابل ترجیح گردانا ہے۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ آپ خود کو آنحضرتؐ کے بڑے قریبی صحابہ یا متوسط لوگوں تک نہیں گنتے تھے بلکہ بے بضاعت اور حاجت مند لوگوں والا مقام اپنائے ہوئے تھے۔ آپؓ کوئی مفلس یا

نادار آدمی نہ تھے۔ آپؓ کی تجارت اور خلافت کا بار گراں تجارتی مشاغل میں بھی دخل انداز نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر چاہتے تو فارغ البالی سے زندگی گذار سکتے تھے۔ لیکن آپؓ نے اپنے اور اہل خانہ کے لئے حد درجہ سخت اور کٹھن زندگی اختیار کی۔ حضرت عمرؓ نے جو نفس کشی اختیار کی تو ہماری سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ آپؓ نے عام الرماد (قحط کا سال) میں کیوں اپنی تاریخی ایثار پسندانہ اور جفاکشانہ روش اختیار کی تھی۔ یہ بلاخیز دور نو ماہ تک رہا اور ان مہینوں میں حضرت عمرؓ نے ایک ایسی روش اختیار کی جس کی عالمی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ قحط کی وباء اکثر و بیشتر مختلف ممالک پر نازل ہوئی اور لوگ بھوک سے برباد و ہلاک ہوئے اور ان کے حکمرانوں نے ان پر اس منحوس مصیبت کو کم کرنے کے اقدامات بھی کئے۔ مگر ہمیں تاریخ نے یہ نہیں دکھایا کہ ان حکمرانوں میں سے کسی نے کبھی خود بھوک میں بھی عام انسانوں کا ساتھ دیا ہو۔ اس مدت میں حضرت عمرؓ نے ہر قسم کی آسائش، ہر طرح کی راحت سب کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ زمانہ قحط میں حضرت عمرؓ نے اپنے گھر کے کھانے پر بڑی کڑی نگرانی رکھی۔ اگر کوئی اچھا یا زیادہ کھاتا تو بڑی سختی سے اس کو روکتے۔ پھر جب خود سختی اٹھاتے، گھر والوں کو برداشت پر مجبور کرتے تو اس میں کچھ مضائقہ نہ سمجھتے کہ لوگوں کے ساتھ بھی وہ طرز عمل اختیار کیا جائے جس میں سختی ہو لیکن جبر نہ ہو۔ نرمی ہو لیکن کمزوری کا پہلو شامل نہ ہو۔ روایت ہے کہ ایک دن آپ لوگوں میں کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے۔ آپؓ کے گرد و پیش لوگوں کا غیر معمولی ہجوم ہو گیا۔ اتنے میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی آگئے اور ہجوم کو چیرتے ہوئے حضرت عمرؓ تک پہنچ گئے۔ دربار نبویؐ میں سعد بن ابی وقاصؓ کا جو درجہ ہے وہ سب جانتے ہیں، فتح فارس کے سلسلہ میں ان کی قربانیاں مسلم ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے درے سے ان کی خبر لی اور فرمایا: "زمین پر اللہ کی قوت سے تجھے خوف نہیں تو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قوت بھی تجھ سے نہیں ڈرتی" اسی طرح حضرت عمرؓ انتہائی آرزو رکھتے تھے کہ لوگ آپس میں برابری کا سلوک کریں اور وہ خود اور ان کے گھر والے بھی عام مسلمانوں کے بالکل برابر ہوں۔ جب کبھی عوام کو کسی بات سے منع کرتے تو گھر والوں کو اکٹھا کر کے اعلان فرماتے کہ "میں نے مسلمانوں کو فلاں کام سے منع کیا ہے اور خلاف ورزی کرنے پر سزا دینے کا اعلان کیا ہے، لوگ میرے تعلق کی وجہ سے تم پر نظر رکھیں گے۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ تم میں سے کسی نے خلاف ورزی کی ہے تو اسے دوہری سزا دوں گا"

خلافت کا بار سنبھالتے ہی حضرت عمرؓ نے شام میں برسرپیکار اسلامی فوجوں کو حضرت ابو بکرؓ کی وفات اور حضرت خالدؓ کی معزولی کی اطلاع بھجوائی۔ حضرت خالدؓ کی جگہ آپ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو کمان دار مقرر کیا۔ آپؓ کا فرمان رات کے وقت ابو عبیدہؓ تک پہنچا اور اگلی صبح رومیوں کے ساتھ جنگ

تھی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے مسلمانوں کے جوشِ جہاد میں کمی آجانے کے ڈر سے اس فرمان کو مخفی رکھا۔
زبردست معرکہ ہوا اور مسلمان فتحیاب ہوئے۔ اب شام کی تمام مسدود راہیں کھل گئیں اور مسلمان
دمشق کی جانب روانہ ہوئے۔ چنانچہ زبردست محاصرہ کے بعد صلح کے ذریعہ دمشق فتح ہوا۔ کہا جاتا ہے
کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے فتح دمشق کے بعد حضرت خالدؓ کو فرمان معزولی دکھایا۔ فلسطین اور اردن پر
مسلمانوں کو پورا تصرف حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن مسلمان لشکر ابھی تک بیت المقدس پر قابض نہ ہو سکے
تھے اور انہوں نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اہل شہر نے صلح کی پیشکش کے ساتھ یہ شرط رکھ دی کہ
امیر المومنینؓ خود آکر دستخط فرمائیں۔ چنانچہ آپ شام آئے اور صلح نامہ کی تکمیل کے بعد بیت المقدس
میں داخل ہوئے۔ کم از کم تین مرتبہ آپؓ کا شام جانا یقینی ہے۔ دوسری مرتبہ جب آپؓ روانہ ہوئے تو
راستے میں اطلاع ملی کہ شام میں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی ہے۔ ابو عبیدہؓ نے آپ کو واپس لوٹ جانے کا
مشورہ دیا تو فرمایا: "تعجب ہے کہ یہ تم کہہ رہے ہو۔ اے ابو عبیدہؓ! میں کیا قضا و قدر سے بھاگ رہا
ہوں۔ دراصل میں تو قضا و قدر کے ایک دائرہ کار سے دوسرے دائرہ کار تک جا رہا ہوں" تاہم اکثریت
کی مخالفت پر آپ نے واپسی کا قصد کیا۔ تیسری بار آپ شام پہنچے تو وباء کا زور ٹوٹ چکا تھا اور مسلمانوں کا
ایک بڑا گروہ اس کا شکار ہوا' جن میں ابو عبیدہؓ بن الجراح اور حضرت معاذ بن جبلؓ بھی تھے۔ اس دفعہ
حضرت عمرؓ نے مملکت کے تمام علاقوں کا دورہ کرنے کا سوچا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ہر صوبہ میں کم از کم
دو دو ماہ قیام کریں اور عملی طور پر والیوں اور حکمرانوں کو اپنی مثال سے سمجھائیں کہ صوبوں اور اضلاع
میں مال غنیمت کی تقسیم کس حکمت عملی کے تحت کی جائے۔ مگر وقت نے آپ کو اس دورہ کی فرصت نہ
دی۔

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ عوام کی مشکلات اور مخصوص حالات کا خود جائزہ لیں۔ ایک چیز
جس سے بے حد ڈرتے تھے یہ تھی کہ کہیں حکام کے اخلاق نہ بگڑ جائیں۔ چنانچہ اپنے عمال پر کڑی نگاہ
رکھتے۔ آپؓ ہر سال حج کے موقع پر گورنروں سے ملاقات فرماتے اور ساتھ ہی زائرین حج سے بھی۔
آپؓ کے دور میں شام' فلسطین اور ایران جیسی سلطنتوں پر فتح کے نتیجہ میں اس قدر مال
غنیمت مسلمانوں کو میسر آیا کہ حضرت عمرؓ خود بھی حیران رہ گئے۔ وسیع سلطنت میں ایک طرف داخلی و
خارجی امور بہت زیادہ بڑھ گئے تو دوسری طرف یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں مسلمانوں میں بھی وہ نشاط پرستی
داخل نہ ہو جائے جو فراوانی دولت کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ مدینہ میں دولت کے ڈھیر دیکھ کر
حضرت عمرؓ کو خیال گزرا کہ جو دولت پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ کو میسر نہ آسکی وہ یقیناً
کوئی قابل قدر شے نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اس دولت کو ایک عظیم آزمائش گردانا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں نظام شرعی کی رو سے (جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں رائج ہو چکا تھا) مال غنیمت کا 80 فیصد (4\5) تو مجاہدوں میں بانٹ دیا جاتا اور باقی بیس فیصد (خمس) حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا جاتا۔ زمین کو سابق کاشتکار مالکان کے پاس ہی رہنے دیتے تاکہ وہ کاشت کر کے ٹیکس ادا کرتے رہیں۔ چنانچہ آپؓ کی خدمت میں مندرجہ ذیل اقسام کی رقوم آتی تھیں :(1)۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ '(2) مفتوحہ زمیوں پر غیر مسلموں کی کاشتکاری سے ملنے والا لگان' اور (3) دین اسلام قبول نہ کرنے والوں سے حاصل کردہ جزیہ۔ حضرت ابو بکرؓ مال غنیمت تقسیم کرتے وقت مرتبوں یا منزلتوں کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی آزادوں اور غلاموں میں کوئی فرق برتتے۔ تاہم حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کی رائے سے مال غنیمت کی تقسیم کے لئے منظم انداز اپنایا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مردم شماری اور تمام شہریوں کے اعداد و شمار کا جمع کرنا ایک ایسا نظام تھا جسے قبل ازیں عربوں نے بالکل دیکھا سنا نہیں تھا۔ حضرت عمر نے ایک دفتر بھی مرتب کیا' یعنی بڑے پیمانے پر ایک سیکرٹریٹ قائم کیا اور اسی طرح ایک فوج بھی منظم و آراستہ کی۔

آپؓ نے حسب نسب کے ماہر ولید ابن ہشام سے کہا کہ آنحضرتؐ کی قربت کے پیش نظر بنی ہاشم سے ابتداء کرتے ہوئے تمام لوگوں کے نام قبیلہ وار لکھ دیں۔ یہ حضرات تھے عقیل بن ابی طالب' مخزمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم۔ یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قبیلہ کو ہی موخر نہ کیا تھا بلکہ قرابت نبویؐ کے احترام کا ایک اور ثبوت دیا کہ عطیات کی تعداد کے تعین میں بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھا۔ اس کے بعد لوگوں کے نام اس لحاظ سے ترتیب دیئے گئے کہ کون پہلے اسلام لایا۔ اسلام کے لئے صبر و استقامت کا مظاہرہ' قرآن کی آیات کا حفظ' یہ تمام چیزیں بھی قابل ترجیح تھیں۔ ایک روایت کے مطابق اسامہ بن زید کو جب چار ہزار درہم کا مستحق مانا گیا تو عبید اللہ ابن عمرؓ نے احتجاج کیا کہ ان کے لئے تین ہزار کیوں مقرر فرمائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''وہ آنحضرتؐ کی نگاہوں میں تم سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد حضرت زیدؓ بھی تمہارے والد کے مقابلہ میں نگاہ رسولؐ میں زیادہ مقبول تھے'' اس کے بعد مزید طبقہ بندی ہوئی یہاں تک کہ آخری اور سب سے کم عطیہ تین سو درہم منظور ہوا۔ ہر اس بچہ کے لئے جس کا دودھ چھٹ چکا ہو' ایک سو درہم کی رقم منظور ہوئی۔ لیکن ایک دفعہ آپؓ کو پتہ چلا کہ عورتیں زیادہ رقم کی خاطر زبردستی بچوں کا دودھ چھڑا دیتی ہیں۔ لہذا آپؓ نے سرکاری اعلان کرا دیا کہ ہر مسلمان بچے کو پیدائش سے ہی وظیفہ ملے گا۔ لاوارث بچوں کے لئے بھی سو درہم مقرر ہوئے جو ولی وصول کرتا۔ اسی طرح بیوہ خواتین کے وظائف بھی مقرر کیے گئے۔ غلاموں کو آزادی کے بعد اپنے آقاؤں جتنا ہی وظیفہ ملتا۔

عطیات کا یہ نظام، جو حضرت عمرؓ نے قائم کیا، ہر اعتبار سے نیا تھا۔ عربوں سے بہت پہلے تمدن کی انتہاؤں تک پہنچی ہوئی کوئی قوم بھی نہ صرف اس نظام سے ناواقف تھی بلکہ اس سے ملتی جلتی کوئی چیز بھی اس کے تصور میں نہ آئی تھی۔ کسی حکومت کا تمام رعایا کے لئے غذائی ذمہ داری کا قبول کرنا قدیم اور جدید دونوں تمدنوں اور تہذیبوں میں مفقود ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام مسلمانوں کو کھلانے کی ذمہ داری خود حکومت نے لے لی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے: "اگر میں زندہ رہ گیا تو ایک چرواہے کو بھی، اس سے پہلے کہ اس کا چہرہ اپنے مقررہ عطیہ کے نہ ملنے سے سرخ ہو جائے، اس کا حق بیت المال سے جایا کرے گا" حضرت عمرؓ نے کبھی طبقاتی نظام کو ترجیح نہ دی۔

یہ نرمی اور یہ انصاف پسندی کہ حق، حق دار کو دلایا جائے، خواہ کچھ بھی ہو، یہی وہ صفات تھیں جنہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنے والیوں پر اتنا سخت بنا دیا۔ آپ ہر والی کے تقرر سے پہلے اس کے مملوکہ سامان کی فہرست بنواتے اور سبکدوشی کے بعد اگر کسی ولی کے پاس فہرست سے کچھ زیادہ نکلتا تو اسے لے کر بیت المال میں جمع کرا دیتے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی سختی معروف چیز ہے۔ والیوں کے ایک پورے گروہ کے اموال، ان کے اپنے عہدوں سے نکالے جانے کے بعد چھین لئے گئے تھے۔ اسی صورت سے دوران عہدہ بھی آپؓ والیوں سے کڑی باز پرس کرتے اور عوامی شکایات کی ہمیشہ تحقیقات کرواتے۔ علاوہ ازیں بڑی باریک بینی کے ساتھ دیکھتے کہ ان والیوں کا رعایا کے ساتھ کیا سلوک ہے اور انہیں خفیہ اور کھلم کھلا سخت تاکید فرماتے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں، نہ جسمانی اور نہ مالی۔ اس سلسلہ میں آپ نے بعض والیوں سے فرمایا: "تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا ہے" مصر سے عمروبن العاصؓ اور کوفہ سے سعدؓ بن ابی وقاص کے بارے میں شکایات موصول ہونے پر آپ نے محمد بن مسلمہ کو تحقیقاتی کارروائی کے لئے بھیجا۔

فتح مدائن کے بعد غیر مانوس آب و ہوا میں جب عربوں کی طبیعت بگڑنے لگی تو حضرت عمرؓ نے ساحلی علاقے میں کوفہ اور پھر بصرہ شہر بسائے۔ دونوں شہر والوں نے بانسوں اور سرکنڈوں سے مکانات تعمیر کر لئے، پھر اتفاق سے ان شہروں میں آگ لگ گئی تو حضرت عمرؓ نے اینٹوں سے مکانات بنانے کی اجازت دیتے ہوئے حکم دیا کہ لمبی عمارتیں نہ بنائیں۔ صحیح اندازہ یہ تھا کہ فضول خرچی ہو اور نہ اعتدال سے تجاوز ہو۔ حضرت عمرؓ نے یہ حکم بھی دیا کہ سڑکیں چالیس گز کی ہوں اور اس سے کم درجے کی تیس گز کی اور کم از کم بیس گز چوڑی ہوں۔ جبکہ گلیاں سات گز کی رکھی جائیں۔ عام قطعات ساٹھ گز کے ہونے چاہئیں۔ بازار میں کوئی عمارت نہیں تھی اور نہ نشانات مقرر تھے۔ حضرت عمرؓ کی ہدایت تھی

کہ بازار مسجد کی طرح ہیں' جو سب سے پہلے کسی ٹھکانے پر پہنچ جائے اس کا وہ حق دار ہے۔

حضرت عمرؓ نے قسم کھا رکھی تھی کہ عوام کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرنے والے سے قصاص لیں گے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہم بیت المال سے مسلمانوں کو کھلاتے رہیں گے اور جب دیکھیں گے کہ بیت المال خالی ہو چکا ہے تو محتاجوں کو حسب حیثیت دولتمندوں کے گھروں میں داخل کر دیں گے تاکہ کوئی مسلمان بھوکا نہ رہے۔ لیکن شعبہ مالیات میں آپ کی نگاہیں ایک اور مساواتی راستہ بھی دیکھ رہی تھیں جس پر آپ کافی دور تک چل چکے تھے۔ اگر حضرت عمرؓ کچھ عرصہ مزید زندہ رہتے تو تاریخ اسلامی ہمیں حیرت انگیز واقعات سناتی۔ ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایک مرتبہ زلزلہ آیا تو آپ نے خدا کی حمد و ثنا کرنے کے بعد زمین پر درہ مارا اور فرمایا: "تو کیوں کانپتی ہے۔ عمرؓ نے تجھ پر عدل وانصاف نہیں کیا؟" اور زلزلہ تھم گیا۔

آپ کو موقع ملتا تو بلاشبہ شوریٰ کا ایک ایسا نظام دے جاتے جو باقی رہتا اور مسلمانوں کو فساد اور اختلاف اور حاکموں کے ظلم و تکبر سے بچاتا۔ آپؓ کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گذرا کہ آپؓ اتنی وسیع و عریض سلطنت چلا رہے ہیں جو اپنے اندر غیر معمولی فتوحات رکھتی ہے۔ وہ تو اس بات کو ایک حیرت خیال کرتے اور تنہائی میں اپنے نفس کو یاد دلاتے تھے کہ "اے خطاب کے لڑکے! آج تو امیر المومنین بن گیا ہے' کل تک اسلام سے قبل تو ایک چرواہا تھا...... لوگ ابھی یہ نہیں بھولے"

لیکن پھر وہ وقت آن پہنچا جب اس عظیم منتظم' فقیہہ' عادل' انسانی مساوات کے علمبر دار 'فقید المثال کردار کے حامل حکمران نے اس دنیا سے جانا تھا۔ 26 ذوالحجہ 23 ہجری (647 عیسوی) کی صبح فجر کی نماز پڑھانے سے قبل آپ صفیں درست کروا رہے تھے کہ مسجد کے گوشے میں چھپے ہوئے ابولولوۃ نامی شخص نے آپؓ پر خنجر سے وار کر دیا۔ حضرت عمرؓ زمین پر زخمی ہو کر گرے۔ تو لوگوں نے اس حملہ آور کو پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے مزید 12 افراد کو زخمی کر دیا۔ قابو آجانے پر اس نے خود ہی اپنا خاتمہ کر لیا۔ لوگ حضرت عمرؓ کو زخمی حالت میں اٹھا کر گھر لا رہے تھے تو آپ یہ فرماتے رہے "اللہ کے احکامات معین اوقات میں نافذ ہوتے ہیں" پھر آپ نے ابن عباسؓ کو یہ تحقیقات کرنے کے لئے بھیجا کہ پتہ چلائیں حملہ آور کون تھا۔ انہوں جب آکر بتایا کہ ابولولوۃ مغیرہ بن شعبہ کا غلام ہے تو آپؓ نے فرمایا: "شکر ہے یہ مکروہ فعل کسی گیر مسلم سے سرزد ہوا۔ اس کے بعد آپؓ نے اپنے بیٹے عبیداللہ کو بھیجا کہ وہ حضرت عائشہؓ کو جا کر ان کی یہ خواہش بتائیں کہ آپ آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ کے جوار میں دفن ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: "خدایا یہ جگہ میں نے اپنے لئے منتخب کر لی تھی' لیکن آج کے دن میں اسے قربان کئے دے رہی ہوں" اجازت ملنے پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"اللہ کا شکر ہے، میرے لئے سب سے اہم چیز یہی تھی" اس مہم کے سر ہونے کے بعد آپ نے خلافت کے معاملہ کو چھ افراد کی ایک کونسل کے سپرد کر دیا جو حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمنؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، زبیر بن العوامؓ اور طلحہ بن عبید اللہؓ پر مشتمل تھی۔"

پھر آپؓ کو بیت المال کا قرض واپس کرنے کی فکر لاحق ہوئی اور فرمایا کہ میری وفات کے بعد میری آل اولاد یہ قرض چکا دے۔ اگر پھر بھی قرض باقی رہ جائے تو میرے قبیلہ بن عدی سے رجوع کیا جائے اور اس کے بعد اہل قریش سے۔ خیال غالب ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ قرض نہیں واپس کرنے کو کہا تھا بلکہ یہ اس تمام رقم کا مجموعہ تھا جو انہوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی کفالت کے لئے بیت المال سے لی تھی۔ آپؓ کی وفات کو ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ رقم ادا ہو گئی اور حضرت عثمانؓ نے ادائیگی کی رسید لے لی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے کو یہ بھی ہدایت کی تھی کہ ان کے کفن کا کوئی خاص اہتمام نہ کریں کیونکہ آخرت میں صرف نیکیاں کام آئیں گی۔ آپؓ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت فرمائی۔

یکم محرم 24 ہجری (647ء) کو جب آپ نے محسوس کیا کہ آخری ساعت آن پہنچی ہے تو اپنے بیٹے سے کہا کہ آپ کو کنپٹی کے بل زمین پر لٹا دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ جب روح طیب نے پرواز کی تو آپؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: "اللہ نے اگر مجھے نہ بخشا تو میرے اور میری ماں کے لئے وبال ہی وبال ہے" وفات کے وقت آپ کی عمر 57 سال تھی۔ آپؓ دنیا سے ایک پر امید انسان کی طرح اٹھے۔ آپؓ کی مدت خلافت 10 سال 5 ماہ اور 21 دن بنتی ہے۔

حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد آکر آپؓ کے چہرے سے کپڑا اٹھایا اور کہا:
"واللہ اس دنیا میں سوائے اس کفن پوش کے آج تک کوئی شخص نہیں دیکھا جس کے اعمالنامہ پر مجھے رشک آئے"

حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک ایسا تابناک دور ختم ہو گیا جس سے زیادہ تابناک اور زریں عہد آنحضرتؐ کی وفات سے قیامت تک شاید پھر نہ آسکے گا۔ زہد، نیکی اور تقویٰ کی رو سے حضرت عمرؓ کو ان تمام سلاطین پر فوقیت حاصل ہے۔ جنہوں نے اسلام کی تاریخ بنائی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ قرآن مجید اور طریق نبوی کے سوا حضرت عمرؓ کے پیش نظر کوئی دوسری چیز نہ تھی۔

حضرت عثمانؓ بن عفان

(577ء ---- 659ء)

حضرت عثمانؓ اندازاً 577ء میں طائف میں پیدا ہوئے۔ خلفائے راشدین میں آپ تیسرے خلیفہ اسلام ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں رقیہؓ اور ام کلثومؓ آپؓ سے بیاہی گئی تھیں لہذا آپؓ "ذوالنورین" کہلاتے تھے۔ آپؓ کی کنیتیں ابو عبداللہ اور ابو عمرو تھیں۔ مالدار ہونے کی وجہ سے غنی بھی کہلاتے تھے۔ آپ نے اسلام کی راہ میں اپنی بے تحاشا دولت خرچ کی۔ آپؓ کی والدہ محترمہ اروی بنت کریز کا سلسلہ نسب عبدشمس بن مناف سے جا کر ملتا ہے۔ اروی کی والدہ بیضا بنت عبدالمطلب رسول کریم ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ آپؓ اسلام کے ابتدائی دور میں اس وقت مسلمان ہوئے جب کہ آنحضرت ﷺ دار ارقم میں پناہ گزیں نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت آپؓ کی عمر بمشکل 30 سال تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپؓ کو اسلام کی دعوت دی جو آپؓ نے خوشی قبول کر لی۔ اگلے ہی دن عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابو عبیدہؓ ابن الجراح اور ابو سلمہؓ سمیت اڑتیس افراد اسلام لے آئے۔ حضرت عثمانؓ نے پہلی دفعہ حبشہ اور دوسری مدینہ کو ہجرت کی۔ آپؓ کا شمار ان دس صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جنہیں رسول اللہ نے جنتی ہونے کی بشارت دی۔

حضرت عمرؓ اپنے آخری وقت میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ افراد پر مشتمل شوریٰ تشکیل دے گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں کسی شخص کو خلیفہ نامزد نہ کیا اور صدیق اکبرؓ کی اتباع میں مسلمانوں کو بلا مشورہ اور بلا نصیحت بھی نہ چھوڑا۔ چھ حضرات کی رائے برابر ہو جانے کی صورت میں حضرت علیؓ کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ عبدالرحمٰن بن عوف والے دھڑے کا ساتھ دیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت علیؓ کو بلوا کر پوچھا کہ اگر میں تمھارے ہاتھ پر بیعت نہ کروں تو تم مجھے کیا مشورہ دو گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: "عثمانؓ"۔ حضرت عثمانؓ سے یہی سوال کرنے پر جواب ملا: "علیؓ" اگر حضرت عمرؓ کو اس قسم کا نظام شوریٰ وسیع بنیادوں پر قائم کرنے کا موقع مل جاتا تو یقیناً آئندہ خلیفہ کے انتخاب میں مشکل پیش نہ آتی اور مسلمان پارلیمانی نظام

کی طرف پہل کرنے والوں میں ہوتے۔

حضرت عثمانؓ کی بیعت خلافت 648ء کو ہوئی۔ حضرت علیؓ نے بھی حضرت عبدالرحمن کی موجودگی میں ان کی بیعت کی۔ سیف کی روایت ہے کہ بیعت کے بعد حضرت عثمانؓ اداس ہو کر منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہوئے اور یوں خطبہ دیا: "تم قلعہ بند گھر میں (خود کو سمجھتے) ہو اور عمر کے بقیہ حصہ میں ہو۔ اس لیے تم اپنی باقی زندگی میں بہت جلد نیک کام انجام دو...... کیونکہ تمہیں صبح یا شام کوچ کرنا ہو گا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ دنیا مکر و فریب میں لپٹی ہوئی ہے...... تم گذری باتوں سے عبرت حاصل کرو اور سرگرمی کے ساتھ نیک کام کرو...... تم بھی دنیا کو وہیں پھینک دو جہاں اللہ نے اسے پھینکا ہوا ہے۔"

مورخین روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے عنان خلافت سنبھالتے ہی اپنے عاملوں اور سپہ سالاروں کے نام فرمان لکھے' بعض فرامین میں عوام کو بھی خطاب کیا۔ آپؓ نے عاملوں کے نام لکھا: "اللہ نے خلفاء کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ رہیں' ٹیکس وصول کرنے والے (محصل) نہ بنیں۔ اس امت کے صدر نشین حفاظت کرنے والے رہے ہیں وصول کرنے والے نہیں بنے۔ تمہارے امام نگرانی سے دور اور تحصیل داری سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو حیا' امانت اور وفاداری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یاد رکھو' سب سے زیادہ منصفانہ روش یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات اور ان کے فرائض پر گہری نظر ڈالو۔ ان کے حقوق دو اور جو کچھ ان پر واجب ہے لو...... اپنے دشمن پر غلبہ حاصل کرو' لیکن وفا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔" یہ مختصر فرمان تکلف سے خالی' تصنع سے دور اور زیادتی کے تصور سے بالکل پاک ہے۔ یہ جس سیاست کا نقشہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کے سامنے پیش کیا بعینہ قرآن کا پیش کردہ ہے جو ان سے قبل کے خلفاء اور مسلمانوں کا دستور العمل رہا ہے۔ بعد ازاں ضرورت محسوس ہونے پر کچھ سختی بھی کی' مگر قرآن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا: "اللہ نے تمام مخلوقات کو برحق پیدا کیا اور وہ حق کو ہی قبول کرتا ہے۔ پس حق دو اور حق لو...... تم اپنے اندر امانت کے جوہر پیدا کرو...... اور ہاں وفا کا خیال رکھو' وفا کا' یتیموں اور غریبوں پر زیادتی نہ کرو' اگر یہ مظلوم ہو نگے تو اللہ خود مقابل ہو گا۔"

حضرت عثمانؓ کو خلافت سنبھالنے کے بعد جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہوا وہ عبید اللہ ابن عمرؓ کا مقدمہ تھا' جنہوں نے اپنے والدؓ کے قتل میں شریک مسلمان ہرمزان' پھر عیسائی جیفینہ اور اس کے بعد یہودی ابولولوۃ کی لڑکی کو قتل کر کے قصاص لیا تھا۔ اس مقدمہ میں حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کس طرح کیا؟ مورخین کی اکثریت کا خیال ہے کہ انہوں نے فرمایا: "میں ہرمزان اور دوسرے مقتولین کا ولی ہوں' میں قاتل کو معاف کرتا ہوں اور بیت المال میں رکھے ہوئے اپنے مال میں سے خون بہا

ادا کرتا ہوں۔" حضرت عثمانؓ کی افتاد طبع کے پیش نظر یہی خیال ان کی سیرت سے میل کھاتا ہے۔ اس طرح انہوں نے عبید اللہ ابن عمرؓ کو بچا کر ایک طرف تو یہ شکایت کرنے والوں کا منہ بند کر دیا کہ "کل عمرؓ کو شہید کیا گیا اور آج ان کا بیٹا مارا جائے"" تو دوسری طرف دیت ادا کر کے بد نظمی اور بد عنوانی کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال حضرت عثمانؓ نے خلافت کا استقبال جس سیاسی مسلک سے کیا اس میں آپؓ کی تصویر ایک ایسے شخص کی دکھائی دیتی ہے جو رحم دل اور نرم طبیعت، صلح پسند ہے اور کینہ پروری سے بچنا چاہتا ہے۔ شکوک وشبہات سے بھرے ہوئے ماحول میں انہوں نے خلافت کا آغاز کیا تھا۔ فاروق اعظمؓ کا جو نقشہ لوگوں کے دل میں تھا اس کے پیش نظر وہ عبید اللہ ابن عمرؓ کے قضیئے سے متعلق خود ہی دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ممتاز صحابہؓ کو مدینہ میں ہی روک رکھا تھا تاکہ عوام میں ان کا اثر ورسوخ بڑھے اور نہ ہی مسلمان نفاق کا شکار ہوں۔ بعد کے حالات کی روشنی میں یہ پالیسی بالکل درست نظر آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس اقدام کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات اور خود اس ممتاز طبقے کے حالات ٹھیک رہے، لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کے لیے نقل وحرکت کا راستہ کھولا تو فتنہ وفساد نے پوری فضا گرد آلود کی، اس لیے نہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرامؓ نے کچھ غلط چاہا، بلکہ اس لیے کہ ایک طرف تو ان کے پاس دولت کی فروانی ہوئی جس نے حامیوں کی زبردست جماعت پیدا کر دی اور دوسری طرف عوام فرط عقیدت سے ان کی جانب مائل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے کبھی یہ بھی گوارا نہ کیا تھا کہ وہ عام مسلمانوں اور ممتاز صحابہ میں کوئی فرق کریں مگر حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں نہ صرف انہیں باہر آنے جانے کی اجازت دی بلکہ انہیں بیت المال میں سے گرانقدر انعامات بھی عطا فرمائے۔ آپؓ کے خیال میں بیت المال اللہ کا ہے اور خلیفہ امت کا پاسبان ہونے کے ناطے اس مال کو حسب ضرورت تقسیم کرنے کا مجاز ہے۔ نتیجتاً حجاز میں بڑے بڑے محل تعمیر ہوئے، خادموں اور حامیوں کی تعداد بڑھی اور دولت کے ساتھ لازم وملزوم تمام قباحتیں بھی لوگوں کے گھروں میں اقامت گزیں ہو گئیں۔ یہ امر قابل غور وفکر ہے کہ خود حضرت عثمانؓ کی نظر میں حضرت عمرؓ کی سیرت کا جوہر اللہ کا قرب حاصل کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے صلہ رحمی کا ذریعہ اپنایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی وہی کیا جو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کرتے رہے۔ بس حضرت عثمانؓ کے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے ذرائع مختلف تھے۔

حضرت عثمانؓ نے ایک سال تک عہد فاروقیؓ کے گورنروں کو برقرار رکھا کیونکہ یہ حضرت عمرؓ کی وصیت تھی۔ اسی طرح ایک سال تک کوئی تقرری بھی نہ کی۔ لیکن آپؓ نے لوگوں کے

وظیفوں میں اضافہ کیا۔یقیناوہ عام لوگوں کو خوشحال اور فارغ البال رکھنا چاہتے تھے۔ یہ عمل جزائے خیر کا مستحق ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ذاتی دولت تمام لوگوں کے لیے تو گنجائش نہیں رکھتی تھی اس لیے انہوں نے بیت المال میں پڑی ہوئی ان کی امانت ان میں بانٹنا شروع کی۔ اس سے ایک ایسا دروازہ کھل گیا جس میں داخل ہونا تو لوگوں کو معلوم تھا لیکن نکلنے کی راہ کوئی نہ جانتا تھا۔ اسلام لوگوں کی روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشی زندگی میں بھی انقلاب لایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ہونے والی فتوحات نے ایران سے لے کر افریقہ تک کی دولت امت مسلمہ کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دی۔ حضرت عمرؓ اس دولت سے خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ مسلمانوں کو کاہل اور سست نہ بنا دے۔ حضرت عثمانؓ نے نہایت صدق دلی کے ساتھ لوگوں کو سکھ دینا چاہا۔ لیکن اپنی نرم دلی کے باعث پیدا ہونے والے بگاڑ کا تدارک نہ کر سکے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دولت کے باعث لوگوں میں حضرت عمرؓ کے آخری دور میں ہی نقائص ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ غالباً حضرت عثمانؓ نے سوچا کہ اگر لوگ دولت کی خاطر باہمی انتشار کا شکار ہیں تو انہیں دولتمند کر کے متحد کیا جائے۔ آپؓ کہتے تھے: "میں رسول اللہ ﷺ اور حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں اپنی ذاتی ملکیت میں سے بہت زیادہ خیرات کیا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ شباب تھا جب میں کفایت شعار تھا۔ اب جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری عمر فنا ہو رہی ہے اور تمام سرمایہ گھر والوں کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں...... خدا کی قسم! میں نے کسی شہر میں سے فالتو مال بھی حاصل نہیں کیا جس کی وجہ سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میں زائد مال انہیں لوٹا دیتا تھا اور میرے پاس صرف پانچواں حصہ ہی پہنچتا تھا۔ اور اس میں سے بھی میں نے کوئی چیز اپنے لئے روا نہیں رکھی۔"

حکومتی معاملات میں بھی حضرت عثمانؓ کی نرمی کا گورنروں نے غلط فائدہ اٹھایا۔ جب آپ نے عمرو بن العاصؓ کو معزول کیا تو انہوں نے اس اقدام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ میں حضرت عمرؓ کے دور میں حاکم مصر تھا اور وہ آخری وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: "اگر میں بھی اسی طرح باز پرس کرتا جس طرح حضرت عمرؓ کیا کرتے تھے تو تم سیدھے رہتے مگر نرمی کے نتیجہ میں تم مجھ پر گستاخ ہو گئے۔" یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت عثمانؓ کی سوتیلی بہن عمرو بن العاصؓ کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ عمرو بن العاصؓ نے معزولی کے بعد انہیں طلاق دے دی۔ علامہ جریر الطبری نے لکھا ہے کہ جب عمرو بن العاصؓ معزولی کا حکم سن کر وہاں سے نکلے تو حضرت عثمانؓ سے بہت عداوت رکھنے لگے۔ حضرت علیؓ کو بھی ان کے خلاف بھڑکانے کی ناکام کوششیں کی۔ اور حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس جا کر حضرت عثمانؓ کے خلاف باتیں کیں۔ اس حوالے سے یہ بات

بھی ذہن نشین رکھنا ہوگی کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف مصریوں نے سازش کی اور عمرو بن العاصؓ وہیں کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ عمروؓ خود کہتے تھے: "خدا جب میں کسی چرواہے سے بھی ملتا تو اسے بھی حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکاتا۔"

مسائل و مشکلات سے بھرپور زمانے میں عنان خلافت کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے باوجود حضرت عثمانؓ نے دور دراز مہمات بھیج کر اسلام کو سرفراز اور وسیع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایران میں یزدگرد قدیم ساسانی حکومت بحال کرنے کی غرض سے برابر ایرانیوں کو ابھارتا رہتا تھا۔ خراساں سے لے کر طبرستان، فارس و کرمان، آرمینیا اور آذربائیجان تک باغیوں نے شرارتیں شروع کر رکھی تھیں۔ حضرت عثمانؓ کے حکم پر ان کے نائبوں نے ان بغاوتوں کو فرو کر کے ایرانی سلطنت کے ان پہاڑی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جو اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں تھے۔ بعد ازاں یزدگرد کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں بازنطینی سلطنت کے اشارہ پر سکندریہ کے رومیوں نے سر اٹھایا مگر ناکام رہے۔ والئ مصر عمرو بن العاص نے ان کو زبردست شکست دی۔ طبرستان حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوا تھا اور وہاں کے لوگوں نے جزیہ کا معاہدہ کیا۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں انہوں نے معاہدہ توڑ کر خلاف ورزی کی، اس لئے والئ بصرہ عبداللہ ابن عامر نے بلخ، نساء اور سرخس کو فتح کر کے سارا صوبہ خراساں مغلوب کیا۔ سابق ایرانی مملکت اور چین کی سلطنت کے درمیان ترکوں کی ریاستیں تھیں۔ فتح خراساں سے اسلامی سرحدیں ترکوں کے ساتھ جا ملیں۔ بعد ازاں احنف بن قیس نے ترکوں کو زیر کیا اور اسلامی سلطنت کو چین کی سرحدوں سے ملا دیا۔ اس کے علاوہ سیستان اور زابلستان کے تمام اہم مقامات یعنی زرنج، کابل اور غزنی فتح ہونے سے اسلامی قلمرو ہندوستان کی سرحد تک پھیل گئی۔ اسی طرح شام کے والی امیر معاویہؓ نے اناطولیہ کی طرف بڑھ کر عموریہ تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر قبرص، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ بھی فتح ہوئے۔

650ء میں حضرت عثمانؓ نے حرم کعبہ کی تجدید و توسیع کا حکم دیا۔ آپؓ نے مسجد نبوی ﷺ کو چونے اور پتھر سے دوبارہ تعمیر کروایا اور اسے وسعت دی۔ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور ان کے اخلاق درست کئے، موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں اور قرآن پاک کی نقول تمام اسلامی ممالک میں بھیجیں۔ ایک کنواں 20 ہزار درہم میں یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ ایک بند بنوا کر مدینہ کو سیلاب سے محفوظ بنایا۔ مکہ کی بندرگاہ جدہ کا انتخاب حضرت عثمانؓ نے ہی کیا تھا۔ آپؓ نے شراب نوشی پر کوڑوں کی سزا تجویز کی۔ خطبے کے متعلق یہ قانون بنایا کہ امام تیز کی بجائے آہستہ آہستہ خطبہ پڑھائے۔ پولیس کے محکمہ کی بنیاد بھی آپ نے ڈالی۔ حضور ﷺ کی امت میں سب سے

پہلے مہاجر آپؓ ہوئے۔

عہد عثمانیؓ کے ابتدائی پانچ چھ سال نسبتاً امن وامان کے ساتھ گذر گئے۔ بڑی بڑی فتوحات ہوئیں کافی مال غنیمت ہاتھ آیا' خراج کی آمدنی بڑھی' فوجیوں کی تنخواہیں اور وظائف بڑھا دیئے گئے' ملک میں مادی خوشحالی آئی' نقل و حرکت کی آزادی کے باعث کوفہ اور شام و مصر میں آبادی بڑھ گئی' خطرناک اقتصادی انقلاب آیا' زمینوں اور جائیداد کی آزادانہ منتقلی سے مکہ' مدینہ اور طائف میں امراء اور سرمایہ داروں کا وہ طبقہ پیدا ہو گیا جو خود کچھ کام نہیں کرتا تھا بلکہ تمام وقت لہو و لعب میں گزارتا اور مزدور و غلام اس کے لیے کام کرتے۔ تعیش بڑھا' فرصت اور فضولیات نے قدم جما لیے۔ واضح طور پر مالدار اور غریب میں طبقاتی تضاد نے جنم لیا۔

حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرنے والوں کو آپؓ سے ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ آپؓ نے بڑے بڑے صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ ناتجربہ کار نوجوانوں کا تقرر کیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہوا کہ ابوذر غفاریؓ' عمار بن یاسرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے ممتاز صحابہ کرامؓ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ علاوہ ازیں جب رسول اللہ کی انگوٹھی آپؓ کے ہاتھ سے کنوئیں میں گر کر کھو گئی تو مخالفین نے اسے بھی بدشگونی قرار دے کر پراپیگنڈہ شروع کیا۔

ان اعتراضات کے بڑھتے ہوئے طوفان کو دبانے کے لیے آپ نے ایک آخری کوشش حج کے موقع پر کی جہاں تمام بڑے بڑے عہدیداروں کو بھی بلایا گیا تھا۔ حضرت علیؓ' طلحہؓ اور زبیرؓ کو بلا کر ان سے رائے لی۔ امیر معاویہؓ بھی اس موقع پر آئے اور مشورہ دیا کہ "آپؓ میرے ساتھ شام چلے چلیں۔ وہاں آپؓ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: "میرا سر تن سے جدا ہو جائے گا مگر میں پھر بھی جوار رسول کو نہیں چھوڑ سکتا۔" عثمانؓ حالات کو بہتر بنانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے اور ادھر کوفہ' بصرہ اور مصر کے باغی آپس میں خفیہ خط و کتابت کر کے مدینہ پر چڑھائی کا عزم کر چکے تھے۔ 658ء کے آخر میں جب حج کا زمانہ گذر چکا اور گہما گہمی ختم ہو چکی تھی تو باغیوں کے تین گروہوں نے حج کے بہانے مدینہ کا رخ کیا۔ کوفہ کے باغی حضرت زبیرؓ' بصرہ والے حضرت طلحہؓ اور مصر کے باغی حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور انہیں اپنی خواہش سے آگاہ کیا لیکن ان تینوں نے انہیں ڈانٹ دیا۔

ایک دن حضرت عثمانؓ معمول کے مطابق منبر پر بیٹھے اور وعظ و نصیحت شروع کی "اے دشمنو! خدا سے ڈرو۔ واللہ مدینہ کے لوگ جانتے ہیں کہ تم حدیث نبوی ﷺ کے مطابق مطعون ہو......" اس دوران دو باغیوں نے آپؓ کی بات کاٹنے کی کوشش کی۔ پھر لوگ ایک دوسرے پر کنکر

پھینکنے لگے۔ ایک پتھر حضرت عثمانؓ کو اس طرح لگا کہ آپ گر پڑے اور بیہوش حالت میں گھر پہنچائے گئے۔ اس واقعہ کے بعد مصر کے باغیوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کی نیت سے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کو بلا کر کہا کہ باغیوں کو سمجھا کر واپس بھیجیں۔ حضرت علیؓ نے ایسا ہی کیا اور پھر آپؓ کو ایک تقریر کرنے کا مشورہ دیا۔ بہت سے لوگ یہ تقریر سن کر رو دیئے۔ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک دن مصری باغیوں کا گروہ پھر آ پہنچا اور آپؓ کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ لیکن آپؓ نے کہا کہ خدا نے مجھے جو خلعت خلافت پہنایا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے نہ اتاروں گا۔" باغیوں نے قتل کی دھمکی دی تو آپؓ نے پھر فرمایا "میں سر دیدوں گا لیکن خدا کی بخشی ہوئی خلافت نہ چھوڑوں گا۔ آپؓ نے جنگ نہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ حضرت علیؓ نے دوبارہ باغیوں کو سمجھا بجھا کر آپؓ کے مکان سے ہٹا دیا۔ لیکن انہوں نے محاصرہ کر لیا۔ اس وقت مدینہ کی حالت نہایت خطرناک تھی۔ بدامنی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ بہت سے لوگ مدینہ چھوڑ کر چلے گئے جب کہ باقی لوگوں نے خود کو گھروں میں بند کر لیا۔ حضرت عثمانؓ نے آخری مرتبہ حضرت علیؓ کو بلا بھیجا تو باغیوں نے انہیں زبردستی روک لیا۔ حضرت علیؓ نے اپنا عمامہ اتار کر قاصد کو دیا اور فرمایا: "جو حالت ہے دیکھ لو اور یہی جا کر کہہ دو۔" باغیوں نے گھر میں پانی تک جانا بند کر دیا' لیکن حضرت علیؓ کسی نہ کسی طرح اندر پانی پہنچاتے رہے۔ محاصرہ چالیس روز تک جاری رہا اور اس دوران حضرت طلحہؓ باغیوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ اگر شیر خدا اس موقع پر بے بس تھے تو کوئی اور کیا کر سکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ بار بار کھڑکی سے سر باہر نکال کر باغیوں کو نصیحت کرتے اور اللہ کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث یاد کراتے رہے' مگر وہ نہ سدھرے۔ سعئی آخر کے طور پر آپؓ نے مکان کی چھت پہ کھڑے ہو کر تقریر فرمائی: "لوگو یاد رکھو! اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو بخدا قیامت تک اکٹھے نماز پڑھ سکو گے نہ جہاد کر سکو گے۔ تمہارے اتحاد و اتفاق کا خاتمہ ہو جائے گا۔" رسول اللہ ﷺ آپؓ کی شہادت کی پیشگوئی کر چکے تھے اس لئے آپؓ نے گھر سے باہر نکل کر باغیوں سے جنگ کرنے یا فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہ بنایا۔

18 ذوالحجہ 35ھ (659ء) کو کچھ باغی ملحقہ مکان کے راستے آپؓ کے گھر میں داخل ہوئے اور کمرے کے دروازے کو آگ لگا دی۔ آپؓ اپنے سامنے قرآن پاک کھولے بیٹھے تھے۔ آخر محمد بن ابی بکرؓ' جو آپؓ کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے' نے آگے بڑھ کر آپؓ کی داڑھی ہاتھ میں لے لی اور گستاخانہ الفاظ کہے۔ اس پر آپؓ نے فرمایا: "تم نے جس چیز کو پکڑا ہے اور جس طرح میرے ساتھ سلوک کیا ہے (تمہارے والد) ابو بکرؓ بھی اسے نہیں پکڑتے تھے اور نہ ہی میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔" اس پر وہ آپؓ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ابو سعد کی روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ کے

پاس آیا تو آپؓ نے فرمایا: "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔" اس شخص نے تلوار سے حملہ کر کے آپؓ کی گردن کاٹ ڈالی۔ قرآن کریم کی جس آیت پر آپؓ کا خون گرا وہ یہ تھی: (ترجمہ) "ان کے مقابلے میں عنقریب اللہ تمہارے لیے کافی ہوگا اور وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔" ابو حبیبہ بیان کرتے ہیں:

جس دن حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تھے میں نے سعد بن ابی وقاص کو دیکھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے گھر گئے۔ وہاں سے نکل کر انہوں نے دروازہ پر جو مشاہدہ کیا اس پر اناللہ پڑھتے رہے۔ مروان نے ان سے کہا' آپ اب پشیمان ہو رہے ہیں۔ آپ ہی نے تو اس کا احساس دلایا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا: استغفر اللہ' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لوگ اس حد تک جرات کریں گے۔

حضرت عثمانؓ نے کہا تھا: "میں گھاٹی پر کھڑا ہوا اہل قریش کی گردنیں پکڑے ہوئے ہوں تاکہ انہیں آگ میں گرنے سے روکوں۔" آپ کی شہادت کے ساتھ ہی گویا اہل قریش نفرت ور قابت کی آگ میں گر پڑے۔ آپؓ کی لاش تین دن تک گھر میں پڑی رہی اسے کسی نے دفن کرنے کے بارے میں گفتگو نہ کی۔ بالآخر حضرت علیؓ کے کہنے پر آپؓ کے گھر والوں کو دفن کرنے کو کہا گیا۔ دشمنوں کو اطلاع ملی تو وہ پتھر لے کر راہ میں بیٹھ گئے تاکہ جنازہ لے کر جانے والوں پر یہ پھینک سکیں۔ لیکن یہاں بھی حضرت علیؓ ان کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ حضرت عثمانؓ کے جنازہ میں مروان بن الحکم' آپؓ کے تین آزاد کردہ غلام اور پانچویں بیٹی نے شرکت کی۔ حکیم بن حزام نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپؓ حش کوکب میں دفن ہیں۔ (اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں) آپؓ کی مدت خلافت بارہ سال سے آٹھ دن کم ہے۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب

(601ء ------ 664ء)

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ 601ء میں پیدا ہوئے۔ مشہور القاب حیدر، مرتضٰی اور اسد اللہ جبکہ کنیت ابو الحسن اور ابو تراب تھی۔ موخر الذکر کنیت کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے کیونکہ یہ عطیہ رسول تھی۔ حسب ونسب کے لئے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ آپؓ رسول اللہؐ کے حقیقی چچا حضرت ابو طالب بن عبد المطلب کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام فاطمہؓ بنت اسد بن ہاشم تھا جو حضرت ابو طالب کی بنت عم تھیں۔ چنانچہ آپؓ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ جب حضرت علیؓ کی والدہ نے انتقال فرمایا تو آنحضرتؐ نے انہیں اپنی قمیض مبارک کا کفن پہنایا اور ان کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا "اے میری ماں، اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں۔ آپ خود بھوکی رہتیں لیکن مجھے کھلاتی تھیں......" رسول اللہؐ نے آپؓ کو اپنا مواخاتی بھائی بنایا اور اپنی عزیز ترین بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کو آپ کے عقد میں دیا۔

رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کو پانچ برس کی عمر میں اپنی کفالت میں لے لیا۔ یعنی چار پانچ برس کی عمر میں ہی آپؓ ذات اقدس سے وابستہ ہو گئے۔ اسلام میں آپؓ سب سے پہلے ایمان لانے والے بچے ہیں اور سب سے پہلے آنحضرتؐ کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ متعدد مواقع پر آپ نے آنحضرتؐ کے لئے اپنی زندگی کو موت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہجرت نبویؐ کے موقع پر حضرت علیؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے (ہجرت کے بعد) انہیں اہل مکہ کی امانتیں واپس کرنے کی ذمہ داری سپرد کی اور روانہ ہوتے وقت اپنے بستر پر لٹا دیا۔ بعد ازاں مسجد نبویؐ کی تعمیر شروع ہوئی تو دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ نے بھی اینٹیں اور گارا ڈھویا۔ غزوات شروع ہوئے تو نگاہ فلک نے دیکھا کہ بدر ہو یا احد، خندق ہو یا خیبر ہر معرکہ میں حضرت علیؓ کی تلوار نے بے مثال جوہر دکھائے۔ آپ کا قول ہے: "میدان رزم میں مجھے پروا نہیں ہوتی کہ موت میری طرف آ رہی

ہے یا میں موت کی طرف جا رہا ہوں"۔

حضرت علیؓ اسلام کا ستارہ سحر ہیں۔ آپ نے رسول اللہؐ اور ان کے بعد تین خلفاء کے
دور دیکھے۔ اہم موقعوں پر آپ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو مشورے دیئے۔
اگرچہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؓ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد سے ہی خلافت کے لئے خود کو
حقدار سمجھتے تھے۔ تاہم اس حوالے سے کوئی ذکر نہیں ملتا کہ آپؓ نے خلافت حاصل کرنے کی
کوشش کی ہو یا خلفا میں سے کسی کو اس بارے میں شکایت کرنے کا موقع ملا ہو۔ معمولی باہمی رنجشیں
انسانی تعلقات کا جزو لاینفک ہیں' مثلاً باغ فدک میں حضرت فاطمہؓ کی وراثت کا مسئلہ۔

35ھ/659ء جب حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا تو امت ایسی حالت میں تھی جو پہلے
کبھی نہیں آئی تھی۔ مدینہ میں باغیوں کے تین گروہ بے چینی اور افراتفری کا سبب بنے ہوئے تھے اور
اپنی اپنی مرضی کا خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ جس خوشنودی' خوشدلی اور سکون قلب کے ساتھ شگفتہ
امیدوں کے ماحول میں مسلمانوں نے تین سابق خلفا کا انتخاب کیا تھا وہ بات حضرت علیؓ کی خلافت
کے استقبال میں موجود نہ تھی۔ یہاں تو سکتے کا عالم تھا' بے چینی اور خوف و ہراس تھا۔ اس عالم میں
حضرت طلحہؓ' زبیرؓ اور مہاجرین و انصار کا ایک گروہ آپؓ کے پاس بیعت کرنے کو گیا تو آپؓ نے فرمایا
"تم جس کو منتخب کرو گے میں بھی اسی کو منتخب کروں گا۔" ان لوگوں نے منت و سماجت سے کہا "ہم
تم سے زیادہ کسی کو امارت کا مستحق نہیں پاتے اور نہ تمہارے سوا کسی اور کو منتخب کر سکتے ہیں" لیکن
حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے بیعت کرنے کے لئے ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ آپؓ قاتلین عثمانؓ سے
قصاص لیں گے۔ کافی اصرار پر حضرت علیؓ نے فرمایا "جب تم مجھے مجبور کر رہے ہو تو بہتر یہ ہے کہ
بیعت مسجد میں ہو تاکہ میری بیعت مخفی نہ رہے۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو آپ کا مسجد میں جانا
بہتر معلوم نہ ہوا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ شرپسند ان کے خلاف شور مچائیں گے۔ لیکن آپؓ نے ان
کی بات قبول نہ کی اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ لوگوں کے درمیان منبر پہ بیٹھ کر آپؓ نے فرمایا
"میں نے تمہاری اس خلافت کا بار مجبوراً قبول کیا ہے...... اب میری شرط صرف اتنی ہے کہ
تمہارے خزانوں کی چابیاں اگرچہ میرے قبضہ میں ہوں لیکن میں تمہاری رضامندی کے بغیر اس
میں سے ایک درہم بھی نہ لوں" حضرت علیؓ کے یہ الفاظ حضرت عمرؓ کی راہ پر چلنے کے عزم کا اظہار
تھے۔ آپؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح تنگدستی کی زندگی گزاری تھی اور اس بات سے بخوبی آگاہ تھے
کہ دولت کی زیادتی اپنے ساتھ کیسی کیسی قباحتیں بھی لاتی ہے۔ دونوں خلفاء کی شخصیت میں بھی
اس حوالے سے کافی مشابہت تھی کہ جو فیصلہ کرتے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے۔ دوسری

طرف آپؓ نے بھی سابق خلفاء کی پیروی میں آنحضرتؐ اور قرآن کی تعلیمات کو مشعل راہ جانا۔ لیکن ان کی طرح آپؓ کے پاس کسی معتبر اور قابل بھروسہ مشیر کی سہولت موجود نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ تو خلافت اور قصاص عثمانؓ کے مسئلہ پر اختلاف رائے کا شکار تھے' جیسا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے موقع پر نظر بھی آیا۔ کچھ عناصر مزید بے چینی پھیلا کر امت میں نفاق ڈالنے کی کوشش میں تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں قریش کی سرداری کا جھگڑا بھی دوبارہ ابھر کر سامنے آ گیا۔ امیہ ہاشم سے ٹکرایا تھا اور اس کا پوتا ابو سفیان رسول اللہؐ سے۔ اسلام نے ان اختلافات کو کافی حد تک مدھم کر دیا تھا لیکن قبیلہ داری نظام میں اختلافات نسل در نسل چلتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب امارت اموی خاندان کے پاس گئی تو بہت سے لوگ معترض ہوئے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت ایک بے لگام بغاوت تھی جس میں لوگ مذہب کے حوالے سے اپنی پہچان کھو کر دوبارہ خاندانی اختلافات کا شکار ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے اپنے چار سالہ دور خلافت میں امیر معاویہؓ بن ابو سفیان اور مروان بن حکم کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ جب آپؓ نے خلافت سنبھالی تو مکہ اور مدینہ والوں کی رقابت نے بھی سر اٹھایا جو جنگ جمل پر ختم ہوئی۔ اس حوالے سے حکومت کی خاطر کی جانے والی سیاست قابل غور ہے۔

حضرت علیؓ کی بیعت ہو جانے کے بعد حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ دیگر صحابہ کے ہمراہ آپؓ کے پاس تشریف لائے اور قصاص عثمانؓ والا وعدہ یاد دلایا۔ کچھ گفتگو کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا "تاوقتیکہ لوگ ایک رائے پر جمع نہ ہو جائیں اور دل درست نہ ہو جائیں' اس وقت تک قصاص ممکن نہیں۔" یہ بات اہل قریش پر گراں گذری اور انہوں نے مدینہ سے بھاگنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے بنو امیہ بھاگے اور لوگ متفرق ہو گئے۔ ایک گروہ حضرت علیؓ کا حامی تھا تو دوسرا مخالف' لہٰذا لوگ واقعی ایک رائے پر جمع نہیں تھے۔ بیعت کے تیسرے روز حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ اور دیگر صحابہ حضرت علیؓ کے پاس آئے تو آپؓ نے ان سے فرمایا "اب تم لوگ اپنے قاتل کو پکڑ کر قتل کر دو۔" صحابہؓ نے جواب دیا کہ یہ قاتل تو اس حد تک چھائے ہوئے ہیں کہ اعراب کے چلے جانے سے بھی ان کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا "خدا کی قسم آج کے بعد وہ اس سے بھی زیادہ چھا جائیں گے" حضرت طلحہؓ نے بصرہ اور حضرت زبیرؓ نے کوفہ جانے کی اجازت مانگی تو حضرت علیؓ نے غور کرنے کا کہا۔ اس کے بعد گورنروں کی تقرری کے معاملہ میں حضرت امیر معاویہؓ کی معزولی کا مسئلہ سامنے آیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پہلے گورنروں کو قائم رکھنے اور پھر تبدیل کر دینے کی رائے دی۔ (یاد رہے کہ حضرت عمرؓ کا قاتل ابو لولوہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا

ہی غلام تھا) حضرت ابن عباسؓ کو پتہ چلا تو انہوں نے حضرت علیؓ سے کہا: "خدا کی قسم یہی مغیرہؓ کل کہیں گے کہ میں نے تو علیؓ کو نصیحت کی تھی لیکن جب اس نے میری نصیحت قبول نہ کی تو میں نے اسے دھوکہ دیا" مغیرہؓ اس گفتگو کے بعد مدینہ چھوڑ کر چلے گئے۔ تاہم حضرت علیؓ نے بصرہ' کوفہ' یمن' مصر اور شام کے گورنر تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے آپؓ کے مراسلہ کا جواب کورے کاغذ کی صورت میں بھیجا تو آپؓ نے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی لشکر کوچ نہ کرنے پایا تھا کہ مکہ سے اختلاف کی خبر آئی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ عمرہ کی غرض سے مکہ پہنچ چکے تھے۔ ان کا تعلق بھی حضرت عائشہؓ والے قبیلے بنو تمیم سے تھا۔ حضرت عائشہؓ بھی حج کرنے کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سن کر واپس مکہ آئیں۔ بنو امیہ حجاز میں حضرت علیؓ سے اختلاف کے بعد مکہ گئے' ان میں سعیدؓ بن العاص اور ولیدؓ بن عتبہ نمایاں تھے۔ عبداللہ بن عامر بھی بصرہ جبکہ یعلیؓ بن امیہ یمن سے آکر ان کے ساتھ مل گئے۔ سب نے مل کر بصرہ جانے پر اتفاق کیا۔ اس موقع پر حضرت طلحہؓ وزبیرؓ نے کہا کہ حضرت علیؓ نے ان سے جبراً بیعت لی (جبکہ روایات اس کے برعکس حقائق بتاتی ہیں۔) دیگر امہات المومنینؓ نے مدینہ کی بجائے بصرہ کا قصد سن کر کنارہ کشی کا فیصلہ کیا۔ لشکر کی تیاری کے لئے رقم کا مسئلہ درپیش آیا تو یعلیؓ بن امیہ اور ابن عامرؓ نے چھ چھ لاکھ درہم اور چھ چھ سو اونٹ دینے کا اعلان کیا۔ یہ بات معاشرے میں مالی نابرابری کی چغلی کھاتی ہے کہ صرف ایک شخص چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹ دینے کے قابل تھا۔ لشکر روانہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ ایک نہایت تیز رفتار اونٹنی پر سوار تھیں۔ ایک منزل طے کی تو حضرت سعیدؓ بن عاص اور حضرت مغیرہؓ نے واپسی کا فیصلہ کیا کیونکہ متوقع کامیابی کے بعد آئندہ خلیفہ کے بارے میں حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کے ساتھ ان کا اختلاف ہو گیا تھا۔ پھر نماز پڑھانے پر بھی حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ میں نوک جھونک ہوئی۔ اس موقع پر معاذؓ بن عبیداللہ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہم کامیاب بھی ہو گئے تو آزمائش میں مبتلا ہو جائیں گے' تاوقتیکہ خلافت طلحہؓ یا زبیرؓ کے حوالے نہ کر دیں (تاریخ طبری۔)

حضرت عائشہؓ کا لشکر جب چشمہ حواب پر پہنچا اور وہاں کے کتے آپؓ پر بھونکے تو ارشاد فرمایا: "مجھے واپس لے چلو' مجھے واپس لے چلو" دریافت کرنے پر آپؓ نے بتایا کہ رسول اکرمؐ نے ایک مرتبہ زوجین کے درمیان بیٹھ کر فرمایا تھا: "تم میں سے کون ہے جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے" چنانچہ حضرت عائشہؓ نے یہ پیشگوئی پوری ہوتے دیکھ آگے نہ جانا چاہا اور اونٹنی کو بٹھا دیا۔ اتنے میں لوگوں نے غل مچا دیا: "جلدی کرو' بے شک علیؓ کا لشکر تمہارے سروں پہ پہنچ گیا

ہے "(طبری' ابن خلادن) دوسری جانب جب حضرت علیؓ لشکر تیار کر کے روانہ ہونے لگے تو عبداللہ بن سلام نے کہا "امیر المومنین آپ مدینہ تشریف نہ لے جائیں۔ اگر آپ گئے تو شاید واپس نہ آسکیں" لیکن حضرت علیؓ نے انہیں صحابی ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کہا۔ بصرہ پہنچ کر احنف بن قیس نے کنارہ کش ہونے کا خیال کیا۔

پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے تو حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ کو یاد دلایا کہ رسول اللہؐ نے ان (طلحہؓ) سے فرمایا تھا کہ بے شک تم ایسے شخص سے لڑو گے جس پر تم خود ہی ظلم کرنے والے ہو گے۔ حضرت طلحہؓ کو بھی یہ بات یاد آئی اور انہوں نے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں حضرت زبیرؓ نے جب حضرت عمار بن یاسرؓ کو حضرت علیؓ کے لشکر میں دیکھا تو انہیں بھی رسول اللہؐ کی بات یاد آئی کہ "عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا" لہٰذا وہ بھی واپس ہو گئے۔ اسی طرح کچھ افراد حضرت علیؓ کے لشکر میں سے نکل گئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ دونوں لشکر اور ان کے امیر جنگ سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مضر، مضر کے مقابلہ میں اور ربیعہ ربیعہؓ کے مقابلہ میں ہتھیار سنبھالے کھڑا تھا۔ انہی میں قاتلین عثمانؓ بھی اپنے ارادوں کی تکمیل کی امیدیں باندھے شامل تھے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ نے حضرت قعقاعؓ کو صلح کی گفت و شنید کے لئے بھیجا اور وہ پرامید واپس آئے تو ان لوگوں کی پریشانی بڑھ گئی جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ اور ان پر خروج کیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے صبح ہونے سے پہلے پہلے جنگ چھیڑ دینے کی ٹھانی اور اس ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ امیر المومنینؓ نے جب دیکھا کہ جنگ شروع ہی ہو گئی ہے تو لشکروں میں منادی کرادی کہ کوئی شخص بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرے' نہ کسی زخمی پر حملہ آور ہو' نہ لوٹ مار کرے۔ ام المومنینؓ نے بھی جنگ روکنے کی تدبیر کے طور پر کعب بن سور سے کہا کہ قرآن ہاتھ میں اٹھا کر آگے بڑھیں' لیکن فرقہ سبیہ کے تیر اندازوں نے انہیں شہید کر دیا۔ ہر دو فریقین ایک ہی اللہ' رسولؐ اور قرآن سے مدد مانگ رہے تھے کہ یہ مشکل وقت کسی طرح ٹلے۔ دونوں طرف سے قاتلین عثمانؓ پر لعنت بھیجی جا رہی تھی۔ مسلمان اس کوشش میں تھے کہ اپنے بھائیوں کو مارنے کی بجائے صرف ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر روکنے کی کوشش کریں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت زبیرؓ کو شہید کرنے کے بعد جب ابن جرموز حضرت علیؓ سے ملنے آئے اور خیمے کے اندر آنے کی اجازت چاہی تو حضرت علیؓ نے دربان سے فرمایا: "ہاں اجازت دیدو اور اسے جہنم کی بشارت بھی دو"

بالآخر حضرت علیؓ نے جنگ کو طول پکڑتے دیکھا تو حکم دیا کہ حضرت عائشہؓ کی اونٹنی پر حملہ کرو۔ چنانچہ جب اونٹنی گری تو آپؓ کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ محمد بن ابی بکر کو حضرت علیؓ

نے حکم دیا کہ ہودج اٹھالو اور اس پر ایک خیمہ لگا دو اور دیکھو کہ حضرت عائشہؓ کو چوٹ تو نہیں آئی۔ "پھر ہودج کو اٹھا کر ایسی جگہ رکھ دیا گیا جہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت قعقاعؓ حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو گفتگو کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "کاش میں آج سے بیس سال قبل مر گئی ہوتی" حضرت قعقاعؓ نے آکر حضرت علیؓ کو یہ بات بتائی تو انہوں نے بھی کہا کہ: "کاش میں آج سے بیس سال قبل مر گیا ہوتا" پھر حضرت علیؓ نے توہین حضرت عائشہؓ کے مرتکب شخص کو سخت سزا دی۔ امیر المومنینؓ نے ام المومنینؓ کو عبداللہ بن خلف کے گھر ٹھہرایا (طبری)

ابن خلدون کے مطابق اگلے دن سامان سفر درست کر کے امیر المومنینؓ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو رؤسائے بصرہ کی چالیس عورتوں اور محمد بن ابی بکر کے ہمراہ مکہ روانہ کیا۔ مشایعت کی غرض سے چند میل خود بھی ساتھ آئے۔ پھر حسنؓ ابن علیؓ ایک دن کی مسافت تک ساتھ رہے۔ جریر الطبری نے شعیب اور سیف کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ تین روز تک لشکر گاہ میں رہے۔ لوگ اپنے اپنے مقتولین کو تلاش کر کے دفن کر رہے تھے۔ کعب بن سور کی لاش دیکھ کر آپ نے فرمایا: "تم لوگ تو کہتے تھے کہ ان کے ساتھ بیوقوف لوگ آئے ہیں حالانکہ یہ تو ایک عالم کی لاش ہے" پھر آپؓ نے مقتولین کوفہ اور مقتولین بصرہ کے علاوہ دونوں فریقین کے قریشیوں کی نماز جنازہ بھی پڑھائی اور ایک بڑی قبر میں سب کو دفن کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میدان جنگ سے تمام سامان جمع کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مرنے والے مسلمان کا مال حلال نہیں۔

جب حضرت علیؓ اہل بصرہ کی بیعت سے فارغ ہو گئے تو بیت المال کھلوا کر وہاں موجود چھ لاکھ درہم کا مال لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک کے حصے پانچ پانچ سو درہم آئے (طبری) حضرت علیؓ نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم شام پر فتح یاب ہوئے تو اسی قدر اور دیا جائے گا۔ فرقہ سبیہ کو یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے آپؓ پر مختلف اعتراضات اٹھائے۔ اس سے پیشتر بھی جب آپ نے مال و اسباب لوٹنے سے منع فرمایا تھا تو لوگوں نے زبان طعن دراز کی تھی۔ پھر فرقہ سبیہ والے بصرہ سے چلے گئے۔ جبلہ بن عقاب حبطی اور عمران بن الفضل الرحمی اعراب کے ساتھ پہلے ہی سجستان جا چکے تھے۔ حضرت علیؓ کے دانش مندانہ اقدامات کی وجہ سے جب خارجیوں کو اپنے مقاصد پورے ہوتے نظر نہ آئے تو انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ مل کر دوبارہ مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے بیعت کے انکار کے بعد پہلے ہی ان سے لڑائی کرنے کی ٹھان چکے تھے۔ جنگ جمل تو مخالفین کی حضرت علیؓ کو شام کی طرف بڑھنے سے باز رکھنے کی تدبیر تھی جس

کے باعث مسلمانوں کا اتحاد ٹوٹا لیکن حضرت علیؓ ارادے کے مضبوط تھے۔ جنگ جمل میں کامیابی نے انہیں حق پرستی کا مزید حوصلہ دیا۔

جنگ جمل کی خبریں ایک دو روز میں مدینہ اور گردونواح میں پہنچ چکی تھیں۔ ایک گدھ مغرب سے قبل مدینہ کے اوپر سے گذرا جس کے پنجوں میں گوشت کے لوتھڑے لٹکے تھے۔ لوگوں نے پیچھا کیا اور پتھر مارے تو گدھ کے پنجے سے ایک ٹکڑا نیچے گر پڑا۔ لوگوں نے اسے دیکھا تو وہ ایک انسانی ہاتھ تھا اور انگلی میں انگوٹھی تھی جس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عتاب کا نام کندہ تھا۔ یہ گدھ مدینہ اور مکہ کے قرب وجوار میں پھیل گئے جس سے دور دراز کے لوگوں کو جنگ کی اطلاع ملی۔ اس ناگوار جنگ میں خود حضرت علیؓ کی جماعت اور حریفوں کی بہت سی جانیں گئیں۔ دشمن' دوست اور اقربا اپنے اپنے پیاروں کی ہلاکت کے باعث نالاں تھے۔ لیکن حضرت علیؓ' شامیوں سے جنگ کی تیاری میں مشغول تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ حضرت علیؓ نے اس جنگ سے پہلے بھی صلح کی غرض سے سفیر بھیجے اور پھر خط وکتابت کی لیکن اطمینان بخش نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ تب دونوں فریقین کو معلوم ہو گیا کہ تصادم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دونوں لشکروں میں سے ایک ایک ٹکڑی نکلتی اور تلواروں کے علاوہ زبان سے بھی لڑتی۔ عمرو بن العاص نے حضرت امیر معاویہؓ کے کہنے پر ابن عباسؓ کو خط لکھ کر مدد مانگی لیکن انہوں نے شدید انکار کیا۔ رہ رہ کر شروع ہونے والی لڑائی کی طوالت سے جب حضرت علیؓ اکتا گئے اور فتنہ کی آگ پھیلتی دیکھی تو ایک عام حملے کی تیاری کی۔ تیسرے روز حضرت امیر معاویہؓ کی فوج میں کچھ پسپائی کے آثار نظر آئے۔ چنانچہ شامیوں نے قرآن کو نیزے پر اٹھا کر لڑائی بند کرانے کی کوشش کی۔ حضرت علیؓ کی فوج کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی انہیں یہ بات سمجھ آئی کہ شامی اگر قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کے اتنے ہی خواہشمند ہیں تو لڑائی سے پہلے ایسا کیوں نہ کیا تھا؟ حضرت علیؓ نے جمہوری تقاضوں کے مطابق اکثریت کی بات مانی اور جنگ بند ہو گئی۔ وہاں موجود لوگوں میں قرآن کو حضرت علیؓ سے زیادہ کوئی نہ جانتا تھا۔

دونوں فوجوں میں ظاہری اختلاف صرف یہ تھا کہ امیر معاویہؓ حضرت عثمانؓ کا قصاص لینا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ امیر المومنینؓ قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ جبکہ امیر المومنینؓ کسی مقرر قاتل کو نہیں جانتے تھے اور باغیوں کا پورا گروہ حوالے کر دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن یہ بات بہت عجیب ہے کہ جنگ بندی اور ثالثی منظور کرتے ہوئے جو معاہدہ لکھا گیا اس میں حضرت عثمانؓ اور قاتلین کا ذکر تک نہ تھا۔ (خلدون طہٰ حسین' تاریخ طبری' تاریخ ابن خلدون)

بلکہ اہل عراق کی طرف سے ابو موسیٰؓ اشعری اور اہل شام کی جانب سے عمرو بنؓ عاص کو حکم مقرر

کرنے کا فیصلہ ہوا۔ معاہدے کی تحریر کے بعد عراقیوں میں پھوٹ پڑی اور شامیوں میں اتحاد ہو گیا۔ ثالثی کی حمایت اور مخالفت کرنے والوں نے امیر المومنینؓ کو پریشان کیا۔ پھر حضرت علیؓ نے اپنی جماعت کو صفین سے کوچ کرنے کا اعلان کیا اور فوج کوفہ واپس ہوئی۔ یہ 37ھ کا واقعہ ہے۔

کوفہ پہنچے تو وہاں کا نقشہ بھی بدلا ہوا پایا' لوگ خستہ حال اور روتے ہوئے نظر آئے کیونکہ جنگ جمل کے مقابلہ میں جنگ صفین کے شہداء کی تعداد زیادہ تھی۔ قاتلین عثمانؓ حضرت علیؓ کے لشکر میں ہی چھپے تھے اور حالات کو بدستور خراب کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے (حتی کہ حضرت علیؓ صفین میں مخالفین سے جنگ کر کے انہیں قرآن کے تابع بنانے پر مصر تھے تو مسعر بن فدکی الیتمی اور زید بن حصین الطائی السنی ' جو بعد ازاں خارجی بن گئے تھے' بولے کہ ثالثی کی دعوت قبول کر کے جنگ بند کر دی جائے " ورنہ ہم تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو عثمانؓ کے ساتھ کیا تھا" (حوالہ ابن الطبری' ابن الاثیر) پھر خارجی اپنے مقاصد پورے کر لینے کے بعد امیر المومنینؓ اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے حاکم جداگانہ بنا لئے۔ ان لوگوں نے پہلے تو شام کی فوج سے صلح کرنے کی حمایت کی تھی لیکن بعد میں صلح کرنے پر حضرت علیؓ پر اعتراض کرنے لگے۔ حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ مناظرہ کے دوران فرمایا: "میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر سوال کرتا ہوں کہ جب شامیوں نے قرآن اٹھائے تو تم نے ہی یہ کہا تھا کہ ہم اللہ کی کتاب کو قبول کرتے ہیں؟" اس سوال کا جواب دینے کے بجائے خارجیوں نے موضوع بدل دیا۔ جب خارجیوں کی غلط گوئی اور فتنہ انگیزی بڑھ گئی اور وہ مسجد میں بھی حضرت علیؓ کی بات کاٹنے کی جرات کرنے لگے تو آپ نے ان کے لئے اعلان کیا: "...... میری جانب سے تین فیصلے ہیں۔ ایک تو ہم تمہیں اس مسجد میں نماز پڑھنے سے نہ روکیں گے' دوم جب تک جنگ میں تم ہمارے ساتھ شریک رہو گے تمہیں مال غنیمت میں سے حصہ ملتا رہے گا' ثالثاً جب تک تم ہم سے جنگ نہیں کرو گے ہم بھی نہیں کریں گے" اس کے بعد عبداللہ بن وہب خارجی نے تقریر کر کے اپنے ساتھیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جمع ہونے کو کہا۔ پھر بصرہ کے خارجیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ رات کی تاریکی میں عبداللہ نے جوخی کی طرف سے دریائے دجلہ عبور کیا اور نہروان پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ جب ابو موسیٰؓ اشعری شامیوں کے خوف سے بھاگ کر مکہ چلے آئے اور عبداللہؓ بن عباسؓ بصرہ چلے گئے تو حضرت علیؓ نے اہل کوفہ کو جمع کر کے خطاب فرمایا اور آخر میں کہا: "تم تیار ہو جاؤ اور شام چلنے کی تیاری کرو اور دو شنبہ کے روز سب لشکر میں پہنچ جاؤ۔ انشاء اللہ" پھر آپؓ نے خارجیوں کے نام خط لکھ کر نہروان روانہ کیا اور انہیں بھی تیاری کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

دریں اثناء خارجیوں نے رسول اللہؐ کے صحابی حضرت عبداللہؓ بن جناب کو شہید کر دیا۔ حضرت علیؓ کو اس فتنہ و فساد کی خبر ملی تو پہلے انہیں درست راہ پر لانے کا قصد کیا کیونکہ وہ لشکریوں کے اہل و عیال کو ان کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ چنانچہ نہروان کی جانب کوچ کا فیصلہ ہوا۔ حضرت علیؓ نہر کی جانب تشریف لے گئے اور خارجیوں سے جماعت مسلمہ میں واپس آجانے کو کہا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ہم نے ثالثی کو قبول کیا اس لئے گنہگار اور کافر ہو گئے (خارجیوں کے نزدیک ہر گناہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ وہ مسئلہ تحکیم کو قرآن کی رو سے گناہ خیال کرتے تھے۔) حضرت علیؓ نے قرآن کی رو سے انہیں مسئلہ تحکیم سمجھانے کی کوشش کی تو خارجیوں نے چلا کر ایک دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں سے کوئی گفتگو نہ کرو۔

38ھ میں جنگ نہروان سے قبل حضرت علیؓ نے ابو ایوب انصاریؓ کو امان کا جھنڈا دیتے ہوئے اعلان کیا کہ جو شخص تم میں سے اس جھنڈے کے نیچے آجائیگا اسے امان ملے گی۔ اور جو شخص کوفہ یا کہیں اور جائیگا اسے بھی امان ہو گا۔ پھر لشکر کو ہدایت کی کہ پہلے حملہ نہ کیا جائے۔ خارجی چیختے چلاتے آگے بڑھے اور بری طرح شکست کھائی۔ آنحضرتؐ خارجیوں کے متعلق پیشگوئی فرما چکے تھے: "ایک قوم اسلام اور دین سے اس طرح نکل جائے گی جیسے شکار تیر سے نکل جاتا ہے......" فتح کے بعد امیر المومنینؓ نے خارجی لشکر کے 400 زخمیوں کو جمع کر کے ان کے قبیلہ والوں کے پاس پہنچایا اور ان کا سامان بھی ساتھ بھجوایا' مقتولین کی تدفین کی اور مال غنیمت مسلمانوں میں بانٹ دیا۔ بقیہ سامان' غلام اور باندیوں کو مقتولین کے رشتہ دار پہنچان کر لے گئے۔ حضرت علیؓ نے خیال کیا کہ تین ہزار خارجیوں کا صفایا کر کے معاملات درست ہو گئے اور اب اس فاتح فوج کو شامی دشمنوں پر حملہ آور کر دینا چاہئے۔ لیکن لشکریوں میں اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی۔

دراصل مقتولین نہروان زیادہ تر عراقی تھے اور تھوڑے بہت بصرہ کے۔ حضرت علیؓ کی جس فوج نے انہیں قتل کیا ان میں انہی کے قبیلے کے لوگ تھے۔ مثلاً عدی بن حاتم لشکر حیدرؓ جبکہ ان کا بیٹا خارج لشکر کے ساتھ تھا جو مارا گیا۔ اسی طرح کتنے ہی چچازاد بھائی ایک دوسرے کے قاتل بنے۔ معرکہ جمل میں اہل کوفہ اہل بصرہ پر فتح حاصل کر کے خوش تھے لیکن اب تو کوفیوں نے ہی کوفیوں کو مارا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ اگر دلوں پر رنج و ملال چھایا ہو' غم و الم نے اس طرح گھیرا ہو کہ خیریت نظر نہ آئے اور حضرت علیؓ اس حالت میں شام پر چڑھائی کا حکم دیں تو مخلص و مکار سرداران قوم جواب میں کہیں کہ اب تو ترکش کے سارے تیر ختم ہو چکے ہیں' تلواریں ٹوٹ چکیں' نیزے کھٹے ہو چکے' اب ہم کو شہر جانے دیجئے تاکہ کچھ آرام کر لیں اور اپنے

ہتھیار درست کرنے کے بعد دشمن پر حملہ آور ہوں گے۔ حضرت علیؓ نے ان کی بات مان لی۔ لیکن
کوفیوں کے دل اپنے اپنے قبیلوں کے ہو گئے تھے اور اسلام ان کے لئے ثانوی ترجیح بن چکا تھا۔ جب
دوبارہ امیر المومنینؓ نے انہیں جنگ کی تیاری کا حکم دیا تو وہ متردد رہے۔ ہر شخص اپنے یقین اور
ایمان میں حضرت علیؓ کی سی قوت' ارادے میں ان جیسی پختگی اور رائے میں ان جیسا خلوص نہیں
رکھتا تھا۔

ایسے موقع پر بھی حضرت علیؓ نے بیت المال کی مدد سے لوگوں کو راغب کرنے کی
کوشش نہ کی۔ بلکہ آپ تو جو بھی بیت المال میں کچھ آتا فوراً لوگوں میں سارا کا سارا تقسیم کر دیتے۔
حتیٰ کہ یہ روایت بھی ہے کہ آپ کی خواہش تھی کہ بار بار بیت المال میں جھاڑو دینے کا حکم دیں' پھر
پانی بہا کر اسے دھویا جائے' اس کے بعد آپؓ اس میں داخل ہوں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔ آپؓ کو یہ
منظور نہ تھا کہ یکایک موت آ جائے اور بیت المال میں کچھ بچا رہ جائے جو حقداروں تک نہ پہنچ سکے۔ ایک
مرتبہ تو سوئی اور دھاگہ بھی آپؓ نے لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ امن کی زندگی لوگوں کو بہت عزیز
تھی بہ نسبت جنگ وجدل کے۔ چنانچہ وہ جنگ و مقابلے کی ہر دعوت اور تحریک کو ٹالتے رہے۔ آپؓ
نے لوگوں کو جمع کر کے سرزنش کی لیکن وہ کوئی جواب نہ پا کر ادھر ادھر ہو گئے اور اپنی بے عملی سے
حضرت علیؓ کو مایوس کر دیا۔ بعض راویوں نے ان روایت کرنے والوں کا بیان لکھا ہے جنہوں نے اپنی
آنکھ سے دیکھا کہ حضرت علیؓ سر پر قرآن اٹھائے فرما رہے ہیں: "اے میرے خدا میں نے قرآن
میں جو کچھ ہے اس کی طلب کی تھی' ان لوگوں نے مجھے اس سے بھی روکا۔ اے خدا میں ان سے اکتا چکا
ہوں اور یہ بھی مجھ سے برداشتہ خاطر ہو چکے ہیں۔ مجھے ان سے نفرت ہے اور ان کو بھی مجھ سے۔ مجھے
ان لوگوں نے ایسے طور طریقوں پر مجبور کیا جن سے میری عادات واخلاق کا کوئی تعلق نہیں۔ پس
ان کے عوض مجھے ان سے بہتر آدمی دے اور میرے عوض ان کو مجھ سے کوئی برا بدل دیدے اور ان
کے دلوں کو اس طرح گھول دے جیسے پانی نمک۔"

حضرت علیؓ جس خطرے کے پیش نظر امت مسلمہ کو جنگ کی تیاری کا حکم دے رہے
تھے بالآخر وہ سر پہ منڈلانے لگا۔ 39ھ (مطابق 663ء) میں حضرت علیؓ کے مقبوضات پر شامیوں
نے حملے شروع کئے حضرت امیر معاویہؓ کی ہدایت پر لقمانؓ بن بشیرؓ نے عین التمر' سفیان ابن عوف
نے انبار و مدائن' عبداللہ فرازی نے تیما' ضحاک بن قیس نے ثعلبہ اور واقصہ پر حملہ کیا' جبکہ حضرت
امیر معاویہ خود حجاز و یمن پر حملہ آور ہوئے۔ پھر بسرؓ نے یمن میں شیعان علیؑ کو قتل کیا' جاریہؓ نے
نجران کو آگ لگا کر عثمانیوں کا قتل عام کیا اور اہل مکہ کو امیر المومنینؓ کی شہادت کی جھوٹی خبر سنا کر اپنی

بیت پر مجبور کیا۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے مابین اسلامی حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا جس کے مطابق عراق امیر المومنینؓ جبکہ شام حضرت امیر معاویہؓ کا علاقہ قرار پایا۔

40ھ (بمطابق 664ء) میں ابن ملجم' برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر الیتمی نے مل کر خارجیوں کے لئے دعائے مغفرت کی اور حضرت امیر معاویہؓ حضرت عمرو بنؓ العاص 'اور حضرت علیؓ کو اپنے بھائیوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان تینوں حضرات کے قتل کا پروگرام بنایا (طبری)۔

جندب بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں روپوش ہونے کا کہا اور پوچھا: "خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم حسنؓ کی بیعت کر لیں؟" حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ روکتا ہوں تم لوگ زیادہ مناسب سمجھتے ہو۔" دوبارہ سوال کرنے پر آپؓ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو بلوایا اور کہا: "میں تم دونوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تم دونوں دنیا کو ہرگز تلاش نہ کرنا خواہ دنیا تم سے بغاوت کیوں نہ کرے 'اور جو شئے تم سے ہٹادی جائے اس پر رونا نہیں۔ ہمیشہ حق بات کہنا کتاب اللہ کے احکامات پر عمل کرنا...... یقیناً میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا اور میں تابع فرمان لوگوں میں سے ہوں...... میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں......" اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ "اے بنی عبدالمطلب کہیں تم میری وجہ سے مسلمانوں کے خون نہ بہادینا...... سوائے میرے قاتل کے کسی کو قتل نہ کرنا۔ اے حسنؓ اگر میں اس کے وار سے مر جاؤں تو تو بھی قاتل کو ایک ہی وار سے ختم کرنا کیونکہ ایک وار کے مقابلہ میں ایک وار ہونا چاہیے۔"

17 رمضان 40ھ کو عمرو بن بکر نے غلطی سے عمرو بنؓ العاص کی بجائے خارجہ ابن حذافہ کو شہید کر دیا اور عمروؓ نے اسے پکڑ کر مروادیا۔ برک بن عبداللہ حضرت امیر معاویہؓ پر حملہ آور ہوا لیکن وار اوچھا پڑا۔ پکڑے جانے پر برک نے کہا کہ میرے پاس ایسی خبر ہے جس سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آج میرے بھائی نے حضرت علیؓ کو قتل کر دیا ہوگا۔ امیر معاویہؓ نے فرمایا کاش تیرا بھائی ان پر قدرت نہ پاسکے۔ برک بولا 'کیوں نہیں۔ علیؓ جب باہر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ کوئی محافظ نہیں ہوتا۔ امیر معاویہؓ نے برک کو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ مصر کے ابن ملجم نے اپنے ذمہ حضرت علیؓ کو قتل کرنے کا کام لیا تھا۔ فجر کے وقت آپ نماز پڑھانے جا رہے تھے کہ ابن ملجم کے ساتھی شبیب نے لپک کر تلوار چلائی۔ آپ آگے بڑھ گئے تھے۔ تلوار دروازے پر پڑی۔ ابن ملجم نے بڑھ کر پیشانی پر

تلوار کا وار کیا۔ شبیب کو بھاگتے ہوئے ایک حضرمی شخص نے پکڑ کر تلوار چھین لی۔ پھر لوگوں کو آتے دیکھ کر اس خوف سے چھوڑ دیا کہ کہیں اسے ہی قاتل نہ سمجھ لیا جائے۔ ابن ملجم گرفتار ہوا حضرت علیؓ نے کہا : "اگر میں مر جاؤں تو تم بھی اس کو مار ڈالنا۔ اگر زندہ بچ گیا تو خود فیصلہ کروں گا۔ اس کے اعضانہ کاٹنا کیونکہ آنحضرتؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔" اس کے بعد آپؓ لا الہ الا اللہ پڑھنے میں مشغول رہے حتیٰ کہ طائر روح عالم بالا کو پرواز کر گیا۔ آپؓ کے بیٹوں حضرت حسنؓ و حسینؓ اور عبداللہؓ بن جعفرؓ نے غسل دیا' تین کپڑوں میں کفنایا جس میں قمیض نہ تھی۔ حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور نو تکبیرات کہیں (طبری)۔ پھر چھ ماہ تک حضرت حسنؓ والی رہے۔ ابن ملجم کو حضرت حسنؓ نے انجام تک پہنچایا' لیکن لوگوں نے امیر المومنینؓ کی وصیت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ابن ملجم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے (طبری)۔ وفات کے وقت آپ کی عمر 63 سال تھی۔ دارالامارت میں جامع مسجد کے قریب دفن ہوئے۔ آپؓ کا دور خلافت تین ماہ کم پانچ سال ہے۔

حضرت علیؓ آزمائش کے تلخ دور سے گذرتے رہے۔ دوست غداری اور دشمن مکاری سے پیش آئے لیکن آپؓ اس پورے دور میں اپنے روشن مسلک پر ارادے کے پکے رہے۔ نہ معاملات میں کوئی پستی گوارا کی نہ دین میں کوئی کمزوری دکھائی اور نہ ہی اپنی واشگاف سیاست سے ذرا بھی انحراف کیا۔ مصیبتیں مسلسل سدراہ بنتی رہیں مگر آپؓ اپنی راہ پر چلتے رہے اور قرآن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ کوفہ والوں کے لئے آپؓ کی روش وہی تھی جو مدینہ میں حضرت عمرؓ نے اپنائی تھی۔ آپؓ بازاروں کا گشت کرتے وقت درہ اپنے ساتھ رکھتے' لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کی ہدایت فرماتے۔ خرید و فروخت کے موقع پر ان کی نگرانی کرتے' اگر لین دین یا گفتگو میں کوئی غلط بات پاتے تو ڈانٹ ڈپٹ کر یا درے سے سیدھا کرتے۔ لوگوں کی طبیعتوں میں سختی کے پیش نظر آپؓ نے درہ چھوڑ کر خیزرانہ ہاتھ میں لیا۔ لیکن پتہ چلا کہ لوگ اس سے بھی نہیں ڈرتے تو کوفہ کے عوام اور خواص سے کہا کرتے تھے کہ "میں جانتا ہوں تم کس طرح درست ہو سکتے ہو' لیکن خود بگڑ کر تم کو بنانا نہیں چاہتا۔" حضرت علیؓ خلافت کے رعب داب سے بھی بڑی احتیاط کرتے اور خریداری کرنے کے لئے بازار میں کسی ایسے دکاندار کے پاس جاتے جو آپ سے رعایت نہ کرے۔ لوگوں کی دینی خدمت کا فرض ادا کئے بغیر آپ کو تسکین نہ ملتی۔ چنانچہ نماز پڑھاتے' اپنے قول و عمل سے تعلیم دیتے' فقراء و مساکین کو رات کا کھانا کھلاتے اور ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے۔

گورنروں کے ساتھ بھی آپ نے عام لوگوں جیسی ہی روش اپنائی۔ ان پر کڑی نظر رکھتے حساب کتاب کی سختی سے پڑتال کرتے' علاوہ ازیں حاکموں کی روش کا پتہ چلانے کے لئے کچھ

سپروائزر اور انسپکٹر بھی روانہ کرتے رہتے۔ یوں آپؓ کو رپورٹیں ملتی رہتیں۔ گورنر آپؓ سے ڈرتے تھے۔ بصرہ کے گورنر زیاد کو لکھا: "اگر مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مال میں سے تم نے ذرا بھی خیانت کی ہے تو میں تم پر وہ سختی کروں گا کہ زمین پر تمہارا چلنا دشوار ہو گا" حضرت علیؓ نے چاہا کہ عربوں کو پھر فاروق اعظمؓ کے دور میں پہنچادیں' لیکن وہ دن جا چکے تھے ان کا واپس آنا ناممکن تھا۔ دولتمندوں کے دل پر ہوس غالب آچکی تھی۔ اگر آپؓ اپنے بیٹے اور قریبی ساتھیوں کی بات مان لیتے تو بیعت سے مستعفی ہو جاتے لیکن یہ نہ ہو سکا' آپ حق پر ایمان رکھتے تھے اور حق کی امداد نہ کرنا بزدلی اور معصیت تھا۔ آپؓ خلیفہ تھے' حاکم نہیں۔

حضرت علیؓ سے منسوب کردہ مجموعہ اقوال و نصائح "نہج البلاغہ" میں آپؓ کی شخصیت کا ایک وقت بالکل جداگانہ اور ممتاز پہلو سامنے آتا ہے۔ بلاشبہ رسول اللہؐ کی قربت اور تربیت نے آپؓ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں اور دنیا و آخرت کے علاوہ تمام انسانی مسائل پر فلسفیانہ غور و فکر کرنے کی صلاحیت کو اجاگر کیا۔ نیز اسلامی سلطنت وسیع ہو جانے پر ایرانی' مصری اور عراقی تہذیب نے عربوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ قبل از اسلام کے عرب میں باقاعدہ غور و فکر اور معاشرتی مسائل پر بحث کی روایت موجود نہ تھی۔ رسول اللہؐ نے معاشرے کو نئے خطوط پر استوار کرتے ہوئے اس روایت کی بنیاد رکھی۔ آپ کے بعد حضرت علیؓ فلسفیانہ غور و فکر کے میدان میں غالب نظر آتے ہیں۔ آپؓ کے خطبات اور وعظوں میں معاصرانہ عقل و دانش کی واضح جھلک ملتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا: "تیر انداز جب تیر چلاتا ہے تو اس کا تیر کبھی خطا بھی ہو جاتا ہے' لیکن کلام کا تیر بے خطا ہوتا ہے۔ کلام باطل مہلک ہوتا ہے...... حق و باطل (آنکھ اور منہ) کے درمیان صرف چار انگلیوں کا فرق ہے۔"

بدعت و سنت کے موضوع پر فرمایا: "اے لوگو! اس دنیا میں تم وہ نشانہ ہو جس پر موت کے تیر چلتے رہتے ہیں...... کوئی بدعت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی سنت (طریقہ رسولؐ) ترک نہیں کی جاتی" "نہج البلاغہ" میں آپؓ کی آخری گفتگو کے زیر عنوان کچھ ارشادات دیئے گئے ہیں: "...... اگر اس لغزش گاہ میں میرے قدم استوار رہے تو خیر یہی مقصود ہے اور اگر میرے قدم ڈگمگا گئے (یعنی موت آگئی) تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہم شاخوں کے سائے میں تھے جو بر ابر ڈھلتا رہتا ہے' ہواؤں کی گذرگاہ میں تھے اور ایسے ابر کے سایہ میں تھے جو فضا میں پھٹ گئے اور زمین پر جن کا نقش مٹ گیا...... میری تم سے جدائی اس شخص کی جدائی کے مانند ہے جو کل پھر ملاقات کا منتظر ہو۔ کل تم میرے عہد کو یاد کرو گے اور میرا باطن تم پر منکشف ہو گا۔ جب میری جگہ دوسرا آجائیگا اور میری مسند خالی ہو جائے گی تب مجھے پہچانو گے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؓ

اس کا دروازہ ہیں" (سیارہ ڈائجسٹ خلفاؓ نمبر) ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: "جس شخص نے علیؓ کو برا کہا مجھ کو برا کہا۔"

حضرت امام حسنؑ

(627ء-----674ء)

15 رمضان المبارک سنہ 3 ہجری (بمطابق 627 عیسوی) کا بابرکت دن نواسہ رسول امام حسنؑ مجتبیٰ کی ولادت باسعادت کے باعث یادگار ہے۔ آپ نے زندگی کے ابتدائی آٹھ برس آغوش رسالتؐ میں گذارے۔ احادیث کے مجموعے کثرت و تواتر کے ساتھ سرور کائناتؐ کی آپ سے بے پناہ محبت اور خاص تعلق کا پتہ دیتے ہیں۔ 11 ہجری میں آنحضرتؐ کا شفیق سایہ اٹھنے کے بعد سے لے کر 40 ہجری تک حضرت امام حسنؑ اپنے والد حضرت علیؓ کے زیر تربیت رہے۔ آپ کو خلفائے راشدین کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ یوں تو اس 29 سالہ دور میں آپ سیاسی' سماجی اور معاشرتی امور میں اپنے والد کے ممد و معاون رہے تھے لیکن جب لوگوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ کی بیعت کر لی تو خلافت مرتضوی کا بہت سارا بوجھ بھی آپ کے کاندھوں پر آپڑا تھا۔

40ھ بمطابق 664ء میں حضرت علیؓ کے فرزند اکبر حضرت امام حسنؑ سے خلافت کی بیعت ہوئی۔ سب سے پہلے قیس بن سعد نے کہا: "ہاتھ بڑھایئے میں آپ سے خدائے عزوجل کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت اور مفسدوں سے جنگ کرنے کی بیعت کرتا ہوں"۔ اس کے بعد لوگ بیعت کرنے لگے اور حضرت حسنؑ فرماتے جاتے تھے: "تم لوگ میرے کہنے کو سنتے رہنا' میری اطاعت کرنا' جس سے میں صلح کروں اس سے تم بھی صلح کرنا اور جس سے جنگ کروں تم بھی اس سے لڑنا" دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی خلافت کی بیعت اہل شام سے لی اور امیر المومنین کہلوانے لگے۔ کچھ تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی بیعت کرنے کے بعد لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے کہ نئے خلیفہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ دراصل آپؓ گذشتہ کئی سال سے دیکھتے آئے تھے کہ حضرت علیؓ لوگوں کو

جنگ کی تیاری کرنے کو کہہ رہے ہیں لیکن یہ بات کسی نے نہیں مانی اور نتائج خوفناک برآمد ہوئے۔
دوسرے حضرت امام حسنؑ طبیعتاً صلح جو تھے۔ شہادت عثمانؓ سے پہلے بھی جب حالات بہت زیادہ خراب ہوئے تو آپؓ نے اپنے والد محترم کو مدینہ سے چلے جانے کو کہا۔ اس کے بعد جنگ جمل کے لیے جاتے ہوئے بھی آپ نے نہ لڑنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ اپنی بیعت کے بعد حضرت امام حسنؑ نے مصالحانہ رویہ اپنا کر معاملات کو درست کرنا چاہا۔

کوفہ، بصرہ، یمن، حجاز، فارس اور وہ تمام ریاستیں آپ کے تابع ہو گئی تھیں جو اس سے قبل آپ کے والد محترم کے زیر نظر رہیں۔ صرف والئ شام امیر معاویہؓ اور ان کے حواریوں نے اس خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ساٹھ ہزار افواج کے ہمراہ عراق پر حملہ آور ہوئے۔ یقیناً یہ امام حسنؑ کے حق خلافت کے خلاف کھلا تجاوز تھا۔ اس سے پہلے اپنے متعدد خطوط میں امام مجتبیٰؑ انہیں بغاوت و سرکشی ترک کر کے اپنی بیعت کے زمرے میں شامل ہونے کی تاکیدیں کر چکے تھے۔ ایک قانونی حکمران ہونے کی حیثیت سے بھی امیر شام پر امام حسنؑ کی اطاعت فرض تھی کیونکہ صلح سے پہلے یعنی رمضان 40 ہجری سے لے کر جمادی الاول 41 ہجری تک امیر شام ابھی تک عالم اسلام کے مطلق العنان حاکم نہ بنے تھے۔

صحابہ میں ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت حسنؑ کو، بچپن میں ایک دن اپنے پہلو میں منبر پر بٹھایا۔ پھر ایک نظر حضرت امام حسنؑ اور دوسری لوگوں پر ڈالتے۔ اسی طرح بار بار کیا اور فرمایا "میرا یہ لڑکا سردار ہے اور شاید خدا اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرا دے۔" گویا فتنے کے بادل دیکھ کر آپ کو حدیث یاد آجاتی۔ آپؓ کو شک تھا کہ قیس بن سعد جنگ نہ کرنے کی مخالفت کریں گے اس لیے انہیں معزول کر کے عبداللہ بن عباس کو امیر لشکر مقرر کیا، لیکن بعد ازاں وہ امیر معاویہؓ کے ساتھ مل گئے۔

اپنی شہادت سے چند روز قبل حضرت علیؓ نے شام جانے کے لیے مسلمانوں کا ایک لشکر مرتب کیا تھا۔ جب لوگوں نے حسن ابن علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تو امیر معاویہ اہل شام کو لے کر کوفہ کی طرف بڑھے۔ امام حسنؑ بھی روانہ ہوئے۔ مدائن پہنچنے پر افواہ پھیل گئی کہ قیس بن سعد مارے گئے۔ لوگ افراتفری کے عالم میں باہم الجھنے لگے۔ حتیٰ کہ حضرت امام حسنؑ کے خیمے کی طرف جھپٹے اور جو کچھ پایا لوٹ لیا۔ آپ کے نیچے بچھی ہوئی بساط اور بدن کی چادر بھی چھین لی۔ بعض نے آپ کی ران پر نیزہ (یا خنجر) بھی مارا۔ یہ نفاق و انتشار دیکھ کر امام حسنؑ کوئی نیا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ عراقی قبائل کے سرداروں اور سپاہ کے سامنے آئے اور ان سے خطاب کیا: "اے عراق

کے لوگو! مجھے تمہارے ان اشخاص کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے جو میرے ہمراہ ہیں؟...... مجھے آگاہ کیا گیا ہے کہ تمہارے شرفا تک معاویہؓ سے مل چکے ہیں۔ میرے والد کے بعد تم خود سے میرے پاس آئے تھے اور تم نے اپنی پسند سے مجھ سے بیعت کی تھی۔ میں نے تمہاری بیعت کو قبول کیا اور معاویہ سے مقابلے کو نکل کھڑا ہوا...... جو کچھ میں تم سے جھیل چکا ہوں کافی ہے۔ مجھے میرے دین میں دھوکا مت دو کیونکہ میں اقتدار کو معاویہ کے حوالے کرنے جا رہا ہوں" حضرت امام حسنؓ نے اس وقت تک صلح کا ارادہ نہیں کیا جب تک سپاہ نے اپنی نالائقی اور بے دینی کا عملی ثبوت نہ فراہم کر دیا۔ آپ شام و عراق کے درمیان جاری کشمکش کو ختم کر کے امت میں اتحاد برقرار کرنا چاہتے تھے۔

ابن طبری نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کے نام خط میں خلافت و حکومت سے دست کشی کا ارادہ ظاہر کیا اور صلح کی مندرجہ ذیل شرائط بھی پیش کیں: "معاویہؓ قرآن کریم' سنت رسولؐ اور نیک خلفا کی پیروی کریں گے' (2) حضرت علیؓ کو ناشائستہ کلمات سے یاد نہ کیا جائے گا' (3) اللہ کی زمین میں اس کے بندوں کو مکمل تحفظ حاصل ہو گا' (4) معاویہؓ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین معین نہ کریں گے' (5) حضرت علیؓ کے ماننے والوں کی جان' مال اور عزت کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔" کچھ تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام حسنؓ نے بیت المال میں سے پانچ لاکھ دینار اور مضافات فارس کا خراج بھی طلب کیا تھا۔ لیکن یہ اس لئے درست نظر نہیں آتیں کیونکہ اگر امام حسنؓ کو دنیا اور مال و دولت اتنی ہی عزیز ہوتی تو وہ اقتدار مکمل طور پر حضرت معاویہؓ کے حوالے کر کے گوشہ نشین نہ ہو جاتے۔

حضرت امام حسنؓ اس کے بعد مدینہ چلے گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ امیر معاویہؓ کا قاصد ان کو خارجیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلانے آیا۔ آپؓ نے انکار کر دیا اور کہا: "میں نے امیر معاویہؓ سے صلح کر لی ہے اور اس کا مقصد ہی خون کی حفاظت اور جنگ سے گریز ہے" حضرت امام حسنؓ مدینہ پہنچے تو صلح پر لوگوں نے انھیں طعنے دیئے حالانکہ یہی لوگ حضرت علیؓ کو جنگ کرنے کی وجہ سے برا بھلا کہتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام حسنؓ نے جواب دیا: "مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اللہ سے اس حالت میں ملوں کہ ستر ہزار یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کے نرخروں سے خون بہہ رہا ہو اور ہر ایک یہ کہہ رہا ہو کہ اے خدا میں کس گناہ میں قتل کیا گیا ہوں"

مسلمان اب تک خلافت دیکھتے آئے تھے لیکن اب ان پر حکومت قائم ہو چکی تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ کا انداز حکومت اور عمال کی تقرری کا طریقہ ایک الگ بحث ہے لیکن بلاشبہ لوگ

جلد ہی بیزار ہو گئے۔ عراقیوں کو حضرت علیؓ کا دور یاد آنے لگا۔ وہ ان کے ساتھ اپنے سلوک پر پچھتاتے اور نادم ہوتے۔ شامیوں سے صلح کر لینے کا بھی انہیں افسوس تھا۔ جب کبھی ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی تو بحث کرتے کہ کیا کیا جائے؟ ابھی چند ہی برس گذرے تھے کہ وہ وفود کی صورت میں مدینہ جانے لگے تاکہ حضرت امام حسنؓ سے مشورہ کریں۔

ایک دن کوفہ کے رئیسوں اور سرداروں کا ایک وفد حضرت امام حسنؓ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ "کوفہ کے چالیس ہزار نبرد آزما آپ کے ساتھ ہیں۔ سب لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے علاوہ اتنی ہی تعداد میں لڑکے اور ساتھی، اور پھر حجاز اور بصرہ میں آپ کے حامی بھی موجود ہیں" انہوں نے حضرت امام حسنؓ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے حضرت امیر معاویہؓ کی عہد شکنی اور دیگر نقائص گنوائے حضرت حسنؓ ان کے مخلص ہمدرد تھے لیکن امن و آشتی ان کی نظر میں مقدم تھی، پھر بھی آپ نے انہیں مایوس نہ کیا، ان کی ڈھارس بندھائی۔ بلاذری کی روایت ہے کہ آپ نے ان سے کہا: "تم ہماری جماعت ہو، ہم سے محبت کرتے ہو۔ اگر میں دنیا کے لیے شدت سے کام لیتا اور میرے پیش نظر دنیاوی اقتدار ہوتا تو معاویہؓ مجھ سے زیادہ شان و شوکت والے نہ تھے اور نہ ہی مجھ سے زیادہ خوددار اور ارادے کے پکے۔ لیکن میری نگاہ تم سے جدا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد خونریزی روکنا تھا اور کچھ نہیں۔ بس اللہ کے فیصلے پر رضامند رہو اور معاملہ اسی کے حوالے کرو...... اپنے ہاتھ کو روکے رکھو تاکہ نیک مرد چین پائے یا پھر بدکار لوگوں سے نجات مل جائے" (حضرت علیؓ از طہٰ حسین)۔ یہ پہلا دن تھا جب حضرت علیؓ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے حامیوں کی ایک منظم سیاسی جماعت بنائی گئی۔ اسی مجلس میں مدینہ میں یہ جماعت بنی اور حضرت امام حسنؓ اس کے صدر ہوئے۔ ایک مقررہ پروگرام بھی تشکیل دیا کہ حالات کو اس نہج پر لایا جائے کہ لوگ خود بخود اٹھ کھڑے ہوں۔

حضرت امام حسنؓ سے وقتاً فوقتاً وفود مدینہ میں آکر ملتے رہے۔ شیریں کلام، شگفتہ طبع اور ملنساری کی وجہ سے آپ قریش و انصار کے نوجوانوں میں ہردلعزیز تھے۔ ضعیف صحابہؓ کرام رسول اللہ کی نگاہ میں آپ کے درجہ کے پیش نظر آپ کی عزت اور محبت کرتے آپ بڑے دریادل اور فیاض تھے۔ لوگوں کو دل کھول کر عطیات دیتے۔ اس طرح گوشہ نشین ہو جانے کے باوجود آپؓ نے دنیا سے تعلق قائم رکھا۔ بہت سے لوگوں نے علیؓ کا بیٹا اور نبی کریم کا نواسہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنی بیٹیوں کے رشتے دیئے۔

امیر معاویہؓ حضرت امام حسنؓ کی مخالفت کی اطلاعات ملنے کے باوجود آپ پر مہربان

رہے۔ غالباً انہیں علم تھا کہ حضرت امام حسنؑ ان کی دی ہوئی خلافت کو قبول نہیں کریں گے اس لئے انہیں ولی عہدی کا منصب پیش کیا جسے حضرت حسنؑ نے ٹھکرا دیا اور شرط رکھی کہ خلافت کا معاملہ مسلمانوں کی شوریٰ سے طے ہو۔ 50ھ بمطابق 674ء میں حضرت حسن کو زہر دیدیا گیا۔ یہ امر بہت زیادہ اختلاف رائے کا حامل ہے کہ آپ کو کس نے زہر دیا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے وفات سے پہلے قریب موجود لوگوں سے کہا: "مجھے بارہا زہر دیا گیا' لیکن اتنا شدید کبھی نہیں۔ ابھی ابھی میرے کلیجے کا ٹکڑا منہ سے نکلا ہے" یہ بھی روایت ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے زہر دینے والے کے متعلق پوچھا تو آپ نے نہ بتایا کہ کہیں بلا دلیل کسی سے قصاص نہ لیا جائے۔ حضرت امام حسنؑ اپنی زندگی سے مایوس نہ تھے اور نہ ہی یہ چاہتے تھے کہ خدا سے ایسی حالت میں ملیں کہ شبہ کی بناء پر ان کا قصاص لیا گیا ہو۔ لہذا انہوں نے یہی مناسب جانا کہ اللہ ہی قصاص لے۔ سیرت امام حسنؑ کو دیکھتے ہوئے یہی روایت معتبر لگتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ

(628ء ——— 685ء)

حضرت امام حسینؑ آنحضرتؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ امام حسینؑ نے بچپن میں آنحضرتؐ کی گود میں کھیل کر گذارا' لڑکپن میں خلفاء کے دور کے نشیب و فراز دیکھے اور پھر اپنے والد کی مشکلات اور ثابت قدمی سے سبق سیکھا۔ آپؑ حضرت علیؓ کے جنگوں میں باقاعدہ شریک ہوئے' اور پھر اپنے برادر اکبر حضرت امام حسنؑ کی زیر ہدایت پر امن زندگی گذارتے ہوئے دس برس تک تمام صورتحال کا جائزہ لیتے رہے۔ آپ کے تمامتر کردار اور شخصیت کا عکس واقعہ کربلا میں ملتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ اپنی طبیعت' مزاج اور اصول پرستی کے اعتبار سے اپنے والد محترم کا کامل عکس تھے۔ حق کے معاملہ میں ذرا بھی رعایت نہیں کرنا جانتے تھے معاملات پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ حکومت امیر معاویہؓ کی تابع فرمان ہے' بڑے بڑے شہر ان کے اشاروں پر چل رہے ہیں' ان کی پالیسی چشم پوشی اور سخاوت پر مبنی ہے' شہروں پر ایسے حاکم مسلط کر دیئے گئے ہیں جو وہاں کے باشندوں کو تشدد اور دہشت آفرینی سے مرعوب کیے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ نے بغاوت کا ارادہ نہیں کیا حالانکہ امیر معاویہؓ کی طرف سے بیعت کی خلاف ورزی نے آپ کے لیے ایسا موقع پیدا کر دیا تھا۔ بیت المال کا مسرفانہ استعمال' صوبوں پر ڈکٹیٹر قسم کے افراد کا تقرر' عوام کے جان و مال کے ساتھ زیادتی' یہ تمام باتیں اس بیعت کے خلاف جاتی تھیں جن کا امیر معاویہؓ نے عوام سے عہد کیا تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے حاکموں کے بارے میں سخت تنقیدیں شروع کر دیں۔ اس وقت امیر معاویہؓ اور ان کے گورنر زیاد کی شدید مخالفت کا مرکز کوفہ تھا۔

45ھ (669ء) میں زیاد بصرہ کا والی ہوا تو وہاں کے حالات نے پلٹا کھایا۔ اسی طرح جب

کوفہ بھی زیاد کی حکمرانی میں آگیا تو کوفہ کے حالات بھی بدل گئے۔
50ھ میں مغیرہ کے وفات کی بعد کوفہ بھی زیاد کی حکمرانی میں آگیا تو کوفہ کے حالات بھی بدل گئے۔
ابن طبریؒ لکھتے ہیں کہ زیاد ابھی کوفہ میں پہلا خطبہ دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ لوگوں نے اسے سنگریزے مارنا شروع کر دیئے۔ مسجد کے دروازے بند کروا کے سب کو روک لیا گیا' کہا جاتا ہے کہ زیاد نے سب سے قسم لی کہ اس نے ڈھیلا نہیں مارا یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام اسی افراد کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔ زیاد نے کوفہ میں جس پہلے شخص کو قتل کیا وہ ابن حصن تھا۔ زیاد جب سمرہ کو اپنا جانشین کر کے کوفہ چلا آیا تو واپسی تک سمرہ آٹھ ہزار ادمیوں کو قتل کر چکا تھا۔ ابو سواری عدوی کا بیان ہے کہ سمرہ نے میری قوم کے لوگوں میں سے فقط ایک دن صبح کے وقت 47 آدمیوں کو قتل کیا کہ وہ سب کے سب جامع قرآن تھے۔ اسی سال یعنی 50ھ میں امیر معاویہؓ نے منبر رسول کو شام لیجانے کا ارادہ کیا لیکن آفتاب کو گہن لگنے پر وہ باز رہے۔ بہر حال منبر کے زینوں میں چھ کا اضافہ کر دیا۔ کوفہ میں خانہ جنگی کی ابتداء 51ھ میں ہوئی۔ حجر بن عدی اور اصحاب حجر کو جب زیاد نے قتل کیا تو حضرت عائشہؓ نے اظہار ناراضگی کیا۔ اس سال یزید بن معاویہؓ نے لوگوں کے ساتھ حج کیا۔ 56ھ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے امامت حج کی۔ امیر معاویہؓ نے اپنے فرزند یزید کو ولی عہد کر کے اسلام میں ملوکیت کا آغاز کیا۔ مغیرہ بن شعبہ نے ضعیفی کی شکایت کرتے ہوئے استعفٰی دے دیا۔ لیکن امیر معاویہؓ نے انھیں امارت کوفہ پر واپس کرتے ہوئے حکم دیا کہ یزید کی بیعت کے لئے کچھ فکر کریں۔ امیر معاویہؓ نے زیاد سے بھی اس سلسلہ میں مشورہ مانگا' لیکن اس نے جلدی کرنے سے منع کیا۔ زیاد جب مر گیا تو امیر معاویہؓ نے ایک تحریر نکالی اور لوگوں کے سامنے پڑھی۔ اس میں یزید کے جانشین کرنے کا مضمون تھا۔ یہ سن کر پانچوں اشخاص کے سوا سب لوگ بیعت کرنے پر تیار ہو گئے۔ یعنی حسینؑ ابن علیؓ' ابن عمرؓ' ابن زبیرؓ' عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور ابن عباسؓ نے بیعت نہ کی۔ امیر معاویہؓ نے مدینہ میں آکر حسینؑ ابن علیؓ کو بلا بھیجا اور کہا "اے فرزند بد' اور قریش میں سے پانچ شخصوں کے سوا جن کے تم سر گروہ ہو' اور سب لوگ بیعت کرنے پر آمادہ ہیں۔ آخر مخالفت سے کیا مطلب؟" حضرت حسینؑ نے کہا" "اگر میں ان لوگوں کا سر گروہ ہوں تو ان لوگوں کو بلاؤ اگر وہ بیعت کر لیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ کو بلایا گیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ حضرت ابن ابی بکرؓ کے ساتھ امیر معاویہؓ کی تلخ کلامی ہوئی۔ (اس روایت میں ابن عباسؓ کا ذکر نہیں۔) سعید بن عثمانؓ نے امیر معاویہؓ سے حکومت خراسان طلب کی تو جواب ملا" "وہاں تو عبید اللہ بن زیاد ہے۔" "سعید نے کہا "سنو تمہیں میرے باپ نے اس قدر بلند کیا کہ تم اس حد تک پہنچ گئے لیکن تم نے ان احسانوں کا کچھ خیال نہ کیا اور مجھ پر اس کو یعنی یزید بن معاویہؓ کو مقدم کر دیا" لیکن امیر معاویہؓ نے سب باتوں کو تسلیم

کر کے کہا "میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تم سا شخص اور یزید کے معاملہ میں خرابی ڈالے۔
"لہذا امیر معاویہؓ نے سعید کو خراسان کے جنگ و جدل کا اور اسحاق بن طلحہ کو خراج کا حاکم مقرر کر
دیا۔

60ھ میں امیر معاویہؓ کو مرض الموت لاحق ہوا۔ انہوں نے یزید کو بلا کر کہا "بیٹا میں نے
تجھے زحمت و مشقت سفر سے بچالیا۔ تیرے لئے ہر امر کو سہل کر دیا۔ تیرے دشمنوں کو میں نے رام
کر دیا۔ تیرے لئے عرب کی گردنوں کو میں نے جھکا دیا۔ تیرے لئے میں نے جو کچھ جمع کیا ہے وہ کسی
نے نہ کیا ہوگا...... قریش میں سے چار شخصوں کے علاوہ کوئی تجھ سے نزاع نہ کرے گا۔ حسینؓ ابن علیؓ
عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہؓ بن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ کا تو عبادت نے کام تمام کر دیا
ہے...... حسینؓ ابن علیؓ کو عراق کے لوگ جب تک خروج پر آمادہ نہ کر لیں گے ہرگز نہ چھوڑیں
گے۔ اگر تجھ پر خروج کریں اور تو ان پر قابو پا جائے تو در گزر کرنا۔ ان کو قرابت قریبہ حاصل ہے اور
بہت بڑا حق رکھتے ہیں۔ پسر ابوبکرؓ اپنے اصحاب کو جو کرتے دیکھے گا ویسا ہی خود بھی کرے گا۔ ہاں جو
شخص شیر کی طرح تیری گھات میں بیٹھے گا...... وہ ابن زبیرؓ ہے۔ اگر ایسی حرکتیں وہ تیرے ساتھ
کرے اور تیرے قابو آ جائے تو اس کے ٹکڑے اڑا دینا" ایک اور روایت کے مطابق امیر معاویہؓ نے
حضرت امام حسینؓ کو معاف کر دینے کی وصیت کی تھی۔ بہر حال اس وصیت سے ہم یہ اندازہ کر سکتے
ہیں کہ امیر معاویہؓ کی حکومت کن بنیادوں پر قائم تھی اور یزید کو وہ کیا باتیں سکھلا کر گئے۔ امیر معاویہؓ
کو کھنکار میں خون آتا تھا۔ دو بیٹیاں انہیں کروٹ دلوا رہی تھیں کہ انہوں نے کہا "تم اس شخص کو الٹ
پلٹ رہی ہو جو دنیا کے الٹ پلٹ کرنے میں استاد تھا......" ان کی وفات کے موقع پر یزید موجود نہ تھا
اور تدفین کے بعد پہنچا۔ امیر معاویہؓ کا ایک قول ابن طبری نے نقل کیا ہے: "جو شخص اموی ہو کر
اپنے مال کا انتظام نہ کرے حکم اس میں نہ ہو وہ اپنے خاندان سے الگ ہے' اور جو شخص ہاشمی ہو کر سخی
جواد نہ ہو وہ بھی اپنے خاندان سے الگ ہے۔ ہاشمی کی طاقت و شجاعت چھپ نہیں سکتی"

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید نے لوگوں سے بیعت لی۔ اس نے عبیداللہ بن
زیاد کو بصرہ اور نعمان بن بشیر کو کوفہ میں حال رکھا۔ مدینہ کا امیر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان تھا اور مکہ کا
عمرو بن سعید بن العاص یزید کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ ان افراد سے بیعت لی جائے جن کا
ذکر امیر معاویہؓ نے اپنی وصیت میں کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ولید بن عتبہ کو لکھا کہ حسینؓ، عبداللہ بن عمرؓ
اور ابن زبیرؓ سے بیعت لینے میں تشدد کرو۔ ابن طبری نے لکھا ہے کہ ابن زبیرؓ اور حسینؓ مسجد میں بیٹھے
تھے کہ انہیں ولید بن عتبہ نے بلا بھیجا۔ حسینؓ نے ابن زبیرؓ سے کہا "میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کا

فرعون ہلاک ہو گیا ہے۔ ہم کو اس لئے بلا بھیجا ہے کہ اس خبر کے فاش ہونے سے پہلے ہی بیعت کے لیے ہم پر مواخذہ کرے...... میں اپنے جوانوں کو لے کر ولید کے پاس جاتا ہوں۔ دروازہ پر ان کو روک دوں گا اور خود اس کے پاس جاؤں گا" حسینؓ ملاقات کے لیے گئے تو مروان بن حکم بھی وہاں موجود تھا۔ بیعت کی بابت حسینؓ نے کہا: "میں پوشیدہ طور پر بیعت کرنے والا نہیں اور تم کو بھی ایسی کوشش نہیں کرنی چاہیے...... لوگوں کے مجمع میں آکر مجھ سے بیعت لینا......" اس موقع پر آپؓ کی مروان بن حکم سے تلخ کلامی بھی ہوئی۔ اس نے ولید بن عتبہ کو مشورہ دیا کہ حسینؓ کو شہید کر دیں، لیکن ولید نہ مانا اور کہا "تم مجھے ایسا مشورہ دیتے ہو جس میں میرے دین کی تباہی ہے"

پھر انہوں نے ابن زبیرؓ کو بلا بھیجا۔ لیکن انہوں نے مہلت مانگی اور رات ہی کو گھر سے نکل کر فرع کی طرف روانہ ہوئے۔ حسینؓ اگلی رات یعنی 28 رجب 60ھ کو مدینہ سے نکل گئے اور اپنے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں اور محمد بن حنیفہ کے سوا تمام اہل بیت کو ساتھ لیا۔ عبداللہ بن عمرؓ نے سب سے آخر میں بیعت کرنے کا وعدہ کیا۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

حضرت امام حسینؓ محمد بن حنیفہ کے مشورہ پر مکہ روانہ ہوئے۔ ابن زبیرؓ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ یزید نے ابن زبیرؓ کے متعلق قسم کھائی تھی کہ "ابن زبیرؓ جب تک زنجیروں میں جکڑا ہوا میرے سامنے نہ لایا جائے گا اس کی بیعت میں نہ قبول کروں گا۔" ذیعقد 60ھ میں عمرو بن سعید حاکم ہو کر مدینہ آیا۔ اور ابن زبیرؓ کو پکڑنے کے لیے مکہ پر فوج کشی کی لیکن اسے شکست ہوئی۔ میدان جنگ عبداللہ بن صفوان کے ہاتھ رہا۔ ابن خلدون کے مطابق جس وقت امام حسینؓ مدینہ سے مکہ کو آرہے تھے تو راستے میں عبداللہ بن مطیع نے آپ کو نصیحت کی: "آپ ہرگز کوفہ کا قصد نہ کیجئے گا۔ ان لوگوں ہی نے آپ کے والد کو شہید کیا...... یہ لوگ بڑے پیمان شکن ہیں...... بیت اللہ سے باہر بھول کر بھی قدم نہ نکالیے گا...... آپ عرب کے سردار ہیں جن کو آپ کی ہواخواہی منظور ہو گی وہ یہیں آئیں گے"

جب کوفیوں کو بیعت یزید اور حسینؓ ابن علیؓ کے مکہ چلے جانے کا حال معلوم ہوا تو کچھ لوگ سلیمان بن صرد کے مکان پر جمع ہوئے اور چند لوگوں (سلیمان، مسیب، محمد، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہرہ وغیرہ) کی طرف سے امام حسینؓ کو خط لکھا: "...... اللہ نے آپ کے دشمن جبار و سرکش کو مرگ خواب میں سلا دیا جس نے امت پر جبراً حکومت ٹھائی...... اب ہم پر کوئی امام نہیں، آپ آئیے۔ شاید آپ کے ذریعہ سے اللہ ہم کو حق پر جمع کر دے۔ ہم گورنر کوفہ نعمان بن بشیر کے ساتھ نماز جمعہ و نماز عید میں شریک نہیں ہوتے۔ آپ تشریف لائیں گے تو ہم اس کو ایسا نکال دیں

کہ وہ شام ہی میں جا کر دم لے" امام حسینؓ نے خط پڑھ کر اپنے ابن عم مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا تاکہ صورتحال کی حقیقت معلوم کر سکیں۔ مسلم بن عقیلؓ پہنچے تو 12 ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ یزیدیوں نے نعمان بن بسیر کو اقدام کرنے کا کہا تو اس نے جواب دیا' جب تک کوئی مجھ سے نہیں لڑے گا میں بھی نہیں لڑوں گا" ایک یزیدی نے یہ تقریر یزید کو لکھ بھیجی جس پر نعمان کو معزول کر کے ابن زیاد کو گورنر کوفہ بنا دیا گیا۔ لوگوں نے قصر ابن زیاد کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمؓ اپنے چار ہزار ساتھیوں کے ساتھ جمع تھے۔ ادھر عبیداللہ نے رؤسا کو اپنے قصر میں بلایا۔ مسلمؓ جب قصر کے دروازے پر پہنچے تو تمام رؤسا قصر پر چڑھ کر اپنے اپنے برادری والوں کے سامنے آئے اور انہیں سمجھا سمجھا کر واپس کرنے لگے۔ لوگ مسلمؓ کے پاس سے کھسکنا شروع ہو گئے۔ شام تک پانچ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں وہ بھی چلے گئے۔ مسلمؓ کو گرفتار کر کے سولی دیدی گئی۔ ابن زیاد نے مسلمؓ اور ہانی کے سروں کے ساتھ یزید کو خبر بھیجی۔ یزید نے جواب میں لکھا: "جو میں چاہتا تھا وہی تو نے کیا...... مجھے خبر ملی ہے کہ حسینؓ عراق کی طرف آ رہے ہیں۔ نگران مقرر کر مورچے تیار رکھ......"

حضرت امام حسینؓ 8 ذوالحجہ 60ھ کو مکہ سے نکلے۔ اسی دن مسلمؓ نے حملہ کیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز مخزومی کا بیان ہے کہ جب اہل عراق کے خط حسینؓ کے پاس آئے اور وہ روانہ ہونے لگے تو میں نے انہیں باز رکھنا چاہا۔ لیکن حسینؓ بولے "جو مقدر میں ہے ہو کر رہے گا۔" عبداللہ بن عباس بھی حسینؓ کے پاس آئے اور اہل کوفہ کی بد عہدی کا ذکر کیا۔ امام حسینؓ یقین کامل کے ساتھ پھر گویا ہوئے: "میں خدا سے خیر کا طالب ہوں اور دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے" عبداللہ بن زبیرؓ نے آپ کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا۔ حضرت امام حسینؓ ان کی بات کا مقصد سمجھتے تھے اس لئے ان کے جانے کے بعد فرمایا "اس شخص کو دنیا کی کسی شے کی اتنی آرزو نہیں جتنی میرے عراق جانے کی ہے...... کیونکہ یہ جانتا ہے میرے ہوتے اسے ریاست نہیں مل سکتی......" ابن عباسؓ نے یہ کہا کہ "آپ یمن چلے جائیں' یا اگر کوفہ ہی جانا ہے تو عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نہ جاؤ" ابن طبری نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے امام حسینؓ اور ابن زبیرؓ کو باتیں کرتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد امام حسینؓ لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: "یہ کہتے ہیں آپ مسجد الحرام میں رہیں۔ میں آپ کی نصرت کے لئے لوگوں کو جمع کروں گا...... اگر میں ایک بالشت بھر اس مسجد کے باہر قتل ہو جاؤں تو واللہ میں اسے اس بات سے بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک بالشت بھر مسجد کے اندر قتل ہوں...... خدا اگر میں حشرات کے کسی سوراخ میں بھی چھپوں گا تو یہ لوگ مجھے وہاں سے بھی نکال لیں گے...... اور واللہ مجھ پر ایسا ظلم کریں گے جیسا

یہود نے روز سبت کیا تھا"

عراق جاتے ہوئے راستے میں صفاع کے مقام پر فرزوق بن غالب شاعر سے آپ نے حالات پوچھے تو وہ کہنے لگا: "لوگوں کے دل آپ کی طرف مائل ہیں اور تلواریں ان کی بنو امیہ کی اعانت کے لیے ہیں..... "حسینؓ نے اونٹ آگے بڑھا دیا۔ علی بن الحسینؓ کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ مکہ سے نکلے تو عبداللہ بن جعفر نے اپنے بیٹوں عون و محمد کے ہاتھ خط بھیجا کہ "میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں میرا خط دیکھتے ہی واپس چلے جائیں..... اگر آپ ہلاک ہوئے تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے گا..... اسی خط کے پیچھے میں بھی آتا ہوں" عبداللہ بن جعفر اور یحیی نے آپ کو جانے سے روکنا چاہا۔ لیکن امام حسینؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ جو انہوں نے حکم دیا ہے اسے میں جالاؤں گا" جب اپ ثعلبہ میں وارد ہوئے تو مسلم بن عقیل کے شہید ہونے کی خبر آئی۔ بنو عقیل نے انتقام لینے کا اعادہ کیا۔ جب لوائل لشکر ابن زیاد کے سوار آپ کو ملنے تو آپ کربلا کی طرف مڑ پڑے۔ راہ میں جہاں جہاں سے آپ پانی لیتے لوگ آپ کے ساتھ ہو لیتے۔ زہالہ میں آپ کو اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن بقطر کے قتل کی خبر ملی۔ ان کو آپ نے رستہ ہی سے مسلمؓ کے پاس بھیجا تھا۔ یہ خبر سن کر امام حسین نے ہمراہیوں سے کہا: "مسلم، ہانی اور عبداللہ قتل کئے گئے۔ ہمارے ساتھیوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ تم میں سے جو کوئی جانا چاہے چلا جائے۔ میں نے تم سے اپنا ذمہ اٹھالیا" یہ سنتے ہی کوئی دائیں کو چلا اور کوئی بائیں کو۔ حتی کہ صرف مدینہ سے ساتھ چلنے والے ہی باقی رہ گئے۔ امام حسینؓ جانتے تھے کہ یہ لوگ اس امید میں ساتھ ہیں کہ وہ کسی ایسے شہر میں جارہے ہیں جہاں سب لوگ اطاعت پر آمادہ ہوں۔ لہذا انہیں دھوکے میں رکھنا آپ کو مناسب معلوم نہ ہوا۔

حضرت امام حسینؓ نے منزل شراف میں مقام کیا۔ صبح کے وقت خادموں کو حکم دیا کہ پانی بھر لیں۔ دوپہر تک چلتے رہے۔ سامنے سے مقدمہ لشکر کا رسالہ دکھائی دیا۔ لہذا امام عالی مقام نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنے کا سوچا جسے پس پشت رکھ کر مخالفین کا سامنا ایک ہی رخ سے کیا جائے بنی اسد کے دو اشخاص نے ذو حسم جانے کا مشورہ دیا۔ آپ بائیں طرف مڑے ہی تھی کہ رسالے کے سوار بھی آن پہنچے۔ ان کی برچھیوں کے پھل شہد کی مکھیوں کے غول معلوم ہوتے تھے۔ سواروں سے پہلے ہی ذو حسم پہنچ کر آپ نے خیمے نصب کر لیے۔ حر بن یزید تمیمی ایک ہزار سواروں کا رسالہ لئے آپ کے مقابل آکر ٹھہرا۔ آپ نے تمام افراد اور گھوڑوں کو بھی پانی پلانے کی ہدایت کی۔ ظہر کی اذان کے بعد آپ خیمے سے نکل کر سواروں کی طرف آئے اور فرمایا: "میں تمہارے پاس از خود نہیں آیا"

بلکہ تمہارے خطوط اور پیغام ملنے کے بعد روانہ ہوا...... اب اگر تم لوگ اپنا اقرار پورا کرو تو میں تمہارے شہر چلوں اور اگر تمہارے شہر میں داخل ہونے سے تم کو نفرت ہو تو اجازت دو کہ جس شہر سے آیا ہوں وہیں واپس جاؤں۔" کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ موذن نے تکبیر کہی' حر نے اپنے ہمراہیوں سمیت آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ عصر کے وقت آپ نے سب کو روانگی کا حکم دیا۔ نماز کے بعد سب کی طرف رخ کر کے آپ نے مخالف لشکر سے فرمایا: "اگر تم کو ہم سے کراہت ہے اور ہمارے حق سے تم واقف نہیں ہو......اور جو کچھ مجھ سے کہلا بھیجا ہے اب وہ تمہاری رائے نہیں تو میں تمہارے پاس سے واپس چلا جاؤں" حر نے جواب دیا کہ ہمیں خطوط کا علم نہیں۔ یہ سن کر آپ نے خطوط سے بھرے ہوئے دو تھیلے منگوائے اور خط ان کے سامنے بکھیر دیئے۔ حر نے کہا ہم ان خطوط کو لکھنے والوں میں سے نہیں۔ ہمیں تو حکم ہوا ہے کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس ہر صورت میں لے چلیں۔

امام حسینؑ نے انصار سے کہا اٹھو سوار ہو۔ مستورات بھی سوار ہو گئیں۔ حر کے رسالے نے آپ کی راہ روک لی۔ اس پر حسینؑ نے لوگوں سے کہا: "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص ظالم بادشاہ کو دیکھے اور بادشاہ عہد کو توڑتا ہو' سنت رسولؐ کے خلاف عمل کرتا ہو' جو بندگان خدا کے ساتھ ظلم و سرکشی سے پیش آتا ہو اور پھر قولاً یا فعلاً اس پر یہ اعتراض نہ کرے تو خدا اس کو بھی اسی کے اعمال میں شریک کرے گا...... مومن کو اب چاہئے کہ حق پر رہ کر خدا سے ملاقات کرے...... مرجانا شہادت ہے اور ظالموں میں زندگی بسر کرنا ناگوار امر" حر نے یہ بات سنی تو آپ کے پاس سے سرک گیا۔ اب حر اپنے اصحاب کے ساتھ ایک طرف چل رہا تھا اور حسینؑ دوسری طرف۔ عذیب الہجانات پہنچے تو طرماح بن عدی اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ کوفہ سے آپ کے پاس آیا۔ حر ابن زیاد کے نئے احکامات کا منتظر تھا۔

امام حسینؑ قصر بنی مقاتل سے پانی بھر کر روانہ ہوئے۔ ایک ساعت بھر چلے تھے کہ ذرا اونگھ آگئی۔ اس دوران آپ کو شہادت کی بشارت ملی۔ اگلی صبح آپ نے نینوا میں قیام کیا۔ کوفہ سے ایک قاصد ابن زیاد کا پیغام بھی لے کر آگیا کہ ان لوگوں کو بہت زیادہ تنگ کیا جائے۔ ابن زیاد نے قاصد کو بھی حکم دیا تھا کہ صورتحال اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے۔ چنانچہ اب حر سختی پر اتر آیا اور سب لوگوں کو اپنی جگہ اترنے کے لئے مجبور کیا جہاں پانی تھا اور نہ بستی۔ زہیر بن قین نے جنگ شروع کرنے کی رائے دی لیکن امام حسینؑ پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

کچھ آگے چل کر آپ نے پوچھا یہ کونسا قریہ ہے۔ کسی نے بتایا اس کا نام عقر (زخم) ہے۔

آپ نے کہا خداوند عقر سے مجھ کو بچانا' اور وہیں اتر پڑے۔ یہ محرم 61ہجری کی دوسری تاریخ تھی۔ اگلی صبح کو عمرو بن سعد چار ہزار کی سپاہ لئے ہوئے کوفہ سے آگیا اور عزرہ بن قیس احمسی کو حکم دیا کہ امام حسینؓ کے پاس جا کر ان کے آنے کا مقصد پوچھے۔ عزرہ خود بھی امام حسینؓ کو خط لکھنے والوں میں سے ایک تھا' لہذا اسے ایسا کرنے میں شرم محسوس ہوئی۔ ابن سعد کے لشکر کے باقی رئیسوں نے بھی (جنہوں نے آپؓ کو خطوط لکھے تھے) یہ پیام لیجانے کو کہا لیکن سب نے انکار کر دیا۔ آخر کثیر بن عبداللہ شعبی اور قرۃ بن قیس نے سفارت کی۔ امام حسینؓ اپنے موقف پر قائم رہے کہ میں اہل کوفہ کی درخواست پر آیا ہوں' اب اگر ان کی رائے بدل گئی ہے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ابن سعد نے صورتحال ابن زیاد کو لکھ بھیجی۔ ابن زیاد نے جواب میں ہدایت کی کہ حسینؓ سے یزید کے حق میں بیعت لی جائے۔ ابن سعد چاہتا تھا کہ اسے ملک رے کی حکومت بھی مل جائے اور آل نبیؐ کے ساتھ کشت و خون بھی نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ وہ ابن زیاد کی ہدایت پر نہر اور امام حسینؓ کے درمیان حائل ہو گیا۔ پانچ سو سواروں کو نہر پر متعین کر دیا گیا تاکہ حسینؓ و اصحاب حسینؓ ایک بوند پانی بھی نہ حاصل کر سکیں۔

ایک واقعہ کے مطابق جب انصار حسینؓ پیاس سے نڈھال تھے تو عبداللہ بن ابی حصین ازدی نے پکارا "حسین" ذرا پانی کی طرف دیکھو۔ اس کا آسمانی رنگ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سن کر امام حسینؓ نے فرمایا: "واللہ تم پیاسے مر جاؤ گے اور ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوگا" حمید بن مسلم کا بیان ہے کہ عبداللہ بن ابی حصین اپنے مرض الموت میں پانی پانی پکارے جاتا تھا' لیکن ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتا تھا۔ وہ پیاس پیاس کہتے ہوئے مر گیا۔

لوگ شدت پیاس سے بے حال ہونے لگے تو حسینؓ نے اپنے بھائی عباسؓ کو پانی لانے کے لئے روانہ کیا۔ ان کے ہمراہ بیس آدمی مشکیزے لئے ہوئے اور بیس سوار حفاظت کی غرض سے تھے۔ عباسؓ پانی لے کر آرہے تھے کہ دشمنوں نے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد امام حسینؓ نے عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کی معرفت عمرو بن سعد کے پاس کہلا بھیجا کہ آج شب کو دونوں لشکروں کے درمیان مجھ سے ملنا۔ ملاقات کے بعد ابن سعد نے ابن زیاد کو لکھا: "حسینؓ نے تین شرائط پیش کی ہیں: (1) جہاں سے وہ آئے ہیں وہیں واپس کر دیئے جائیں (2) جس سرحد کی طرف ہم چاہیں ان کو بھیج دیں اور (3) ہم ان کو یزید کے پاس لے جائیں تاکہ ان سے معاملہ کر سکیں" شمر بن ذی الجوشن نے اس موقع پر ابن زیاد کو مشورہ دیا کہ حسینؓ سے ہرگز کوئی رعایت نہ کی جائے کیونکہ اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو وہ بہت شان و شوکت کے ساتھ ابھریں گے۔

شمر ابن زیاد کا ایک خط لے کر ابن سعد کے پاس پہنچا کہ "حسینؓ اور انصار سے زبردستی

بیعت لی جائے اگر وہ نہ مانیں تو قتال کرو" شمر کی پھوپھی ام البنین بنت حزام علیؓ بن ابو طالب کی بیوی تھیں۔ ان کے بطن سے عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان پیدا ہوئے تھے۔ عبداللہ بن ابی محل بن حزام نے کہا خدا امیر کا بھلا کرے، ہماری بہن کے بیٹے حسینؑ کے ساتھ ہیں، تو ان کے لئے امان لکھ دے۔ ابن زیاد نے یہ بات مان لی۔ عبداللہ کے غلام کرمان نے بھانجوں کو اس کا پیغام سنایا تو انہوں نے جواب دیا: "ہمارے ماموں کو سلام کہنا اور کہہ دینا تم لوگوں کی امان ہمیں نہیں چاہئے۔ پسر سمیہ کی امان سے خدا کی امان بہتر ہے۔" صورتحال دیکھ کر ابن سعد نے شمر سے کہا: "واللہ، حسینؑ گردن جھکانے والے شخص نہیں۔ ان کے پہلو میں وہ دل ہے جو برداشت نہیں کر سکتا"

نویں محرم کو شام کے وقت ابن سعد لشکر لے کر چلا۔ شمر آکر انصار حسینؑ کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا ہم لوگوں کی بہن کے بیٹے کہاں ہیں۔ عباس و جعفر و عثمان بن علیؓ اس کے پاس آئے اور کہا تجھے کیا کام ہے۔ شمر بولا "میری بہن کے فرزندو تمہیں امان ہے" ان نوجوانوں نے جواب دیا: "تجھ پر خدا کی لعنت تو جو ہمارا ماموں ہے۔ تو ہم کو امان دیتا ہے اور رسول اللہؐ کے فرزند کو امان نہیں" ابن سعد نے اب ندا کی: "اے فوج کے سوارو گھوڑوں پر چڑھو اور خوش ہو"

ابن طبری کے مطابق نماز عصر کے بعد ابن سعد نے چڑھائی کی۔ اس وقت حسینؑ اپنے خیمہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں گھٹنے بلند تھے اور تلوار پر ٹیکے ہوئے۔ آپ نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ آپ کی بہن زینبؓ نے شور کی آواز سنی تو بھائی کے پاس آئیں۔ کہا بھائی آپ نے سنا لوگوں کی آوازیں قریب آ رہی ہیں۔ حسینؑ نے زانو سے سر اٹھایا اور کہا "میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے فرماتے ہیں تم ہمارے پاس آ جاؤ گے۔

عباس بن علیؓ گھوڑے پہ سوار ہو کر مخالفین سے بات کرنے گئے۔ ابن سعد نے اپنے امیر کا حکم سنایا کہ "تمہارے سروں کو جھکا دوں ورنہ ہم تم سے لڑیں گے" عباسؓ نے آکر حسینؑ کو بتایا تو انہوں نے کہا "ابن سعد سے جا کر کہہ دو کہ ہم کو شب بھر کی مہلت دے تاکہ ہم استغفار و دعا کر لیں، اپنے رب کی نمازیں پڑھ لیں اور تلاوت کر لیں۔ صبح کو وہ ہو گا جو ہونے والا ہے" یہ بات مان لی گئی۔ اس کے بعد حسینؑ نے اپنے تمام اصحاب کو جمع کیا اور فرمایا...... "سنو میں سمجھ چکا ہوں کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں صبح کو ہماری قضا ہے۔ سنو تم سب کے باب میں میری یہ رائے ہو چکی ہے میری اجازت سے تم سب چلے جاؤ۔ میری طرف سے کوئی روک تم پر نہیں۔ دیکھو رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہے اسے غنیمت سمجھو...... شامی میرے خون کے پیاسے ہیں، اگر مجھے پا جائیں گے تو دوسروں کی جستجو نہ کریں گے۔" آپ کے بھائی اور لڑکوں اور بھتیجوں اور عبداللہ بن جعفر کے لڑکوں نے آپ کے ساتھ

جینے مرنے کی قسم کھائی۔ حضرت زینبؓ یہ سب ضبط نہ کر سکیں اور گھبرا کر یہ کہتی ہوئی دوڑیں:
"میرے باپ علیؓ جدا ہو گئے' میری ماں فاطمہؓ مر گئیں' میرا بھائی حسنؓ جاتا رہا۔ اے خلیفہ ماضی اے سرپرست باقی" حسینؓ نے یہ آہ و بکا سنی تو انہیں دلاسہ دیا اور فرمایا: "بہن سوائے اللہ تعالیٰ کے کل شئے فنا ہونے والی ہے...... ہمیں رسول اللہؐ کی پیروی کرنی ہے۔ وہ بھی اس دنیا سے اٹھ گئے تو ہم کس شمار و حساب میں ہیں...... اے میری بہن میں تم کو قسم دلاتا ہوں کہ کل اگر میں مارا جاؤں تو جامہ دری نہ کرنا' رونا پیٹنا نہیں بین نہ کرنا' نوحہ نہ پڑھنا...... 'یہی دن سب کو پیش آنے والا ہے۔ تم صبر کرنا......"

حسینؓ نے ہمراہیوں کو بلا کر ہدایت کی کہ خیموں کو ایک دوسرے کے قریب کر دو' رسیاں ایک دوسرے سے ملا دو اور ان کے دائیں بائیں خندق کھود کر آگ روشن کر دو۔ کل صبح جب لوگ حملہ آور ہوں تو خیموں کے روبرو ہو کر لڑنا۔ اسی اثنا میں رات ہو گئی۔ تمام شب آپ اور آپ کے ہمراہی نماز و استغفار پڑھتے رہے۔ نماز فجر آپ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ادا کی۔ یہ 10 محرم 61ھ کا دن تھا۔ ایک روایت ہے کہ صبح کے وقت دشمنوں کا رسالہ جب امام حسینؓ کی طرف بڑھا تو آپ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی۔ "......اے خدا میں نے تجھ پر بھروسہ کیا' تجھ سے اپنا درد دل کہا...... تو نے آفتوں کو ٹال دیا۔ تو ہر نعمت کا بخشنے والا ہر نیکی کا عطا کرنے والا ہے......" بہنوں کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے عباسؓ کو بھیجا کہ انہیں چپ کرائیں: "انہیں تو ابھی بہت رونا ہے" اہل حرم کے رونے کی آواز موقوف ہو گئی تو آپ نے تاریخی خطبہ دیا"...... تم میرے نسب پر غور کرو اور دیکھو کہ میں کون ہوں' پھر اپنی طبیعتوں کی طرف رجوع کرو اور اس کو جھڑکو اور غور کرو' کیا میرا قتل کرنا اور میری آبروریزی تمہیں روا اور جائز ہے۔ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں۔ کیا سید الشہدا حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا جعفر الشہید جو جنت میں اڑ رہے ہیں میرے چچا نہیں؟ کیا تم کو یہ خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہؐ نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرمایا ہے کہ تم دونوں سردار جوانان جنت ہو اور اہل ایمان کی آنکھ کی ٹھنڈک ہو؟...... اگر تم مجھے جھوٹا جانتے ہو تو اپنے درمیان موجود لوگوں سے ہی تصدیق کرو...... اگر تم میری بات پر یقین کرتے ہو تو بتاؤ کیا میں نے تم میں سے کسی کو مار ڈالا ہے جس کا عوض تم مجھ سے طلب کرتے ہو' یا کسی مال کو میں نے دبا لیا ہے جس کا معاوضہ یا قصاص مانگتے ہو" یزید کے لشکریوں میں سے کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ آپ نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ دشمن حملہ آور ہوئے تو زہیر بن قین نکل کر آئے اور اہل کوفہ کو عذاب الٰہی سے ڈرایا: "بندگان خدا' فاطمہؓ کی اولاد سمیہ کے بیٹے سے زیادہ نصرت و مودت کا حق رکھتی ہے۔ اگر تم ان کی نصرت نہیں کرتے تو

خدا کے واسطے ان کے قتل سے تو باز آؤ" شمر ذی الجوشن نے ایک تیر زہیر کو مارا اور کہا "خاموش' خدا تیری بک بک کو خاموش کر دے۔ تو نے ہم لوگوں کا دماغ پریشان کر دیا ہے" زہیر بولے' واللہ' حسینؑ کے ساتھ مر جانا تم لوگوں کے ساتھ زندگانی جاوید سے میں بہتر سمجھتا ہوں۔"

حر بن یزید کو ابھی تک یقین نہ تھا کہ ابن سعد لشکر حسینؑ سے قتال کرے گا۔ جب ابن سعد حملہ کرنے کو بڑھنے لگا تو حر گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے لشکر سے نکل گیا اور حسینؑ کی جانب بڑھا۔ اس نے حسینؑ سے اپنے سابقہ رویہ کی معافی مانگی۔ آپ نے کہا تو حر (آزاد) ہے۔ پھر حر نے اپنے قبیلہ والوں کو کشت و خون سے منع رکھنے کی کوشش کی۔ یہ سن کر پیادوں کی فوج نے حر پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ پہلا تیر ابن سعد نے چلایا اور بولا' لوگو گواہ رہنا' سب سے پہلے میں نے ہی تیر مارا۔ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ لشکر شام سے زیاد کا غلام یسار اور عبید اللہ کا غلام سالم نکل کر میدان میں آئے جن کو عبداللہ بن عمیر نے مقابلہ کر کے قتل کیا۔ بنی تمیم کے عبداللہ بن حوزہ نے آکر حسینؑ سے بد تمیزی کی۔ آپؑ نے اسے بد دعا دی۔ اس کا گھوڑا لید کا اور وہ اس طرح گرا کہ پاؤں تو رکاب میں رہ گیا سر زمین پر آرہا۔ گھوڑا بھاگتا رہا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ علی بن قرظہ' یزید بن سفیان' مزاحم بن حریث مقابلوں میں انجام تک پہنچے۔ حسینیؑ لشکر کے پہلے زخمی مسلم بن عوسجہ اسدی تھے جو عمرو بن حجاج کے حملہ میں زخمی ہوئے۔ انصار حسینؑ نے شدت و قوت کے ساتھ جنگ کی۔ ادھر کل 32 سوار تھے۔ دوپہر ہونے کو آئی اور کوفیوں کو ایک رخ کے سوا کسی دوسری طرف سے انصار حسینؑ پر حملہ کرنا ممکن نہ ہوا۔ چنانچہ سعد نے دائیں اور بائیں طرف کے خیموں میں آگ لگانے کا حکم دیا۔ آپؑ کا خیمہ شمر نے خود جلانا چاہا۔ بیبیاں چلاتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ جیب کی لعنت ملامت پر شمر واپس ہو گیا۔ مزید لڑائی میں حبیب بن مظاہر اور حر شجاعت دکھاتے ہوئے شہید ہوئے۔

سب نے ظہر کے وقت نماز ادا کی۔ پھر بہت شدت سے کشت و خون ہونے لگا۔ دشمن امام حسینؑ تک پہنچ گئے۔ حنفی نے خود کو سامنے لا کر تیر کھائے اور شہید ہوئے۔ زہیر بن قین اور نافع بن ہلال بھی مارے گئے۔ اب شمر رجز پڑھتا ہوا انصار حسینؑ کی طرف بڑھا' انصار قاتلوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر گھبرائے اور اس بات پر ملول ہوئے کہ وہ آپ کو بچا نہیں پائیں گے۔ آپ کا دفاع کرنے میں حنظلہ بن اسعد' سیف و مالک عابس بن ابی شبیب' یزید بن زیاد' عمر بن خالد' سعد اور جابر بن حارث' علی اکبرؑ بن حسین' عونؑ و محمدؑ' عبدالرحمن و جعفر بن عقیل اور قاسم بن حسنؑ شہید ہوئے۔ عبداللہ بن حسینؑ' عبداللہ و جعفر و عثمان بن علیؑ بھی کام آئے۔ پیاس کی شدت ہوئی تو امام حسینؑ پانی کی طرف آئے۔ حصین بن تمیم نے آپ کو تیر مارا جو دہانہ پر آکر لگا۔ آپ خون کو منہ سے لے کر آسمان کی طرف

پھینکتے جاتے تھے۔ اس کے بعد خدا کا شکر بجالائے اور حمد و ثنا کی۔
پھر شمر نے پیادوں کو لے کر آپؑ کو گھیر لیا۔ آپ حملہ کرتے تو وہ پیچھے بھاگ جاتے۔ انصار میں سے تین چار افراد باقی رہ گئے تھے۔ شمر نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ حسینؑ پر حملہ آور ہوں۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے لپک کر آپ کے بائیں بازو پر پھر کندھے پر تلوار چلائی۔ صدمہ زخم سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ سنان بن انس نخعی نے پہنچ کر نیزہ مارا۔ آپ زمین پر گر پڑے۔ سنان نے آپ کا سر مبارک کاٹ کر غلام خولی کو دیا۔ راہ حق میں ذبح ہونے سے پہلے بہت سی تلواریں بھی آپ پر پڑ چکی تھیں۔ سر جدا کرنے سے پہلے سنان بن انس کی یہ حالت تھی کہ جسے حسینؑ کے قریب آتے دیکھتا اس پر حملہ کر بیٹھتا کہ کہیں وہی سر نہ لے جائے۔ آپ جو لباس پہنے ہوئے تھے وہ بھی لٹ گیا۔ بحر بن کعب نے پاجامہ لیا۔ قیس بن اشعث نے چادر اتار لی' جب سے اس کا نام "چادر والا" پڑ گیا۔ اسود نے نعلین اتار لیں بنی نھشل کے ایک شخص نے تلوار نکال لی۔ پھر یہ لوگ ورس (زعفران) اور پوشاک اور اونٹوں کی طرف جھکے اور یہ سب چیزیں لوٹ لیں۔ اس کے بعد اہل حرم اور مال و متاع کے لوٹنے کو گئے۔ یہ حال تھا کہ ایک بی بی کے سر سے چادر کوئی اتارتا تھا تو دوسرا اس سے چھین کر لے جاتا۔

معرکہ کربلا کے 72ویں شہید سوید بن عمرو تھے۔ سنان بن انس دیوانگی کے عالم میں شعر پڑھتا جاتا تھا کہ جو شخص ماں باپ کی طرف سے بہترین خلق ہے اور نسب میں سب سے بہتر ہے میں نے اسے قتل کیا۔ ابن سعد نے اسے بلوا کر کہا' او دیوانے!...... اگر ابن زیاد یہ کلمہ سنتا تو تیری گردن مارتا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ کا سر مبارک نیزہ پہ رکھ کر کوفہ کی تمام گلی کوچوں میں تشہیر کرا کے اگلے دن مع ان کے ہمراہیوں کے سروں کے شام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عورتیں اونٹوں پر بغیر محمل سوار کرائی گئیں اور امام زین العابدین کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں طوق و سلاسل ڈالے گئے۔ اگلے دن یزید کے روبرو شہدائے کربلا کے سر پیش کئے گئے۔ یزید نے قتل حسینؑ سے اپنی برات کا اظہار کیا اور سارا گناہ مرجانہ کے لڑکے عبیداللہ بن زیاد پر ڈال دیا۔ لیکن ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا کہ اس نے ابن زیاد کو برا بھلا کہا ہو' اس کو سزا دی ہو یا معزول کر دیا ہو۔ اسی طرح اس سے پہلے امیر معاویہؓ نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اور اس کی ذمہ داری زیاد پر ڈال کر کہہ دیا کہ سمیہ کے لڑکے نے مجھ سے یہ سب کچھ کروا لیا۔

طہٰ حسین نے اپنی کتاب "حضرت علیؓ" میں لکھا ہے کہ بنو امیہ عام مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور عداوت کے جذبات رکھتے تھے' کیونکہ معرکہ بدر میں ان کے آدمی قتل ہوئے تھے۔

ان جماعتوں میں صرف اس لئے اختلاف نہ تھا کہ دین کی باتوں میں ایک دوسرے سے دور تھے بلکہ انتقامی جذبات اور باہمی دشمنی بھی اختلافات کی بنیاد تھی۔ بنو امیہ' شیعہ اور خارجی تینوں ایک دوسرے سے قصاص اور انتقام کے خواہاں تھے۔ خاندانی عصبیت فتنے کا ایک عنصر بن چکی تھی جس نے مسلمانوں کو بہت سی خرابیوں کی طرف دھکیل دیا' جس کا سلسلہ نہ قتل حسینؓ سے منقطع ہوا نہ مرگ یزید سے رکا' بلکہ برابر جاری ہے۔ قرابت کی طرف جھک پڑنے اور دین کو دور رکھنے کے مجرم صرف اہل عراق نہیں بلکہ یہ مصیبت عام ہوئی اور اس میں عراقیوں کے ساتھ شامی مصری' حجازی سبھی شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حسینؓ نے یزید کے خلاف بغاوت کی اور یزید نے محض اپنے اقتدار کی حفاظت کی۔ یہ بات اس صورت میں صحیح ہوتی اگر حسینؓ جنگ پر اصرار کرتے اور کسی قسم کی گفت و شنید اور واپسی پر تیار نہ ہوتے۔ ابن زیاد نے تو فتنے کی آگ کو ہوا دی۔ حضرت امام حسینؓ اور ان کے انصار کے ساتھ ابن زیاد کا سلوک بدترین گمراہی کا عمل تھا جس سے مسلمان آشنا نہ تھے۔ پھر ان کاموں پر ابن زیاد یزید سے کوئی سزا یا سرزنش نہ پا سکا بلکہ اس کا محبوب اور مقرب بن گیا۔

بیٹوں کے بارے میں حضرت علیؓ کی آزمائش کا سلسلہ اس سانحہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی آزمائش آج سے قبل کسی مسلمان سے نہ لی گئی۔ اس میں آپؓ کے لڑکوں حسینؓ' عباسؓ' جعفرؓ' عبداللہ' عثمانؓ' محمدؓ اور ابوبکرؓ کو قتل کر دیا گیا۔ آپؓ کے یہ ساتوں بیٹے ایک ہی دن میں ایک ساتھ مارے گئے۔ حسینؓ کے دو بیٹے علیؓ اور بھائی عبداللہ قتل ہوئے۔ حضرت حسنؓ کے لڑکے عبداللہ' ابوبکر اور قاسم سمیت حضرت فاطمہؓ کے پانچ پوتے قتل کئے گئے۔ حضرت فاطمہؓ کے بیٹوں کے لیے یہ مصیبت کیسی دل دوز تھی اور خود اسلام کے لیے کتنا بڑا سانحہ تھا جس میں خیر خواہی' رواداری اور خون کی حفاظت کے تمام اصول توڑے گئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور رسول اللہؐ کی وفات کو ابھی 50 سال نہیں گذرے تھے۔ سانحہ کربلا جیسی مذموم حرکت کے نتائج جلد ہی سامنے آنے لگے۔ ابن زبیرؓ لوگوں کو یزید کے خلاف بھڑکانے لگے یزید حاکم کو مدینہ سے نکال کر اپنی طرف سے عبداللہ بن حنظلہ غسل کو حکم مقرر کیا۔ بنی امیہ کا محاصرہ بھی کر لیا گیا۔ یزید نے نعمان بن بشیر انصاری کو صلح صفائی کے لیے بھیجا لیکن ناکامی ہوئی۔ 64 ہجری میں 12 ہزار شامیوں پر مشتمل فوج مسلم بن عقبہ کی قیادت میں مدینہ پہنچی۔ مسلم نے مدینہ پر غلبہ پایا اور تین دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ لوگوں کی عزت و آبرو برباد کی گئی۔ جو لوگ باقی رہ گئے ان سے کتاب و سنت کی بجائے اس بات پر بیعت لی کہ وہ سب یزید کے غلام اور حاشیہ بردار ہیں۔ اس کے بعد یہ فوج مکہ گئی' ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا۔

مسلم تو راستہ میں ہی مر گیا۔ اس کی جگہ حصین بن نمیر سالار مقرر ہوا۔ شامیوں نے مکہ کے محاصرے میں شدت کی۔ اہل شام بقیہ نصف ماہ محرم اور کل ماہ صفر تک ابن زبیرؓ سے جدال و قتال کرتے رہے۔ حتی کہ تین ربیع الاول 64 ہجری کو ان لوگوں نے خانہ کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے اور آگ لگا دی۔ خانہ کعبہ کے جلنے کا واقعہ یزید کے مرنے سے 29 دن پیشتر ہوا۔ لوگ گرد اگرد آگ سلگایا کرتے تھے۔ ہوا چلی اور ایک چنگاری اڑ کر غلاف کعبہ پر جا پڑی۔ یزید کے مرنے کی خبر ملنے پر سب اہل شام واپس ہو گئے اور ابن زبیرؓ محفوظ رہے۔

ابن زبیرؓ کا مکہ میں محاصرہ کیے رہنا' تا آنکہ وہ اطاعت قبول کر لیں' یزید اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی تھا' لیکن یزید کی فوج بضد تھی کہ وہ مکہ کی حرمت بھی خاک میں ملا دے۔ اس طرح یزید نے قتل حسینؓ کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں اور بالخصوص حجاز والوں کو سخت ناراض کیا۔ گناہ میں اس قدر بڑھ جانا قابل مذمت ہے۔ سیاست کا تقاضا تھا کہ یزید کی بغاوت کرنے والوں سے جنگ کی جائے ان کو قتل یا اطاعت پر مجبور کیا جائے---- لیکن ان کے اعضا کاٹ لینا' نعشوں کی بے حرمتی کرنا یہ تو ایسی شرمناک باتیں ہیں جن سے دین و سیاست دونوں بیزار ہیں۔ نیز یہ عربی طور طریقوں کے بھی خلاف ہیں۔ انہی باتوں کا انجام یہ نکلا کہ حکومت ابو سفیان کی اولاد میں باقی نہ رہ سکی اور نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلی گئی۔ راویوں کا بیان ہے کہ یزید ایک بندر سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

تیسرا حصہ

بلند مرتبت خواتین

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

(556ء ---- 620ء)

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ان مقدس خاتون کا نام ہے جنہوں نے تمام مردوں اور عورتوں سے پیشتر اسلام کی روشن شاہراہ پر قدم رکھا' اور سب سے پہلے اس سچے مذہب کی حقیقت کو سمجھا۔ ارباب سیر اور محدثین بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے اول جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا وہ یہی مقدس خاتون ہیں۔

ان کے نسب کا سلسلہ اس طرح ہے۔ خدیجہ بنت خویلد' ابن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی قریشی۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ بھی قریشی تھیں۔ ان کے والد خویلد قریش میں ایک معزز سردار تھے۔ اور سب سے زیادہ دولت ان کے پاس تھی۔ ان کے مرنے کے بعد تمام دولت حضرت خدیجہؓ کو ملی۔ قریش میں ان کی بہت زیادہ عزت تھی۔ نہ صرف مال کی وجہ سے بلکہ نیکی' حسن اخلاق میں بھی یہ ایک ممتاز درجہ رکھتیں تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا لقب عہد جاہلیت میں طاہرہ تھا۔

ان کا نکاح پہلے عتیق بن عابد مخزومی کے ساتھ ہوا تھا۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا۔ انہیں کے بیٹے محمد مخزومی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ابوہالہ سے ہوا' جو تمیم میں سے تھے۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا ان کا نام بھی ہند رکھا گیا۔ وہ حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ جمل میں شریک ہو کر کام آئے۔

ابوہالہ کے مرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے پھر نکاح کا ارادہ نہیں کیا۔ دنیا سے ان کی طبیعت اچاٹ تھی۔ اکثر خانہ کعبہ میں جاتیں اور وہیں اپنی عبادت کیا کرتیں۔ طبیعت کا میلان بالکل نیکی کی طرف تھا' اس لئے کاہنہ عورتیں' جو اس زمانہ میں بہت بزرگ خیال کی جاتی تھیں' ان کے پاس آتیں تھیں۔ یہ ان کی باتیں نہایت خوش اعتقادی سے سنتیں اور ان کی خاطر و مدارات کرتیں۔ بہت سے قریش کے سردار اس خواہش میں تھے کہ ان سے شادی کریں۔ کیونکہ مالدار

اور دولتمند ہونے کے علاوہ حسن میں بھی تمام قبیلہ میں بے نظیر تھیں۔ علاوہ بریں اعلیٰ درجہ کی منتظم اور نہایت عقیل تھیں۔ گھر اور باہر کا سب انتظام بہت اچھی طرح رکھتی تھیں۔ لیکن انہوں نے پسند نہ کیا۔

ایک سال بہت ہی سخت قحط تھا اور عرب کے لوگ نہایت پریشان تھے۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "تمہارا نام عرب میں امین (امانت دار) مشہور ہو گیا ہے۔ لوگ تمہاری سچائی اور دیانت داری پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اس وقت شام کے ملک میں قافلہ جانے کو تیار ہے۔ خدیجہؓ اپنے اونٹوں کے ہمراہ ایک شخص کو اجیر (ملازم) کر کے بھیجتی ہیں۔ اگر تم ان سے کہو تو کیا عجب ہے کہ تمہیں کو اس کام کے لئے وہ پسند کریں۔ کیونکہ بہت قحط ہے ہم لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ کوئی صورت آمدنی کی کرنی چاہئے" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "بہت ممکن ہے کہ وہ بلا درخواست یہ کام میرے سپرد کریں۔" کیونکہ آپؐ سمجھتے تھے کہ میری امانت داری کی شہرت ہے 'اور وہ امین آدمی تلاش کریں گی اس لئے کوئی تعجب نہیں ہے کہ پہلے ان کی نظر مجھی پر پڑے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب حضرت خدیجہؓ نے اپنے ایک آدمی سے حضرت ابو طالب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا حال سنا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ میں اپنے تجارتی سامان کے اونٹ آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ اور پہلے لوگوں کو میں جس قدر اجرت دیا کرتی تھی اس کا دوگنا آپ کو دوں گی۔ یہ سن کر حضرت ابو طالب بہت خوش ہوئے۔

تمام راستہ میں آپ کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ خوش معاملگی کا تھا۔ میسرہ جان و دل سے آپ کا مطیع تھا۔ اور جس وقت قافلہ واپس آیا تو حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر اس نے تمام حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی اور نسطورا کا قصہ بیان کیا۔ اور حد سے زیادہ ان کی تعریف کی۔ اس کے بعد سب مال و منافع پیش کیا۔ حضرت خدیجہؓ اس غیر معمولی نفع کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اور رسول اللہ کو ان کی مقررہ اجرت سے بھی دگنا دیا۔

پھر حضرت خدیجہؓ نے یمن کے بازار جاشہ میں آپ کو بھیجا۔ وہاں بھی اچھا نفع حاصل ہوا۔ آپؐ وہاں سے کپڑے خرید لائے جس کی تجارت سے مکہ میں بہت فائدہ ہوا۔ یہ سفر بھی آپ کا بہت کامیاب ہوا۔

حضرت خدیجہؓ آپ کے حسن معاملت اور دیانت داری سے بیحد خوش ہوئیں۔ اس کے علاوہ چونکہ نسطورا راہب وغیرہ کا قصہ سن چکی تھیں اس لئے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ آنحضرت کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں اور یہی وجہ جس نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی ترغیب

دلائی۔

نفیسہ جو حضرت خدیجہؓ کی لونڈیوں میں تھیں' کہتی ہیں کہ خدیجہؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے بہت قدر تھی' اور ان کے اخلاق اور راستی پر وہ فدا تھیں۔ جب آنحضرتؐ دوسری بار یمن کے بازار سے واپس آئے تو خدیجہؓ نے مجھ کو بطور پیغامبر کے آپؐ کے پاس بھیجا۔ میں نے جا کر عرض کیا کہ آپ نکاح کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ میرے پاس اس وقت نہ کچھ مال ہے نہ سامان۔ نکاح کیونکر کروں۔ میں نے کہا کہ اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ اور ایسی جگہ نکاح کراؤں گی جہاں مال' جمال' شرافت اور اطاعت سب کچھ ہو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ میں نے کہا خدیجہؓ۔ فرمایا کہ کیونکر اس کا سرانجام ہوگا۔ میں نے کہا کہ سب کچھ میں کر لوں گی۔ یہ کیفیت میں نے آکر خدیجہؓ سے بیان کی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا۔ اور کہا کہ مجھے آپؐ کی طرف صرف اس لئے رغبت ہے کہ آپؐ کی کوئی بات کبھی میں نے جھوٹی نہیں پائی' اور آپؐ کے خلاق بہت اچھے ہیں۔

آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے پاس گئے ان سے یہ حال بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ حضرت خدیجہؓ نے بھی اپنے چچا عمرو بن اسد اور تمام قبیلے کو جمع کیا۔ ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ حضرت حمزہ نے بیس اونٹ مہر میں دیئے اور نکاح ہو گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کی تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال۔

اس نکاح کے بعد چونکہ آپؐ کو دولت مل گئی اس وجہ سے آپؐ کی عزت اور وقعت بہت بڑھ گئی۔ اور دنیوی اسباب کے لحاظ سے رسالت کی کامیابی کی شاہراہ اسی وقت سے کھل گئی۔ اس کے بعد آپ کو فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ اپنے اس کام کے لئے کوشش کرنے کا موقع مل گیا جس کے لئے مشیت ایزدی نے دنیا میں آپؐ کو بھیجا تھا۔ آپؐ اکثر غار حرا میں چلے جاتے اور وہیں عبادت کیا کرتے۔ حضرت خدیجہؓ ہر ایک کام میں آپ کی مرضی کے مطابق مدد کرنے کے لئے تیار رہتیں۔

غار حرا میں آپؐ زبردست نشانی (روح الامین) کو دیکھ کر ڈر گئے۔ کانپتے ہوئے گھر میں آئے۔ اور کہا کہ زملونی' زملونی (مجھ کو چادر اڑھاؤ)۔ پھر جب آپؐ کی طبیعت کو کچھ سکون ہوا تو حضرت خدیجہؓ سے تمام کیفیت بیان فرمائی۔ حضرت خدیجہؓ نے ہر طرح پر تسکین دلائی۔ اور کہا کہ تم صدقہ دیتے ہو' قرابت مندوں کے ساتھ سلوک کرتے ہو' تمہارا شیوہ احسان ہے' تم اللہ سے ڈرتے ہو۔ کیا تم کو اللہ ضائع کرے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ پھر آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان سے سارا حال بیان کیا۔

انہوں نے کہا یہ علامت نبوت کی ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ سرفراز کرے گا اور تمہاری قوم تم کو یہاں سے نکال دے گی۔ ورقہ نوفل کا یہ کلام سن کر اور خدیجہؓ کی باتوں سے آپ کو تسکین ہو گئی۔ جب کبھی کسی قسم کی گھبراہٹ آپ کی طبیعت کو ہوتی تو حضرت خدیجہؓ ہی تسکین دلاتیں اور ہمت بندھاتیں۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو خدیجہؓ سے کہتا تھا۔ وہ اس طرح سمجھاتی تھیں کہ اس سے میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج مجھ کو نہیں ہوتا تھا۔" اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ثابت القلب اور مستقل مزاج تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم اور باحوصلہ رسولؐ کی ہمت بندھایا کرتی تھیں۔ اس طرح وہ آنحضرت کی نہ صرف زندگی کی شریک تھیں بلکہ رسالتؐ کی کامیابی میں بھی ایک قوی اور زبردست بازو تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات کے بعد اکثر ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اکثر جب آپ گھر میں تشریف لاتے تو خدیجہؓ کا ذکر کرتے اور بعد ان کی تعریف فرماتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ خدیجہؓ سے اچھی کوئی بیوی مجھ کو نہیں ملی۔ وہ ایمان لائی اور سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی' اور سب لوگ مجھ کو جھٹلاتے تھے۔ اس نے اپنے مال سے میری مدد کی اور سب لوگوں نے مجھ کو محروم رکھا۔ اس سے اللہ نے مجھے اولادیں عطا کیں اور کسی بیوی سے اولاد نہ ہوئی۔

حضرت خدیجہؓ نے 65 برس کی عمر میں 620ء میں وفات پائی اور مکہ کے مشہور قبرستان حجون میں دفن کی گئیں۔ اس وقت جنازہ کی نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولادیں' سوائے حضرت ابراہیم کے انہیں سے تھیں۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے جو چار برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انہیں کے نام سے آپ کی کنیت ابو القاسم ہوئی۔ پھر زینب۔ اس کے بعد عبداللہ' پھر رقیہ' پھر ام کلثوم' پھر فاطمہ زہرا۔ عبداللہ نے بھی جن کا لقب طیب و طاہر تھا دو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حضرت فاطمۃ الزھرہ

(635ء -----660ء)

آپ کا نام فاطمہؓ لقب زہرا ہے۔ نسب کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا میں سب سے بڑے باپ کی بیٹی ہیں جن پر تمام مکارم فضائل' انسانی شرافت اور خوبیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی والدہ خدیجہ الکبریٰؓ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے رسالتؐ کی تصدیق کی۔ اور جن کے فضائل اس قدر ہیں کہ اس امت میں ان کا وہی درجہ ہے جو گزشتہ امت میں حضرت مریمؑ کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سات اولادیں ہوئیں جن میں سے آپؐ کے صرف ایک بیٹے ابراہیم ماریہ قبطیہ سے تھے۔ اور باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ الکبریٰؓ سے تھیں۔ لیکن کسی سے سوائے فاطمہؓ کے نسل نہیں چلی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے تمام حقیقی بھائی بہنوں سے چھوٹی ہیں۔ 606ء میں ان کی ولادت مکہ میں ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک 35 سال کا تھا۔

بچپن ہی سے حضرت فاطمہؓ کی طبیعت میں بہت زیادہ متانت اور سادگی تھی ان کی اور بہنیں کھیلنے لگتیں لیکن ان کا جی کھیل میں نہ لگتا۔ وہ اکثر اپنے قبیلہ کے اور گھروں میں چلی جاتیں لیکن یہ کہیں جانا پسند نہ کرتیں۔ ہمیشہ اپنے محترم والد کے پاس ہی رہتیں۔ ان کی یہ سادگی متانت اور استغنا رسول اللہؐ کو بے حد پسند تھی۔ اس لئے آپ کو بتول (تارک الدنیا) کہا کرتے تھے۔ ابھی ان کی عمر پورے پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ محترم والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسی سال قضائے الہی سے ابو طالب نے بھی انتقال کیا جو حضرت علیؓ کے والد اور رسول اللہؐ کے چچا اور زبردست حامی تھے۔ مگر باوجود ایسے سخت روحانی آلام کے انہوں نے نہایت صبر و استقلال سے کام لیا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہتیں کہ کسی طرح اپنے معزز باپ کو خوش دیکھیں۔ اور ہمیشہ اسی ٹوہ میں لگی رہتیں کہ ایسا نہ ہو کہ کفار ان کو کوئی تکلیف پہنچائیں۔

حضرت فاطمہؓ ہمیشہ سے اپنے تمام انداز' کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے' بول چال' لباس وغیرہ

غرض ہر ایک بات میں رسول اللہؐ کی پوری تقلید کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "میں نے تمام حرکات وسکنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ فاطمہؓ ہی کو پایا" ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ "رفتار و گفتار میں بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاطمہؓ ہیں" یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے آنحضرت ان سے بہت زیادہ الفت رکھتے تھے۔ جب کبھی کسی سفر یا لڑائی سے واپس آتے تو مسجد میں دوگانہ ادا کر کے سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کو دیکھنے جاتے اس کے بعد ازدواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے۔ اور ان کی اس قدر وقعت کرتے تھے کہ جب وہ پاس آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور ان کو اپنے پاس بٹھاتے۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے تو اس وقت حضرت فاطمہؓ کنواری تھیں۔ بعض لوگوں نے نکاح کا پیغام دیا۔ لیکن سرور کائنات خاموش رہے۔ پھر انصار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آمادہ کیا کہ تم خود جا کر آنحضرتؐ سے اپنے متعلق کہو۔ حضرت علیؓ تشریف لے گئے اور فاطمہؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا۔ آپ خوش ہوئے اور حضرت فاطمہؓ سے جا کر فرمایا کہ علیؓ تمہاری نسبت ذکر کرتے تھے وہ خاموش ہو گئیں۔ حضورؐ نے ان کے سکوت کو رضامندی قرار دیکر حضرت علیؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ یہ نکاح ہجرت سے پانچ مہینے بعد ہوا۔ اس وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر اٹھارہ سال چھ مہینے تھی۔ اور حضرت علیؓ کا سن اکیس برس پانچ مہینے کا تھا۔

حضرت علیؓ اس وقت بہت تنگ دست تھے اور کچھ پاس نہ تھا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے تم کو ایک زرہ دی تھی وہ کہاں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو موجود ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ اسی کو فروخت کر دو۔ حضرت علیؓ وہ زرہ بیچنے کو لے گئے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس کو چار سو درہم پر خرید لیا اور جب پہنا تو کہا کہ اے علیؓ یہ زرہ بہ نسبت میرے جسم کے تمہارے جسم پر زیادہ زیب دیتی ہے اس لئے میں قیمت دینے کے بعد یہ زرہ بھی تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ وہ زرہ اور چار سو درہم لائے۔ وہی چار سو درہم حضرت فاطمہؓ کا مہر قرار پایا۔

حضرت علیؓ نے ایک چھوٹا سا مکان جو رسول اللہؐ کے مکان سے کسی قدر فاصلہ پر تھا کرایہ پر لیا۔ آپ نے اپنی لونڈی ام ایمنؓ کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت کر دیا۔

اس دین و دنیا کے بادشاہ کی معزز بیٹی نہایت سادگی کے ساتھ ایک لونڈی کے ہمراہ پیدل اپنے شوہر کے گھر میں آکر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ عروسی لباس یہ تھا زیوروں میں صرف بازوبند اور کپڑوں میں چادر زعفرانی رنگی ہوئی اور بس۔

جہیز میں ایک چادر' ایک چمڑے کا گدا جس میں گھاس بھری ہوئی تھی۔ ایک تکیہ' آٹا پیسنے

کی ایک چکی' ایک مشکیزہ اور دو ڈول تھے۔

حضرت فاطمہؓ ایک نہایت متقی اور دیندار عورت تھیں۔ تکلیف دنیا اور مصائب کا ان کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے گھر کا تمام کام کاج پیسنا' پکانا خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ آٹا گوندھتے گوندھتے ان کا ہاتھ گھس گیا تھا اور چکی پیستے پیستے گٹھے پڑ گئے تھے تو حضرت علیؓ کے کہنے سے رسول اللہؐ کے پاس گئیں تاکہ ان سے ایک خادمہ مانگیں۔ اس وقت آنحضرتؐ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئی ہوئی تھیں۔ جب وہاں گئیں تو آنحضرتؐ نے نہایت پیار سے بٹھایا اور باتیں کرنے لگے۔ حضرت فاطمہؓ کو لونڈی مانگتے ہوئے شرم آئی۔ تھوڑی دیر بیٹھیں۔ اس کے بعد واپس چلی آئیں اور کچھ نہ کہا۔ پھر حضرت علیؓ خود ان کو ساتھ لے کر گئے اور عرض کی۔ آپ نے فرمایا کہ ان لونڈیوں میں سے میں تم کو نہیں دے سکتا۔ یہ اہل صفہ کا حق ہے۔ یہ دونوں ناکامیاب وہاں سے واپس چلے آئے۔

ایک مرتبہ کسی بات پر حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے رنجیدہ ہو گئیں اور کہا کہ میں اس کی شکایت رسول اللہؐ سے کروں گی۔ چنانچہ وہاں تشریف لے گئیں اور کیفیت بیان کی۔ حضرت علیؓ بھی ساتھ ساتھ گئے تھے اور خاموش بیٹھے تھے۔ حضور رسالت مآب نے جناب سیدہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "بیٹی سنو' سوچو' سمجھو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ مرد تمام کام عورت کی منشاء کے مطابق ہی کرے"

یہ نصیحت سن کر آپ وہاں سے واپس آئیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کا میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اب کبھی فاطمہؓ کے خلاف مزاج کوئی کام نہیں کروں گا۔

حضرت علیؓ نے جب تک حضرت فاطمہؓ ان کے نکاح میں رہیں دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ایک بار ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ان کا ارادہ معلوم ہوا تھا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک مشرک اور رسول اللہ کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے حضرت علیؓ باز رہے۔

حضرت فاطمہؓ کی اور تین بہنیں جس طرح عین جوانی کے زمانہ میں گذر گئیں اسی طرح حضرت فاطمہؓ نے بھی کم عمر پائی۔ 29 سال اور چند مہینے کی عمر میں رسول اللہؐ کی وفات کے چھ مہینے کے بعد انتقال کیا۔

ان کے مرض الموت کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل خاموش ہیں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا وہ کسی ایسے سخت مرض میں نہیں فوت ہوئیں جس کی وجہ سے کچھ دنوں تک صاحب فراش رہی ہوں۔ بلکہ جس دن ان کا انتقال ہوا اسی دن انہوں نے غسل کیا تھا اور کپڑے بدلے تھے۔ جنازے میں بہت کم لوگوں کو شرکت کا موقع ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کو انتقال ہوا۔

اور حضرت علیؓ کو وصیت کر گئی تھیں کہ رات ہی کو مجھ کو دفن کر دینا۔ انہوں نے خود ہی غسل دیا۔ حضرت عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ قبر کا ٹھیک پتہ نہیں۔ مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ مدینہ میں جنت البقیع کے قریب ہی کہیں ہے۔ ان سے چار اولادیں تھیں۔ حسنؓ، حسینؓ، زینبؓ، ام کلثومؓ۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

(614ء----681ء)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت نظام اسلام میں کامل عورت کا مثالی نمونہ قرار پاتی ہے۔ آپ رسول اکرمؐ کے سب سے زیادہ قریب تھیں۔ ایک مسلمان عورت کے لیے سیرت عائشہؓ میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات' انقلابات اور مصائب----شادی' رخصتی' سسرال' شوہر' سوکن' بے اولادی' بیوگی' غربت' خانہ داری' رشک وحسد' غرض اس قسم کے ہر موقع اور ہر حالت کے لئے تقلید کے قابل نمونے موجود ہیں۔ پھر علمی' عملی' اخلاقی ہر طرح کے گوہر گرانمایہ سے پاک زندگی مالامال ہے۔ اس لئے سیرت عائشہؓ ایک آئینہ ہے جس میں صاف طور پر نظر آئے گا کہ ایک مسلمان عورت کی زندگی کیا ہونی چاہیے۔ آپ کا نام عائشہؓ لقب صدیقہ' خطاب ام المومنین' کنیت ام عبداللہ اور لقب حمیرا ہے۔ حضور انورؐ نے بنت الصدیق سے خطاب فرمایا ہے۔ عبداللہ' حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ آنحضورؐ نے ہی آپ سے فرمایا تھا کہ اپنے بھانجے عبداللہ کے نام پر کنیت رکھیں۔ حضرت عائشہؓ پہلے خلیفہ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ والد کی طرف سے قریشیہ تمیمیہ اور ماں کی طرف سے کنانیہ ہیں

علامہ سید سلیمان ندوی نے آپ کی تاریخ پیدائش تاریخ نبوت کے پانچویں سال کا آخری حصہ یعنی شوال 9 قبل ہجری مطابق جولائی 614 عیسوی طے کی ہے۔ صدیق اکبرؓ کا کاشانہ وہ برج سعادت تھا جہاں خورشید اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے پرتوافگن ہوئیں' اس بناء پر حضرت عائشہؓ اسلام کے ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں جن کے کانوں نے کبھی کفر وشرک کی آواز نہیں سنی۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "جب سے میں نے اپنے والدین کو پہچانا' ان کو مسلمان پایا" (بخاری شریف)

بچپن سے ہی حضرت عائشہؓ کے ہر انداز سے سعادت اور بلندی کے آثار نمایاں تھے۔

لڑکپن میں کھیل کود کی بہت شوقین تھیں۔ محلّہ کی لڑکیاں ان کے پاس جمع رہتیں۔ لیکن اس کھیل کود میں بھی رسول اللہ کا ادب ہر وقت ملحوظ خاطر رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عائشہؓ کھیلتی ہوتیں' ارد گرد سہیلیوں کا ہجوم ہوتا اور اتفاقاً آپؐ پہنچ جائے۔ وہ جلدی سے گڑیوں کو چھپا لیتیں' سہیلیاں چھپ جاتیں' لیکن چونکہ آپؐ بچوں سے خاص محبت رکھتے تھے اس لئے لڑکیوں کو پھر بلا بلا کر حضرت عائشہؓ کے ساتھ کھیلنے کو کہتے۔

جب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے وفات پائی تو رسول اللہؐ بہت عرصہ تک مغموم رہے۔ حضرت خولہؓ نے آپ کو نکاح کرنے کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہاں؟ کہا: "اگر آپ چاہیں تو کنواری سے کریں ورنہ بیوہ سے۔ کنواری تو عائشہؓ ہے جو آپ کے عزیز ترین شخص کی لڑکی ہے۔ بیوہ سودہ بنت زمعہ ہے۔" "آپ نے فرمایا" "دونوں سے کہو" حضرت ابو بکرؓ نے پیغام سن کر خوشی نکاح کر دیا۔ پچاس دینار مالیت کا ایک مکان حق مہر قرار پایا۔ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر 6 برس تھی۔ حضرت عطیہؓ حضرت عائشہؓ کے نکاح کا واقعہ اس سادگی سے بیان کرتی ہیں کہ "حضرت عائشہؓ لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں' ان کی انا آئی اور انہیں لے گئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے آکر نکاح پڑھا دیا" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں "جب میرا نکاح ہوا تو مجھ کو خبر تک نہ ہوئی کہ میرا نکاح ہو گیا ہے۔ جب والدہ نے باہر نکلنے سے روک ٹوک شروع کی' تب مجھے پتہ چلا۔ اس کے بعد والدہ نے مجھے سمجھا بھی دیا" تین برس بعد جب حضرت ابو بکرؓ بیمار ہوئے تو عرض کی یا رسول اللہؐ اب آپ اپنی بیوی کو گھر کیوں نہیں بلوا لیتے۔ مدینہ حضرت عائشہؓ کی سسرال تھی۔ انصار کی عورتیں دلہن کو لینے حضرت ابو بکرؓ کے گھر آئیں۔ حضرت ام رومانؓ نے بیٹی کو آواز دی۔ وہ اس وقت سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔ ماں نے ہاتھ منہ دھلا کر بال سنوارے۔ تھوڑی دیر بعد آنحضرتؐ بھی تشریف لے آئے۔ صحیح روایتوں کی بنا پر حضرت عائشہؓ کی رخصتی شوال 1 ہجری میں ہوئی۔ نکاح' مہر' رخصتی' غرض ہر رسم کسی تکلیف' آرائش اور اسراف کے بغیر ادا ہوئی۔

حضرت عائشہ کی تعلیم و تربیت کا اصلی زمانہ رخصتی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے اسی زمانے میں پڑھنا سیکھا' قرآن دیکھ کر پڑھتی تھیں (صحیح بخاری)۔ شب و روز میں علوم و معارف کے بیسیوں مسئلے ان کے کان میں پڑتے تھے۔ آپ خود بھی ہر مسئلہ رسول اللہؐ سے بلا تامل پوچھ لیتی تھیں۔ ان کے سینکڑوں سوالات اور مباحث احادیث میں مذکور ہیں جو در حقیقت ان کی روزانہ تعلیم کے مختلف اسباق ہیں۔ جب آپؓ رخصت ہو کر آئیں تو گھر کی کل کائنات ایک چارپائی' ایک چٹائی' ایک بستر' تکیہ آٹا اور کھجور رکھنے کے ایک دو برتن' پانی کا ایک برتن اور ایک پیالے سے

زیادہ نہ تھی۔ گھر کے کاروبار کے لئے زیادہ اہتمام وانصرام کی ضرورت نہ تھی۔ کھانا پکنے کی نوبت بہت کم آتی۔ آنحضرتؐ عائشہؓ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ دیگر ازواج مطہرات کو اس بات پر ملال ہوتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے آپؐ کی توجہ حاصل کرنے کے لئے حضرت ام سلمہؓ کو وسیلہ بنایا۔ آپؐ نے فرمایا: "ام سلمہؓ مجھ کو عائشہؓ کے معاملے میں دق نہ کرو' کیونکہ عائشہؓ کے علاوہ کسی اور بیوی کے لحاف میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوئی" آپؐ حضرت عائشہؓ کی مدارات کرتے' دل بہلاتے' ساتھ کھانا کھاتے اور سفر میں ساتھ رکھتے۔ اس قسم کے واقعات جو احادیث میں مذکور ہیں لوگ ان کو قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ وہ ان کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ ایک امی کا اپنے پیغمبر کے ساتھ یہ خطاب ہے مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک بیوی اپنے شوہر سے باتیں کر رہی ہے۔

مدینہ میں آکر مسلمانوں کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ مکہ سے بالکل مختلف تھیں۔ مدینہ میں منافقوں کا ایک گروہ سازشوں میں مصروف رہتا تھا' جس کی ایک مثال افک یعنی حضرت عائشہ پر تہمت لگانے کا واقعہ ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یہ تہمت مٹا دی اور کسی کو اس سلسلہ میں شبہ نہ رہ گیا۔ رسول اللہؐ بھی آپ کو بدستور عزیز جانتے رہے۔ آخری وقت میں آپؐ نے حضرت عائشہ ہی کے حجرے میں قیام فرمایا۔ آپؐ عالم نزع میں انؓ کے سینے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور اسی حالت میں آپؐ کا وصال ہوا۔

حضرت عائشہؓ بیوہ ہوئیں اور اسی عالم میں عمر کے چالیس مرحلے طے کئے۔ آپ قبر نبویؐ کے پاس ہی سوتی تھیں۔ ایک دن آپ کو خواب میں دیکھا تو وہاں سونا چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ کے وہاں دفن ہونے سے پہلے بے حجاب وہاں آتی جاتی تھیں لیکن بعد ازاں پردہ میں جانے لگیں۔

آنحضورؐ کے وصال کے بعد حضرت عائشہؓ کے والد ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے۔ انہوں نے ازواج مطہرات کے لیے سالانہ مصارف مقرر کئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دیگر ازواج مطہرات کے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ کو ترجیح دی کیونکہ وہ رسول اللہؐ کو زیادہ عزیز تھیں۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کے لواخر میں جب حالات بہت زیادہ خراب ہونے لگے تو حضرت عائشہؓ حج کرنے چلی گئیں اور اسی دوران آپ کو شہادت حضرت عثمانؓ کی خبر ملی۔ حضرت علیؓ کے ساتھ آپ کے اختلافات کچھ سیاسی افراد کے پیدا کردہ تھے (جن پر تفصیلاً حضرت علیؓ کے ضمن میں بات کی گئی ہے۔) حضرت امیر معاویہؓ نے تخت حکومت پر قدم رکھا اور تقریباً 20 برس حکومت کی۔ ان کی وفات سے دو سال پہلے حضرت عائشہؓ نے وفات پائی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال جزئی اوقات کے سوا خاموشی سے گذارے۔ سید سلیمان ندوی کے مطابق حضرت امیر معاویہؓ نے ایک

دفعہ انہیں خط لکھا کہ مجھے مختصر سی نصیحت کیجئے۔ حضرت عائشہؓ نے جواب میں لکھا: "......میں نے آنحضرتؐ کو کہتے سنا ہے کہ جو شخص انسانوں کی نارضامندی کی پروانہ کر کے خدا کی رضاجوئی کرے گا' خدا انسانوں کی نارضامندی کے نتائج سے اس کو محفوظ رکھے گا۔ اور جو خدا کو نارضامند کر کے انسانوں کی رضامندی کا طلب گار ہوگا خدا اسے انسانوں کے ہاتھ میں سونپ دے گا" یزید کی جانشینی کے اعلان کے وقت حضرت عائشہؓ کے بھائی نے اٹھ کر مخالفت کی۔ خود وہ بھی اس بات پر خوش نہ تھیں۔

حضرت عائشہؓ 67 برس کی تھیں جب 58ھ رمضان کے ماہ میں بیمار پڑیں۔ چند روز تک علیل رہیں۔ کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتیں "اچھی ہوں" جو لوگ عیادت کو آتے بشارت دیتے' تو فرماتیں "اے کاش میں پتھر ہوتی' اے کاش میں کسی جنگل کی جڑی بوٹی ہوتی" حضرت ابن عباسؓ نے آکر کہا "آپؓ کا نام ازل سے ام المومنین تھا۔ آپؓ آنحضرتؐ کی محبوب ترین بیوی تھیں......خدا نے آپ ہی کے ذریعہ تیمم کی اجازت فرمائی۔ آپ کی شان میں قرآن کی آیتیں نازل ہوئیں جواب ہر محراب و مسجد میں شب و روز پڑھی جاتی ہیں۔" فرمایا "ابن عباسؓ مجھے اپنی اس تعریف سے معاف رکھو۔ مجھے یہ پسند تھا کہ میں معدوم محض ہوتی" غالباً آپ کے ان خیالات کا سبب امت کے حالات ہوں گے۔ آپؓ نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کا عروج و انتشار دیکھا' خلافت کو ملوکیت میں بدلتے اور آل رسولؐ کو زخ ہوتے ہوئے دیکھا۔ مرض الموت میں وصیت کی کہ اس حجرہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ مجھے دفن نہ کرنا کیونکہ میں نے ایک جرم کیا ہے۔ مجھے جنت البقیع میں دفن کرنا اور رات کو ہی دفن کر دی جاؤں۔ صبح کا انتظار نہ کیا جائے۔" (سیرت عائشہؓ سلیمان ندوی۔)

علمی حیثیت سے حضرت عائشہؓ کو نہ صرف عام عورتوں پر' نہ صرف امہات المومنینؓ پر بلکہ چند ایک بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہ پر فوقیت حاصل تھی۔ صحیح ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے: "ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی کہ جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات ہم کو نہ ملی ہوں۔" امام زہری اور عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی آپ کے فضل و کمال کی تصدیق کی۔ آپ سے 2210 احادیث بھی مروی ہیں۔ مکثرین روایت میں آپ کا چھٹا نمبر ہے۔ آپ نے کئی راویوں مثلاً ابو ہریرہ کی بیان کردہ کئی احادیث سن کر ان کی تصحیح و تردید بھی فرمائی۔ عروہ نے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی۔ وہ کہتے ہیں "میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ کسی کو طب کا ماہر نہیں پایا" آپؓ سے ایک شخص نے پوچھا "آپ شعر کہتی ہیں تو میں نے مانا کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی ہیں۔ لیکن طب سے واقفیت کیسے ہوئی۔"

فرمایا "آنحضرتؐ آخر عمر میں بیمار رہا کرتے تھے اطبائے عرب آیا کرتے تھے۔ وہ جو بتاتے میں یاد کر لیتی تھی۔"

حضرت عائشہ نے شاعری کا فن اپنے والد محترم سے سیکھا تھا۔ امام بکاری نے ادب المفرد میں عروہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کو کعب بن مالک کا پورا قصیدہ یاد تھا۔ جنگ جمل میں بعض بہادروں نے جو رجز پڑھے وہ ان کو یاد تھے۔ ایک دفعہ ان کو پڑھ کر بہت روئیں۔ وہ رجز کے شعر یہ تھے: "اے ہماری ماں اے ہماری سب سے اچھی ماں جس کو ہم جانتے ہیں آپ نہیں دیکھتیں کہ اتنے بہادر زخمی ہوئے"

مسلمان کی نجی زندگی کے بارے میں رسول اللہ کی ہدایات و احکامات ہم تک زیادہ تر حضرت عائشہؓ کی زبانی ہی پہنچے ہیں۔ آپ کی سیرت "دنیا کے بزرگ ترین انسان" کی زندگی کا وہ نصف حصہ ہے جو کامل عورت کا بہترین مثالی مرقع ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

چوتھا حصہ

آئمہ کرام

حضرت امام جعفر صادقؒ

(704ء ---- 772)

آپ کا نام نامی جعفر صادق اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ کے مناقب اور کرامتوں کے متعلق جو کچھ بھی تحریر کیا جائے بہت کم ہے۔ آپ امت محمدیؐ کے لئے صرف بادشاہ اور حجت نبویؐ کے لئے روشن دلیل ہی نہیں بلکہ صدق و تحقیق پر عمل پیرا اولیاء کرام کے باغ کا پھل' آل علی' نبیوں کے سردار کے جگر گوشہ اور صحیح معنوں میں وارث نبیؐ بھی ہیں۔ اور آپ کی عظمت و شان کے اعتبار سے ان خطابات کو کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کا درجہ صحابہ کرام کے بعد ہی آتا ہے لیکن اہل بیت میں شامل ہونے کی وجہ سے نہ صرف باب طریقت ہی میں آپ سے ارشادات منقول ہیں' بلکہ بہت سی روائتیں بھی مروی ہیں۔ جو لوگ آپ کے طریقہ پر عمل پیرا ہیں وہ بارہ اماموں کے مسلک پر گامزن ہیں۔ آپ نہ صرف مجموعہ کمالات و پیشوائے طریقت کے مشائخ بلکہ ارباب ذوق اور عاشقان طریقت اور زاہدان عالی مقام کے مقتدا بھی ہیں' نیز آپ نے اپنی بہت سی تصانیف میں رازہائے طریقت کو بڑے اچھے پیرائے میں واضح فرمایا ہے اور حضرت امام باقر کے بھی کثیر مناقب روایت کئے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مجھے ان کم فہم لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اہل سنت نعوذباللہ اہل بیت سے دشمنی رکھتے ہیں' جبکہ صحیح معنوں میں اہل سنت ہی اہل بیت سے محبت رکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے عقائد ہی میں یہ شے داخل ہے کہ رسول خدا پر ایمان لانے کے بعد ان کی اولاد سے محبت کرنا لازم ہے۔

اہل بیت ہی کی محبت کی وجہ سے حضرت امام شافعی کو رافضی کا خطاب دے کر قید کر دیا گیا' جس کے متعلق امام صاحب خود اپنے ہی ایک شعر میں اشارہ فرماتے ہیں: اگر اہل بیت سے محبت کا نام رفض ہے تو پھر پورے عالم کو میرے رافضی ہونے پر گواہ رہنا چاہئے اور اگر بالفرض اہل بیت اور صحابہ کرام سے محبت کرنا ارکان ایمان میں داخل نہ بھی ہو تب بھی ان سے محبت کرنے اور ان کے حالات سے باخبر رہنے میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔ اس لئے ہر اہل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ خلفائے راشدین و دیگر صحابہ کرام اہل بیت کے مراتب کو بھی مراتب افضل خیال کرے۔ روایت

ہے کہ کسی نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے دریافت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین میں سب سے زیادہ افضل کون ہے ؟ فرمایا کہ بیبیوں میں حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا، صدیق اکبرؓ و حضرت عمرؓ اور جوانوں میں حضرت عثمانؓ و علیؓ اور ازدواج مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ۔

خلیفہ منصور نے ایک شب اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ امام جعفر صادق کو میرے روبرو پیش کرو، تاکہ میں ان کو قتل کر دوں۔ وزیر نے عرض کیا کہ دنیا کو خیرباد کہہ کر جو شخص عزلت نشین ہو گیا ہو اس کو قتل کرنا قرین مصلحت نہیں۔ لیکن خلیفہ نے غضب ناک ہو کر کہا کہ میرے حکم کی تعمیل تم پر ضروری ہے۔ چنانچہ مجبوراً جب وزیر امام جعفر صادق کو لینے چلا گیا تو منصور نے غلاموں کو ہدایت کی کہ جس وقت میں اپنے سر سے تاج اتاروں تو تم فی الفور امام جعفر صادق کو قتل کر دینا۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو آپ کے جلال نے خلیفہ کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہ بے قرار ہو کر آپ کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا اور نہ صرف آپ کو صدر مقام پر بٹھایا بلکہ خود بھی مودبانہ آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کی حاجات اور ضروریات کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ میری سب سے اہم حاجت و ضرورت یہ ہے کہ آئندہ پھر کبھی مجھے دربار میں طلب نہ کیا جائے تاکہ میری عبادت و ریاضت میں خلل واقع نہ ہو۔ چنانچہ منصور نے وعدہ کر کے عزت اور احترام کے ساتھ آپ کو رخصت کیا حضرت داؤد طائیؒ نے حاضر خدمت ہو کر امام جعفر صادقؒ سے عرض کیا کہ آپ چونکہ اہل بیت میں سے ہیں اس لئے مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیں۔ لیکن آپ خاموش رہے اور جب دوبارہ داؤد طائی نے کہا کہ اہل بیت ہونے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فضیلت بخشی ہے اس لحاظ سے نصیحت کرنا آپ کے لئے ضروری ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ مجھے تو یہی خوف لگا ہوا ہے کہ قیامت کے دن میرے جد اعلیٰ ہاتھ پکڑ کر یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ تو نے خود میرا اتباع کیوں نہیں کیا؟ کیوں کہ نجات کا تعلق نسب سے نہیں بلکہ اعمال صالحہ پر موقوف ہے۔ یہ سن کر داؤد طائی کو بہت عبرت ہوئی۔

جب آپ تارک دنیا ہو گئے تو کسی بزرگ نے حاضر خدمت ہو کر فرمایا کہ مخلوق آپ کے تارک الدنیا ہونے سے آپ کے فیوض عالیہ سے محروم ہو گئی ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل دو شعر پڑھے (ترجمہ):

کسی جانے والے انسان کی طرح وفا بھی چلی گئی   اور لوگ اپنے خیالات میں غرق رہ گئے

گو بظاہر باہم اظہار محبت و وفا کرتے ہیں   لیکن ان کے قلوب بچھوؤں سے لبریز ہیں

آپ کو بیش بہالباس میں دیکھ کر کسی نے اعتراض کیا کہ اتنا قیمتی لباس اہل بیت کے لئے مناسب نہیں۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جب اپنی آستین پر پھیرا تو اس کو آپ کا لباس ٹاٹ سے بھی زیادہ کھردرا محسوس ہوا۔ اس وقت آپ نے فرمایا' مخلوق کی نگاہوں میں تو یہ عمدہ لباس ہے لیکن حق کے لئے یہی کھردرا ہے۔

آپ نے امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ دانش مند کی کیا تعریف ہے ؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ جو بھلائی اور برائی میں امتیاز کر سکے۔ آپ نے کہا کہ یہ امتیاز تو جانور بھی کر لیتے ہیں کیونکہ جو ان کی خدمت کرتا ہے اس کو ایذا نہیں پہنچاتے اور جو تکلیف دیتا ہے اس کو کاٹ کھاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا کہ پھر آپ کے نزدیک دانشمندی کی کیا علامت ہے ؟ جواب دیا کہ جو دو بھلائیوں میں سے بہتر بھلائی کو اختیار کرے۔ اور دو برائیوں میں سے مصلحتہً کم برائی پر عمل کرے۔

کسی نے آپ سے عرض کیا کہ ظاہری وباطنی فضل و کمال کے باوجود آپ میں تکبر پایا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا میں متکبر تو نہیں ہوں۔ البتہ جب میں نے کبر کو ترک کر دیا تو میرے رب کی کبریائی نے مجھے گھیر لیا۔ اس لئے میں اپنے کبر پر نازاں نہیں ہوں' بلکہ میں تو اپنے رب کی کبریائی پر فخر کرتا ہوں۔

جو شخص عبادت پر فخر کرے وہ گنہگار ہے اور جو معصیت پر اظہار ندامت کرے وہ فرمانبردار ہے۔ صبر کرنے والے درویش کو اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ مالدار کو ہمہ اوقات اپنے مال کا تصور رہتا ہے اور درویش کو صرف اللہ تعالیٰ کا خیال۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ "توبہ کرنے والے ہی عبادت گزار ہیں۔" ذکر الٰہی کی تعریف یہ ہے کہ جس میں مشغول ہونے کے بعد دنیا کی ہر شے کو بھول جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شے کا نعم البدل ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے یعنی تمام اسباب وسائل ختم کر دیئے جاتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ عطائے الٰہی بلاواسطہ ہے نہ کہ بالواسطہ۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ جو اپنے مولیٰ کی اطاعت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ صاحب کرامت وہ ہے جو اپنی ذات کے لئے نفس کی سرکشی سے آمادہ جنگ رہے کیونکہ نفس سے جنگ کرنا اللہ تعالیٰ تک رسائی کا سبب ہوتا ہے۔ اوصاف مقبولیت میں سے ایک وصف الہام بھی ہے۔ جو لوگ دلائل سے الہام کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں وہ بد دین ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جتنا کہ رات کی تاریکی میں سیاہ پتھر پر چیونٹی رینگتی ہے حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ مجھ پر رموز حقیقت اس وقت منکشف ہوئے جب میں خود دیوانہ ہو گیا۔ نیک بختی کی علامت یہ بھی ہے کہ عقلمند دشمن سے واسطہ پڑ جائے۔ آپ نے فرمایا

کہ پانچ لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرنا چاہئے: اول' جھوٹے سے کیونکہ اس کی صحبت فریب میں
مبتلا کر دیتی ہے۔ دوم' بیوقوف سے کیونکہ جس قدر وہ تمہاری منفعت چاہے گا اسی قدر نقصان پہنچے
گا۔ سوم' کنجوس سے کیونکہ اس کی صحبت سے بہترین وقت رائیگاں ہو جاتا ہے۔ چہارم' بزدل سے
کیونکہ یہ وقت پڑنے پر ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ پنجم' فاسق سے کیوں کہ ایک نوالے کی طمع میں کنارہ
کش ہو کر مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالی نے دنیا ہی میں فردوس و جہنم کا نمونہ پیش کر دیا ہے'
کیونکہ آسائش جنت ہے اور تکلیف جہنم۔ جنت کا صرف وہی حقدار ہے جو اپنے تمام امور اللہ تعالی
کے سپرد کر دے اور دوزخ اس کا مقدر ہے جو اپنے امور نفس سرکش کے حوالے کر دے۔ اگر
دشمنوں کی صحبت سے اولیاء کرام کو ضرر پہنچ سکتا تو فرعون سے آسیہ کو پہنچتا اور اگر اولیاء کی صحبت
دشمن کے لئے فائدہ مند ہوتی تو سب سے پہلے انبیاء کی ازدواج کو فائدہ پہنچتا۔ لیکن قبض اور بسط
کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ

(774-----704ء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد ایک مرد ظاہر ہوگا کہ ابو حنیفہؒ کے نام سے پہچانا جائے گا۔ اس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ میری سنت کو زندہ کریگا۔ مسند میں ہے کہ امام صاحب نے فرمایا کہ میری پیدائش 704ء میں ہوئی ہے اور 720ء میں والد کے ساتھ حج کے واسطے روانہ ہوئے۔

سولہ سال کی عمر میں جب مسجد حرام میں ہم پہنچے تو ایک جماعت لوگوں کی بیٹھی ہوئی دیکھی۔ میں نے والد صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں والد صاحب نے فرمایا' یہ حلقہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یار حضرت عبداللہ جزر زیدی کا ہے۔ پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: من تفقه فی دین الله الخ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین میں فقیہ ہوا تو اس کی روزی کا اللہ تعالیٰ خود کفیل ہے اور اس کی مہم کا بھی خود کفیل ہے۔

امام ملک اور امام ابو حنیفہ ہم عصر تھے۔ امام موصوف امام مالک سے تقریباً 13 سال بڑے تھے۔ منصور کے زمانے میں جس طرح امام مالک پر مظالم کیے گئے اسی طرح آپ کو بھی اس کے استبداد کا شکار ہونا پڑا۔

حکومت عباسیہ کی ملوکیت کے آپ بھی بالکل خلاف اور اس کے متمنی تھے کہ اسلام کا صحیح نظام قائم ہو جائے اس لئے آپ نے تمام عمر قیام حق کے لئے کوشش کی' اور باطل کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہ کیا۔ نفس ذکیہ کے بعد جب ابراہیم نے منصور کے خلاف بغاوت کی تو آپ نے علی الاعلان اس کا ساتھ دیا اور مالی مدد بھی کی اور کچھ پند و نصائح بھی کیے۔ جب منصور نے فتح پائی تو آپ کو بغداد بلایا' اور آپ سے عہدہ قضا کے قبول کرنے کو کہا مگر آپ اس غیر اسلامی نظام سے تعاون کرنا پسند نہ کرتے

تھے اس لئے صاف انکار کر دیا۔ تمام ائمہ حدیث و فقہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک احادیث کے متعلق قابل تقلید ہے آپ نے کھلم کھلا ان تمام راویوں کی تکذیب کی جنہوں نے احادیث رسول کو اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا تھا آپ کے اس طرز عمل کی تصویر اس روایت سے سامنے آجاتی ہے جو در حقیقت اصول تنقید کی روح ہے۔

"ایک مرتبہ ابو مطیع بلخی نے ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ اس حدیث کی نسبت آپ کیا فرماتے ہیں ۔کہ جب مومن زنا کرتا ہے تو ایمان اس کے سر سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ قمیض بدن سے۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا کہ میں ان سب راویوں کی تکذیب کرتا ہوں اور میرا جھٹلانا ان لوگوں کا اور رد کرنا ان کے قولوں کا کچھ تکذیب پیغمبر کی نہیں ہے اس لئے کہ تکذیب قول پیغمبر کی یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ میں پیغمبر خدا کے قول کو نہیں مانتا لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں ہر بات پر جو حضرت محمدؐ نے فرمائی ایمان رکھتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کوئی بات پیغمبر نے خلاف قرآن نہیں فرمائی تو یہ حقیقت میں تصدیق پیغمبر کی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے صرف ان احادیث پر توجہ کی جن سے اوامر و احکام شرعی مستنبط ہوتے تھے اور مواعظ و قصص و سیر کی طرف زیادہ رخ نہیں کیا۔ مسائل شرعیہ کے استنباط میں بھی آپ نے قیاس جلی کو خبر آحاد پر ترجیح دی در حقیقت آپ نے فقہ اسلامی کی بنیاد قرآن کریم اور قیاس جلی پر رکھی۔

امام ابو حنیفہؒ کی حدیث پر نہ کوئی تصنیف موجود ہے اور نہ صحاح ستہ میں آپ کی ایک دو روایت کے علاوہ کوئی روایت ہے علامہ ابن خلدونؒ، مولوی چراغ علیؒ اور مولانا شبلیؒ کی تحقیقات کے مطابق امام موصوف نے کل سترہ یا اٹھارہ احادیث کو صحیح تسلیم کر کے دوسروں سے روایت کیا ہے۔ اس وقت تک احادیث کی تدوین کتابی شکل میں نہ ہوئی تھی جو زبانی روائتیں آپ کے پاس پہنچی تھیں ان میں سے آپ نے صرف سترہ احادیث کو صحیح تسلیم کیا۔ چنانچہ ابن خلدون مقدمہ حصہ سوم میں لکھتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے کل سترہ کے قریب حدیثیں روایت کی ہیں اور امام مالک نے تقریباً تین سو اور امام حنبل نے قریباً 50 ہزار حدیثیں جس کے اجتہاد نے جتنی احادیث کی صحت پر شہادت دی اتنی ہی حدیثیں نقل کر دیں اور باقی سے خاموشی اختیار کی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام موصوف علم حدیث سے نابلد تھے یا آپ تک روائتیں بہت کم پہنچیں آپ نے کوفہ مکہ و مدینہ منورہ میں احادیث کے درس حاصل کئے اور عطاء ابن رباح، اعمش کوفی، امام باقر، امام اوزاعی جیسے مشہور محدثین سے اسناد فضیلت حاصل کیں خود آپ کے شاگردوں

میں عبداللہ بن مبارک اور یحییٰ بن زکریا جیسے فقہاء و علماء حدیث پیدا ہوئے۔ لیکن علم حدیث میں ان کے بے پایانی اور کمال ذکاوت کے باوجود ان سے احادیث جس لئے کم روایت کی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے احادیث کی تنقید کے اصول بہت سخت مقرر کئے تھے۔ آپ ہر حدیث کو آنکھ بند کر کے صحیح نہیں مان لیتے تھے علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

"امام ابو حنیفہؒ کی روایت اس لئے اور بھی کم ہو گئی کہ انہوں نے روایت کی شرطیں نہایت سخت لگائیں۔ یہاں تک کہ جب حدیث یقینی کو بھی فعل معارض ہو گیا تو اس کو نا قابل اخذ قرار دیا۔ انہیں وجوہ سے آپ کی حدیثیں کم رہیں نہ کہ عمداً آپ نے احادیث کی روایت سے اعراض کیا۔ ان باتوں سے بجائے اس کے کہ آپ کی کسر شان ہو اور عظمت ثابت ہوتی ہے اور علم حدیث کے بھی آپ مجتہد کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ جو حدیث آپؒ نے اختیار کی ہے تمام ائمہ حدیث اسے مانتے ہیں۔" امام ابو حنیفہؒ نے اس زمانے میں جب کہ مذہب میں عقل کا نام تک لینا گناہ تھا یہ اعلان کیا کہ جو حدیث عقل کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں ہے۔

آپؒ نے حدیث کے صحیح ثابت کرنے کے لئے صرف راوی کے صدق و کذب کے علم کو کافی نہیں سمجھا بلکہ آپ یہ دیکھتے تھے کہ جو مسائل و عقائد حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں وہ عقل و قیاس کے مطابق ہیں یا نہیں راوی فہم و روایت کے اعتبار سے کیا حیثیت رکھتا ہے 'روایت باللفظ ہے یا بالمعنیٰ' محل حدیث کیا تھا کون لوگ مخاطب تھے اور کیا حالت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء حنفیہ نے حدیث کے قبول کے لئے یہ اصول مقرر کیا کہ وہ حدیث جس کے رواۃ فقیہ نہ ہوں اور ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابل حجت نہیں ہے۔

دوسرا اصول روایت جو آپ نے بیان کیا یہ وہ ہے۔ (روایت کا مطلب کسی واقعہ کو طبیعت انسانی کی خصوصیات کی کسوٹی پر پرکھنا ہے)

جو واقعات تمام لوگوں کو دن رات پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق اگر رسول اللہؐ سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار آحاد کے درجے سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہو گی۔ یہ اصول اس بناء پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں سے متعلق تھے ان کی روایت کا صرف ایک آدھ شخص میں محدود رہنا روایت کے خلاف ہے۔

ان اصولوں سے بعض کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ آپ کے نزدیک ہر وہ حدیث نا قابل قبول تھی جو قیاس کے مخالف تھی واقعہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے اکثر صحیح حدیث کو قیاس پر ترجیح دی۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق آپ کی شرائط بہت سخت تھیں۔ جب تک

کوئی حدیث ان شرائط کے مطابق ثابت نہ ہوتی آپ اس کو قابل استدلال نہ سمجھتے تھے اور قیاس جلی ہی کو ترجیح دیتے تھے لیکن جب کوئی حدیث مقرر کردہ معیار پر پوری اتر جاتی تو اس کے مقابلہ میں آپ قیاس کو ترک کر دیتے تھے۔

امام موصوف نے نوعیت ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں (1) مشہور (2) آحاد (3) متواتر۔ متواتر سے آپ کی مراد وہ حدیث ہے جس کے رواۃ طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں جن کے تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا۔ یعنی رسول اللہؐ سے بے شمار لوگوں نے روایت کی ہو اسی طرح ان لوگوں سے لے کر اخیر زمانہ تک بے شمار رواۃ روایت کرتے آئے ہوں۔

حافظ ابن حجرؒ نے حدیث متواتر کی تعریف یوں کی ہے۔

ایک تعداد کثیر جس کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو اس کو روایت کرے اور ابتدا سے انتہا تک ان کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو اور اس کی بنا محسوس پر ہو اور اس سے بداہۃً سامع کو یقین حاصل ہو جائے۔

بعض علماء کے نزدیک ان شرائط کے مطابق بہت کم حدیثیں متواتر ملتی ہیں کیونکہ راویوں کی تعداد کا رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر تدوین احادیث کے وقت تک اس قدر کثیر ہونا کہ ان کا جھوٹ بولنا عادتاً محال ہو بہت مشکل ہے۔

لیکن اکثر علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ احادیث کی کافی تعداد متواتر ہے بالخصوص وہ روایات جو احکام فرائض کے متعلق ہیں: مثلاً طہارت غسل' وضو' عبادات' معاملات' سیاسیات اور دیگر عقائد و ایمانیات نہ صرف روایتاً بلکہ عملاً متواتر طور سے ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں منتقل ہوتی آئی ہیں۔ ان راویوں اور عمل کرنے والوں کی تعداد ہر وقت اتنی کثیر رہی ہے جن کا جھوٹ بولنا محال ہے۔

(2) مشہور وہ حدیث ہے جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقے سے آخر تک اسی کثرت سے ہوں جو متواتر کے لئے مشروط ہے۔ مشہور روایتوں کی تعداد کافی ہے بعض بعض روایات کئی کئی سو راویوں نے بیان کی ہیں' مثال کے طور پر انما الا عمال بالنیات سات سو راویوں سے سات سو مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک متواتر حدیث فرضیت کے درجے پر ہے۔ اس کے احکام کا ماننا بلا کسی عذر کے فرض ہے لیکن حدیث مشہور سے فرضیت کا اثبات نہیں ہوتا۔

(3) خبر آحاد وہ حدیث ہے جو نہ مشہور ہو نہ متواتر اس کا ثبوت بالکل ظنی ہے اس قسم کی

احادیث کو امام موصوف نے قطعی تسلیم نہیں کیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ راوی کی حیثیت ایک شاہد کی سی ہے۔ روایت کے لئے کم از کم دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ شہادتیں ابتدائی راویوں سے لے کر آخر راوی تک ہونی چاہئیں۔

آپ کے قصہ شہادت میں بہت اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ بغداد میں قید کی حالت میں آپ کی وفات ہوئی ہے امام شعبی بادشاہ منصور کے قاضی تھے اور بادشاہ نے اپنے غلاموں کو زمین دی کاغذ لکھا اور کوتوال کو حکم دیا کہ اس کاغذ پر قاضی کی مہر اور دیگر علماء کی مہریں لگا کر ہمارے پاس لے آ۔

قاضی نے اور باقی علما نے مہریں لگا دیں جب امام اعظمؒ کے پاس پہنچا تو کہا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ اس کاغذ پر اپنی گواہی کی مہر لگائیں تو امام صاحب نے دریافت کیا کہ بادشاہ کہاں ہے۔ کوتوال نے کہا کہ اپنے مکان پر ہے۔ امام صاحب نے فرمایا' میں بغیر بادشاہ کے حاضر ہونے اور بغیر اس کے کلام سننے کے گواہی نہیں کرتا۔ کوتوال نے کہا کہ قاضی اور باقی علماء نے گواہی کر دی ہے تم کیوں نہیں کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا' یہ ہر ایک کا معاملہ اس کے نفس پر ہے۔ جب یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو امام شعبی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا گواہی دینے کے لئے مشہود اور مشہود علیہ کی حاضری ضروری ہے تو شعبی نے کہا ہاں' ضروری ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ تم نے کیوں مہر کی ہے بغیر میرے دیکھنے کے شعبی نے کہا کہ میں جانتا ہوں لیکن تیرے حکم کی اطاعت کی ہے اور تیرے حاضر کرنے پر میں قدرت نہیں رکھتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا یہ بات حق سے بعید ہے قاضی کو قضا سے معزول کر دیا۔ اس بات پر مصلحت ٹھہری کہ ابو حنیفہ' شریک' سفیان ثوری اور معتر بن کدام میں سے ایک کو قاضی بنایا جائے۔ بادشاہ نے ابو حنیفہ سے کہا کہ

عہدہ قضا قبول کر لیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں بزار ہوں اور کوفہ کے لوگ مجھ سے کپڑا وغیرہ خریدتے ہیں۔ عرب کے اشراف میری قضا کو قبول نہیں کریں گے۔ بادشاہ نے کہا یہ کام علم کے متعلق ہے نہ کہ نسب کے۔ امام صاحب نے کہا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔ اگر میں اس بات میں سچا ہوں تو عدم لیاقت ثابت ہو گی۔ اگر میں نے جھوٹ بولا ہے تو جھوٹا آدمی قضا کے لائق نہیں ہے۔ بادشاہ خاموش ہو گیا۔

چند روز کے بعد پھر امام صاحب کو طلب کیا گیا اور کہا کہ آپ قضا قبول کر لیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔ بادشاہ نے کہا آپ جھوٹ بولتے ہیں' آپ لائق ہیں۔ امام صاحب نے کہا اگر آپ کا کلام سچ ہے تو بڑا تعجب ہے کہ بادشاہ اسلام جھوٹے آدمی کو قاضی بنائے۔

بادشاہ نے قسم کھائی کہ میں لازماً تم کو قاضی بناؤں گا اور امام صاحب نے قسم کھائی کہ میں بالکل قضا قبول نہ کروں گا۔ حاصل قصہ کا یہ ہے کہ امام صاحب کو جیل خانہ میں ڈال دیا گیا اور حکم ہوا کہ ہر روز آپ کو سر پر کوڑے لگائے جائیں۔ امام صاحب نے فرمایا' دنیا میں کوڑے کھانے بہتر ہیں آخرت کے گرم گرزوں سے۔ آپ کا چہرہ مبارک اور سر مبارک ورم کر گیا۔ دسویں روز جب سو تازیانہ پورے ہو گئے تو آپ نے سر کو سجدہ میں رکھ کر جان کو بہ دربار رب العالمین کے سپرد کیا۔ یہ واقعہ 77ء کا ہے۔ لوگوں کی کثرت کے باعث آپ کی نماز جنازہ پانچ مرتبہ پڑھی گئی۔ آپ شہر بغداد کے مقبرہ خیزران میں دفن ہوئے۔

امام احمد بن حنبلؒ

(788ء-----865ء)

امام احمد بن حنبلؒ اسلامی تاریخ کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیت ہیں جن کے پایہ استقلال میں نہ حکمرانوں کا رعب و جلال اور تازیانے لغزش پیدا کر سکے اور نہ جن کو سیم وزر کی زنجیریں قیصر سلطانی کے گنبد پر اپنا نشیمن بنانے پر آمادہ کر سکیں' جن کا نور حق و صدق سے منور کردار اہل سنت اور اہل بدعت کی شناخت کا معیار بن گیا۔ دنیا انہیں المجدد دین' امام المصلحین امام احمد ابن حنبلؒ کے نام سے جانتی ہے۔ وہ حنبلی مکتب فکر کے بانی اور امام ہیں' ان کا امت کے نامور مجتہدین میں شمار ہوتا ہے' ان کی فقہ حنفی' مالکی اور شافعی فقہ کی طرح آج بھی عالم اسلام میں زندہ ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ 788ء میں پیدا ہوئے۔ نسلاً خالص عرب تھے۔ ان کا قبیلہ بصرہ میں رہتا تھا اور ان عرب قبائل میں سے تھا جو قبیلہ شیبان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام احمدؒ کے دادا حنبل بن بلال' بصرہ سے خراسان چلے گئے' وہیں اموی فوج میں شامل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے کمانڈر رہے' پھر سرخس کے گورنر مقرر ہوئے۔ واضح رہے کہ بنو امیہ کے عہد میں فوج کے اعلیٰ کمانڈر ہی گورنر مقرر کیے جاتے تھے۔

جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنو ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت شروع کی' تو حنبل اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں شریک ہو گئے اور اس راہ میں بڑی تکالیف اٹھائیں۔ امام احمدؒ کے والد محمد بن حنبل بھی فوجی تھے۔ ابھی امام صاحب پیدا نہیں ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ امام صاحب کی والدہ مرو سے بغداد آئیں اور یہیں امام احمدؒ پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ بڑی باہمت اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ شوہر نے مختصر سی جائداد چھوڑی تھی۔ اسی پر تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی۔ اس طرح امام صاحب بچپن ہی سے صبر و شکر' قناعت' جفاکشی' بلند ہمتی' زمانے کی مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرنے کے خوگر ہو گئے۔

امام احمد بغداد ہی میں پلے اور پروان چڑھے۔ اس زمانے کا بغداد پوری دنیا میں اسلام کا دارالخلافہ اور علم و تہذیب کا مرکز تھا' وہاں فنون و معارف کا بحر ذخار موجزن تھا۔ بڑے بڑے علماء' محدث' زبان دان' فقیہہ اور فلسفی موجود تھے اور علم کے پیاسے علم و فن کے اس منبع سے فیض یاب ہونے کے لئے چاروں طرف سے امڈ کر آرہے تھے۔ امام صاحب کو تو گویا یہ منبع گھر بیٹھے میسر آگیا۔ ان کی والدہ خاندانی روایات کے برعکس اپنے بچے کو عالم بنانا چاہتی تھیں' چنانچہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ مکتب میں بٹھادیئے گئے۔ سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا' پھر علم لغت حاصل کیا' اس کے بعد لکھنا سیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے بے پناہ حافظہ دیا تھا۔ ایک بار جو کچھ پڑھتے یا سنتے' ذہن پر گویا نقش ہو جاتا' جلد ہی انہیں مثالی طالب علم سمجھا جانے لگا۔۔۔۔۔ نہایت مہذب' لوگ اپنے بچوں کی تربیت کرتے وقت ان کی مثال سامنے رکھتے۔ ان کی صلاحیتیں' تقویٰ و طہارت اور اطوار و خصائل دیکھ کر اصحاب نظر کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اگر زندہ رہا تو اپنے عہد کا مرد کامل اور اہل زمانہ کے لئے حجت بنے گا۔

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر امام احمدؒ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ بغداد کے بڑے بڑے محدثین کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ دارالخلافے کے علمی سرچشموں سے فیض یاب ہو چکے تو بصرہ' حجاز' یمن' شام اور جزیرے کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔ امام شافعی سے پہلی بار ملاقات اور ان کی شاگردی کی سعادت حجاز کے پہلے سفر ہی میں حاصل ہوئی۔ طلب حدیث کی راہ میں ہر طرح کے مصائب اور شدائد جھیلتے اور کالے کوسوں کا فاصلہ پیدل طے کر کے علم و فضل کے ان سرچشموں تک پہنچتے جن کا چرچا بلاد اسلامیہ میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمت کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جو نیت کرتے' اسے پورا کر کے رہتے۔ چالیس برس کی عمر میں امام صاحب نے درس حدیث دینا شروع کیا۔ ان کے فضل و کمال کا چرچا بلاد اسلامیہ میں دور دور تک پھیل چکا تھا' چنانچہ ان کے درس میں طلبہ اور سامعین کا زبردست ازدہام ہوتا۔ شاگردوں کا خاص حلقہ وہ تھا جو امام صاحب کے گھر جا کر ان سے حدیث سنتا اور لکھتا۔ درس کی یہ محفلیں نہایت باوقار' پرسکون اور سنجیدہ ہوتیں۔ حاضرین ادب اور وقار کے ساتھ بیٹھتے۔

معتزلہ کی تحریک بنوامیہ کے دور میں شروع ہو گئی تھی' تاہم اسے فروغ عباسیوں کے ابتدائی عہد میں ملا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے تک ایک اچھا خاصا نام نہاد روشن خیال طبقہ وجود میں آگیا۔ اور جیسا کہ ہر زمانے میں دیکھنے میں آیا ہے اس 'روشن خیالی' سے متاثر لوگ زیادہ تر اونچے' مرفہ الحال اور غیروں کی فکری غذا پر پلنے والے دانشور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تحریک آزادی فکر و رائے' آزادی ضمیر اور رواداری کے نام پر اٹھی تھی۔ مگر امام صاحب اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح قائم

رہے۔ بغداد کا نائب حاکم اپنے آپ کو عزم و ثبات کے اس پیکر کے آگے بے بس پا رہا تھا کہ مامون کا فرمان گویا اسے اس بے بسی سے نجات دلانے کی نوید بن کر آیا۔ اس نے امام صاحب کو بیڑیوں میں جکڑ کر پولیس کے ایک دستے کی حراست میں طرطوس روانہ کر دیا۔ اس قافلے نے چند ہی منزلیں طے کی تھیں کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ اچانک بیمار ہوا اور چند روز موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہ کر اپنی فرد عمل کا حساب دینے کے لئے حضور حق تعالیٰ میں پہنچ گیا تھا۔ نئے احکام صادر ہونے تک امام احمد اور ان کے جلیل القدر ساتھی کو رقہ کے زنداں میں پہنچا دیا گیا۔

پھر انہیں بغداد لے جایا گیا۔ وہاں پہنچنے پر امام صاحب نے رات معتصم کے محل کے اندھیرے بندی خانہ میں رکوع و سجود میں گزاری۔ صبح ہوئی تو معتصم کا قاصد انہیں دربار میں لے گیا۔ قاضی القضاۃ ابن ابی دؤاد اور اس کے ہم مشرب بھی بڑی تعداد میں حاضر تھے۔ امام صاحب کی حاضری سے چند لمحے پہلے دو آدمیوں کی گردنیں ماری جا چکی تھیں اور ان کے لاشے وہاں پڑے تھے۔ معتصم نے انہیں بیٹھ جانے کو کہا۔ امام صاحب بیڑیوں کے بوجھ سے تھک گئے تھے' اجازت پا کر بیٹھ گئے۔

پھر بولے: "مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے" معتصم نے کہا "ہاں بولو!" امام صاحبؒ نے کہا: "میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے" امام صاحب کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی' پھر معتصم نے کہا: "لاالہ الہ اللہ کی شہادت کی طرف!" امام صاحب نے فرمایا: "تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں" معتصم امام احمد کے منشاء کو سمجھ گیا تھا' چنانچہ اسے اس کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا کہ احمد! میرے پیشرو نے اگر تمہیں گرفتار نہ کیا ہوتا تو میں تم سے کوئی تعرض نہ کرتا۔"

امام احمدؒ اپنی گرفتاری کے بعد ۲۸ مہینے تک قید و بند کی اذیتوں میں مبتلا رہے۔ ان کو تینتیس چونتیس کوڑے مارے گئے۔ یہ سارا عرصہ امام صاحب نے بڑے حوصلے اور جرات و وقار کے ساتھ گزارا۔ آخر امام صاحب کے صبر و استقامت کے آگے ظالموں کا جبر و تشدد جواب دے گیا' چنانچہ انہیں رہا کر دیا گیا اور اس حالت میں گھر پہنچے کہ زخموں سے چور تھے۔ صحت یاب ہونے پر درس حدیث پھر شروع کر دیا۔

معتصم کے بعد واثق تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس نے جسمانی ایذا تو نہیں دی' البتہ امام صاحب کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ اس کے مرنے کے بعد متوکل خلیفہ بنا تو فتنے کے رہے سہے بادل بھی چھٹ گئے اور مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ متوکل نے امام احمد کی نظر بندی ختم کر دی اور پچھلے مظالم کی اپنے جود و کرم سے تلافی کرنا چاہی اور انعام و عطیات سے نوازنے کی کوشش کی۔ امام صاحب

جنہوں نے کوڑوں کی مار بڑے تحمل سے برداشت کرلی تھی اس تازہ آزمائش پر چیخ اٹھے کہ یہ آزمائش کوڑوں کی مار سے زیادہ سخت ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے دامن کو اس آلائش سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ ایک بار انہوں نے متوکل کے بھیجے ہوئے ایک لاکھ کے خطیر عطیہ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا: "میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کاشتکاری کرلیتا ہوں' جو میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اس بوجھ کو اٹھا کر کیا کروں گا؟"

خیر و صلاح' تدوین حدیث' اتباع سنت' اور دفاع حق و صدق سے عبارت بھرپور زندگی گزارنے کے بعد امام احمد کا 77 برس کی عمر میں جب انتقال ہوا تو آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں بادل مجروح و محزون ان کے جنازے میں شریک تھیں۔

حضرت امام شافعیؒ

(804ء------864ء)

آپ بحر شریعت وطریقت کے تیراک اور رموز حقیقت کے شناسا تھے فراست وذکاوت میں ممتاز اور تفقہ فی الدین میں یکتائے روزگار۔ آپ نے تیرہ سال کی عمر میں ہی بیت اللہ میں فرمادیا تھا کہ جو کچھ پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھ لو' اور پندرہ سال کے سن میں فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ حضرت امام احمدؒ بن حنبل آپ کا بہت احترام اور خدمت کیا کرتے تھے۔ جب کسی نے یہ اعتراض کیا کہ آپ جیسے اہل علم کے لئے ایک کم عمر شخص کی مدارات کرنا مناسب نہیں آپ نے جواب دیا کہ "میرے پاس جس قدر علم ہے اس کے معانی ومطالب سے وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہے' اور اسی کی خدمت سے مجھے احادیث کے حقائق معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو ہم علم کے دروازے پر ہی کھڑے رہ جاتے اور فقہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند رہ جاتا۔ اور اس دور میں وہ اسلام کا سب سے بڑا محسن ہے۔ وہ فقہ معانی اور علوم لغت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور حضور اکرمؐ کے اس قول کے مطابق کہ ہر صدی کی ابتدا میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا کہ اہل علم اس سے علم دین حاصل کریں گے اور اس صدی کی ابتدا امام شافعی سے ہوئی ہے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ امام شافعی کے دور میں ان سے زیادہ دانشور اور کوئی نہیں۔ حضرت بلالؒ خواص کا قول ہے کہ میں نے حضرت خضرؑ سے پوچھا کہ امام شافعیؒ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے! فرمایا کہ ان کا شمار اوتاد میں ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ ابتدائی دور میں کسی کی شادی یا دعوت میں شریک نہ ہوتے' مخلوق سے کنارہ کش ہو کر ذکر الہیٰ میں مشغول رہتے' حضرت سلیم راعی کی خدمت میں حاضر ہو کر فیوض باطنی سے فیضیاب ہوتے اور آہستہ آہستہ ایسے عروج کمال تک رسائی حاصل کر لی کہ اپنے دور کے تمام مشائخ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ عبداللہ انصاری کا قول ہے کہ گو میرا شافعی مسلک سے تعلق نہیں لیکن امام صاحب

کے بلند مراتب کی وجہ سے ان کے عقیدت مندوں میں ہوں۔

آپ کی والدہ بہت بزرگ تھیں اور اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے۔ ایک دفعہ دو آدمیوں نے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک صندوق آپ کے پاس بطور امانت رکھوایا۔ اس کے بعد ایک شخص آکر وہ صندوق لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شخص نے آکر صندوق طلب کیا تو آپ نے کہا کہ میں تمہارے ساتھی کو وہ صندوق دے چکی ہوں۔ اس نے کہا جب ہم دونوں نے ساتھ رکھوایا تھا تو پھر آپ نے میری موجودگی کے بغیر اس کو کیسے دے دیا؟ اس جملہ سے آپ کی والدہ کو بہت ندامت ہوئی لیکن اسی وقت امام شافعیؒ بھی گھر میں آگئے اور والدہ سے کیفیت معلوم کر کے اس شخص سے کہا کہ تمہارا صندوق موجود ہے لیکن تم تنہا کیسے آگئے' اپنے ساتھی کو ہمراہ کیوں نہیں لائے ہو۔ پہلے اپنے ساتھی کو لے آؤ۔ یہ جواب سن کر وہ شخص ششدر رہ گیا۔

جس وقت آپ امام مالکؒ کے پاس پہنچے تو آپ کی عمر سترہ سال تھی چنانچہ آپ ان کے دروازے پر اس نیت سے کھڑے رہتے۔ جو شخص امام مالکؒ سے فتوے پر دستخط لے کر نکلتا تو آپ بغور اس کا مطالعہ کرتے۔ اگر جواب صحیح ہوتا تو اس شخص کو رخصت کر دیتے اور اگر کوئی خامی نظر آتی تو واپس امام مالک کے پاس بھیج دیتا اور وہ غور کرنے کے بعد نہ صرف اس خامی کو دور کر دیتے بلکہ امام شافعی کے عمل سے بہت مسرور ہوتے۔

خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیوی میں کسی بات پر تکرار ہو گئی تو زبیدہ نے کہا کہ تم جہنمی ہو اور ہارون رشید نے کہا کہ اگر میں جہنمی ہوں تو تیرے اوپر طلاق ہے۔ یہ کہہ کر بیوی سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن محبت کی زیادتی کی وجہ سے جب جدائی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی تو تمام علماء کو بلا کر پوچھا کہ میں جہنمی ہوں یا جنتی؟ لیکن کسی کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ امام شافعی بھی کم سنی کے باوجود ان علماء کے ساتھ تھے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو میں اس کا جواب دوں اور اجازت کے بعد خلیفہ سے پوچھا کہ آپ کو میری ضرورت ہے یا مجھے آپ کی؟ خلیفہ نے کہا کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا تم تخت سے نیچے آجاؤ کیوں کہ علماء کا مرتبہ تم سے بلند ہے۔ چنانچہ اس نے نیچے آکر آپ کو تخت پر بٹھا دیا۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ تمہیں کبھی ایسا موقع بھی ملا ہے کہ گناہ پر قادر ہونے کے باوجود محض خوف الٰہی سے گناہ سے باز رہے ہو؟ اس نے قسمیہ عرض کیا کہ ہاں ایسے مواقع بھی آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم جنتی ہو۔ علماء نے اس کی حجت طلب کی تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قصد گناہ کے بعد جو شخص خوف خدا سے گناہ سے رک گیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے"

ایک روایت کے مطابق حاکم روم کچھ رقم سالانہ ہارون رشید کے پاس بھیجا کرتا تھا لیکن ایک مرتبہ چند راہبوں کو بھیج کر یہ شرط لگادی کہ اگر آپ کے دینی علماء مناظرے میں ان راہبوں سے جیت گئے تو میں اپنی رقم جاری رکھوں گا ورنہ بند کر دوں گا۔ چنانچہ خلیفہ نے تمام علماء کو مجتمع کر کے حضرت امام شافعیؒ کو مناظرہ پر آمادہ کیا۔ آپ نے پانی کے اوپر مصلیٰ بچھا کر فرمایا کہ یہاں آکر مناظرہ کرو۔ یہ صورت حال دیکھ کر سب ایمان لے آئے۔ جب اس کی اطلاع حاکم روم کو پہنچی تو اس نے کہا کہ یہ بہت اچھا ہوا اس لئے کہ اگر وہ شخص آجاتا تو پورا روم مسلمان ہو جاتا۔

امام شافعیؒ حافظ نہیں تھے اور کچھ لوگوں نے خلیفہ سے شکائت کر دی کہ آپ حافظ نہیں ہیں۔ اس نے بطور آزمائش رمضان میں آپ کو امام بنادیا۔ چنانچہ آپ دن بھر میں ایک پارہ حفظ کر کے رات کو تراویح میں سنادیا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ماہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا۔

آپ ایک حسینہ پر فریفتہ ہو گئے اور اس سے نکاح کرنے کے بعد صرف صورت دیکھ کر اور مہر ادا کر کے طلاق دے دی امام شافعیؒ نے امام حنبلؒ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک عمداً نماز ترک کر دینے والا کافر ہو جاتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کی کیا شکل ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نماز ادا کرے۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ کافر کی تو نماز ہی درست نہیں۔ یہ سن کر آپ ساکت رہ گئے۔

ایک شخص نے آپ سے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا کہ دوسروں کے برابر دولت جمع کرنے کی سعی مت کرو بلکہ عبادت میں برابر کی کوشش کرتے رہو کیوں کہ دولت تو دنیا میں رہ جاتی ہے اور عبادت قبر کی ساتھی ہے کبھی کسی مردے سے حسد نہ کرو کیوں کہ دنیا میں سب مرنے کے لئے آئے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ گزرے ہوئے وقت کی جستجو میں نکلے تو صوفیاء کی ایک جماعت نے کہا کہ گزرا ہوا وقت تو ہاتھ نہیں آتا لہذا موجودہ وقت ہی کو غنیمت جانو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو مراد حاصل ہو گئی کیوں کہ تمام دنیا کا علم مجھ کو حاصل نہیں ہوا اور میرا علم صوفیاء کے علم تک نہیں پہنچا اور صوفیاء کا علم انہیں کے ایک مرشد کے اس قول تک نہیں پہنچا کہ موجودہ وقت شمشیر قاطع ہے۔

عالم نزع میں آپ نے وصیت نامہ میں تحریر کر دیا تھا اور زبانی بھی لوگوں سے کہہ دیا کہ فلاں شخص سے دینا کہ وہ مجھ کو غسل دے۔ لیکن وفات کے بہت عرصہ بعد وہ شخص مصر سے واپس آیا تو لوگوں نے وصیت نامہ اور زبانی وصیت اس تک پہنچادی۔ چنانچہ وصیت نامہ میں تحریر تھا کہ میں ستر ہزار کا مقروض ہوں۔ یہ پڑھ کر اس شخص نے قرض ادا کیا اور لوگوں سے کہا کہ غسل سے آپ کی یہی مراد تھی۔

امام احمد ابن تیمیہؒ

(1285ء-----1328ء)

احمد تقی الدین ابو العباس ابن تیمیہ 22 جنوری 1285ء کو پیدا ہوئے۔ عمر چھ سال تھی کہ ان کے خاندان کو حران سے دمشق جانا پڑا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ قرآن حفظ کیا پھر صرف و نحو' تاریخ اور ادب پڑھا۔ آپ کی وفات 1328ء میں ہوئی۔

ان کے دادا ابو البرکات مجد الدین ابن تیمیہؒ کا شمار اپنے وقت کے حنبلی مسلک کے اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ والد شہاب الدین عبد الحلیم ابن تیمیہؒ بھی متبحر عالم' محدث' فقیہہ' اور صاحب درس وافتاء تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تاتاری قہر الٰہی بن کر عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے تھے۔ امام صاحبؒ سات برس کے تھے کہ اس سیلاب بلا کی خونیں لہریں ان کے وطن کی طرف بڑھیں اور لوگ جانیں بچانے کے لئے محفوظ علاقوں میں منتقل ہونے لگے۔ سخت افراتفری اور خوف کا عالم تھا۔ لوگ قیمتی مال و متاع لئے شہر خالی کر رہے تھے۔ شیخ شہاب الدین کا سب سے بڑا سرمایہ ان کا خاندانی کتب خانہ تھا جو کئی پشتوں سے اس خاندان کی علمی وجاہت کا نشان چلا آتا تھا۔ شیخ نے مادی مال و متاع کو چھوڑ کر علم کی بیش بہا دولت کو رخت سفر بنایا' کتابیں گاڑی پر بار کیں اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر شام کی طرف چل کھڑے ہوئے کہ یہی علاقہ قریب ترین تھا اور تاتاریوں کی خونیں یلغار سے بچا ہوا تھا۔ یہ سفر ننھے احمد کے لئے یقیناً ایک ایسا تجربہ تھا جس نے آنے والے ماہ و سال میں ان کے شعور و نفسیات کو علم و عمل اور دعوت و جہاد کے سانچے میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قدم قدم پر تاتاریوں کی دہاڑ کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ہر طرف رگوں میں لہو جما دینے والی وحشت پھیلی ہوئی تھی' بچوں اور عورتوں کا ساتھ تھا' جانور دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی شیخ کو خود کھینچنا پڑ رہی تھی' پھر راستے کی صعوبتیں مزید پریشان کن تھیں۔ آخر شیخ کی عزیمت ساری مشکلات پر غالب آئی اور یہ قافلہ دمشق پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابن تیمیہ کے علمی گھرانے کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا' دمشق نے اس علمی گھرانے کے لیے

اپنی آغوش محبت وا کر دی۔ یہ شہر صدیوں سے علم کا گہوارہ چلا آتا تھا۔ تاتاریوں کے سیلاب بلا سے بچنے کے لئے بے شمار علمی خانوادے پہلے ہی یہاں منتقل ہو چکے تھے۔ اس طرح دمشق کی علمی فضا میں تازگی اور شادابی آگئی تھی، شیخ شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہؒ نے چند روز کے اندر دمشق میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ وہ جامع اموی اور دارالحدیث السکریہ میں درس دینے لگے۔ احمد تقی الدین اسی علمی گہوارے میں پلے اور پروان چڑھے۔ امام ابن تیمیہؒ کا خاندان اپنے بے پناہ حافظہ کی وجہ سے مشہور تھا۔ ان کے دادا اور والد کا بھی بڑا قوی حافظہ تھا، مگر امام ان سب سے سبقت لے گئے، خصوصا سرعت حفظ میں تو کوئی ان کی مثال نہ تھا۔ جو چیز ایک بار غور سے پڑھ لیتے، لوح دماغ پر نقش ہو جاتی۔ ان کے اس خداداد وصف کا چرچا دمشق میں گھر گھر پھیلا ہوا تھا۔ جو بھی سنتا دنگ رہ جاتا۔ حلب کے ایک بہت بڑے عالم نے ان کا امتحان لیا تو حیرت میں ڈوب کر رہ گئے اور پکار اٹھے یہ بچہ اگر جیتا رہا تو کام کا آدمی بنے گا۔ بچپن ہی سے علم گویا ان کی تفریح بھی اور زندگی کا مقصد بھی تھا اور دعوت حق کی اشاعت و سربلندی کا ذریعہ بھی۔ بے مثل حافظہ امام صاحب کی علمی و دعوتی زندگی میں سب سے زیادہ قابل اعتماد رفیق رہا۔ قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد اپنے صاحب علم و فضل والد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور خاندان کی عزیز ترین میراث کے اس طرح وارث ہوئے کہ تاریخ میں چند ہی علمی خانوادے اس کے ہمسر ملیں گے۔ گھر کا خزانہ علم دل و دماغ کی وسعتوں میں سمٹ کر باہر نکلے تو جہاں کہیں بھی علم کا چشمہ جاری تھا وہاں پہنچے اور اس سے جی بھر کر سیراب ہو کر آئے۔ سترہ برس تک وہ علم تفسیر، فن حدیث و رجال، فقہی مذاہب، احکام فقہ، عربی ادب، تاریخ، منطق، فلسفہ اور وقت کے تمام مروجہ علوم پر عبور حاصل کر کے کمال کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے شوق طلب علم کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف حدیث میں انہوں نے دو سو سے زائد شیوخ سے استفادہ کیا۔

حدیث اور قانون کا علم انہوں نے شامی اساتذہ سے حاصل کیا۔ ابھی سترہ سال کے تھے کہ انہیں فتوے جاری کرنے کی سند دے دی گئی۔ ابھی تیس برس کے نہیں ہوئے تھے کہ انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا مگر انہوں نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ وہ صرف بڑے عالم ہی نہ تھے بلکہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ ابن تیمیہؒ نے تحریروں کے انبار لگا دیئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد پانچ سو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ کتابیں لکھیں۔ انہوں نے سیاسیات سمیت متعدد موضوعات پر اپنے خیالات قلم بند کیے۔

دور خلافت کے بعد آنے والے حکمران خاندانوں نے خود کو شریعت کے قوانین سے دور دور رکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ جن مسلمان مفکرین نے اپنے خیالات

کی نیو اسلامی قوانین پر اٹھائی تھی ان کے لئے عہد موجود کے رجحانات اور اسلامی ضابطوں میں تال میل پیدا کرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ اس فضا میں ابن تیمیہ قرآن وسنت کے سرچشموں سے سیاسی بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک حکمران میں پائی جانے والی صفات کے بیان کی بجائے شرعی قوانین کی تعبیر و تشریح پر اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کرتے۔ ان کے سیاسی افکار صرف ایک مسئلہ کے گرد گھومتے ہیں : اسلامی قوانین سماجی اصلاحات اور تنظیم نو میں کہاں تک معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم ابن تیمیہ اپنے عہد کی سیاست اور اسلامی قوانین کے درمیان تعلق کو دانستہ نظر انداز کرتے ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ دونوں کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے جائیں ؟

ابن تیمیہ نہ تو انسان کے کردار کے بارے میں کچھ کہتے ہیں اور نہ ہی یہ بتاتے ہیں حکمران کا کردار کیسا ہونا چاہیے۔ وہ چیزوں کو اسی حالت میں قبول کرتے ہیں۔ تاہم وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک فرد کی دوسرے فرد پر برتری ثابت کرنے کی کوشش انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ ابن تیمیہ نے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا۔

1۔ وہ لوگ جو دوسروں پر غلبہ پانا چاہتے ہیں۔ یہ گروپ آمروں، سلاطین اور ایسے روسا پر مشتمل ہوتا ہے جو فساد کا بیج بوتے ہیں۔ یہ بدترین خلائق لوگ ہیں۔

2۔ اس گروہ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو دوسروں سے بدتر تو نہیں ہوتے لیکن معاشرتی بے چینی اور فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ میں چور اور دوسرے جرائم پیشہ افراد آتے ہیں۔

3۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو گروہ اور برتری کے خواہاں ضرور ہیں مگر اس کے لیے دنگا فساد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی گروہ میں وہ مذہبی راہ نما بھی شامل ہیں جو ذاتی برتری کے حصول کے لئے مذہب کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

4۔ چوتھے گروہ میں ایسے افراد آتے ہیں جو دوسروں سے افضل ہوتے ہوئے بھی نہ تو کسی قسم کی برتری کے خواہاں ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنے کا قصد کرتے ہیں۔

ابن تیمیہ سیاست اور ایمان کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ایک کے بغیر دوسرے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ ان کی نظر میں سیاست دراصل اللہ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور جو لوگ اللہ کی قربت چاہتے ہیں دراصل وہ ایمان کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں ۔چنانچہ ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں مادی خوشحالی اور آخرت میں روحانی نجات حاصل کرنے کے لیے اللہ کے نام پر اپنی دولت تقسیم کریں۔ ابن تیمیہ اپنی کتاب "سیاست شرعیہ" میں لکھتے

ہیں کہ ملک پر حکومت کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام کے مذہبی عقائد کی اصلاح کی جائے۔ اگر ایمان جاتا رہے تو پھر سب کچھ چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں سیم وزر کی فراوانی بے معنی ہو جاتی ہے۔

ابن تیمیہؒ اسی کتاب میں لکھتے ہیں: "اگر کوئی ملک بے عقیدہ ہو جاتا ہے یا ریاست ایمان یا عقیدے کی حمایت ترک کر دیتی ہے تو پھر وہاں کے لوگ بھی اخلاق باختہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے عہد میں جو انتشار اور آشوب ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکمرانوں کا مذہب پر سے ایمان اٹھ گیا ہے" حیرت کی بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے شاہوں کی حکمرانی کو جائز بھی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امت کا فرض ہے کہ وہ ان حکمرانوں کی وفادار رہے۔ ابن تیمیہ کو خلافت اور خلیفہ کے معاملہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے نزدیک امام کے انتخاب کا طریقہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ امام کا تقرر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے جو اجماع کے بے خطا طریقہ سے عمل میں آتا ہے' تاہم وہ امام کو شرع کا مکمل طور پر پابند کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں حاکم کے لئے امین اور طاقتور ہونا لازمی ہے۔

امام کے فرائض کے بارے میں ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فرض اس امانت کی نگہداشت ہے جو بطور حکومت اس کے سپرد ہوئی ہے۔ اولی الامر یا امام کا ادائے امانت کے بعد دوسرا فریضہ قیام عدل ہے اور تیسرا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر واضح موقف اور عملدر آمد ہے۔ آخری یہ کہ امام انتہائی اعلیٰ اخلاق کا مالک ہونا چاہیے۔

اتنے علم و فضل کے باوجود امام تیمیہ کے نزدیک عوام کی امامت یعنی سیاسی راہنمائی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ عقیدت کو سیاسی حیثیت حاصل ہے اور وہ ان مفکرین سے اتفاق نہیں کرتے جو اس خیال کی حمایت کرتے تھے کہ صحیح بنیادوں پر معاشرتی نظام کا قیام مقاصد نبوت میں سے تھا۔ ان کے خیال میں نبوت کا فریضہ لوگوں کو پاک کرنا اور انہیں قرآن و حکمت کی تعلیم دینا ہے۔

امام تیمیہؒ ریاست کے انتظام کے تصور سے انکار نہیں کرتے لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن نے کسی مخصوص نظام کا تصور نہیں دیا لہذا اس کو وہ اہمیت نہیں دی جا سکتی جو عقیدے یا حدود کو دی جا سکتی ہے۔ ان کے نزدیک امامت رسالت کے بعد کا تصور ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ حضورؐ کی اطاعت ان کی زندگی کے بعد بھی لازم ہے جبکہ امام کی وفات کے بعد اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی۔

امام تیمیہؒ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ نے عربوں پر سیاسی بالادستی قائم کر لی تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا لازم ہے کہ یہ عمل اسلام میں ریاست و نظام حکومت کی طرف سنت رسول کا اہم اقدام تھا جس کی پیروی کرنا اجتماعی طور پر لازم آتا ہے۔

پانچواں حصہ

صوفیاء و اہل ریاضت

خواجہ حسن بصریؒ

(645ء------728ء)

21ہجری مطابق 645عیسوی میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے' بصرے میں پرورش پائی' اسی مناسبت سے بصری کہلائے۔ آپ کے والد محترم کے نام کے میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے یسار لکھا ہے۔ لیکن موسیٰ بن راعی بن خواجہ اویس قرنی بہت مشہور نام ہے۔

یہ بات تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق لکھی ہے کہ جب حسن بصریؒ پیدا ہوئے تو آپ کے والد محترم موسیٰ بن راعی انہیں دعائے خیر و برکت کے لئے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں اٹھا لائے۔ جناب فاروقؓ نے آپ کو دیکھا تو فرمایا' واللہ کتنی پیاری صورت ہے' ماشاء اللہ بڑا ہی خوبرو اور حسین و جمیل بچہ ہے۔ اس کا نام حسن رکھو۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں حسن بصریؒ کی کینت ابو سعید بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ جواہر فروشی کے سبب آپ حسن لولوئی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ کی والدہ خیرہ ام المومنین ام سلمہؓ کی خادمہ تھیں۔ ام سلمہ خواجہ کو بہت پیار کرتی تھیں۔

یوں تو حسن بصریؒ نے بڑے بڑے صحابیوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے۔ لیکن علوم ظاہری و باطنی آپ نے بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے حاصل کئے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آپ جناب امام حسنؓ کے مرید و شاگرد تھے۔ ممکن ہے آپ دونوں ہی کے مرید و شاگرد ہوں۔ علاوہ ازیں ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کے دوران قیام بصرہ آپ نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے تبرکاً طہارت سکھا دیجئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک طشت منگوا کے آپ کو وضو کرنا سکھایا۔ بصرے میں وہ مقام جہاں یہ واقعہ ہوا آج تک "باب الطشت" کے نام سے مشہور ہے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے عالم صرف چار ہی ہیں۔ مدینہ میں المسیبؒ' شام میں مکحولؒ کوفہ میں شعبیؒ بصرے میں امام المتصوفین والعارفین خواجہ حسن بصریؒ۔ تمام سیرت

نگاروں نے یہ بات بالاتفاق لکھی ہے کہ حسن بصریؒ اگرچہ نسلاً حبشی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت بڑا فصیح اللسان بنایا۔ حجاج بن یوسف آپ کی فصاحت کے مقابلے میں خود کو ہیچ سمجھتا تھا۔

علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے اور تیسرے دور میں جن حاملین حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصنیفات و ملفوظات کے مستقل ترجمے لکھے اور انہیں ترتیب دیا ہے۔ ان میں حسن بصریؒ سر فہرست ہیں۔ اس کے علاوہ ذہبی نے خواجہ کے مفصل سوانح بھی تحریر کئے ہیں۔

واقعہ کربلا اور اس کے بعد بھی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنے والوں نے قتل و غارتگری کا جو بازار گرم کیا' حسن بصریؒ اسے ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی یہ طریقہ موثر ہو سکتا تھا۔ حسن بصریؒ نے مسلمانوں کے ذہن کا دنیا سے رخ پھیرنے کے لئے دین میں کمال زہد و اطاعت کی بنیاد رکھی۔ الغرض دنیا کی سخت مذمت کی اور یہاں تک نفرت کی کہ دنیا کی محبت کو ایمان کی کمزوری قرار دیا۔ دراصل زہد و عبادت گوشہ گیری اور اللہ کے خوف سے گریہ کرتے رہنے کی جو بنیاد حسن بصریؒ نے رکھی وہ آپ کے زمانے کے سیاسی احوال کا نتیجہ ہے۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ مسلمانی کی تعریف کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔ جواب میں ارشاد فرمایا "مسلمانی در کتاب و مسلماناں در گور" یعنی مسلمانی کتاب میں ہے اور مسلمان قبر میں ہیں۔ پھر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا یا حضرت ہمارے دل سوئے ہوئے ہیں آپ کے ارشادات اور پند و نصائح کا ان پر اثر کیوں نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کے لئے کیا علاج کرنا چاہئے۔ فرمایا "اگر دل سوئے ہوئے ہی ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی انہیں جھنجوڑ کر جگایا جا سکتا تھا۔ رونا تو یہ ہے کہ دل مر چکے ہیں اب انہیں کتنا ہی جھنجوڑو جگانے کی کوشش کرو بیدار نہیں ہو سکتے۔"

حسن بصریؒ نے مسلمانوں کو دنیا اور صرف دنیا ہی کے ہو رہنے پر بڑی سختی سے روکا اور خلاف پیمبر چلنے سے منع کیا۔ آپ کی نظر قرآن حکیم اور حدیث نبوی کی تفصیل پر تھی اس لئے آخرت کی زندگی آپ کے نزدیک گویا آنکھوں دیکھی چیز تھی۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حسن بصریؒ کی بیان درد و کرب اور سوز و گداز سے پر ہوتا یہی سبب تھا کہ جو بات آپ کے منہ سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں تیر کی طرح اترتی چلی جاتی۔ آپ کی زبان میں غضب کا اثر تھا جو ایک مرتبہ کہہ دیتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی۔

جنازے کے ساتھ چلنا آپ کے نزدیک فرض اولیٰ تھا۔ ایک مرتبہ کسی کے جنازے میں شریک تھے جب لوگ اسے قبر میں اتار چکے اور گھر کو واپس آنے لگے تو آپ ایک جگہ پر بیٹھ گئے اور لوگوں سے فرمایا: "اے دنیا کے پرستارو' مال و دولت کے حریصو! دیکھ لیا تم نے توی کا انجام۔ یہ جگہ دنیا کا آخری

مقام اور آخرت کی پہلی منزل ہے۔ پھر کیا ناز اور کیا غرور اس دنیا پر جس کا انجام بالآخر یہ ہے۔ سن لو کہ یہ دنیا جائے عبرت ہے۔"

ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ دیکھا کوئی حبشی عورت کو پہلو میں لئے بیٹھا ہے اور اس کے قریب ہی شراب کی ایک بوتل پڑی ہے وہ خود بھی پی رہا ہے اور عورت کو بھی پلا رہا ہے۔ آپ کے دل میں خیال گزرا کہ یہ شخص اگرچہ شراب پی رہا ہے تاہم مجھ سے ہر حال میں بہتر ہے۔ پھر سوچا کہ بہتر کیونکر ہو سکتا ہے' یہ تو شراب پی رہا ہے۔ اتنے میں آپ نے دیکھا کہ مال واسباب سے لدی ہوئی ایک کشتی آ رہی ہے۔ جب وہ کشتی حبشی کے قریب آئی تو ڈوب گئی جس میں مال واسباب کے علاوہ سات آدمی بھی تھے جو غوطے کھانے لگے حبشی فوراً دریا میں کود پڑا اور انہیں باہر نکال لایا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اس خیال سے توبہ کر لی اور دریا میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی طرح خود بھی حبشی کی اس جرات کے طفیل دریائے خود بینی سے نکل آئے اور پھر آپ نے تمام عمر خود کو رذیل سے رذیل اور گنہگار سے گنہگار آدمی سے بھی کبھی اونچا نہیں سمجھا بلکہ خود کو اس سے کمتر ہی خیال کرتے رہے۔

ایک شخص کے بارے میں لوگوں نے شکایت کی کہ وہ نماز باجماعت میں شامل نہیں ہوتا اور اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا "اے شخص تجھے ایسا کونسا ضروری کام آ پڑا جو تجھے نماز باجماعت میں شریک ہونے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں باز رکھتا ہے۔" اس نے عرض کی' میری کوئی سانس اور انسانیت کا کوئی لمحہ معصیت و گناہ سے خالی نہیں اس لئے میں خدا کی بارگاہ میں گریہ زاری میں مسرور رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "اے شخص تو مجھ سے بہتر ہے" اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے۔

آپ نے فرمایا ورع و پرہیزگاری کے تین درجے ہیں: ایک یہ کہ غیض و غضب کی حالت میں بھی سچ بات کہے' سچ کو ترک نہ کرے' حق بات اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جن باتوں کی ممانعت ہے انہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔

حسن بصریؒ کا زمانہ ولایت دو اعتبار سے مشہور ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے وقت میں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے زمانے کے زاہدوں' عابدوں اور گوشہ نشینوں نے صوفی کا لقب پایا' اور آگے چل کر اس سلسلے کے جو دوسرے بزرگ پیدا ہوئے انہوں نے تصوف کے مسلک کی باقاعدہ تنظیم کی' اس کے فروغ و اشاعت کے لئے تصنیف اور تالیف کا آغاز کیا۔ اختلاف عقائد کے معاملے میں حسن بصریؒ کا طرز عمل نہایت صلح کل تھا۔ یہی سبب ہے کہ بعد کے زمانے ہی میں نہیں

بلکہ خود انہی کے وقت میں بھی بعض لوگوں نے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ معتزلہ کا گروہ حسن بصریؒ ہی کو اپنے فاسد عقائد کا امام قرار دیتا تھا۔ اور یہ بھی طبقات ہی میں لکھا ہے کہ حسن بصریؒ کو اسی سبب سے جناب معاذ کی حدیث پیش کر کے اپنے بارے میں اہل سنت والجماعت ہی کے عقیدے کو بطور توثیق وصیت پر پیش کرنا پڑا۔

آپ کے چند ایک اقوال مندرجہ ذیل ہیں جو ابن جوزی نے صفوۃ الصفا میں نقل کئے:
درحقیقت وہ شخص سب سے بڑا فاجر و فاسق ہے جو چھوٹے بڑے سبھی گناہ کئے چلا جاتا ہے مگر کہتا جاتا ہے کہ کوئی خطرے کی بات نہیں 'وہ بخشنہار سب کے گناہ بخشنے والا ہے' میرے لئے کوئی کھٹکا نہیں۔ سعید بن جبیرؒ تابعی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ مجھے چند نصیحتیں فرمائیں' آپ نے فرمایا 'تین چیزوں سے تمہیں روکتا ہوں۔ اول یہ کہ بادشاہوں سے میل جول نہ بڑھانا' ان کی عنایات پر بھروسہ نہ کرنا کیونکہ انہیں آنکھ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دوم یہ کہ کسی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا چاہے تم اسے قرآن حکیم ہی کی تعلیم کیوں نہ دو۔ تیسرے یہ کہ دنیا کے کسی راگ رنگ میں نہ پڑنا۔ جس نے ان باتوں پر عمل کیا اس نے ہدایت کی راہ پائی۔

حسن بصریؒ اس اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ ایک طرف امام الحدیث تھے اور دوسری طرف بصرے کے سب سے بڑے فقیہہ۔ آپ نے فقیہہ یا مجتہد کے لئے حسب ذیل شرطیں مقرر کی ہیں: اول فقیہہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے یعنی دنیا اس کے نزدیک مقصود بالذات نہ ہو۔ دوم 'آخرت کے امور میں رغبت رکھے۔ سوم دین میں کامل بصیرت حاصل ہو۔ چہارم 'طاعات پر مداومت کرنے والا ہو۔ پنجم مسلمانوں کی بے آبروئی اور ان کی حق تلفی سے بچنے والا ہو۔ ششم اجتماعی مفاد اس کے سامنے رہے 'یعنی انفرادی و شخصی مفاد پر قومی و اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتا ہو۔ ہفتم یہ کہ مال و دولت کا اسے لالچ نہ ہو۔

خواجہ حسن بصریؒ نے 728 عیسوی میں انتقال کیا۔ بصرے سے دو تین کوس پر آپ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ

(اندازاً 705ء---- 786ء)

ابراہیم ادھم بہت ہی اہل تقویٰ بزرگوں میں سے ہوئے ہیں اور بہت سے مشائخین سے شرف نیاز حاصل کیا بہت عرصہ تک امام ابو حنیفہؒ کی صحبت میں رہے۔ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کو وہ تمام علوم حاصل تھے جو اولیا کرام کو ہوا کرتے ہیں اور در حقیقت آپ گنجینہ علوم کی کلید تھے ۔ایک مرتبہ امام ابو حنیفہ کی مجلس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا لیکن امام ابو حنیفہ نے "سیدنا" کہہ کر خطاب کیا اور اپنے نزدیک جگہ دی۔ اور جب لوگوں نے سوال کیا کہ انھیں سرداری کیسے حاصل ہو گئی تو امام صاحب نے فرمایا کہ ان کا مکمل وقت ذکر و شغل میں گذرتا ہے ،اور دنیاوی مشاغل میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔

ابتداً میں آپ بلخ کے سلطان اور عظیم المرتبت حمران تھے۔ ایک مرتبہ آپ محو خواب تھے کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو آواز دے کر پوچھا کہ چھت پر کون ہے؟ جواب ملا کہ میں آپ کا ایک شناسا ہوں اونٹ کی تلاش میں چھت پر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ چھت پر اونٹ کس طرح آسکتا ہے تو اس نے کہا آپ کو تاج و تخت میں خدا کس طرح مل جائے گا۔ یہ سن کر آپ ہیبت زدہ ہو گئے۔ دوسرے دن جس وقت دربار جما ہوا تھا تو ایک بہت ہی ذی حشم شخص دربار میں آپہنچا۔ حاضرین پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ کسی میں کچھ پوچھنے کی سکت باقی نہ رہی اور وہ شخص تیزی کے ساتھ تخت شاہی کے نزدیک پہنچ کر چاروں طرف کچھ دیکھنے لگا۔ جب ابراہیم ادہم نے سوال کیا کہ تم کون ہو اور کس کی تلاش میں آئے ہو تو اس نے کہا کہ میں قیام کرنے کی نیت سے آیا تھا لیکن یہ تو سرائے معلوم ہوتی ہے اس لیے یہاں قیام ممکن نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ برادرم یہ سرائے نہیں بلکہ شاہی محل ہے۔ اس نے سوال کیا کہ آپ سے قبل یہاں کون آباد تھا، فرمایا کہ میرے باپ دادا، غرض کہ اسی طرح کئی پشتوں تک پوچھنے کے بعد اس نے کہا اور اب آپ

کے بعد یہاں کون رہے گا۔ فرمایا کہ میری اولادیں، اس نے کہا کہ ذرا تصور فرمایئے جس جگہ اتنے لوگ آکر چلے گئے اور کسی کو ثبات حاصل نہ ہو سکا وہ جگہ سرائے نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ غائب وگیا اور ابراہیم ادہم چونکہ رات ہی کے واقعہ سے بہت مضطرب تھے اس لیے اس واقعہ نے اور بھی بے چین کر دیا اور آپ اس کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے ایک جگہ جب ملاقات کے بعد آپ نے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے خضرؑ کہتے ہیں۔ اسی ادھیڑبن میں آپ لشکر سمیت شکار کے لیے روانہ ہوئے لیکن لشکر سے بچھڑ کر جب تنہا رہ گئے تو غیب سے ندا آئی: اے ابراہیم! موت سے قبل بیدار ہو جاؤ۔ آواز مسلسل آتی رہی جس سے آپ کی قلبی کیفیت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ آپ گھبرا کر اس طرح متوجہ الی اللہ ہوئے کہ قلب نور باطنی سے منور ہو گیا۔ اس کے بعد آپ تخت و تاج کو خیرباد کہہ کر صحرا بصحرا گریہ وزاری کرتے ہوئے نیشاپور کے قرب وجوار میں پہنچ کر ایک تاریک اور بھیانک غار میں مکمل نو سال تک عبادت میں مصروف رہے اور ہر جمعہ کو لکڑیاں جمع کر کے فروخت کر کے جو کچھ ملتا آدھا راہ مولا میں دے دیتے اور باقی ماندہ رقم سے روٹی خرید کر نماز جمعہ ادا کرتے اور پھر ہفتہ بھر کے لیے غار میں چلے جاتے۔

جب عوام کو آپ کے مراتب کا اندازہ ہو گیا تو آپ نے اس غار کو خیرباد کہہ کر مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ شیخ ابوسعیدؒ نے اس غار کی زیارت کر کے فرمایا کہ اگر یہ غار مشک سے لبریز کر دیا جاتا جب بھی اتنی خوشبو نہ ہوتی جتنی ایک بزرگ کے چند روزہ قیام سے موجود ہے۔

صحرائی سفر میں آپ کی ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ سے ملاقات ہوئی جس نے آپ کو اسم اعظم کی تعلیم دی اور آپ ہمیشہ اسی اسم اعظم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہے۔ پھر اسی دوران آپ کی ملاقات جب حضرت خضر سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ جن بزرگ نے تمہیں اسم اعظم کی تعلیم دی وہ میرے بھائی الیاس ہیں۔ اس کے بعد اپ نے باقاعدہ طور پر حضرت خضر کی بیعت کی اور بلند مراتب تک پہنچے۔ پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ میں بیابانوں کی خاک چھانتا ہوا جب نواح عراق میں پہنچا تو ایسے ستر فقرا کو دیکھا جو راہ مولیٰ میں اپنی جان نچھاور کر چکے تھے لیکن ان میں ایک فرد ایسا باقی تھا جس میں زندگی کے کچھ آثار موجود تھے۔ جب میں نے اس واقعہ کی نوعیت دریافت کی تو اس نے کہا کہ اے ابراہیم! اس محراب اور پانی کو جزو حیات بنا کر آگے جانے کی سعی نہ کرو ورنہ مجبور ہو جاؤ گے اور قربت کا تصور بھی چھوڑ دو ورنہ اذیت اٹھاؤ گے کیوں کہ کسی کی اب طاقت نہیں کہ سلامت روی کی حالت میں گستاخی کا مرتکب ہو سکے اور اس دوست سے بھی ڈرتے رہو جو حاجیوں کو کفار روم کی مانند بذریعہ جنگ تہہ تیغ کر دیتا ہے۔ ادھمؒ اس بیابان میں یہ عہد کر کے کہ خدا کے سوا کسی سے

سروکار نہ رکھیں گے محض توکل علی اللہ کے سہارے مقیم ہو گئے۔ جب قطع مسافت کرتے ہوئے بیت اللہ کے قریب پہنچے تو حضرت خضرؑ سے شرف نیاز حاصل ہو گیا ادھم نے آپ کی ملاقات کو مبارک فال تصور کرتے ہوئے اپنی سعی کے بار آور ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا' لیکن اسی وقت ندا آئی کہ اے عہد شکنو! اے فریب کارو! کیا تمہارا یہی عہد تھا کہ مجھ کو فراموش کر کے دوسروں سے رسم وراہ بڑھاؤ۔ سن لو کہ میں تمہیں اس جرم کی سزا میں شہرت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ چنانچہ اے ابراہیم ادہم' یہ تمام فوت شدہ لوگ اسی کے قہر کا شکار ہو گئے اور اگر تم بھی غیریت چاہتے ہو تو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا اور حضرت ابراہیمؒ نے حیرت زدہ ہو کر اس شخص سے پوچھا کہ تم کیسے زندہ بچ گئے۔ تو جواب دیا کہ ابھی نیم پختہ ہوں اور اب انہیں کی طرح پختہ ہو کر جان دینا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ بھی جاں بحق ہو گیا۔

آپ قطع مسافت کرتے اور گریہ وزاری فرماتے مکمل 14 برس میں مکہ معظمہ پہنچے' اور جب اہل حرم بزرگوں کو آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ برائے استقبال نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے محض اس خوف سے کہ کوئی شناخت نہ کر سکے خود کو قافلے سے جدا کر لیا اور جب خادمان اہل حرم نے جو آگے آگے تھے' دریافت کیا کہ ابراہیم بن ادہم کتنی دور ہیں؟ اہل حرم ان سے نیاز حاصل کرنے آ رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ ایک ملحد و دہریہ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ یہ سنتے ہی خدام نے آپ کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا کہ ملحد و دہریہ تو خود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ جب وہ لوگ آگے نکل گئے تو آپ نے اپنے نفس سے فرمایا کہ اپنے کرتوت کی سزا بھگت لی' کیوں کہ خدا کا شکر ہے کہ اہل حرم کے استقبال کرنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جب لوگوں نے آپ کو شناخت کر لیا تو اس قدر عقیدت مند ہو گئے کہ اپ نے بھی وہیں سکونت اختیار کر لی اور بے شمار افراد آپ کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے۔ آپ کی یہ حالت تھی کہ حصول رزق کے لئے بڑی مشقت کے ساتھ کبھی جنگل سے لکڑیاں لا کر فروخت کرتے اور کبھی کسی کے کھیت پر رکھوالی کا کام کرتے۔

جب آپ نے بلخ کی سلطنت کو خیرباد کہا تو اس وقت آپ کا ایک بہت چھوٹا سا بچہ تھا اور جب اس نے جوانی میں پوچھا کہ میرے والد کہاں ہیں؟ تو والدہ نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد بتایا کہ وہ اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ اس لڑکے نے پورے شہر میں منادی کروا دی کہ جو لوگ میرے ہمراہ سفر حج پر چلنا چاہیں میں ان کے پورے اخراجات برداشت کروں گا' یہ منادی سن کر تقریباً چار ہزار افراد چلنے پر تیار ہو گئے جن کو وہ لڑکا اپنے ہمراہ لے کر والد کے دیدار کی تمنا میں کعبۃ

اللہ پہنچ گیا۔ اس نے مشائخین حرم سے اپنے والد کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے مرشد ہیں اور اس وقت اس نیت سے جنگل میں لکڑیاں لینے گئے ہیں کہ فروخت کر کے اپنے اور ہمارے کھانے کا انتظام کریں۔ لڑکا جنگل کی جانب چل پڑا اور ایک بوڑھے کو سر پر لکڑیوں کا بوجھ لاتے دیکھا۔ گو فرط محبت سے وہ بے تاب ہو گیا لیکن خاموشی کے ساتھ آپ کے پیچھے بازار تک پہنچ گیا اور وہاں جا کر حضرت ابراہیم ادھم نے آواز لگائی کہ کون ہے جو پاکیزہ مال کے عوض پاکیزہ مال خریدے۔ یہ سن کر ایک شخص نے روٹیوں کے عوض میں لکڑیاں خرید لیں، جن کو آپ نے اپنے ارادت مندوں کے سامنے رکھ دیا' اور خود نماز میں مشغول ہو گئے۔ آپ اپنے ارادتمندوں کو ہمیشہ یہ ہدایت فرمایا کرتے کہ کبھی کسی عورت یا بے ریش لڑکے کو نظر بھر کر نہ دیکھنا اور خصوصاً اس وقت بہت محتاط رہنا جب ایام حج کے دوران کثیر عورتیں اور بے ریش لڑکے جمع ہو جاتے ہیں۔ تمام افراد اس ہدایت کے پابند رہتے ہوئے آپ کے ہمراہ طواف میں شریک رہتے' لیکن ایک مرتبہ حالت طواف ہی میں آپ کا لڑکا سامنے آگیا اور بے ساختہ آپ کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ فراغت طواف کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے عرض کیا کہ اللہ آپ کے اوپر رحم فرمائے آپ نے جس سے باز رہنے کی ہمیں ہدایت کی تھی اس میں خود ہی ملوث ہو گئے۔ کیا آپ اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو تمہارے علم میں ہی ہے کہ جب میں نے بلخ کو خیر باد کہا تو اس وقت میرا چھوٹا سا بچہ تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بچہ ہے۔ اگلے دن آپ کا ایک مرید جب بلخ کے قافلہ کی تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لڑکا دیباو حریر کے خیمہ میں ایک کرسی پہ بیٹھا تلاوت قرآن کر رہا ہے۔ مرید نے سوال کیا کہ آپ کس کے صاحبزادے ہیں؟ یہ سنتے ہی اس لڑکے نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا' لیکن کل ایک بوڑھے لکڑہارے کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ شاید یہی میرے والد ہیں۔ اگر میں ان سے کچھ پوچھ کچھ کرتا تو اندیشہ تھا کہ وہ فرار ہو جاتے کیونکہ وہ گھر سے فرار ہیں اور ان کا اسم گرامی ابراہیم بن ادہم ہے۔ یہ سن کر مرید نے کہا کہ چلئے میں ان سے آپ کی ملاقات کروا دوں اور اپنے ہمراہ آپ کی بیوی اور لڑکے کو لے کر بیت اللہ میں داخل ہو گیا۔ جس وقت بیوی اور بچے کی آپ پر نظر پڑی تو فرط محبت سے بیتابانہ دونوں لپٹ گئے۔ روتے روتے بے ہوش ہو گئے اور ہوش آنے کے بعد جب حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ تو لڑکے نے جواب دیا اسلام۔ پھر سوال کیا کہ کیا تم نے قرآن کریم پڑھا ہے۔ لڑکے نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تعلیم حاصل کی ہے۔ لڑکے نے کہا جی ہاں۔ یہ سن کر فرمایا کہ الحمد اللہ۔ آپ جانے کے لئے اٹھے تو بیوی اور بچے نے اصرار کر کے آپ کو روک لیا۔ آپ نے آسمان

کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا کہ یاالٰہی اغثنی۔ یہ کہتے ہی آپ کے صاحبزادے زمین پر گر پڑے اور فوت ہو گئے۔ ارادتمندوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ جب میں بچے سے ہم آغوش ہوا تو وفور جذبات اور فرط محبت سے بیتاب ہو گیا۔ اسی وقت یہ ندا آئی کہ ہم سے دوستی کے دعویٰ کے بعد دوسرے کو دوست رکھتا ہے۔ یہ ندا سن کر میں نے عرض کیا کہ یااللہ یا تو لڑکے کی جان لے لے یا پھر مجھے موت دے دے۔ چنانچہ لڑکے کے حق میں دعا قبول ہو گئی اور اس پر کوئی اعتراض کرے تو میرا یہ جواب ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے زیادہ تحیر خیز نہیں' کیوں کہ انہوں نے بھی تعمیل حکم میں اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کی ٹھان لی تھی۔

ابراہیم ادھمؒ اکثر یہ فرماتے کہ مجھے یہ جستجو رہتی تھی کہ رات میں کسی وقت خانہ کعبہ خالی مل جائے' لیکن ایسا موقع نصیب نہ ہوتا تھا۔ اتفاق سے ایک شب بارش ہو رہی تھی اور میں تنہا طواف میں مشغول تھا اور میں اسے حسن اتفاق سمجھ کر حلقہ کعبہ میں ہاتھ ڈال کر اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے لگا' لیکن یہ ندا آئی کہ پوری مخلوق مجھ سے طالب مغفرت ہوتی ہے اور اگر میں سب کو معاف کر دوں تو پھر میری غفاریت و رحمانیت کی کیا قدر رہ جائے گی۔ یہ سن کر آپ نے عرض کیا' اے اللہ میری مغفرت فرما دے۔ ندا آئی کہ دوسروں کے متعلق ہم سے سوال کر اپنے متعلق ہم سے کچھ نہ کہہ کیوں کہ دوسروں کے لئے تیری سفارش مناسب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اکثر یہ دعا کیا کرتا' اے اللہ تو علیم و خبیر ہے کہ تیری عنایت و کرم جو مجھ پر ہے اس کے مقابلہ میں آٹھوں جنتوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں' اور اسی طرح تیری محبت کے مقابلے میں آٹھوں جنتیں ہیچ ہیں۔ لہٰذا اے خدا معصیت سے بچاتے ہوئے مجھے اطاعت کا شرف عطا فرما دے۔ جو تیری ذات سے واقف ہے اسے کیا خبر کہ اس شخص کی کیا کیفیت ہو گی جو تجھ سے قطعاً ناواقف ہے۔

اپ اکثر یہ فرمایا کرتے کہ پندرہ برس کی مکمل اذیتوں کے بعد مجھے یہ ندا سنائی دی کہ عیش و راحت کو ترک کر اس کی بندگی اور احکام کی تعمیل کے لئے مستعد ہو جا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے سوال کیا کہ آپ نے سلطنت کو کیوں خیرباد کہا! فرمایا کہ ایک دن آئینہ لئے ہوئے میں تخت شاہی پر متمکن تھا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ نہ تو میرے پاس طویل سفر کے لئے زاد راہ ہے اور نہ کوئی حجت و دلیل' جب کہ میری آخری منزل قبر ہے اور حاکم بھی عادل و منصف ہے۔ بس یہ خیال آتے ہی میرا دل بجھ سا گیا اور مجھے سلطنت سے نفرت ہو گئی۔ پھر سوال کیا کہ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے' فرمایا کہ کیا کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر ننگی بھوکی رہنے کے لئے نکاح پر تیار ہو سکتی ہے؟ اور اگر میرا بس چلے تو میں خود اپنے آپ ہی کو طلاق دے دوں' پھر بھلا ان حالات میں کسی طرح میں کسی عورت کو اپنی

وابستگی سے فریب دے سکتا ہوں۔ روایت ہے کہ جب آپ کے اوپر واردات غیبی کا نزول ہوتا تو فرمایا کرتے کہ سلاطین عالم آکر دیکھیں کہ یہ کیسی واردات ہے اور اپنی شوکت و سلطنت پر نادم ہوں ۔ خواہشات کا بندہ کبھی سچا نہیں ہو سکتا کیوں کہ خدا کے ساتھ اخلاص کا تعلق صدق و خلوص نیت سے ہے۔ پھر فرمایا کہ جس کو تین حالتوں میں دل جمی حاصل نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس کے اوپر باب رحمت بند ہو چکا ہے۔ تلاوتِ کلام مجید کے وقت' دوم حالت نماز میں' سوم ذکر و شغل۔ تین حجابات رفع ہو جانے کے بعد قلب سالک پر سارے خزانے کشادہ کر دیئے جاتے : اول یہ کہ کبھی دنیا کی سلطنت قبول نہ کرے' دوم اگر کوئی شے سلب کر لی جائے تو غمزدہ نہ ہو کیوں کہ کسی شے کے حصول پر اظہار مسرت کرنا حریص ہونے کی علامت ہے اور غم کرنا غصہ کی نشانی ہے' سوم یہ کہ کسی طرح کی تعریف و بخشش پر بھی اظہار مسرت نہ کرے کیوں کہ اظہار مسرت کرنا کمتری کی علامت ہے اور احساس کمتری والا ہمیشہ ندامت کا شکار ہوتا ہے۔

ایک دن آپ کو کھانا نصیب نہ ہوا تو شکرانے کی چار سو رکعتیں ادا کیں اور جب اسی طرح مکمل سات یوم گزر گئے اور آپ کے ضعف و کمزوری میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے بھوک کا اظہار کیا۔ چنانچہ اسی وقت ایک نوجوان آپ کو اپنے مکان پر لے گیا اور آپ کو پہچان کر عرض کیا کہ میں آپ کا دیرینہ غلام ہوں اور میری تمام املاک آپ ہی کی ملکیت ہے۔ یہ سن کر آپ نے اسے آزاد کر کے تمام جائداد اسی کے حوالے کر دی اور یہ عہد کر لیا کہ اب کبھی کسی سے کچھ طلب نہ کروں گا کیونکہ روٹی کے ایک ٹکڑے کی طلب پر پوری دنیا پیش کر دی گئی۔

حضرت سہیل فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ آپ کے ہمراہ دوران سفر بیمار ہو گیا اور آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ سب میری بیماری پر خرچ کر دیا۔ جب سب چیزیں ختم ہو گئیں تو اپنا خچر فروخت کر کے خرچ کیا اور صحت یاب ہونے کے بعد جب میں نے خچر کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ وہ تو میں نے فروخت کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں سفر کس طرح کر سکوں گا تو فرمایا کہ میرے کاندھوں پر اور آپ یقین کریں کہ مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر تین منزل تک سفر کیا ۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی مکہ معظمہ میں اس لئے کوئی پھل نہیں خریدا کہ وہاں کی بیشتر زمینیں فوجیوں نے خرید رکھی تھیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے بے شمار حج کرنے کے بعد بھی محض اس خوف سے کبھی آب زمزم نہیں پیا کہ اس پر حکومت کا ڈول رہتا تھا۔

اگر کوئی آپ کی معیت اختیار کرنا چاہتا تو آپ اس کے سامنے تین شرطیں پیش فرماتے ضاول یہ کہ میں سب کا خادم بن کر رہوں گا دوم اذان بھی میں خود دیا کروں گا' سوم جو شے مجھے میسر

ہو گی وہ سب کو مساوی تقسیم کروں گا۔ جب ایک شخص نے کہا کہ میں ان شرائط کی پابندی نہیں کر سکتا تو فرمایا کہ مجھے تیری صداقت پر حیرت ہے۔ ایک شخص برسوں آپ کی صحبت میں رہ کر جب واپس جانے لگا تو عرض کیا کہ اگر کچھ خامیاں یا برائیاں آپ نے میرے اندر دیکھی ہوں تو متنبہ فرما دیں تاکہ میں ان کے ازالے کی سعی کرتا رہوں۔ فرمایا کہ میں نے تمہیں سدا نظر محبت سے دیکھا ہے اور عیوب پر صرف دشمن کی نظر ہوتی ہے۔

لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کس کی بندگی کرتے ہیں' یہ سن کر آپ لرزہ براندام ہو کر زمین پر گر پڑے اور بہت دیر تک لوٹتے رہے' پھر بیٹھ کر یہ آیت تلاوت کی ان کل من فی السموات والارض الا اتی الرحمن عبدا (آسمان اور زمین پر رہنے والے سب کے سب خدا کے سامنے بندے ہو کر آنے والے ہیں) اور جب لوگوں نے یہ سوال کیا کہ زمین میں گرنے سے قبل آپ نے یہ آیت کیوں تلاوت نہیں کی' فرمایا کہ اگر میں خود کو اللہ کا بندہ کہوں تو وہ حق بندگی طلب کرے گا اور بندہ ہونے سے منکر بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ سے دعاؤں کی عدم قبولیت کی شکایت کی گئی تو فرمایا کہ تم خدا کو پہچانتے ہوئے بھی اس کی اطاعت سے گریزاں ہو اور اس کے قرآن و رسولؐ سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور اس کا رزق کھا کر بھی اس کا شکر نہیں کرتے' جنت میں جانے اور جہنم سے نجات پانے کا انتظام نہیں کرتے' ماں باپ کو دفن کر کے بھی عبرت حاصل نہیں کرتے' ابلیس کو غنیم جانتے ہوئے بھی اس سے معاندت نہیں کرتے' موت کی آمد کا یقین رکھتے ہوئے اس سے بے خبر ہو اور اپنے عیوب سے واقف ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی عیب جوئی کرتے رہتے ہو' پھر بھلا خود سوچو کہ ایسے لوگوں کی دعائیں کیسے قبولیت حاصل کر سکتی ہیں۔

ابراہیم ادھم فرمایا کرتے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیلؑ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کوئی کتاب سی بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور میرے سوال کے جواب میں فرمایا' میں اس میں اللہ کے دوستوں کے نام درج کرتا رہتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔ فرمایا کہ تمہارا خدا کے دوستوں میں شمار نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے دوستوں کا دوست تو ضرور ہوں۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر ساکت رہے' پھر فرمایا کہ مجھے منجانب اللہ یہ حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے تمہارا نام درج کروں اس کے بعد دوسروں کا' کیونکہ اس راستہ میں مایوسی کے بعد ہی امید ہوتی ہے۔

روایت ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد پورے عالم نے یہ ندا سنی کہ آج دنیا کا امن فوت

ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ لیکن آپ کی گمشدگی کی وجہ سے نہ تو یہ معلوم ہو سکا کہ آپ کا مزار کہاں ہے اور نہ یہ پتہ چلا کہ انتقال کس جگہ ہوا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مزار بغداد میں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت لوطؑ کی قبر کے نزدیک شام میں مدفون ہیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ

(آٹھویں صدی عیسوی)

آپ شریعت وطریقت میں کامل اور علوم رسالت کے وارث تھے جس کی وجہ سے عوام نے آپ کو امیر المومنین کا خطاب دیا تھا۔ علوم ظاہری وباطنی پر آپ کو مکمل دسترس حاصل تھی اور بہت سے مشائخین اپ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادھم نے آپ کو سماعت حدیث کی دعوت دی۔ جب آپ وہاں پہنچ گئے تو فرمایا کہ مجھ کو تو صرف آپ کے اخلاق کا امتحان مقصود تھا ورنہ در حقیقت کسی کام کی غرض سے نہیں بلایا۔

ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے الٹا پاؤں مسجد میں رکھ دیا جس کے بعد ہی یہ ندا آئی کہ اے ثوری مسجد کے حق میں یہ گستاخی اچھی نہیں۔ بس اسی دن سے آپ کا نام ثوری پڑ گیا۔ بہر حال یہ ندا سن کر خوف کا ایسا غلبہ ہوا کہ غش کھا کر گر پڑے اور ہوش آنے کے بعد اپنے منہ پر طمانچے لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ بے ادبی کی ایسی سزا ملی کہ میرا نام ہی دفتر انسانیت سے خارج کر دیا گیا۔ لہذا اے نفس اب ایسی بے ادبی کی جرات کبھی نہ کرنا۔

ایک مرتبہ کسی کے کھیت میں آپ کا قدم پڑ گیا تو فوراً ندا آئی کہ اے ثور دیکھ بھال کر قدم رکھ۔ حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ جس پر خدا کا اتنا بڑا کرم ہو کہ صرف ایک قدم غلط پڑنے پر توبیخ فرمائی گئی تو اس کی باطنی کیفیت کیا ہو گی آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضور اکرمؐ کے جس قدر بھی اقوال سنے ان پر عمل پیرا رہا۔ آپ کا یہ مقولہ تھا کہ محدثین کو زکوۃ ادا کرنی چاہئے' یعنی دو سو احادیث میں سے کم از کم پانچ احادیث پر عمل کرنا ضروری ہے۔

حالت نماز میں خلیفہ وقت نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ ایسی نماز قطعی بے حقیقت ہے اور قیامت میں تیری نماز گیند کی طرح منہ پر مار دی جائے گی۔ آپ عہد شباب ہی میں کبڑے ہو گئے تھے اور لوگوں کو بے حد اصرار پر بتایا کہ میرے تین اساتذہ جو بہت زیادہ عابد و

زاہد تھے' موت سے قبل تینوں یہودی' نصرانی اور آتش پرست ہو گئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر مجھ پر خوف کا ایسا غلبہ ہوا کہ میری کمر جھک گئی اور ہمہ وقت خدا سے سلامتی ایمان کی دعا کرتا رہتا ہوں۔

آپ کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ ایک شخص نے جب آپ کی خدمت میں کوئی تحفہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہ فرمایا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ آپ نے تو کبھی مجھ کو کوئی نصیحت تک نہیں کی جو یہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس کا معاوضہ دے رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تو راستہ دکھایا ہے۔ اگر میں تمہارا تحفہ قبول کر لوں تو ہو سکتا ہے کہ میرے قلب میں تمہاری رغبت پیدا ہو جائے اور اسی کا نام دنیا ہے۔

آپ اپنے ہمسایہ کے جنازے میں شریک ہوئے تو اس وقت تمام لوگ مرحوم کی تعریفیں کر رہے تھے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ وہ تو منافق تھا اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا تو میں جنازے میں کبھی شریک نہ ہوتا اس کی منافقت کی دلیل یہ ہے کہ اہل دنیا اس کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل دنیا سے بہت گہرا تعلق تھا اور یہی چیز اس کی منافقت پر دلالت کرتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے الٹا کرتہ پہن لیا اور جب لوگوں نے سیدھا کرنے کے لئے کہا تو فرمایا کہ میں نے تو خدا کے لئے پہنا ہے پھر مخلوق کے کہنے سے سیدھا کیوں کروں۔

ایک نوجوان نے حج سے محروم رہ جانے پر سرد آہ کھینچی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے چار حج کئے ہیں اور ان کا اجر میں اس شرط پر تجھے دینے کے لئے تیار ہوں کہ تو اپنی آہ کا اجر مجھے دے دے' اس نے شرط منظور کر لی تو آپ نے خندہ پیشانی سے اپنے تمام حجوں کا ثواب اس کو منتقل کر دیا۔ آپ نے خواب دیکھا کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے ایک آہ خرید کر وہ نفع حاصل کر لیا جسے اہل عرفات پر تقسیم کیا جائے تو سب مالا مال ہو جائیں۔

آپ ایک حمام میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک نو عمر حسین لڑکا وہاں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو فوراً یہاں سے نکال دو' کیوں کہ عورت کے ہمراہ تو صرف ایک ہی شیطان رہتا ہے لیکن نوخیز حسین لڑکے کے ہمراہ اٹھارہ شیطان ہوتے ہیں تاکہ دیکھنے والے کے سامنے لڑکے کو آراستہ کر کے پیش کریں۔

کھانے کے وقت ایک کتا آ کھڑا ہوا اور آپ نے اس کو روٹی ڈال دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ بیوی بچوں کے ہمراہ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ فرمایا کہ وہ سب خدا کی عبادت میں حارج ہو جاتے ہیں' لیکن یہ کتا میری حفاظت کرتا ہے جس کی وجہ سے میں پرسکون ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہتا ہوں۔

ایک مرتبہ آپ گریہ وزاری کرتے ہوئے حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔لوگ سمجھے کہ شائد خوف معصیت سے یہ حالت ہے‘لیکن آپ نے فرمایا کہ میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ نہ جانے میرے ایمان میں کچھ صداقت بھی ہے یا نہیں‘ اور گناہوں کی فکر تو اس لئے نہیں کہ رحمت خداوندی کے مقابلہ میں گناہ ایک بے حقیقت شے ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ عارفین کو معرفت‘ عابدین کو قربت اور حکماء کو حکمت اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتا ہے۔ پھر فرمایا کہ گریہ وزاری کی بھی دس قسمیں ہیں جن میں 9 حصے ریا سے بھرپور ہوتے ہیں اور ایک حصہ خشیت سے لبریز ہوتا ہے۔ اعمال نیک کرنے والوں کے اعمال کو ملائکہ عمل نیک کے دفتر میں درج کر لیتے ہیں جب کوئی ان اعمال پر فخر کرنے لگے تو پھر اپنی اعمال کو ریا کے دفتر میں منتقل کر دیتے ہیں سلاطین و امراء سے منسلک رہنے والا عابد بھی ریاکار ہوتا ہے۔ زاہد کی شناخت یہ ہے کہ نیک کام انجام دے کر نہ تو ان پر فخر کرے اور نہ اپنے زہد کا ڈھنڈورا پیٹے۔ زہد کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ موٹا اناج اور بوسیدہ لباس استعمال کرتا رہے اور دنیا سے نہ دل لگائے اور نہ امیدوں میں اضافہ کرے خدا سے خوفزدہ رہنے والوں کو گذر بسر کا غم نہیں رہتا۔ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنے والا اس لئے بہتر ہوتا ہے کہ اسلاف کا طریقہ یہی تھا کہ عظمت کے بجائے ذلت کو پسند کرتے تھے۔ اہل دنیا کا سونا بیداری سے اس لئے افضل ہے کہ وہ نیند کی حالت میں دنیا سے دور رہتے ہیں۔ زاہدوں کی صحبت اختیار کرنے والا بادشاہ اس زاہد سے بہتر ہے جس کو بادشاہ کا قرب حاصل ہو۔ مخلوق میں پانچ قسم کے لوگ زیادہ ہر دلعزیز ہوتے ہیں: اول زاہد عالم‘ دوم فقیہہ صوفی‘ سوم متواضع تونگر‘ چہارم شاکر درویش‘ پنجم شریف سنی۔ اہل یقین تکالیف کو بجا تسلیم کرتے ہوئے کبھی ناشکری نہیں کرتے۔ ہم انہی کو محبوب تصور کرتے ہیں جو زخم پہنچاتے ہیں اور ہماری دولت پر قابض ہو جاتے ہیں۔

کسی نے یقین کا مفہوم پوچھا تو فرمایا کہ قلبی آواز کا نام یقین ہے اور اہل یقین معرفت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ یقین کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ہر مصیبت کو منجانب اللہ تصور کیا جائے ۔لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ حضور اکرمؐ نے جو یہ فرمایا کہ زیادہ گوشت خوروں کو اللہ تعالیٰ دشمن تصور کرتا ہے‘ آخر اس میں کیا بھید ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ یہاں گوشت سے مراد غیبت ہے کیوں کہ مسلمان کی غیبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے مردار کا گوشت کھا لیا اور اہل غیبت کو اللہ تعالیٰ دشمن تصور کرتا ہے۔

آپ نے حضرت حاتم سے فرمایا کہ میں تمہیں ان چار چیزوں سے آگاہ کرتا ہوں جن کو

عوام نے بر بنائے غفلت فراموش کر دیا ہے: اول یہ کہ لوگوں پر تہمت لگا کر ان کو برا بھلا کہنا احکام خداوندی سے غافل بنا دیتا ہے' دوم کسی مومن کے عروج پر حسد کرنا ناشکری کا پیش خیمہ ہے' سوم ناجائز دولت جمع کرنے سے انسان آخرت کو بھول جاتا ہے' چہارم خدا تعالیٰ کی وعید پر خوف زدہ نہ ہونے اور ان وعدوں پر اظہار مایوسی کرنے سے کفر عائد ہو جاتا ہے۔

جب آپ کا کوئی ارادت مند سفر کا قصد کرتا تو آپ فرماتے کہ اگر کہیں راہ میں موت نظر پڑے تو میرے لیے لیتے آنا' اور مرتے دم رو کر فرمایا کہ میں موت کا بہت خواہش مند رہتا تھا لیکن آج معلوم ہوا کہ موت لا ٹھی ٹیک کر دنیا میں سفر کرنے سے کہیں زیادہ دشوار ہے آپ موت کا ذکر سن کر خوف کے مارے بیہوش ہو جایا کرتے تھے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے کہ موت سے پہلے اس کا سامان مہیا کر لو۔ موت کے وقت لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کو جنت مبارک ہو تو فرمایا کہ اہل جنت تو دوسرے لوگ ہیں ہماری وہاں تک رسائی کہاں ہو سکتی ہے۔

جس وقت بصرہ میں آپ بیمار پڑے تو حاکم بصرہ نے آپ کو تلاش کرنے کا حکم دیا اور جب لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو آپ کو مویشیوں کے باندھنے کی جگہ پایا۔ اس وقت آپ درد شکم اور پیچش کی وجہ سے شدید اضطراب میں تھے لیکن ایسی حالت میں ذکر الٰہی سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوئے۔

عبداللہ مہندی بیان کرتے ہیں کہ میں موت کے وقت آپ کے پاس ہی تھا اور آپ نے فرمایا کہ میرا چہرہ زمین پر رکھ دو' کیوں کہ اب وقت بالکل قریب ہے۔ چنانچہ میں حکم کی تعمیل کر کے لوگوں کو اطلاع دینے کی غرض سے باہر نکلا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ ایک جم غفیر ہے۔ لوگ اندر داخل ہوئے تو آپ کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی اور آپ نے تکیہ کے نیچے سے ایک ہزار کی تھیلی نکال کر فرمایا کہ اس کو فقراء میں تقسیم کر دو۔ لوگوں کے قلب میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ آپ دوسروں کو تو دولت جمع کرنے سے منع کرتے رہے اور خود ایک ہزار دینار جمع کر لئے۔ لیکن آپ نے لوگوں کی نیت کا اندازہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دیناروں سے میں نے ایمان کا تحفظ کیا ہے' کیوں کہ جب ابلیس مجھ سے یہ پوچھتا تھا کہ اب تم کہاں سے کھاؤ گے تو میں جواب دیتا کہ میرے پاس یہ دینار موجود ہیں اور جب وہ سوال کرتا کہ تمہیں کفن کہاں سے نصیب ہو گا اس وقت بھی میں یہی جواب دیتا۔ مجھے ان دیناروں کی قطعی ضرورت نہ تھی مگر وسوسہ شیطانی کے لئے جمع کر لئے تھے۔ یہ فرما کر کلمہ پڑھا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ حضرت ابراہیم ادھم کے ہم عصر تھے

حضرت رابعہ الاداویہ

(717ء ---- 801ء)

اسلام کی پہلی صدی کے اختتام پر دنیائے اسلام انسانی فکری تاریخ میں ایک دھماکہ خیز دور کا آغاز کر رہی تھی۔ جب عالمان دین اور فلسفی انسانی وجود کے مرکزی مسائل اور قرآن پاک کی تفسیر پر استدلالی تناظر لاگو کر رہے تھے تو مرتاضوں کا ایک گروہ ابھرنا شروع ہوا، جس نے شاہی انداز فکر کو چیلنج کیا۔ صوفیانہ روایت رابعہ الاداویہ (المشہور رابعہ بصری) کو دینیات اور تصوف کی نئی ترکیب سازی کرنے میں مرکزی حیثیت پیش کرتی ہے۔

حضرت رابعہ کے بارے میں ہماری معلومات کا انحصار بالخصوص ان سے منسوب کردہ اقوال اور بعد ازاں سوانح نگاروں کی تحریر کردہ حکایتوں پر ہے۔ رابعہ بصری کی پیدائش 717ء میں عراق کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی، اور انہیں بچپن میں ہی لونڈی کے طور پر بیچ دیا گیا۔ آقا نے جب یہ دیکھا کہ وہ سارا دن کام کے بعد ساری ساری رات محو عبادت رہتی ہیں تو آزاد کر دیا۔ رابعہ نے شدید مذہبی وظائف اور عقلی مباحث سے بھرپور زندگی گزاری اور شادی کی بہت سی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا۔

صوفیانہ فکر کی ترقی میں رابعہ کا کردار حسن بصری (وفات 728ء) کے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعدد حکایتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ حسن اپنے دور کی مشہور محکم مذہبی شخصیت، ماہر حدیث اور (رسول اللہ ﷺ کے) بہت سے اصحابؓ کے رفیق تھے۔ وہ اسلام میں زاہدانہ سعادت مندی کا اولین وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کی مطلق قدرت اور انسان کی آزاد مرضی جیسے معاملات کا پہلا تنقیدی محقق بھی تھے۔ درحقیقت حسن بصری کو بہت سے لوگ تصوف اور اسلامی علم الکلام دونوں کا بانی خیال کرتے ہیں۔

حکایات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ رابعہ بصری حسن کو جانتی تھیں تو اس

وقت رابعہ بہت نوجوان جب کہ حسن کی عمر کافی زیادہ ہو گی۔ حسن اور رابعہ کے قصوں میں اہم نکتہ ان کی معروضی تاریخیت نہیں بلکہ وہ بنیادی صوفیانہ خیالات ہیں جو ان کے ذریعہ واضح ہوئے اور رابعہ کی ذات میں پیش ہوئے۔ حکایتیں زمانہ وسطیٰ میں صوفیوں کی روحانی مناظرے کی روایت پر مبنی ہیں جن میں دو عارف گفتگو کے ذریعہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے اور دونوں میں سے کوئی ایک زیادہ عقل مند اور زیادہ مخلص ثابت ہو جاتا۔ سابقہ عاجز لونڈی رابعہ اپنے عہد کی انتہائی مشہور مذہبی اور فکری شخصیت حسن کے ساتھ مناظروں میں متواتر جیتتی ہیں۔ جو چیز ان کہانیوں اور ان سے منسلک دیگر حکایتوں اور اقوال کو مربوط کرتی ہے وہ دینیاتی معاملات کے ساتھ صوفیانہ زہد کا نئے انداز میں امتزاج پیدا کرنے کے لیے رابعہ کی قابلیت ہے۔ یہ بھی تصوف کی بنیاد بنی۔

اس امتزاج نے قرآن پاک کے عقیدہ توحید کو صوفیانہ تحریکی قوتوں اور انسان کی خود مختار حیثیت اور خدا کے قادر مطلق ہونے کے ساتھ ملا دیا۔ رابعہ کے خیال میں خدا کی تصدیق محض زبانی توثیق کا ہی معاملہ نہ تھا۔ صرف اپنی ساری زندگی اور خیالات کو واحد معبود کی جانب راغب کر کے خدائے تعالیٰ کی مستند تصدیق کی جا سکتی ہے۔ کسی اور شئے کو اہمیت دینا ایک قسم کی صنم پرستی ہے۔ انہوں نے حسن اور دیگر روحانی راہنماؤں پر متواتر تنقید کی کہ وہ صوفیانہ زاہد بن گئے ہیں اور اسے حتمی وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ خدا کی خاطر تارک الدنیا ہونے کا دعویٰ کرنے والوں پر رابعہ نے کڑی تنقید کی: اگر انہوں نے واقعی خدا کا صدق پا لیا تھا تو وہ اس کی مذمت کرنے والی کسی بھی شئے پر اتنی توجہ نہ دیتے۔

اس طرح ایک توحید کے اصول کے طور پر خدائے واحد کی عقائدانہ تصدیق اس روحانی جستجو کے ساتھ یکجا ہو گئی جس میں صرف ایک چیز ہی کسی شخص کی توجہ کا معروض ہو سکتی تھی۔ یہ امتزاج رابعہ کے مشہور نظریہ صدق یا سچی محبت کی صورت اختیار کر گیا۔ رابعہ کے خیال میں سزا و جزا کے لالچ یا خوف سے بالاتر ہو کر عمل کرنا ہی صدق ہے۔

روز حساب کے بارے میں قرآن کی آیات پیغمبرانہ ابلاغ کی انتہائی خوبصورت اور پر زور مثالیں ہیں۔ ان کی بہت سی تفسیریں کی گئیں۔ البتہ رابعہ کے دور تک یہ واضح ہے کہ وہ عوامی ذہن میں جنت و دوزخ کے پیچیدہ بیان اور سزا و جزا کی نفسیات کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔ زہد و ریاضت کے دوران عذاب جہنم کے خوف کو مادی وجود کی اشتہاؤں پر غلبہ پانے کی راہ کے طور پر شدید تر بناتے رہنے کے لیے حسن بصری مشہور تھے۔

رابعہ بصری نے سزا و جزا کی پوری عمارت کو مسترد کر دیا۔ بہت سے حوالوں میں رابعہ کو

خدا سے یہ دعا کرتے ہوئے بتایا کہ اگر وہ جنت کے لالچ سے بے پرواہو کر عبادت کریں تو اسے جنت دے اور اگر دوزخ کے خوف سے عبادت کریں تو دوزخ کا عذاب ملے۔ایک مشہور قصہ کے مطابق رابعہ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی لئے بھاگی جارہی تھیں۔جب کسی نے پوچھا کہ وہ کہاں جارہی ہیں تو رابعہ نے جواب دیا کہ "جنت کو آگ لگانے اور دوزخ کو ٹھنڈا کرنے' تاکہ کوئی بھی خالص عشق کے علاوہ کسی خوف یا لالچ میں خدا کی عبادت نہ کرے۔خدا کے سوا کسی اور شئے (حتیٰ کہ جنت یا دوزخ) پر توجہ دینا شرک ہے۔"

رابعہ اپنے نظریہ صدق پر شدت کے ساتھ قائم رہیں۔جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ شیطان سے نفرت کرتی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ "نہیں! یاد الٰہی کی مصروفیت میں شیطان کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔" جب پوچھا گیا کہ وہ حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتی ہیں؟ تو جواب دیا کہ نہیں! رسول اللہ ﷺ کے لیے زبردست تعظیم کے ساتھ وہ صرف محبوب حقیقی سے عشق کرتی تھیں۔ کیونکہ خدا کے علاوہ کسی اور سے عشق کرنے کا مطلب اسے خدا مان لینے کے مترادف ہوگا۔

خدا پر مکمل بھروسہ (توکل) حقیقت کے بارے میں رابعہ کی محتاط تفہیم نظریہ صدق کے ساتھ منسلک تھی۔کئی ایک حکایتوں میں رابعہ نہ صرف مستقبل کی منصوبہ بندی بلکہ اس پر غور کرنے سے بھی انکار کرتی نظر آتی ہیں۔ مستقبل کے لیے منصوبے بنانا' ذخیرہ اندوزی کرنے یا سامان آرائش بنانے کا مطلب خدا میں کامل بھروسہ کی ناکامی ہے۔یہ خدائے واحد کی درست توثیق کے بھی منافی ہے: کسی انسان کا اپنے منصوبوں پر بھروسہ کرنا نہیں ہی اپنا خدا بنا لینا ہے۔

اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طرز حیات و فکر کو "رضا" (مطلق قبولیت) قرار دیا جا سکتا ہے' یعنی خدا کی بے پناہ خواہش کی مطلق قبولیت۔رابعہ کے نظریہ' رضا اور یاسیت پسندی یا تقدیر پرستی کے درمیان فرق کرنا بہت ضروری ہے۔بہت سے قصوں میں رابعہ نے انسانی مخلوق سے کوئی بھی چیز لینے سے انکار کیا' کیونکہ ایسا کرنا توکل اور توحید کے عقیدے کی نفی کرنا ہوگا۔وہ اس بنیاد پر خدا سے کوئی بھی چیز مانگنے سے انکار کرتی ہیں کہ وہ اس کی حالت کو پہلے سے ہی جانتا ہے۔ خدا کی مرضی کے بغیر کچھ بھی واقع نہیں ہوتا۔یاسیت یا تقدیر پرستی کی بجائے یہ توکل سچے عمل کی کنجی ہے---- جیسا کہ عیسائی صوفیوں مثلاً ہیڈوخ (1240ء) مارگریٹ پوریٹ (1310ء) اور ایک ہارٹ (1260ء تا 1327ء) کے معاملے میں نظر آتا ہے۔رابعہ سے متعلق قصوں میں یہی نظریہ رضا ان کے آس پاس سے انہیں ممتاز کرتا ہے۔

توکل اور وحدت میں فنا کے ساتھ ملنے والی صداقت کئی ایک کرشماتی حکایتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حکایت کے مطابق مشہور اولین صوفی ابراہیم ادھم نے مکہ کا چودہ سالہ حج کیا تھا' اور راستے میں آنے والی ہر عبادت گاہ میں ہر ممکن عبادت کرتے گئے۔ جب وہ مکہ معظمہ پہنچے تو ان کے طویل سفر کا مقصد یعنی خانہ کعبہ وہاں موجود نہیں تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر انہیں پتہ چلا کہ خانہ کعبہ ایک غریب لونڈی سے ملنے گیا ہے۔ رابعہ زیارت کرنے آئی تھیں اور جب وہ مکہ کے نواح میں پہنچیں تو خانہ کعبہ ان کا استقبال کرنے وہاں گیا۔ یہ دیکھ کر رابعہ زیادہ متاثر نہ ہوئیں اور کہا کہ وہ گھر نہیں بلکہ گھر میں رہنے والے کے لیے آئی تھیں۔ دریں اثناء عظیم صوفی ابراہیم ادھم کو بہت غصہ آیا اور جلن ہوئی کہ بصرہ کی ایک غریب سی خاتون کی خاطر ان کا معرکہ نظر انداز کر دیا گیا۔

• رابعہ کے صدق کی گہرائی نے انہیں غیر محفوظ دنیا میں تحفظ دیا : ایک نجات یافتہ عورت کے طور پر انکار کرنے کے لیے انہیں شادی کی بہت سی پیش کشیں کی گئیں۔ لیکن بہ الفاظ عطار اگر وہ صدق کے پردے میں مستور نہ ہوتیں تو اس قدر عوامی اور بلند گو زندگی نہ گزار پاتیں جو انہوں نے گزاری۔

رابعہ کے بنیادی فکری تصورات قطعی فکری اور روحانی مقصد میں باہم بندھے ہوئے ہیں' وہ مقصد یہ ہے: محبوب حقیقی میں فنائے ذات' یا فنا فی اللہ۔ صرف اس فنا میں ہی رضا' توکل اور سزا و فنا سے بالاتر صدق کی انتہائی صورتوں اور وحدت کی حقیقی تصدیق حاصل کی جا سکتی ہے۔ خدا انسان کی ذاتی انانیت کو فنا کر دیتا ہے۔

صوفیانہ وحدت میں فنائے ذات کا تصور تمام متاخر صوفیانہ فکر میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ ابتدائی تصوف کے اہم مفکرین' مثلاً جنید (وفات 922ء) بسطامی (وفات 875ء) تستری (وفات 896ء) اور حلاج (وفات 933ء) نے اسے مزید ترقی دی۔ انہوں نے اسے خدا کے مشہور فرمان کے ساتھ زیادہ واضح انداز میں جوڑا جس کا لب لباب یہ ہے:

> جب میرے خادم عقیدت مندی کے ذریعے میرے قریب تر آتے ہیں تو میں (اللہ) اپنے خادم سے پیار کرتا ہوں' اور جب اسے پیار کرتا ہوں تو اس کی سماعت' اس کی بصارت اس کے قدم' اس کے ہاتھ اور قوت گویائی بن جاتا ہوں۔

متاخر صوفیوں (مثلاً قشیری) نے توکل' صدق' قبولیت' افلاس اور الوہی وحدت کے تصورات کو مقامات اور احوال کے پیچیدہ مراحل کے ساتھ بدل دیا' لیکن رابعہ کے سوانح نگاروں کے مطابق بنیادی وضع سابق لونڈی رابعہ بصری کی سی خود آموز منزل حاصل کرنا ہے۔

رابعہ کی حکایات اور کہاوتوں میں اسلامی دینیات کے دوبنیادی معاملات کی تشکیل نو متواتر موجود ہے: خدا کی مطلق قدرت اور خدا کی آزاد مرضی کے درمیان' اور وحدت کی تصدیق اور خدا کی کثیر المقدار خصوصیات کے درمیان تناؤ۔ ان دونوں معاملات کو عارفانہ وصال کے لمحے میں بنیاد بناتے ہوئے رابعہ بصری نے انہیں قیاسی منطق اور زبان کی نحوی پابندیوں پر منحصر متکلمانہ عناد سے نکال کر صوفیانہ فکر کی قلمرو میں تبدیل کر دیا۔ یہ تنقیدی جانچ پڑتال تاحال صوفیانہ فکر میں جاری ہے۔ آپ کی وفات 801ء میں بمقام بصرہ ہوئی۔

حضرت ابو بکر شبلیؒ

(788ء-------858ء)

آپ معرفت و حقیقت کے منبع و مخزن تھے اور آپ کا شمار معتبر صوفیائے کرام میں ہوتا تھا۔ جائے ولادت میں اختلاف ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آپ بغداد میں پیدا ہوئے اور سن بلوغ تک وہیں مقیم رہے۔ آپ نے اپنے دور کے تمام بزرگوں کو دیکھا اور فیض بھی حاصل کیا آپ امام مالک کے پیروکار تھے۔ اور بہت سی احادیث بھی آپ نے تحریر کر رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ کی عبادت و ریاضت میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور ستر سال کی عمر پا کر ۸۵۸ء میں انتقال ہوا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تیس سال تک حدیث و فقہ کا درس لیا جس کے بعد میرے سینے سے ایک خورشید طلوع ہو گیا اور جب مجھ کو خدا کی طلب کا اشتیاق پیدا ہوا تو بہت سے اساتذہ کی خدمت میں رجوع ہو کر اپنا مقصد ظاہر کیا لیکن کوئی بھی مجھے راستہ نہ دکھا سکا۔ ان میں سے ایک بھی بذات خود راستے سے واقف نہیں تھا بس مجھ سے تو اتنا کہہ دیتے تھے کہ ہم غیب کے سوا سب کچھ جانتے ہیں۔ چنانچہ میں نے حیرت زدہ ہو کر ان سے عرض کیا کہ آپ لوگ تاریکی میں ہیں۔ میں روز روشن میں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ولایت چوروں کے سپرد نہیں کی یہ سن کر سب لوگ برہم ہو گئے اور میرے ساتھ بہت ہی ناروا سلوک کیا۔

ابتدا میں آپ نہاوند نامی جگہ کے سردار تھے۔ تمام امیروں اور سرداروں کو دربار خلافت میں طلب کیا گیا تو آپ بھی وہاں تشریف لے گئے اور جس وقت خلیفہ سب کو خلعت عطا کرنے والا تھا اس وقت امیر کو چھینک آئی اور اس نے خلعت کی آستین سے ناک صاف کر لی جس کی سزا میں خلیفہ نے خلعت واپس لے کر اس کو برطرف کر دیا۔ اس وقت آپ کو یہ تنبیہ ہوئی کہ جو شخص مخلوق کی عطا کردہ خلعت سے گستاخی کر کے ایسی سزا کا مستوجب ہو سکتا ہے تو خدا کی عطا کردہ خلعت کے ساتھ گستاخی کرنے والے کی تو نہ جانے کیا سزا ہو گی۔ اس خیال کے بعد آپ نے خلیفہ سے آکر عرض کیا

کہ تو مخلوق ہو کر اس چیز کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی تیری عطا کردہ خلعت سے بے ادبی نہ کرے' جبکہ تیری خلعت مالک الملک کی خلعت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ لہذا اس نے مجھ کو اپنی معرفت کی جو خلعت عطا فرمائی ہے میں بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کو ایک مخلوق کے سامنے کثیف کر دوں۔ یہ کہہ کر دربار سے باہر نکلے اور حضرت خیر نساج کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ کچھ عرصہ ان سے فیض حاصل کرنے کے بعد انہیں کے حکم سے حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور عرض کیا کہ لوگوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ آپ کے پاس ایک گوہر نایاب ہے۔ لہذا آپ یا تو اس کو میرے ہاتھ قیمتاً فروخت کر دیں۔ یا پھر بغیر قیمت کے دیں حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اگر میں فروخت کرنا چاہوں تو تم خرید نہیں سکتے کیونکہ تمہارے اندر قوت خرید نہیں ہے اور اگر مفت دے دوں تو اس کی قدر و قیمت نہ سمجھ سکو گے کیونکہ بلا محنت حاصل کردہ شے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اگر تم وہ گوہر حاصل کرنا چاہتے ہو تو بحر توحید میں غرق ہو کر فنا ہو جاؤ۔ آپ نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ایک سال تک گندھک بیچتے پھرو۔ چنانچہ ایک سال تک تعمیل حکم کرتے رہے۔ پھر حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اب ایک سال تک بھیک مانگو۔ چنانچہ آپ نے ایک سال یہ بھی کیا حتیٰ کہ اپ نے بغداد کے ہر دروازے پر بھیک مانگی لیکن کبھی آپ کو کسی نے کچھ نہیں دیا۔ جب اس کی شکایت آپ نے حضرت جنیدؒ سے کی تو انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ اب تو شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مخلوق کے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہیں لہذا اب کبھی مخلوق سے وابستگی کا خیال نہ کرنا اور نہ کبھی کسی چیز پر مخلوق کو فوقیت دینا۔ پھر حضرت جنیدؒ نے حکم دیا کہ چونکہ تم نہاوند کے امیر رہ چکے ہو۔ لہذا وہاں جا کر ہر فرد سے معافی طلب کرو۔ ابو بکر شبلی نے وہاں پہنچ کر بچے بچے سے معافی چاہی لیکن ایک شخص وہاں موجود نہیں تھا تو اس کے بجائے لاکھ درہم خیرات کیے۔ اس کے باوجود آپ کے قلب میں خلش باقی رہ گئی اور جب دوبارہ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ ابھی تمہارے قلب میں حب جاہ باقی ہے' لہذا ایک سال تک اور بھیک مانگتے رہو بھیک کے ذریعہ جو کچھ ملتا اس کو حضرت جنید کے پاس لا کر فقراء میں تقسیم کر دیتے لیکن خود بھوکے رہتے۔ سال کے اختتام پر حضرت جنید نے وعدہ کیا کہ اب تمہیں اپنی صحبت میں رکھوں گا بشرطیکہ تمہیں فقراء کی خدمت گزاری منظور ہو۔ چنانچہ آپ ایک سال تک فقراء کی خدمت گزاری میں مشغول رہے۔ پھر حضرت جنیدؒ نے پوچھا کہ اب تمہارے نزدیک نفس کا کیا مقام ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میں خود کو تمام مخلوقات سے کمتر تصور کرتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اب تمہارے ایمان کی تکمیل ہو گئی ہے۔

ابتدائی دور میں جو کوئی آپ کے سامنے خدا کا نام لیتا تو آپ اس کا منہ شکر سے بھر دیتے اور بچوں میں محض اس نیت سے شیرینی تقسیم فرمایا کرتے تھے کہ وہ آپ کے سامنے صرف اللہ اللہ کہتے رہیں۔ بعد میں یہ کیفیت ہو گئی کہ خدا کا نام لینے والوں کو روپے اور اشرفیاں دے دیا کرتے تھے۔ پھر اس مقام پر پہنچ گئے کہ شمشیر برہنہ لے کر پھرتے اور فرمایا کرتے کہ جو کوئی میرے سامنے اللہ کا نام لے گا اس کا سر قلم کر دوں گا لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنا پہلا رویہ کیوں تبدیل کر دیا؟ فرمایا کہ پہلے مجھے یہ خیال تھا کہ لوگ حقیقت و معرفت کے اعتبار سے خدا کا نام لیتے ہیں لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ محض عادتاً نام لیتے ہیں جس کو میں جائز تصور نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ غیبی ندا سنی کہ اسم ذات کے ساتھ کب تک وابستہ رہے گا اگر طلب صادق ہے تو مسمیٰ کی جستجو کر۔ یہ ندا سن کر عشق الٰہی میں ایسے مستغرق ہوئے کہ دریائے دجلہ میں چھلانگ لگا دی لیکن ایک موج نے پھر کنارے پر پھینک دیا۔ اس کے بعد اکثر مہلک و مہیب مقامات پر پہنچ کر خود کو ہلاک کرنے کی سعی کرتے رہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی خود حفاظت فرماتا ہے اس لئے کسی جگہ بھی کوئی گزند نہیں پہنچی اور ہر روز ذوق و شوق میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ آپ اکثر چیخ چیخ کر فرماتے کہ تاسف ہے اس شخص پر جو نہ پانی میں غرق ہو سکا اور نہ آگ میں جل سکا۔ نہ درندوں نے پھاڑا اور نہ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو سکا۔ پھر آپ نے یہ ندا سنی کہ جو مقبول الٰہی ہوتا ہے اس کو خدا کے سوا دوسرا کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ آپ کے احوال یہاں تک پہنچ گئے کہ لوگوں نے دس مرتبہ زنجیروں میں جکڑا مگر آپ کو سکون میسر نہ آسکا۔ پھر آپ کو پاگل تصور کر کے پاگل خانے بھیج دیا گیا اور ہر شخص آپ کو دیوانہ کہنے لگا۔

ایک مرتبہ عید کے دن سیاہ لباس میں ملبوس تھے اور وجد کا عالم تھا۔ لوگوں نے سیاہ لباس پہننے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں نے مخلوق کے ماتم میں سیاہ لباس پہنا ہے کیونکہ پوری مخلوق خدا سے غافل ہو چکی ہے۔ ابتدا میں آپ سیاہ لباس ہی استعمال فرماتے تھے لیکن تائب ہونے کے بعد مرقع پہننا شروع کر دیا تھا۔ مجاہدات کے دوران آپ اس لئے اپنی آنکھوں میں نمک بھر لیتے تھے کہ نیند کا غلبہ نہ ہو سکے۔ ایک مرتبہ چمٹی لے کر آپ نے اپنا گوشت نوچنا شروع کر دیا تو حضرت جنید نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ جو حقائق مجھ پر منکشف ہوتے ہیں ان کی مجھ میں طاقت نہیں ہے اس لئے یہ عمل کر رہا ہوں تاکہ ایک لمحہ کے لئے سکون مل سکے۔

آپ اپنے معمول کے مطابق تہہ خانے میں عبادت کیا کرتے تھے اور لکڑیوں کا گٹھا اپنے ہمراہ لے جاتے کہ جب عبادت سے ذرا بھی غفلت ہوتی تو ایک لکڑی نکال کر خود کو زدوکوب

کریں۔ حتی کہ ایک ایک کر کے تمام لکڑیاں ختم ہو جاتیں اور بعد میں آپ اپنے جسم کو دیواروں سے ٹکراتے تھے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میری پوری زندگی اسی خواہش میں گذر گئی کہ کاش ایک لحہ کے لئے خدا تعالیٰ سے مجھے ایسی خلوت نصیب ہو جاتی کہ میرا وجود باقی نہ رہتا اور چالیس سال سے یہ تمنا ہے کہ کاش ایک لحہ کے لئے خدا کو جان اور پہچان سکتا۔ کاش میں پہاڑوں میں اس طرح روپوش ہو جاتا کہ نہ تو مخلوق مجھ کو دیکھ سکتی اور نہ میرے احوال سے باخبر ہوتی۔ پھر فرمایا کہ میں خود کو یہودیوں سے بھی زیادہ ذلیل تر تصور کرتا ہوں کیونکہ میں نفس و دنیا اور ابلیس و خواہشات کی بلاؤں میں گرفتار ہوں اور مجھے تین مصیبتیں یہ بھی لاحق ہیں کہ میرے قلب سے اللہ تعالیٰ دور ہو گیا ہے۔ دوم' میرے قلب میں باطل جاگزیں ہو گیا ہے۔ سوم' میرا نفس ایسا کافر بن گیا ہے کہ اس کو مصائب دور کرنے کا تصور تک نہیں آتا۔ پھر فرمایا کہ دنیا محبت کا اور آخرت نعمت کا مکان ہے' لیکن ان دونوں سے قلب بہتر ہے کیونکہ یہ معرفت الٰہی کا مکان ہے۔

جب آپ کے مراتب میں اضافہ شروع ہوا تو آپ نے وعظ گوئی کو اپنا مشغلہ بنالیا اور اس میں لوگوں کے سامنے حقیقت کا اظہار بھی کرنا شروع کر دیا جس پر حضرت جنید نے فرمایا کہ ہم نے جن چیزوں کو زمین میں مدفون کر رکھا تھا تم انہیں بر سر منبر عوام کے سامنے بیان کرتے ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ جن حقائق کا میں اظہار کرتا ہوں وہ لوگوں کے ذہنوں سے بالاتر ہیں کیونکہ میری باتیں حق کی جانب سے ہوتی ہیں اور حق ہی کی جانب لوٹ جاتی ہیں اور اس وقت شبلی کا وجود درمیان میں نہیں ہوتا۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ گو تمہارا یہ قول درست پھر بھی تمہارے لئے اس قسم کی چیزیں بیان کرنی مناسب نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دین و دنیا طلب کرنے والوں کے لئے ہماری مجلس نشینی حرام ہے۔

آپ کے ہاتھ پر توبہ کرنے والا جب طریقت کا طلب گار ہوتا تو آپ حکم دیتے کہ صحرا میں جا کر توکل اختیار کرو اور بغیر زاد راہ اور سواری کے حج کے سفر پر چلے جاؤ۔ اسی وقت تمہیں توکل و تجرد حاصل ہو گا اور جب ان دونوں مجاہدات سے فراغت پالو اس وقت میرے پاس آنا کہ ابھی تمہارے اندر میری صحبت کی صلاحیت نہیں ہے۔ آپ اکثر تائب ہونے والوں کو اپنے اصحاب کے ہمراہ بغیر زاد راہ اور سواری کے صحرا میں بھیج دیا کرتے تھے اور جب لوگ یہ کہتے کہ آپ تو مخلوق کی ہلاکت کے درپے ہیں تو آپ جواب دیتے کہ میری نیت ہرگز یہ نہیں' لیکن جو لوگ میرے پاس آتے ہیں ان کا مقصد میری صحبت نہیں ہوتا بلکہ وہ معرفت الٰہی کے متمنی ہوتے ہیں۔ اگر وہ

مصاحبت کے خواہاں ہوں تو گویابت پرستی کے مرتکب کہلائے جائیں گے۔ لہٰذا ان کے واسطے یہی بہتر ہے کہ اپنی پہلی حالت پر قائم رہیں کیونکہ فاسق موحد رہبانیت پسند زاہد سے افضل ہے' اسی وجہ سے میں اپنے پاس آنے والوں کو خدا کا راستہ بتا دیتا ہوں۔ اس میں اگر وہ ہلاک بھی ہو جائیں جب بھی اپنے مقصد سے محروم نہیں رہیں گے۔ اگر سفر کی صعوبتیں حاصل کر لیں گے تو انہیں وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو دس سالہ مجاہدات سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ ہم آپ کو غیر اطمینانی حالت میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یا تو آپ خدا کے ساتھ نہیں یا خدا آپ کے ساتھ نہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر میں اس کے ساتھ ہوتا تو میں ہوتا لیکن میں تو اس کی ذات میں گم ہو گیا ہوں۔ پھر فرمایا کہ میں ہمیشہ اس خیال سے خوش ہوتا رہا کہ مجھے خدا کا مشاہدہ وانس حاصل ہے لیکن اب محسوس ہوا کہ انس تو صرف اپنے ہی ہم جنس سے ہو سکتا ہے۔

حضرت جنید نے پوچھا کہ جب تمہیں ذکر الٰہی میں صدق حاصل نہیں تو تم کس طرح اس کو یاد کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا کہ میں مجازی اعتبار سے جب اس کو بکثرت یاد کرتا ہوں تو ایک مرتبہ وہ بھی مجھے حقیقت کے ساتھ یاد کر لیتا ہے۔ حضرت جنید یہ جملہ سن کر نعرے لگاتے ہوئے بیہوش ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ بارگاہ الٰہی سے کبھی تو خلعت عطا کیا جاتا ہے اور کبھی تازیانہ۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ دنیا ذکر و شغل کے لئے ہے اور عقبیٰ احوال کے لئے لہٰذا راحت کس جگہ مل سکتی ہے؟ فرمایا کہ دنیا کے ذکر و شغل سے بے نیاز ہو جاؤ تاکہ احوال آخرت سے نجات حاصل ہو جائے۔

ایک دن آپ کو عالم وجد میں مضطرب دیکھ کر حضرت جنید نے کہا کہ اگر تم اپنے امور خدا کے سپرد کر دو تو تمہیں سکون مل سکتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے تو اسی وقت سکون مل سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ میرے امور میرے اوپر چھوڑ دے۔ یہ سن کر حضرت جنید نے فرمایا کہ شبلی کی تلوار سے خون ٹپکتا ہے۔

آپ نے کسی کو "یارب" کہتے سن کر فرمایا کہ تو کب تک یہ جملہ کہتا رہے گا جبکہ اللہ تعالیٰ ہر وقت عبدی عبدی فرماتا رہتا ہے' لہٰذا اس کی بات سن لے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو عبدی عبدی ہی سن کر یارب یارب کہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تیرے لئے یہ جملہ کہنا جائز ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ میری گردن میں آسمان کا طوق اور پاؤں میں زمین کی بیڑی ڈال دے اور ساری دنیا بھی دشمن ہو جائے جب بھی میں اس سے منہ نہیں پھیر سکتا۔

وفات کے وقت جب آپ کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تو ناقابل بیان حد تک بیقرار ہو کر لوگوں سے راکھ طلب کر کے اپنے سر پر ڈالتے رہے لوگوں نے بیقراری کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس وقت مجھے ابلیس پر رشک آرہا ہے اور آتش رشک میرے تمام جسم کو بھسم کیے دے رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو خلعت لعنت سے نوازا۔ لیکن مجھ تشنہ کو خدا نے وہ خلعت کیوں نہیں عطا فرمایا۔ لعنت کی خلعت شیطان کے لئے مخصوص ہے لیکن اس کا عطا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کی خلعت کا مستحق ابلیس کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ لیکن پھر عالم اضطراب میں فرمایا کہ اس وقت کرم کی ایک ہوا چل رہی ہے اور دوسری قہر کی۔ جن پر کرم کی ہوا چلی ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ اور جن پر قہر کی ہوا چلی وہ لوگ راستے ہی میں رہ گئے اور اس قسم کے حجابات ان کے سامنے آگئے کہ وہ منزل تک نہ پہنچ سکے مجھے یہ اضطراب ہے کہ میرے اوپر کون سی ہوا چلنے والی ہے۔

انتقال کے وقت سے قبل ہی ایک جماعت نماز جنازہ پڑھنے کے لئے آ پہنچی تو آپ نے اس جماعت کے قصد کو محسوس کر کے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ زندہ ہی کی نماز پڑھنے چلے آئے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ لا الہ الا اللہ کہیے تو فرمایا جب غیر ہی نہیں ہے تو نفی کس کی کروں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ شریعت کا حکم ہے کہ ایسے وقت میں کلمہ پڑھنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ سلطان فرمارہا ہے کہ میں رشوت قبول نہیں کروں گا۔ اس کے بعد کسی نے باآواز بلند لا الہ الا اللہ کہنے کی تلقین کی تو فرمایا کہ مردہ زندہ کو نصیحت کرتا ہے۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ اب آپ کی حالت کیا ہے تو فرمایا کہ میں اپنے محبوب سے مل گیا۔ یہ فرما کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ

(آٹھویں صدی عیسوی)

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ شریعت و طریقت پر یکساں طور سے گامزن تھے اور آپ کا شمار اہل ورع اور اہل تقوٰی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی تصانیف بھی آپ نے چھوڑی ہیں۔ عرصہ دراز تک مکہ معظمہ میں اعتکاف کرنے کی وجہ سے آپ کو پیر حرم کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ حضرت جنید بغدادی کے پیرو مرشد ہیں اور حضرت ابو سعید خزار کی صحبت سے فیوض حاصل کرتے رہے۔

آپ کے جانماز کے نیچے گنج نامہ کا ترجمہ رکھا ہوا تھا۔ جب آپ وضو کے لئے اٹھے تو کوئی اسے چرا کر لے گیا۔ آپ نے دوران وضو ہی فرمایا کہ جو بھی لے گیا ہے اس کے دست وپا قطع کر کے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور اس کو نذر آتش کر کے راکھ تک اڑا دی جائے گی اور اس کو گنج نامہ سے اس لئے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا کہ وہ اس کے بھید تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس گنج نامہ کا مفہوم یہ تھا کہ ہم نے تخلیق آدم کے بعد جب فرشتوں کو حکم سجدہ دیا تو سوائے ابلیس کے سب نے اس لئے سجدہ کیا کہ وہ تخلیق آدم کے بھید سے واقف نہیں تھے اور ابلیس نے واقف اسرار ہونے کی وجہ سے سجدہ سے انکار کر دیا۔ اسی طرح حضرت آدمؑ بھی جس درجہ ابلیس کے راز سے واقف تھے دوسرا کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ ابلیس کو مردود بارگاہ کر دینے کی ہے۔ پھر ہم نے کہا کہ زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ پوشیدہ کر دیا ہے کہ جو اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا لیکن ابلیس نے کہا جو خزانہ مجھ کو عطا کیا گیا ہے گو اس کے بعد مجھے کسی خزانے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی اگر مجھے اس پوشیدہ خزانے کا علم ہو گیا تو میں اس سے ضرور واقفیت حاصل کروں گا۔ حکم ہوا تجھ کو مہلت دی جاتی ہے لیکن ہمارے بندے تجھے کاذب تصور کر کے کہیں گے کہ ابلیس ایک ایسا جن تھا جس نے حکم الٰہی سے سرتابی کی۔ اس تصور کے تحت وہ تیرے کسی قول کو سچا نہ کہیں گے۔ یہی گنج

نامہ کتاب محبت میں اس طرح درج ہے کہ خدا نے قلب کو روح سے سات ہزار سال قبل تخلیق کر کے انس کے باغ میں رکھا اور سر کو روح سے ایک ہزار سال قبل تخلیق کر کے مقام وصل میں رکھ کر ہر یوم تین سو ساٹھ نظریں اس پر ڈالیں اور کلمات محبت سے ارواح کو واقف کروایا۔ پھر تین سو ساٹھ لطائف اس قلب پر وارد کئے اور تین سو ساٹھ مرتبہ کشف جمال کی تجلیات سر پر ڈالیں۔ جب ان سب نے مل کر دوسری مخلوق کو دیکھا تو اپنے سے زیادہ کسی کو برتر نہیں پایا۔ امتحان کے طور پر خدا تعالیٰ نے سر کو روح میں اور روح کو قلب میں اور قلب کو اجسام میں مقید کر کے انبیاء کرام کو ہدایت کے لئے بھیجا۔ جب ان سب نے اپنے اپنے مقام کی تلاش کی تو اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا' چنانچہ جسم نے نماز کی مطابقت کی قلب نے محبت کی' روح نے قربت کی اور سر نے وصال کی۔

آپ نے بیت اللہ سے حضرت جنید اور حضرت شبلی کو مکتوب تحریر کیا کہ آپ لوگ اہل عراق کے مرشدین میں سے ہیں لہٰذا جو شخص جمال کعبہ کا مشاہدہ کرنا چاہے اس کو بتا دو کہ نفس کو شق کرنے سے قبل تم اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور جو قرب الٰہی کا خواہاں ہو اس سے کہہ دو کہ روح کو شق کر دینے سے قبل تم ہرگز قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اس راہ میں قدم رکھنے سے قبل یہ بھی سمجھ لے کہ جو اس راستے میں دو ہزار آگ کے پہاڑ اور ایک ہزار مرتبہ ہست کی منزل میں داخل نہ ہو کبھی قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر حضرت جنید نے فرمایا کہ میں تو ابھی ان دو ہزار راہوں میں سے صرف ایک ہی راہ طے کر پایا ہوں۔ حضرت حریری نے فرمایا کہ تم اس لئے خوش نصیب ہو کہ میں تو ابھی اس راہ میں صرف تین ہی قدم چلا ہوں۔ اور حضرت شبلی نے کہا کہ تم دونوں ہی خوش بخت ہو کیوں کہ میں تو ابھی اس راہ کے نزدیک تک نہیں پہنچا ہوں۔

کسی دوست کی علالت کے زمانہ میں آپ اس سے ملنے اصفہان تشریف لے گئے۔ اس نے آپ سے فرمائش کی کہ قوال سے کوئی شعر سنوا دیجئے' چنانچہ قوال نے اس مفہوم کا شعر پڑھا کہ میری بیماری میں کوئی عیادت کو جایا کرتا تھا۔ یہ شعر سنتے ہی وہ تندرست ہو گیا اور آپ کے فیض صحبت سے معراج کمال تک پہنچا۔

جب آپ سے افمن شرح الله صدره للا سلام پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب بندے کی نظر' علم' عظمت' وحدانیت اور جلال ربوبیت پر پڑتی ہے تو اس کے سینہ میں ایسی فراخی رونما ہوتی ہے کہ اس کو ہر شے نیست محسوس ہونے لگتی ہے۔ عظمت و وحدانیت میں دخل اندازی معصیت و کفر ہے۔ دوستوں کا وجد خدا کا ایسا راز پنہاں ہے جس کو کسی قیمت پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا کہ محبت بھی داخل رضا ہے اور محبت سے رضا کو اس لئے جدا نہیں کیا جا سکتا کہ بندے کو ہر شے

عزیز ہوتی ہے۔ جس سے وہ راضی نہ ہو اس کو محبوب بھی نہیں سمجھتا۔ فرمایا کہ بندہ اسی کو محبوب جانو جس سے زیادہ کوئی محبوبیت کے قابل نہ ہو۔ ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ صبر نام ہے خدا کے حکم پر استقلال کے ساتھ مصائب برداشت کرنے کا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ

(اندازاً 800ء------ 875ء)

حضرت بایزید بسطامیؒ بہت بڑے اولیاء اور مشائخ میں سے ہوئے ہیں اور ریاضت و عبادت کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کیا احادیث بیان کرنے میں آپ کو درک حاصل تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ حضرت بایزید کو اولیاء میں وہی اعزاز حاصل ہے جو حضرت جبرائیل کو ملائکہ میں اور مقام توحید میں تمام بزرگوں کی انتہاء آپ کی ابتدا ہے کیونکہ ابتدائی مقام میں ہی لوگ سرگرداں ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بایزید کے دادا آتش پرست تھے اور والد بزرگوار کا بسطام کے عظیم بزرگوں میں شمار ہوتا تھا۔ روایات کے مطابق آپ کی کرامات کا ظہور شکم مادر ہی میں ہونے لگا تھا کیونکہ آپ کی والدہ فرماتی تھیں کہ جس وقت بایزید میرے شکم میں تھا تو اگر کوئی مشتبہ غذا میرے شکم میں چلی جاتی تو اس قدر بےکلی اور بے چینی ہوتی کہ مجھے حلق میں انگلی ڈال کر نکالنا پڑتی۔ حضرت بایزید کا قول ہے کہ راہ طریقت میں سب سے بڑی دولت وہ ہے جو مادر زاد ہو' اس کے بعد چشم بینا اور پھر گوش ہوش۔ لیکن اگر یہ تینوں چیزیں حاصل نہ ہوں تو پھر اچانک مر جانا بہتر ہے۔

جب آپ مکتب میں داخل ہوئے اور سورہ لقمان کی یہ آیت پڑھی کہ "میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا" اس وقت اپنی والدہ سے آکر فرمایا کہ مجھ سے دو ہستیوں کا شکر ادا نہیں ہو سکتا لہٰذا آپ مجھے خدا سے طلب کر لیں تاکہ میں آپ کا شکر ادا کرتا رہوں یا پھر خدا کے سپرد کر دیں تاکہ اس کے شکر میں مشغول ہو جاؤں۔ والدہ نے فرمایا کہ میں اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر تجھے خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ شام کی جانب نکل گئے اور وہیں ذکر و شغل کو جزو حیات بنا لیا اور مکمل تین سال شام کے میدانوں اور صحراؤں میں زندگی گذاری۔ اس عرصہ میں یاد الٰہی کی وجہ سے کھانا پینا سب ترک کر دیا۔

آپ فرمایا کرتے کہ میں نے بارہ سال تک نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدے کی آگ سے تپایا اور ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا جس کے بعد میرا آئینہ بن گیا۔ پھر پانچ سال مختلف قسم کی عبادات سے اس پر قلعی چڑھاتا رہا۔ ایک سال تک جب میں نے خود اعتمادی کی نظر سے اس کا مشاہدہ کیا تو اس میں تکبر و خود پسندی کا مادہ موجود پایا۔ چنانچہ پھر مسلسل پانچ سال تک سعی بسیار کے بعد اس کو مسلمان بنایا۔ جب اس میں خلائق کا نظارہ کیا تو سب کو مردہ دیکھا اور نماز جنازہ پڑھ کر ان سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا جس طرح لوگ نماز جنازہ پڑھ کر قیامت تک کے لئے مردے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مجھے خداوند تعالیٰ تک پہنچنے کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔

آپ مسجد میں داخلے سے قبل دروازے پر کھڑے ہوتے گریہ زاری کرتے رہتے تھے۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ میں خود کو حائضہ عورت کی طرح نجس تصور کرتے ہوئے روتا ہوں کہ کہیں میرے داخلے سے مسجد نجس نہ ہو جائے۔ ایک مرتبہ آپ سفرِ حج پر روانہ ہو کر چند منزل پہنچنے کے بعد پھر واپس آ گئے لوگوں نے ارادہ توڑنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ راستے میں مجھے ایک حبشی مل گیا اور اس نے مجھے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ خدا کو بسطام میں چھوڑ کر کیوں جاتا ہے۔ چنانچہ میں واپس آ گیا۔

حج کے سفر میں کسی نے پوچھا کہ کہاں کا قصد ہے؟ فرمایا حج کا' پھر اس نے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کچھ رقم ہے؟ فرمایا دو سو دینار۔ اس نے عرض کیا کہ میں مفلس ہوں اور عیالدار ہوں لہٰذا یہ رقم مجھ کو دے کر سات مرتبہ میرا طواف کر لیجئے تو اسی طرح آپ کا حج ہو جائے گا۔ آپ نے اسی کے کہنے پر عمل کیا اور وہ رقم لے کر رخصت ہو گیا۔

جب آپ کے مراتب میں اضافہ ہونے لگا اور آپ کا کلام عوام کے ذہنوں سے بالاتر ہو گیا تو آپ کو سات مرتبہ بسطام سے نکالا گیا۔ آپ نے نکالنے کی وجہ پوچھی تو کہا گیا کہ تم نہایت برے انسان ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جس شہر کا سب سے برا انسان بایزید ہو وہ شہر سب سے اچھا ہے۔

عبادت کے اوقات میں آپ کو یہ خوف لاحق رہتا کہ کہیں کسی کی آواز سے عبادت میں خلل واقع نہ ہو جائے' اس لئے مکان کے تمام سوراخ بند کر دیتے تھے۔ عیسیٰ بسطامی کا قول ہے کہ میں تیس سال آپ کے ساتھ رہا لیکن کبھی آپ کو بات کرتے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ حال وجد میں آپ نے یہ کہہ دیا کہ "سبحانی ما اعظم شانی" یعنی میں پاک ہوں اور میری شان بہت بڑی ہے۔ اختتام وجد کے بعد ارادت مندوں نے سوال کیا کہ یہ جملہ آپ نے کیوں کہا؟ فرمایا کہ مجھے تو

علم نہیں کہ میں نے ایسا کوئی جملہ کہا ہو۔ لیکن اگر آئندہ اس قسم کا کوئی جملہ میری زبان سے نکل جائے تو مجھے قتل کر ڈالنا۔ اس کے بعد دوبارہ حالت وجد میں پھر آپ نے یہی جملہ کہا' جس پر آپ کے مریدین قتل کر دینے پر آمادہ ہو گئے لیکن پورے مکان میں انہیں ہر سمت بایزید ہی بایزید نظر آئے۔ جب انہوں نے چھریاں چلانی شروع کیں تو ایسا محسوس ہوتا جیسے پانی پر چھریاں چل رہی ہوں۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک لال رنگ کا سیب ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ تو بہت ہی لطیف ہے۔ چنانچہ اسی وقت غیب سے ندا آئی کہ ہمارا نام سیب کے لئے استعمال کرتے ہوئے حیا نہیں آتی۔ اور اس جرم میں اللہ تعالیٰ نے چالیس دن کے لئے اپنی یاد آپ کے قلب سے نکال دی۔ آپ نے قسم کھائی کہ اب کبھی بسطام کا پھل نہیں کھاؤں گا۔

آپ مسجد میں چالیس برس مقیم رہے لیکن اس درجہ محتاط تھے کہ مسجد کا اور مسجد سے باہر کا لباس جدا جدا ہوتا تھا۔ اور اس میں سوائے مسجد کی دیوار کے آپ نے کسی چیز سے ٹیک نہیں لگائی۔ آپ فرمایا کرتے کہ میں نے چالیس برس تک عام انسانوں کی غذا چکھی تک نہیں کیوں کہ میرا رزق کہیں اور سے آتا تھا اور اس دوران اپنے قلب کی نگرانی میں مصروف رہا' اس کے بعد جب غور کیا تو ہر سمت بندگی اور خدائی نظر آئی' پھر تیس سال خدا کی جستجو میں گزارے اور خدا کو طالب اور خود کو مطلوب پایا۔

حضرت ابو موسیٰؒ نے جب آپ سے سوال کیا کہ خدا کی جستجو میں سب سے زیادہ دشوار مقام آپ کو کیا نظر آیا۔ فرمایا کہ خدا کی اعانت کے بغیر قلب کو اس کی طرف متوجہ کرنا بہت دشوار ہے۔ جب اس کی مدد شامل حال ہو جائے تو پھر سعی کے بغیر بھی قلب اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور مجھے اس وقت ایک خاص کشش سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اللہ نے وہ مراتب عطا کئے جو آپ پر بھی ظاہر ہیں اور ظاہر میں بھی اس کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔

حضرت ذوالنون نے آپ کی خدمت میں ایک جائے نماز ارسال کی تو آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ مجھے اس کی حاجت نہیں' البتہ ایک مسند کی ضرورت ہے' یعنی میں اب ایسا بے نیاز ہو چکا ہوں کہ مجھے نماز معاف ہو چکی ہے۔ جب انہوں نے نفیس قسم کی مسند بھیجی تو یہ کہہ کر واپس کر دی کہ جس کے پاس الطاف خداوندی کی مسند موجود ہو اس کو دنیاوی مسند کی ضرورت نہیں۔ ایک مرتبہ قبرستان میں تشریف لائے کہ ایک بسطامی نوجوان بربط بجا رہا تھا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر لاحول پڑھی اور اس نوجوان نے بربط کو اتنی زور سے آپ کے سر پر دے مارا کہ سر پھٹ گیا اور بربط ٹوٹ گیا

۔آپ نے گھر واپس آکر اس نوجوان کو بربط کی قیمت اور کچھ حلوہ وغیرہ بھیجتے ہوئے پیغام دیا کہ اس رقم سے دوسرا بربط خرید لو اور حلوہ وغیرہ خوب کھاؤ تاکہ شکستہ بربط کا غم دور ہو جائے۔ایک شخص تیس سال تک آپ کی صحبت میں عبادت کرتا رہا اور ایک دن آپ سے عرض کیا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی آپ کی تعلیم مجھ پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ہی صورت میں تیرے اوپر اثر ہو سکتا ہے لیکن وہ تیرے لئے قابل قبول نہ ہو گی۔اس نے عرض کیا کہ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔آپ نے فرمایا کہ داڑھی' مونچھ اور سر کے بال منڈا کر اور کمبل اوڑھ کر ایک تھیلے میں اخروٹ بھر لے اور ایسی جگہ پر جا بیٹھ جہاں بہت لوگ تجھ سے واقف ہوں۔بچوں سے کہہ دے کہ جو بچہ مجھے ایک تھپڑ مارے گا اسی کو ایک اخروٹ دوں گا۔بس یہی تیرا واحد علاج ہے اس لئے کہ ابھی تجھے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہو سکا۔

ایک مرتبہ کسی آتش پرست سے مسلمان ہونے کی تبلیغ کی گئی تو اس نے جواب دیا کہ اگر اسلام اس کا نام ہے جو حضرت بایزید کو حاصل ہے تو اس کی مجھ میں طاقت نہیں اور جس طرح کے تم سب لوگ مسلمان ہو تو مجھے اس پر اعتماد نہیں۔لوگوں نے حضرت بایزید سے سوال کیا کہ آپ کا مرشد کون ہے ؟ فرمایا کہ ایک بوڑھی عورت' اس لئے کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا کہ ایک بڑھیا سر پر آٹا رکھے ہوئے ملی اور مجھ سے کہنے لگی کہ یہ آٹا میرے مکان تک پہنچا دو۔اسی دوران مجھے ایک شیر نظر آگیا اور میں نے آٹا اس کی کمر پر رکھ کر بڑھیا سے کہا کہ جاؤ یہ تمہارے گھر پہنچا دے گا' لیکن یہ بتاتی جاؤ کہ شہر میں جاکر لوگوں سے کیا کہو گی۔بڑھیا نے کہا' میں یہ کہوں گی کہ آج جنگل میں میری ملاقات ایک خود نما ظالم سے ہو گئی۔میں نے پوچھا کہ مجھے خود نما ظالم کا خطاب کیوں دیا؟ بڑھیا نے کہا کہ شریعت نے شیر کو مکلف نہیں بنایا اور تم ایک غیر مکلف کی پشت پر اپنا بوجھ لاد رہے ہو۔یہ ظلم نہیں تو پھر کیا ہے۔دوسرا عیب تمہارے اندر یہ ہے کہ تم خود کو لوگوں پر صاحب کرامت ظاہر کرنا چاہتے ہو اور اسی کا نام خود نمائی ہے۔چنانچہ میں نے بڑھیا کی بات سے ایسی نصیحت و عبرت حاصل کی کہ ہمیشہ کے لئے ایسی چیزوں کے اظہار سے توبہ کر لی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے ملاقات کرنے والوں میں بعض کو رحمت حاصل ہوتی ہے اور بعض کو لعنت۔جو لوگ میری مدہوشی کے عالم میں ملاقات کرتے ہیں وہ تو میری حالت سے متاثر ہو کر غیبت کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔اور جو لوگ اس وقت آتے ہیں جب مجھ پر حق کا غلبہ ہوتا ہے تو ان کو رحمت حاصل ہوتی ہے۔پھر فرمایا کہ کاش قیامت جلدی سے آجائے تاکہ میں جہنم کے قریب مقیم ہو جاؤں اور میرے قیام کی وجہ سے جہنم سرد پڑ جائے تاکہ اہل جہنم کو میری ذات

سے آرام و سکون حاصل ہو سکے۔

جس وقت آپ صفات خداوندی بیان فرماتے تو اپنی اصلی حالت میں رہتے' لیکن جب ذات خداوندی کے موضوع پر گفتگو ہوتی تو بے خودی کے عالم میں یہ کہتے رہتے کہ میں سر کے بل آ رہا ہوں اللہ مجھ سے بہت نزدیک ہے۔ ایک مرتبہ کسی مرید نے کہا کہ مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے کہ جو خدا کو جانتے ہوئے بھی عبادت نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس بندے پر حیرت ہوتی ہے جو خدا کو پہچاننے کے بعد عبادت کرتا ہے

ایک موقع پر بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ حج کیا تو کعبہ کی زیارت کی اور دوسری مرتبہ کعبہ اور صاحب کعبہ دونوں کی زیارت سے مشرف ہو' اور تیسری مرتبہ کچھ بھی نظر نہیں آیا کیوں کہ یاد الٰہی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کسی نے دروازے پر آواز دی تو آپ نے پوچھا کس کی تلاش ہے۔ جواب ملا' بایزید۔ فرمایا کہ میں تو تیس سال سے اس کی تلاش میں ہوں لیکن آج تک نہیں ملا۔ جس وقت یہ واقعہ حضرت ذوالنون کے سامنے بیان کیا گیا تو فرمایا کہ وہ خاصان خدا کی طرح خدا سے پیوستہ ہو گئے تھے۔ مجاہدات کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اگر میں اعلیٰ مجاہدات کا ذکر کروں تو تمہارے فہم سے بالاتر ہے' لیکن میرا معمولی مجاہدہ یہ ہے کہ ایک دن میں نے اپنے نفس کو عبادت کے لئے آمادہ کرنا چاہا تو وہ منحرف ہو گیا لیکن میں نے بھی اس سزا میں پورے ایک سال تک اس کو پانی سے محروم رکھا اور کہا یا تو عبادت کے لئے تیار ہو جاؤ ورنہ تجھے اسی طرح پیاس سے تڑپاتا رہوں گا۔

لوگ آپ سے دعا کے لئے عرض کرتے تو آپ خدا سے کہتے کہ مخلوق مجھے واسطہ بنا کر تجھ سے مانگ رہی ہے اور تو ان کی طلب سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس طرح کہنے سے لوگوں کی مرادیں بر آتیں۔ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک ارادت مند آپ کے نقش پا پر قدم رکھ کر چلتے ہوئے کہنے لگا کہ مرشد کے نقش قدم پر چلنا اس کو کہتے ہیں۔ پھر اسی مرید نے استدعا کی کہ مجھے اپنی پوستین کا ایک ٹکڑا عنایت فرما دیں تاکہ مجھے بھی برکت حاصل ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت تک میری کھال بھی سود مند نہیں جب تک مجھ جیسا عمل نہ ہو۔ ایک مرتبہ معرفت و حقیقت کے موضوع پر آپ کچھ فرما رہے تھے تو اپنے ہونٹ چاٹتے جاتے اور کہتے جاتے کہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں کہ میں خود ہی مے بھی ہوں اور مے خوار بھی۔

آپ نے فرمایا کہ خدا کی یاد کا مفہوم اپنے نفس کو فراموش کر دینا ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کے ذریعہ شناخت کرتا ہے وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے' لیکن جو اپنے نفس کے ذریعہ خدا کو پہچاننے کی

سعی کرتا ہے وہ فانی ہے۔ قلب عارف اس شمع کی طرح ہے جو فانوس کے اندر سے ہر سمت اپنا نور پھیلاتی رہتی ہے۔ جس کو یہ مقام حاصل ہو گیا اس کو تاریکی کا خطرہ نہیں رہتا۔ فرمایا کہ دو خصلتیں مخلوق کی تباہی کا باعث بنتی ہیں: اول کسی بھی مخلوق کا احترام نہ کرنا، دوم خالق کے احسان کو ٹھکرا دینا۔

آپ فرماتے ہیں کہ جس وقت مجھے تمام موجودات سے بے نیاز کر کے خدا نے اپنے نور سے منور فرمایا اور تمام اسرار سے آگاہی عطا کی تو میں نے چشم یقین کے ساتھ خدا تعالیٰ کا مشاہدہ کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ میرا نور اس کے نور کے سامنے تاریک ہے اور میری عظمت اس کی برتری کے سامنے قطعاً بے حقیقت ہے کیونکہ وہ مصفا تھا اور میرے وجود میں کثافت تھی۔ جب میں نے اپنے نور و عظمت کے اندر اس کے نور و عظمت کو محسوس کیا تو اندازہ ہو گیا کہ میری تمام عبادت و ریاضت میں اسی کا حکم نافذ ہے۔ خدا نے میری ہستی کو فنا کر کے بقا کا مقام عطا کیا تو اپنی خودی کا میں نے بے حجابانہ مشاہدہ کیا۔ گویا میں نے اللہ کو اللہ کے ذریعہ دیکھا اور اس کی حقیقت میں گم ہو کر گونگا، بہرہ اور جاہل بن گیا، نفس کی بربریت درمیان سے فنا کر کے ایک عرصہ وہاں قیام کیا، پھر خدا نے مجھ کو علوم ازلی سے آگاہ فرما کر زبان کو اپنے کرم سے گویائی دی۔ آپ اپنی مناجات میں یہ کہا کرتے تھے کہ اے اللہ میرے اور اپنے درمیان سے دوئی کا حجاب ختم فرما تاکہ میں تیری ذات میں فنا ہو جاؤں، اے اللہ جب تک میں خودی میں مبتلا رہا سب سے ادنیٰ رہا، لیکن جب تیری معیت نصیب ہوئی اس وقت میں سب سے اعلیٰ و برتر ہو گیا۔

آپ ہمہ اوقات اللہ اللہ کا ورد جاری رکھتے اور عالم نزع میں بھی آپ کی زبان پر اللہ ہی کا نام تھا۔ موت سے قبل آپ نے فرمایا کہ اے اللہ میں دنیا میں بر بنائے غفلت تیری عبادت سے محروم رہا اور اب آخری وقت میں بھی تیری عبادت سے غافل ہوں اس کے باوجود تیری رحمت کا متمنی ہوں۔ یہ کلمات زبان پر تھے کہ روح کی جانب پرواز کر گئی۔ آپ کی وفات 875ء میں ہوئی۔

اپنی فلسفیانہ زندگی کی کتاب میں الرازی ان الزامات کا جواب دیتا اور اپنی مکمل تعلیم کی ایک مفصل جھلک پیش کرتا ہے۔ رسالہ سے پتہ چلتا ہے کہ سقراط نے اپنے انداز زندگی میں یہ مشہور تبدیلی کیوں کی تھی' یعنی وہ پرجوش تصوف کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں میں دلچسپی لینا کیوں شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ الرازی اس تبدیلی کو اسباب کے ثبوت میں پیش کر سکتا تھا کہ سقراط نے بھی ایسا کر کے غلط کیا' لیکن اس نے سقراط کے تصوف کو محض جوانی کی ہیجان انگیزی خیال کیا۔ سقراط اسے پہلے ہی چھوڑ چکا تھا اس لیے وہ اس بات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا تھا کہ کیا کوئی زندگی عقلیت کی تلاش میں اس قدر وقف ہے یا نہیں کہ باقی تمام معاملات کو نظر انداز کر دینا قابل تعریف ہو۔ یا کیا! اچھی زندگی ویسی متوازن ہوتی ہے جو اس نے اپنے رسالہ کے آخر میں بیان کی۔ الرازی سقراط کو اس کی صوفیانہ سرگرمیوں پر برا بھلا کہنے سے احتراز کرتا ہے کیونکہ وہ کسی خطرناک صورت حال سے دوچار نہیں کرتیں۔ اس کی نظر میں تصوف کو برا کہنے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔

وہ انصاف' ضبط جذبات اور جستجوئے علم اور فلسفہ کی کرداری خصوصیت اور سقراط کی زندگی میں قابل توصیف سمجھتا ہے۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ سقراط نے انسانی فلاح پر منتج ہونے والے افعال میں حصہ لینے کے لیے تصوف کو ترک کر دیا' الرازی یہ تجزیہ کرنے سے گریز کرتا ہے کہ یہ خلاف فطرت ہے یا نہیں۔ الرازی اس کے بجائے نتائج کے حوالہ سے اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ کیفیتی کی بجائے کمیتی لحاظ سے ——— اور اسے صرف تبھی غلط قرار دیتا ہے جب اس پر عمل کرنے سے یہ درویشی یا انسانی نسل کی بھلائی کے لیے خطرہ بن جائے۔ اس حکمت نے الرازی کو اپنے ناقدین کی جرح سے بچنے کا موقع فراہم کیا۔

نکتہ بدیہا قابل فہم ہے۔ لیکن الرازی نے یہ دلیل دیتے ہوئے اسے کمزور کیا کہ چاہے وہ سقراط کی ابتدائی درویشی سے کتنا ہی دور ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود غیر فلسفیانہ لوگوں کے ساتھ موازنہ میں فلسفیانہ ہے۔ اگر الرازی یہ تسلیم کر لیتا کہ درویشی کے باعث ہماری دنیا کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہا اور پھر اصلاح شدہ سقراط کی زندگی کے راحت بخش نتائج کی تعریف کرتا تو اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہوتی۔

اپنے دفاع میں کیفیتی حوالے پیش کر کے وہ ایک متوازن زندگی کی تفصیل بتانے میں ناکام رہا۔ الرازی کو صرف یہ دکھانا چاہیے تھا کہ دنیاوی سرگرمیوں میں مشغولیت اختیار کر لینے کے باوجود اور درویشی چھوڑنے کے بعد سقراط فلسفہ میں پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ یا زیادہ دو

ٹوک بات کی جائے تو الرازی کو یہ دلیل پیش کرنا چاہیے تھی کہ سقراط کی ابتدائی درویشی نے اسے فلسفہ کی جستجو میں اس حد تک مشغول و منہمک کر دیا تھا کہ وہ انسانی رویہ سے متعلقہ سوالات پر توجہ نہ دے پایا۔

اس نے ان میں سے کوئی بھی راہ نہ اپنائی کیونکہ کوئی ایک بھی راہ اپنانے سے وہ اپنے مقصد سے بہت دور چلا جاتا اور اس کا مقصد ایسی منطق پیش کرنا تھا جو اس کی فلسفیانہ زندگی کی تصویر مکمل کر دے۔ نتیجتاً اس کا انحصار اس کی تعلیمات پر ہے جن کا خلاصہ اس نے چھ اصولوں کی فہرست بندی کرتے ہوئے مہیا کیا۔ سب اصول اس کی تصنیفات میں سے لئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود بعد کے حصے میں اس نے صرف دو کو آگے بڑھایا۔ پہلا اصول دعوی کرتا ہے کہ جستجوئے مسرت صرف اس انداز میں کرنی چاہیے جو بہت زیادہ تکلیف دہ نہ ہو اور دوسرا اصول خدا کی جانب سے تمام مخلوقات کو مہیا کردہ راہ پر اصرار کرتا ہے۔

مؤخر الذکر اصول بالضرور انسانوں پر دوسری مخلوقات کو تکلیف نہ دینے کا فریضہ عائد کرتا ہے۔ اس اصول کے بارے میں توضیح پیش کرتے ہوئے الرازی اپنے قاری کو سیاسی اہمیت کے معاملات تک لے جاتا ہے: جسم کے مختلف حصوں اور مختلف انواع کے درمیان فطری نظام مراتب' پھر بنی نوع انسان کے اندر افراد کے درمیان فرض کردہ نظام مراتب۔

اس طرح کا امتیاز کر کے وہ اخلاقیات کا تعین کرنے کے قابل ہو سکا۔ وہ اخلاقیات کو بالائی اور زیریں سطوحات کہتا ہے۔ المختصر' پیدائش اور چلن میں اختلافات کو متعین اور مسرت کے مختلف مشاغل پر بالضرور منتج ہونے کے طور پر قبول کرتے ہوئے الرازی ایک طرف تو صرف اس کی حمایت کرتا ہے جو خلاف انصاف یا خلاف عقل نہیں' اور دوسری طرف نہ ہی شخصی تکلیف یا مسرت میں از حد مشغولیت تک پہنچتا ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ آسانی برداشت کر سکتے ہیں' اس لئے حکومت لچک دار ہونی چاہیے۔ اگرچہ الرازی نے حمایت کی کہ کم یا بیش ہمہ عموماً بہتر ہے' لیکن قسمت میں اختلافات کی پیدا کردہ عدم مساوات نے اس بارے میں تجویزیں دینے کے لیے اس میں جوش و جذبہ پیدا نہیں کیا کہ زیادہ منصفانہ تقسیم دولت یا اسے قاعدے میں لانے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاست اور سیاسی معیشت میں اس قسم کی حصہ داریوں سے مکمل طور پر بچتے ہوئے الرازی محض یہ کہتا ہے کہ کم دولت مند کے پاس نچلی سطح پر مطمئن رہنے کا زیادہ وقت ہو گا اور یہ کہ اس سطح کی جانب زیادہ سے زیادہ جھکنا قابل ترجیح ہے۔

الرازی کے بتائے ہوئے "مجموعہ فلسفیانہ زندگی" میں یہ سب باتیں موجود ہیں "خود کو خدا جیسا بنانا---- جس حد تک کسی بھی نوع انسان کے لیے ممکن ہے۔" یہ مختصر سا فقرہ انتہائی غیر معمولی طور پر پیچیدہ اور اختراعی ہے۔ اس کے چار بنیادی حصے ہیں: الرازی خالق کی مخصوص خاصیات کی توثیق کے ساتھ آغاز کرتا ہے؛ اس کے بعد وہ غلاموں کے اپنے آقاؤں یا مقتدرین کو خوش کرنے کے طریقہ اور اس طریقہ کے مابین موافقت کی بنیاد پر ایک ضابطہ اخلاق تلاش کرتا ہے جس کے تحت ہمیں اپنے مقتدر اعلیٰ مالک کو خوش کرنا چاہیے۔ پھر وہ فلسفہ کے کردار سے متعلق اس موافقت میں سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے' اور اس اعلان کے ساتھ ختم کرتا ہے کہ اس مختصر جملے کی مکمل وضاحت اس کی "کتاب روحانیت" میں ملے گی۔

الرازی کہتا ہے کہ دلچسپی رکھنے والا قاری لازماً کتاب روحانیت سے رجوع کرے گا کیونکہ اس میں اس نے نشاندہی کی ہے کہ (1) ہم بری اخلاقی عادات واطوار سے پیچھا کیسے چھڑائیں' اور (2) فلسفیانہ بننے کی خواہش رکھنے والا شخص ذریعہ معاش' منفعت' اخراجات کے حصول اور حکومت کے لیے جدوجہد کے ساتھ کسی حد تک خود کو جوڑے۔ یہ الفاظ دیگر فلسفیانہ زندگی کی یہاں پیش کردہ تعریف ایسے سوالات اٹھاتی ہے جنہیں وہ کسی اور جگہ پر فضائل اخلاق' بالخصوص اخلاقی پاکیزگی اور انسانی معاملات (معاشیات کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار) سے متعلق قرار دیتا ہے۔ الرازی کے خیال میں فلسفہ تین بنیادی مسائل پر مشتمل ہے: فضائل اخلاق یا اخلاقیات: گھریلو انتظام یا معاشیات؛ اور سیاسی حکومت۔ کتاب روحانیت کی جانب اشارہ صرف اس چیز کو زیادہ اہم بناتا ہے جس کی وضاحت الرازی کی تعلیمات سے لئے گئے دو اصولوں کے تعارف میں پہلے ہی کی جاچکی تھی۔ جیسا کہ الرازی سرراہے ذکر کرتا ہے' (اس اعتماد میں کہ قاری کو یہ بات معلوم ہو گی کہ تمام مخلوقات کے لئے مشیت ایزدی کس طرح کچھ لوگوں کو دوسروں کی خدمت کرنے کا جواز پیش کرتی ہے) اس لیے انسانوں کے درمیان ان حوالوں سے فرق کرنا کاملاً قابل توجیہہ ہے کہ وہ اپنی برادری کی فلاح کے لیے کتنے ضروری ہیں۔

رسالہ کے اختتامی الفاظ میں (اپنی حتمی خود توجیہی کے جزو کے طور پر) الرازی دعویٰ کرتا ہے کہ فلسفہ علم اور عمل کے دو حصوں پر مشتمل ہے' اور ان دونوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہنے والا خود کو فلسفی نہیں کہہ سکتا۔ بطور فلسفی اس کا اپنا کردار عنایت کردہ ہے۔ تصنیفات اس کے علم' اور بالائی وزیریں سطحوں سے اس کا لگاؤ اس کے عمل کا ثبوت ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ علم کو زیادہ اعلیٰ رتبہ دیتا تھا۔ بہر صورت اسی میں وہ وضاحت کرتا ہے کہ جستجوئے علم

سے اپنی آنکھیں اور ہاتھ مفلوج کر لینے تک پہنچادیا تھا۔925ء میں وہ دار فانی سے

الفارابی

(870ء ---- 950ء)

ابو نصر محمد الفارابی 870ء میں پیدا ہوا۔ وہ ارسطوئی مسلمانوں میں سے ایک تھا۔ اسے "استاد ثانی" کا خطاب دیا گیا' استاد اول ارسطو تھا۔ ایک نسطوری عیسائی یو حنا ابن حیلان کے ساتھ مطالعہ کرنے کے علاوہ الفارابی نے بغداد میں ایک اور عیسائی گرو ابو بشر متے کے ساتھ ریاضی' فلسفہ' علم فلکیات اور موسیقی کا بھی مطالعہ کیا۔ متعدد دیگر مسلم فلسفیوں کی طرح الفارابی نے بھی طویل سفر کیے' علمی مراکز میں گیا اور اپنے دور کے عالموں سے ملاقات کی۔ بغداد میں عرصے تک مقیم اور مصروف جدوجہد رہنے کے بعد الفارابی نے غالباً سیاسی مشکلات کے سبب سے حلب میں سکونت اختیار کی جہاں سیف الدولہ کا عظیم الشان دربار تھا۔ مگر اس نے اپنی زندگی کا آخری حصہ دربار میں نہیں بلکہ کنج عزلت میں گزارا۔ دسمبر 950ء میں اس نے دمشق کی جانب سفر کے دوران وفات پائی۔

اس کی عمر اسی برس مشہور ہے' ممکن ہے وہ اس سے زیادہ عمر تک پہنچا ہو۔ الفارابی کے ہم عصر اور ہم مکتب ابو بشر متے نے اس سے دس سال پہلے اور شاگرد ابو زکریا یحییٰ ابن عدی نے 974ء میں 81 برس کی عمر میں وفات پائی۔

الفارابی کا فلسفہ اسلامی فکر میں افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات کے درمیان مصالحت کرانے کی پہلی سنجیدہ کوشش پیش کرتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت اس نے افلاطون اور ارسطو کے رسائل پر متعدد تفاسیر اور تشریحات تصنیف کیں۔ ان تفسیروں کے باوجود وہ منطق اور سیاسی فلسفہ پر اپنی کتابوں کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اور منطق' اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات میں اس نے ارسطو کی تقلید کی' جب کہ سیاست میں افلاطون کو فوقیت دی۔

الفارابی کہتا ہے کہ تمام موجودہ مخلوقات واجب اور ممکن ہستیوں میں تقسیم ہیں۔

واجب ہستیاں خود اپنی خوبی میں موجود ہیں اور انہیں اس کے لیے خارجی علت کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہستیاں وہ ہیں جو وجود میں تو آسکتی ہیں لیکن آتی نہیں اور انہیں وجود میں آنے کے لیے کسی خارجی علت کی ضرورت ہوتی۔ الفارابی دلیل دیتا ہے کہ اگر کسی موجود چیز کی تمام اتفاقی (غیر ضروری) خصوصیات کو الگ کر دیا جائے تو اس کے جوہر میں باقی کیا بچے گا؟ چنانچہ الفارابی کے خیال میں تمام اشیائے ہست ایک جوہر پر مشتمل ہوتی ہیں جن کے ساتھ وجود کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ صرف خدا کے لیے ہی جوہر اور وجود بالکل ایک ہیں۔

الفارابی کے مطابق دنیا کی آفرینش یا صدور ایک قدیم معقول کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا اپنا تصور کرتے ہوئے خود میں سے ایک عقل کا صدور کرتا ہے' عقل اول۔ یہ عقل اول اپنے خالق کا تصور کرتی ہے تو افلاک کی عقل ثانی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب عقل اول اپنی ذات کا تصور کر کے جوہر بن جاتی ہے تو اس سے اجسام اول' یعنی سب سے اونچے افلاک پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ سب سے نچلے فلک یعنی قمر تک آتا ہے۔ سب افلاک مل کر ایک سلسلہ بناتے ہیں جو کہیں سے معطل نہیں' کیونکہ تمام موجودات میں وحدت ہے۔ دنیا کی آفرینش اور بقاء ایک ہی چیز ہے۔ کائنات میں نہ صرف ذات الٰہی کی وحدت کی نقل موجود ہے بلکہ اس کی خوشنما ترتیب میں عدل الٰہی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

عقول کے بارے میں ارسطو کے بیان کی اپنے انداز میں تعبیر کرنے والا الفارابی دلیل پیش کرتا ہے کہ ارسطو چار مختلف عقول میں یقین رکھتا تھا۔ مخفی عقل جو انسانی نفس کی استعداد فکر ہے؛ عقل فی الحقیقت' جو قابل محسوس طبیعی دنیا میں ہے؛ اکتسابی عقل' جو اس کے خیال میں تب حاصل ہوتی ہے جب عقل فی الحقیقت قابل محسوس کا تصور کرتی ہے؛ اور سب سے آخر میں عقل فاعل' جو سوچنے کی علت ہے۔

الفارابی اسلام کا شاید سب سے بڑا منطقی ہے۔ وہ تمام ارسطوئی "نظام منطق" (Organon) پر ایک وسیع تر تنقید اور تجزیہ کرتا ہے۔ اس کا قیاسی تخفیف کے اصولوں کا تجزیہ اور فرضی وانفعالی قیاسات (یعنی تردیدی حروف عطف مثلاً' لیکن ---- بلکہ ---- تاہم ---- یا اور نہ ہی) پر اصرار' استقراء پر بحث اور دلائل میں تمثیل کے ذریعہ درجہ بدرجہ قیاسیت کا استعمال منطق میں اس کی بہت بڑی شراکت داری ہے۔ ان اہم شراکتوں کے علاوہ اس نے مستقبل کے احتمالات اور آئندہ واقعات کے تعین پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔

بعد از الفارابی مسلمان منطق دان اس کے زیر اثر رہے' حتیٰ کہ اس کے خیالات لو

جوڑنے توڑنے اور ان پر تنقید کرنے والوں نے بھی اکثر اس کی نظروں سے ارسطو کو جانا۔ واضح ترین مثال ابن سینا ہے' جو منطق پر الفارابی کے خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

الفارابی کو یقین تھا کہ صرف ایک ہی بنیادی مذہب ہے اور مختلف دیگر مذاہب اس کی ظاہری صورتیں ہیں۔ تمام مذاہب کی صداقت کی توثیق کرتے ہوئے الفارابی کہتا ہے کہ ہر مذہب اپنے مخصوص ماحول میں قابل اطلاق ہے۔ لوگوں کو ان مذاہب کا تنوع نہیں بلکہ اس امر سے لاعلمی ایک دوسرے سے الگ الگ کرتی ہے کہ تمام اشخاص حقیقت کے مختلف میدانوں اور روحانی ترقی کے مختلف مدارج میں خدا کی تجسیم ہیں۔

الفارابی کے خیال میں انسان میں معاشرتی زندگی کے لیے اشتیاق موجود ہوتا ہے اور اسے صرف ریاست کے اندر ہی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ افلاطون کی پیروی میں الفارابی کا بھی یقین ہے کہ لوگ صرف اور صرف اسی صورت میں خوش ہو سکتے ہیں۔ جب وہ اپنی تخلیق کے وظائف پورے کریں۔ چونکہ انسان اپنی استعداد کار میں بالکل مساوی نہیں ہوتے۔ لہذا یہ یقینی بنانا ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو وہ مقام دے جہاں ان کی حقیقی فطرت کا بہترین استعمال ہو سکے۔

''ری پبلک'' میں جس طرح افلاطون نے کہا' اسی طرح الفارابی اپنی مثالی ریاست کو انسانی جسم کے نمونے پر ایک فطری ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے' جس میں ذہن روح اور جسم پر مشتمل سلسلہ مراتب موجود ہے۔ اس سلسلے میں ارفع ترین سطح----ذہن----زیریں سطوحات پر غالب ہونے اور ہم آہنگ بنانے کا قدرتی حق رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح حکومت میں پیغمبر اپنی الوہی دانش کے ذریعہ حکومت کرتا ہے۔

اچھی ریاست ایک فطری ریاست ہوتی ہے اور یہ صرف خوش رہنے کی چاہت میں انسانوں کے لیے فطری ہے۔ اس لیے الفارابی کے خیال میں اپنے شہریوں کو خوشی کی ضمانت دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس نے مسرت اور اس کو حاصل کرنے کے موضوع پر بہت زیادہ بات کی۔

الفارابی کے مطابق مسرت کی فطرت کی تین متبادل تفسیریں ہیں: مسرت بطور خالصتاً فطری کارکردگی؛ مسرت بطور عملی کارکردگی؛ اور مسرت نظری و عملی کارکردگی کے ہم آہنگ امتزاج کے طور پر۔

نظری کمال کو عملی کمال کا ماخذ قرار دیتے ہوئے الفارابی نتیجہ پیش کرتا ہے کہ نظری

کاملیت کو حقیقت کا روپ دینا فلسفے کا ہدف ہے۔ اسی مطابقت میں الفارابی کہتا ہے کہ نظری اور عملی استدلال کی مفاہمت کے ذریعہ ہی انسانی کاملیت کا حتمی مقصد پورا ہوتا ہے۔

الفارابی نے مسرت کا عملی مافیہ ایک اخلاقی فطرت' یعنی مسرت کی ذاتی کارکردگی کے طور پر پیش کیا' جو اس کے خیال میں صرف معاشرے کے سیاق و سباق کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے۔ لہٰذا الفارابی نے ایک کامل سیاسی نظام اور اعلیٰ ترین حکمران کی ضرورت پر زور دیا جس کا راستباز کردار شہریوں پر مسرت نچھاور کر سکتا ہے۔ الفارابی کے خیال میں منطقی استعداد کی مکمل ترقی اور فلسفیانہ غور و فکر کے ذریعہ سچائی کا حصول مقصد حیات ہے۔ ایسا صرف ان بانظم معاشروں میں ہی ممکن ہو سکتا ہے جن پر عادل حکمران مقتدر ہوں۔

تاہم' عملی قوانین صرف نظری دانش کے ذریعہ ہی بنانا ممکن ہیں۔ اخلاق صرف اس ریاست میں مکمل ہو سکتا ہے جو محض سیاسی ادارہ نہیں بلکہ مذہبی جماعت بھی ہو۔ ریاست کی حالت پر نہ صرف اس کے موجودہ باشندوں کی قسمت کا انحصار ہے بلکہ آئندہ کا بھی۔ "جاہل" ریاست میں باشندوں کے نفس عقل سے محروم رہتے ہیں اور صورتوں کی حیثیت سے فنا ہو کر عناصر میں مل جاتے ہیں تاکہ نئے سرے سے دوسرے انسانی جسموں میں اپنا گھر بنائیں۔ "خاطی" اور "بد" ریاست میں ساری جوابدہی صرف حکمران کے سر ہے۔ آخرت میں عذاب الٰہی اس کا منتظر رہتا ہے۔ اور جن روحوں کو حکمران نے خطا میں مبتلا کر دیا ہے ان کا بھی وہی انجام ہوتا ہے جو "جاہل" ارواح کا۔ بقاء صرف نیک اور دانا ارواح کو ہے اور وہی خالص عقل کی دنیا میں داخل ہوتی ہیں۔ زندگی میں ان کے علم کا پایہ جس قدر بلند ہو اتنا ہی بلند مرتبہ ان کو مرنے کے بعد وجود کلی کے مدارج میں حاصل ہوگا۔

اب اگر ہم الفارابی کے نظام پر مجموعی نظر ڈالیں تو وہ ایک مدلل نظام روحانیت ہے؛ بلکہ زیادہ صحیح نام اس کے لیے "عقلیت" ہے جسمانی اور محسوس چیزوں کا مبداء عقل کا تخیل ہے۔ اسے تصور بھی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقی وجود صرف عقل کا ہے' لیکن اس کے مختلف مدارج ہیں۔ بسیط صرف خدا کی ذات ہے۔

الفارابی ذہنی دنیا میں ابدی حقیقت کی خاطر زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ اقلیم عقل کا بادشاہ مال دنیا کے اعتبار سے فقیر تھا۔ وہ اپنی کتابوں اور اپنے باغ کے پھولوں اور پرندوں میں مگن رہا کرتا تھا۔ ہم وطنوں اور عام مسلمانوں کی نظر میں اس کی وقعت بہت کم تھی۔ وہ عقل محض کے مجرد تصور میں محو ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتھی اسے ایک متقی اور مقدس شخص سمجھ کر اس کے ثنا خواں

تھے۔ بعض شاگرد اسے مجسم توانائی جان کر اسکے پرستار تھے۔

جس طرح فلسفہ طبیعی کو بگاڑ کر لوگوں نے ایک پراسرار علم بنا دیا اور جس طرح الکندی کا حلقہ فلسفے کو چھوڑ کر ریاضی اور علوم طبیعی کا ہو رہا اسی طرح الفارابی کے منطقی حلقے نے لفظی فلسفے کو اختیار کر لیا۔ موضوع بحث صرف تصورات کا تعین کرنا اور بال کی کھال اتارنا رہ گیا تھا۔ جس چیز کو الفارابی اپنی حکمت کی جان سمجھتا تھا وہ اس جماعت کے لیے محض دلچسپ علمی گفتگو کا موضوع ہوتی تھی۔

ابن سینا

(980ء ---- 1037ء)

ابو علی الحسنین ابن عبداللہ ابن سینا اسلامی اور قرون وسطی کے عیسائی فلسفہ دونوں کی روایت میں تمام مسلم فلسفیوں سے زیادہ تاثر انگیز تھا۔

ابن سینا کی پیدائش ایک اسماعیلی گھرانے میں ہوئی اور اس کے باپ' جو خود بھی باعلم شخص تھا' نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ سیکھنے میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کر کے ابن سینا نے بہت چھوٹی عمر میں اپنی تعلیم شروع کی۔ دس سال کی عمر میں پہنچنے تک وہ قرآن پاک اور بہت سی عربی صرف ونحو حفظ کر چکا تھا۔ پھر اس نے ابو عبداللہ النطلی کے ساتھ منطق اور ریاضی کا' اور ابو سحل المیچی کے ساتھ طبیعیات' مابعد الطبیعیات اور طب کا مطالعہ کیا۔

اپنے دور کے تمام علوم میں کمال حاصل کر لینے والا ابن سینا اس وقت تک ارسطو کی مابعد الطبیعیات کو سمجھ نہ پایا جب تک کہ اس کتاب پر الفارابی کی تفسیر نہ پڑھی۔ اس تفسیر نے ابن سینا کی مشکلات کو دور کر دیا۔ اس وقت ابن سینا کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ یہ اس کے علم کی عمق اور وسعت ہی کی تھی جس کے لیے بعد میں وہ شیخ الرئیس' حجتہ الحق' یا "طبیبوں کا شہزادہ" کہلایا۔

اپنے وطن میں طوائف الملوکی کی گرم بازاری نے ابن سینا کو بھی چھو لیا اور وہ کوئی پناہ ڈھونڈنے کے لیے جرجان کو روانہ ہو گیا۔ متعدد درباروں میں جانے اور شمس الدولہ کے دور میں بحیثیت وزیر چند سال گزارنے کے بعد وہ اصفہان میں قیام پزیر ہو گیا' جہاں اس نے امن اور شانتی کے پندرہ برس گزارے جن میں حملہ اصفہان کی وجہ سے تعطل آیا۔ ابن سینا واپس ہمدان آیا اور وہاں وزیر ہو گیا۔ بعد میں اپنے انتظامی فرائض کی ادائیگی جاری رکھنے سے انکار کرنے پر اسے قید کر دیا گیا۔ اس نے کنج قفس میں ہی آنتوں کے تکلیف دہ تشنج سے وفات پائی۔

ابن سینا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بے نظیر قوت ارتکاز کا مالک تھا اور اس نے

جنگ میں بادشاہ کے پیچھے پیچھے گھوڑے کی کمر پر بیٹھے ہی متعدد فلسفیانہ رسائل مرتب کیے۔ اتنے زیادہ عقلی اور روحانی پہلو بہت کم لوگوں میں ہوں گے۔ وہ بیک وقت ایک ریاست کا فلسفی اور طبیب تھا۔ اس نے طب کی سقراطی اور گلیلائی روایت کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے قرون وسطیٰ کے فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ وہ علم طب کو کم گہرا علم خیال کرتا تھا۔

الفارابی کی طرح ابن سینا بھی یہ دلیل دیتا ہے کہ کائنات "ظہور" کی پیداوار ہے۔ ماخذ وجود یعنی خدا عقل اول کا صدور کرتا ہے اور اس عقل اول سے ہی عقل ثانی کا صدور ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتے چلتے دسویں عقل تک پہنچتا ہے جو تحت قمری دنیا پر حکمران ہے۔ آخری "عقل فعال" ارضی مادے، مجسم صورتوں اور نفس انسانی کو پیدا اور ان کی تشکیل کرتی ہے۔ مندرجہ بالا معقول سلسلہ کے ذریعہ ابن سینا نے یہ پیچیدہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی کہ تکثیرت والی دنیا کا ظہور وحدت میں سے کیسے ہوا۔

مندرجہ بالا دلیل سے موجودات میں ایک تقسیم پیدا ہوتی ہے جو یوں ہے: واجب ممکن اور ناممکن۔ ابن سینا کے خیال میں اس تصور کا موجودات کے درمیان ایک اور اہم فرق کے ساتھ قریبی تعلق ہے یعنی جوہر یا ماہیت اور وجود کے درمیان فرق۔ معروض کی الگ شناخت کے طور پر "جوہر" اور تمام فعالیت کی مشترک خصوصیت کے طور پر "وجود" کے درمیان اہم فرق کو قرون وسطیٰ کے بیشتر فلسفیوں' عیسائی اور مسلمانوں' نے اپنے فلسفہ میں شامل کیا۔

"وجود کا فلسفی" کا خطاب وصول کرنے والے ابن سینا نے جوہر پر وجود کو مقدم قرار دیا۔ ابن سینا کے نظریہ ہست کے مختلف پہلوؤں کے درمیان پیچیدہ تعلق داری کو یہ ظاہر کرنے کے لیے ترکیب دیا گیا ہے کہ واحد واجب الوجود (خدا سے دنیا ظاہر ہوئی' جو ایک طرف تو عارضی (کیونکہ اس کا وجود ظہور پر منحصر ہے) اور دوسری جانب واجب ہے' کیونکہ اس کا ماخذ بھی واجب ہے۔

اپنی تکوینیات (Cosmology) میں ابن سینا وحدت اور کثرت کے درمیان موجود تواتر اور تکثیریت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ "ایک میں سے صرف ایک ہی وجود میں آسکتا ہے" کے اصول کی خلاف ورزی کیے بغیر وحدت سے ظاہر ہونے والی کثرت کے وجود کی وضاحت کرنے کے لیے نوفلاطونی طریقہ کار میں رہتے ہوئے ملائک کے شفاعتی وظائف پر انحصار کرتا ہے۔

ابن سینا خدا میں سے ظہور کے عمل اور جسم افلاک کے درمیان ایک ربط و آہنگ پیدا کرتا ہے۔ عقل اول' جس کا تعلق رئیس الملائکہ سے ہے' عقل دوم کو ظاہر کرتی ہے جو فلک اول

کی جسم و روح ہے۔ عقل دوم میں سے ظاہر ہونے والی تیسری عقل، بالترتیب دوسرے فلک کی روح اور جسم بناتی ہے۔ عقل ظاہر ہونے میں ایک اور روح و جسم کو بنانے کے لیے استعمال ہونے والی پاکیزگی، سویں عقل یا عقل فاعل کے ظہور تک آتے آتے کم ہو جاتی ہے اور مزید کوئی فلک پیدا نہیں ہو پاتا۔ یہیں پر پیداوار اور بگاڑ کی مادی دنیا عقل فاعل کے اندر باقی ماندہ ممکنات سے وجود میں آتی ہے۔

عقل فاعل کو طبعی دنیا اور عقول کی دنیا اور خدا کے درمیان وسیلے کے طور پر "واجب الصورہ" قرار دیا گیا۔ کسی چیز کے معرض وجود میں آنے پر عقل فاعل ایک صورت (ممتاز کردار) مجسم کرتی ہے اور کسی چیز کے فنا ہو جانے پر صورت کو واپس لے لیتی یا اسے کسی اور صورت کے ساتھ بدل دیتی ہے۔

عقل فاعل کا دوسرا کام ذہنوں کو منوّر کرنا ہے۔ عقل فاعل کے ملکوتی ذہن میں صورتیں مادے میں ظاہر ہوتی ہیں اور ذہن انسانی عمل بصیرت کے ذریعہ صورت کا مادے سے علیحدہ ادراک کرنے کے قابل ہوتا ہے: مادے اور صورت کا امتزاج کسی موجود شے کی باہری تجسیم کی صورت گری کرتا ہے۔

وحدت اور کثرت کے درمیان ملائکہ کا بطور وسیلہ استعمال کر کے ابن سینا نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ کثرت وحدت میں سے کیسے باہر نکلی۔ یہ مقدس تکوینیات کے لیے بنیاد مہیا کرتی ہے جس میں ابن سینا عالم اصغر کو سمجھنے کے لیے عالم اکبر کا مطالعہ کرنے کی دلیل دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اسلام میں حروف کا علم پیدا ہوا جسے "جفر" (jafr) کہتے ہیں۔ اس میں عربی حروف تہجی کے الفاظ تکوینیات کے قاعدوں سے مربوط ہیں۔

نفسیات پر ابن سینا کے خیالات علمیات (نظریہ علم) پر خیالات کے ساتھ بلاواسطہ طور پر متعلق ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان تین استعدادیں رکھتا ہے ---- نباتاتی، حیوانی اور استدلالی۔ یہ استعدادیں باہم منسلک اور خارجی حالات پر منحصر ہیں۔ نباتاتی نفس کا معدنیات پر، حیوانی نفس کا نباتاتی نفس پر اور استدلالی نفس کا انحصار حیوانی نفس پر ہوتا ہے۔ چنانچہ نباتاتی نفس کی سب سے بالائی سطح اور حیوانی نفس کی سب سے نچلی سطح آپس میں قریبی عینیت رکھتی ہیں۔ ہر نفس اپنی استعدادوں کے علاوہ اپنے سے سابق نفس کی استعدادیں بھی رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر نباتاتی نفس میں تولید اور نشوونما شامل ہے۔ حیوانی نفس قوت، خواہش، ہوس اور غصے کا مالک ہے۔ تاہم حیوانی نفس کی استعدادیں پانچ حواس ظاہری اور پانچ حواس باطنی کے دو درجوں میں تقسیم ہیں۔ پانچ

حواس باطنی تولید، تصور، جانچ، حافظہ اور یاد آوری پر مشتمل ہیں، جبکہ بصارت، سماعت، لمس، ذائقہ اور سونگھنا پانچ ظاہری حواس ہیں۔

تخلیق کی سب سے پُر شکوہ مثال، یعنی صرف وجود انسانی، میں ہی استدلالی نفس موجود ہے۔ استدلالی نفس کے دو حصے ہیں، عملی اور نظری۔ عملی نفس منبع افعال ہے اور زندگی کے روزمرہ معاملات کے فیصلوں سے بالاتر۔ نظری استعداد، جو صرف انسانوں میں ہے، چار سطوحات پر مشتمل ہے۔

ابن سینا کی نفسیات اس کی وجوہات کے حوالے سے ہے، جس کے مطابق عقل خالص وجود میں سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہ عمل نیچے تک آتے آتے جمود اختیار کر لیتا ہے۔ پیندے یعنی معدنی سطح سے نفس جس قدر اوپر جاتا ہے اتنا ہی خالص ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا کی نفسیات اس طریقہ کار کو وجودیات کے سیاق و سباق میں رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

"کتاب الشفاء" کے پہلے باب میں ابن سینا ہمیں ایک فرضی کہانی سناتا ہے جو اس کی وجودیات کے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایک شخص اس قدر محرومی میں پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے کہ وہ کسی بھی شئے کو دیکھ، چھو، سونگھ یا سن نہیں سکتا لہٰذا خارجی دنیا کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔ اس شخص کو صرف اپنی ذات کا علم ہے اور اس علم کی لاتوسطیت (Immediacy) ایسی ہے کہ اس شخص کو اپنے علاوہ کوئی اور شئے موجود نہ ہونے کا قطعی یقین ہوتا ہے۔

ابن سینا کی فکر کی صوفیانہ جہت نے اس کی ارسطوئی کتابوں کے مقابلہ میں کم توجہ حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ ابن سینا نے زندگی کے اواخر میں اپنے فلسفہ کو صوفیانہ رنگ دے دیا تھا۔ ایک رسالے "منطق المشرقیین" میں ابن سینا کہتا ہے کہ ارسطوئی تصنیفات کا ڈھیر روحانی اشراقیہ کے لیے ہے۔ تصوف (یا جسے اس نے "اشراقیہ کی سائنس" کہا) سے متعلق اسکی تصنیفات میں رسالہ فی العشق، حی ابن یقظان اور رسالہ الطائر جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ابن سینا کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے قانون طب کی تیرھویں سے سولھویں صدی تک مغرب میں بھی بڑی قدر تھی۔ ایران میں آج تک اس کی رو سے علاج کیا جاتا ہے۔ اس کا اثر عیسوی کلام پر بہت اہم تھا۔ دانتے نے اسے بقراط اور جالینوس کی صف میں جگہ دی تھی اور اس کا قول ہے کہ ابن سینا طب میں جالینوس کا ہم پلہ اور فلسفے میں کہیں افضل ہے۔ مشرق میں وہ فلسفے کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے۔

ابن سینا کے دشمن بھی ابتداء ہی سے بہت تھے اور یہ دوستوں سے زیادہ بلند آہنگی کے

ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ شعراء نے اس کی ہجو کی۔ علمائے دین میں سے بعض اس کے مویدتھے اور بعض نے اس کے خیالات کی تردید بھی کی۔ خلیفہ مستنجد نے 1150ء میں ایک قاضی کے کتب خانے کو، جس میں ابن سینا کی تصانیف بھی تھیں، جلوا دیا تھا۔

قشیری

(986ء ---- 1074ء)

قشیری کے عہد تک آتے آتے اسلامی تصوف رابعہ بصری، بسطامی، جنید اور حلاج جیسی عظیم شخصیات سے عبارت دور کی دھماکہ خیز ترقی اور دریافت سے اسلام کے اندر تصوف کے کردار پر زیادہ خود آگاہ غور وفکر کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔

اس تبدیلی کا مطلب ابتدائی شخصیات کی دی ہوئی تخلیقی صلاحیت کا اختتام نہیں تھا، یہ تخلیقی صلاحیت صدیوں جاری رہی۔ تاہم اس کے پہلو بہ پہلو سراج (وفات 988ء) سلمی (وفات 1021ء) اور مکی (وفات 966ء) سے منسوب صوفیانہ ادب کی زیادہ نئی ہم نظر قسم کا ظہور ہوا۔ یہ رجحان قشیری کی اعلیٰ ترین تصنیف میں نکتہ عروج پر پہنچا۔ اس کا نام "رسالہ" ہے، لیکن بطور رسالہ قشیری مشہور ہوا۔

قشیری کا پورا نام عبدالکریم ابن حوازن القشیری تھا۔ وہ 986ء میں سلطنت غزنوی کے دور میں نیشاپور کے نزدیک خراسان میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے دور کی مکمل اسلامی تعلیم حاصل کی، یعنی قرآن پاک حفظ کیا اور فقہ واشاراتی توحید کا مطالعہ کیا۔ صوفی گرو دقاق (وفات 1021ء) کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد قشیری نے کئی ایک کتابیں لکھیں جن میں قرآن کی تفسیر بھی شامل تھی۔ لیکن اس کا "رسالہ" ہی اس کی تحقیقی قابلیت ظاہر کرتا ہے۔ اس میں قشیری ابتدائی صوفیوں کی سوانح کا ایک جامع مجموعہ پیش کرنے میں سلمی کی مثال پر چلتا ہے۔ یہ سوانحات حدیث کے ساتھ وابستہ روایتی صورت پر منحصر ہیں۔ ہر صوفی کے فرمان بیانات کے سلسلہ میں چلتے ہیں جو راویوں نے بتائے۔ یہ طریقہ کار استعمال کرتے ہوئے سلمی اور قشیری تصوف کو اسلامی اسناد کے قدیم مرکزنے میں متعین کرتے ہیں۔

حصہ دوم میں قشیری کا تخیلاتی طرز فکر اپنی کثیف ترین اور عمدہ ترین صورت میں ہے۔

اس کا گمراہ کن عنوان "تفسیر الفاظ" ہے۔ ہر اہم تصور کے تجزیہ کا تانابانا ابتدائی صوفیوں کے اقوال کے اردگرد بنایا گیا ہے۔ ہمیں زبانی روایات ملتی ہیں جنہیں ایک زبردست ادبی شخص نے اپنے رسالے میں تخلیق کر کے یوں پیش کیا جیسے ابتدائی صوفیوں کے مابین کوئی پیچیدہ بحث جاری ہو۔ قشیری بالخصوص محاورات کا دلدادہ تھا۔ اس نے اکثر فقرات ان الفاظ سے شروع کئے "وہ کہتے تھے" "کچھ کہتے ہیں" "یا کسی نے کہا" جب وہ نامی شیوخ ذکر کرتا ہے تو مقولے چند ایک شخصیات' مثلاً اس کے استاد اد قاق اور اد قاق کے استاد سلمی پر مرکوز رہتے ہیں۔ مختلف کہاوتیں اور نظمیں انتہائی لطیف تجزیہ میں پیش کی گئیں۔ ایک واحد اصطلاح مثلاً "وقت" کی مختلف نکتہ ہائے نظر (غیر صوفیانہ اور صوفیانہ) سے تعریف کی جائے گی۔ ہر مختصر مضمون میں آگے بڑھتے بڑھتے بڑھتے درجہ بدرجہ اصطلاح کے زیادہ گہرے معنی عیاں ہوں گے۔ بہت سی صورتوں میں ایک اصطلاح کسی مضمون میں مختلف معنوں میں اس طرح استعمال ہوگی کہ اسے صرف مخالفانہ نکتہ نظر سے ہی سمجھا جاسکے گا۔ اگر اصطلاح کو پہلے مثبت اور پھر منفی مفہوم میں لیا جائے تو مضمون میں کہی گئی بہت سی باتوں کا مطلب بالکل الٹ ہو سکتا ہے۔ "یہ تناظریت" مضمون کو متواتر ایک زبردست تناؤ میں رکھتی ہے' کوئی بھی بے تغیر تعریف خود اپنی قوت پر قائم نہیں۔

ہر اصطلاح پر بحث میں اس کے عام معنی اور بنیادی علم المعانی اعتراف و اقرار' اور ان مختلف طریقوں پر گفتگو شامل ہے جو صوفیوں کے مختلف گروہوں نے اس کا تعین کرنے میں استعمال کئے۔ تاہم' تصور کی جذبات انگیز اور نفسیاتی موشگافیوں کے تحقیقی تجزیے کے علاوہ اس کی اخلاقی و تجرباتی جہتیں بھی شامل ہیں۔ انسانی خود مختاری اور خدا کی قدرت مطلق کے درمیان قدیم تناؤ پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے نظریہ کی دینیاتی اطلاقیت کا تجزیہ کیا گیا۔ مزید برآں' آہنگ و شاعری اور ڈرامائی پہلوؤں سے اصطلاح اور نظریہ تعلق کا محتاط جائزہ بھی موجود ہے۔

قشیری کا رسالہ اس احساس کو شدید کرتا ہے کہ اہم صوفیانہ اصطلاحات و تصورات معنی کا ایک منحصر باہم جال بنتے ہیں جس میں ہر اہم اصطلاح یا کڑی باقی تمام پر منحصر اور ان سے مل کر بنی ہے۔ اس طریقہ کار میں رسالہ صوفیانہ تصورات کا شاندار تجزیہ ہی نہیں' بلکہ صوفیانہ کشف کے کثیر التناظر اور متحرک کردار کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔

عارفانہ تجربے اور حقیقت میں یکجائی کے مقصد کے ساتھ مہم تک قشیری کی پہنچ نظریہ "وقت کی تعارفی تفسیر اور وقت' تجربے اور عینیت کے ساتھ اس کے تعلقات سے واضح ہے۔ تصوف میں وقت "حال" کا عارضی دور ہے۔ ہر لمحے میں مکمل خود سپردگی تک جاتے ہوئے حالت

اور وقت دونوں کی شدت کے متواتر مراحل آتے ہیں' کہ جیسے وہ لمحہ ہی کسی کے وجود کی کایا پلٹ ہو۔ ذاتی ارادے یا انتخاب کی کمی صوفیانہ وقت کا ایک اور عنصر ہے۔ وقت صوفی پر کسی ارادے یا جانی بوجھی کوشش کے بغیر خود بخود وارد ہوتا ہے۔ قشیری نے وقت کے بارے میں مختلف تناظروں کا ایک پیچیدہ مجموعہ پیش کیا۔ انجام کار' سزا و جزا کے اگلے جہان کو فعل حال میں لاتے ہوئے وقت کو "وقت ماورائے وقت در وقت" کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قشیری نے حالت فکر یا "حال" کے موضوع پر اس انداز میں بات کی جو صوفیانہ نفسیات میں خلقی قوائیت (dynamism) پر زور دیتا ہے۔ وہ فانی حالت اور وجدانی وحدت کی راہ کے ساتھ زیادہ پائیدار اور "مقام" کے درمیان امتزاج کے ساتھ آغاز کرتا ہے۔ پھر اس نے ایک زیادہ پیچیدہ تناظر پیش کیا جو بے ثبات حالتوں سے برتر باثبات حالتوں کا وجود قائم رکھتا ہے۔ قشیری نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ باثبات حالتیں صرف کسی چیز کے "ذائقہ" کے طور پر ہی موجود ہو سکتی ہیں۔ "ذائقے" کی متواتر حالت کے تجربے کرنے والا شخص بے ثبات حالتوں سے کہیں ارفع حالتوں کا تجربہ بھی کرے گا۔ جب یہ ارفع حالتیں پائیدار ہو جائیں تو ان سے بھی ارفع بے ثبات حالتیں وقوع پزیر ہوتی ہیں۔

قشیری کا بے ثبات حالتوں کا باثبات حالتوں سے بطور برتر حمایت کرنا صوفی کی تفکرانہ نفسیات میں غیر مختتم تبدیلی پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ حقیقت کی جانب جاتی ہوئی لا محدود شاہراہ پر بڑھتے ہوئے متلاشی اور آنے والی حالتوں کے مافیہ کا تجزیہ کرتا ہے۔ کسی حالت کے مافیہ (مسرت انقباض' خواہش' پریشانی' خوف' موجود' غائب) کی نشاندہی کرنے کے لئے وہ ناقابل ترجمہ اصطلاح "معنا" (Ma'na) استعمال کرتا ہے' جس میں "معنی" "جوہر" یا "احساس" کے تصورات باہم ملے ہوئے ہیں---- جسے ہم "انداز شعور" یا "انداز ادراک" کہہ سکتے ہیں۔

مضمون کا اختتام انقباض و توسیع کے بارے میں جنید کے مشہور الفاظ پر ہوتا ہے۔ قشیری کی نفاست اور شائستگی کے بعد جنید کا اقتباس بھونڈا اور بے جان لگتا ہے۔ آواز "میں موجود ہوں" کے حوالے سے آتی ہے۔ جنید امید اور خوف' ہستی اور عدم' وحدت اور دوئی کے درمیان ایک مسلسل جھولا جھولتے ہوئے خدا کے ساتھ "مدغم ہو جائے" کے مرکزی صوفیانہ تجربہ کی بات کرتا ہے۔ یہ حالتیں عارف پر خود بخود وارد ہوتی ہیں یا انہیں خدا عارف پر نافذ کرتا ہے:

"خوف مجھے جکڑ لیتا ہے۔ امید میری پرتیں کھولتی ہے۔ حقیقت مجھے یکجا کرتی ہے۔ حقیقی مجھے علیحدہ کرتا ہے۔ جب وہ مجھے خوف میں جکڑ لے تو خود سے بیگانہ کر دیتا

ہے۔ جب وہ مجھے امید سے کشادہ کر دے تو میرا اپنا آپ لوٹا دیتا ہے۔ جب وہ مجھے حقیقت میں یکجا کر دے تو حاضر کر دیتا ہے۔ جب وہ مجھے حقیقی میں سے الگ کر دے تو میری گواہی مجھ سے علاوہ بنا دیتا اور مجھے اس سے چھپا لیتا ہے۔"

تصورات کی نفیس ترتیب والے اختتام تک آتے ہوئے جنید کے خیالات صوفیانہ فکر اور تجربے میں صدیوں تک گونجتے رہے۔

مندرجہ بالا مثالیں تصوف کی الجھی ہوئی تخیلاتی دنیا کو دیکھنے کی ایک راہ دکھاتی ہیں' جو قشیری کی شخصیت میں اپنے ایک نکتہ عروج کو پہنچتا تھا۔ رسالہ کے حصہ سوم کے زیادہ طویل مضامین بنیادی موضوع اخلاقی نفسیات (انانیت کی مختلف صورتوں' مثلاً حسد' غرور' خود نمائشی اور غیبت پر گہرے غور و خوض کے ساتھ) اور تجرباتی نفسیات (کشف والہام' یاد آوری اور عشق اور جستجو کے ساتھ) کی صرف چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں۔ رسالہ کے زیادہ جامع مضامین والے حصہ دوم کی طرح اس حصہ میں بھی ہر تصور دیگر کے ساتھ باہم مربوط ہے۔

تصورات کا باہمی ربط "زریعوں" کو بھی باہم مربوط کرتا ہے۔ ہر تصور ایک نفسیاتی' ایک فلسفیانہ اور ایک شاعرانہ سیاق و سباق کا حامل ہے۔ ان تینوں میدانوں میں انصاف کرنے کے لئے قشیری کی اہلیت میں ہی اس کا جوہر قابل قیام پذیر ہے۔ قشیری کے "رسالہ" میں صوفیانہ تحریریں ایک نئی تاریخی سرفرازی تک پہنچیں۔ رابعہ بصری اور جنید جیسی عظیم ابتدائی شخصیات کے عارفانہ اقوال محبوب کی شاعرانہ یاد آوری' انانیت اور خود فریبی کی مختلف صورتوں کا قدیم اخلاقی جائزہ عارفانہ تجربے کی خود تنقیدی اور خود استدلالی علم اور وقت' شخصی عینیت' فریب نظر اور حقیقت کی فطرت پر پیچیدہ فلسفیانہ غور و فکر اس "رسالہ" میں یکجا ہوا۔ قشیری نے 1074ء میں وفات پائی۔

الغزالی

(1058ء ---- 1111ء)

فلسفی شاذو نادر ہی تاریخ پر اپنی زندگی کے ذریعہ اتنا اثر ڈالتے ہیں جتنا کہ اپنے خیالات سے۔ تاہم غزالی ایسی شخصیت ہے جس نے اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں پر تصوف کو مستحکم کر کے اسلامی فلسفہ کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے اور بالخصوص اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں استدلالی فلسفہ کا اثرور سوخ گھٹایا۔

ابو حمید محمد الغزالی 1058ء میں دانشوروں اور عارفوں کے خاندان میں پیدا ہوا۔ سب سے پہلے وہ اپنے باپ' جو ایک درویش تھا' سے اور بعد ازاں باپ کے صوفی دوست سے متاثر ہوا۔ الغزالی کا چچا بھی ایک مشہور عارف تھا۔ اپنے ارد گرد صوفیو کی موجودگی کے باوجود غزالی نے فقہ اور نظری علوم میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔

غزالی نے الطوسی' ابو نصر الاسا عیلی اور الجوائنی (المشہور امام الحرمین) جیسے استادوں کے ساتھ مطالعہ کیا۔ غزالی جب نظامیہ اکیڈمی میں پڑھ رہا تھا تو علی الفرمدھی الطوسی کا شاگرد ہو گیا' جس کے ذریعہ وہ تصوف کے نظری پہلو کے ساتھ ساتھ عملی پہلو سے بھی آشنا ہوا۔ پھر اس نے ریاضت اور نفس کشی کی مشقیں کیں' لیکن مطلوبہ روحانی حالتیں حاصل نہ ہونے پر مایوسی ہوئی۔ اس ناکامی اور تلاش حق کو بھولنے کا موقع نہ دینے والی رہنماء تشنگی نے اس کی بڑھتی ہوئی تشکیکیت میں اضافہ کیا۔

زندگی کے اس موڑ پر غزالی نظامیہ اکیڈمی میں صدر نشینی اور فقہ پر کئی شرحات لکھنے کی وجہ سے اعلیٰ ترین ججوں میں شمار ہوتا تھا۔ "حجتہ الاسلام" "مجدد الدین" اور "زین الدین" جیسے خطاب حاصل کرنے کے باوجود وہ ایک ذہنی و روحانی بحران سے گزر رہا تھا۔ قطعیت کی جستجو میں اس نے متکلم عالمان دین کی حیثیت پر سوال اٹھانا شروع کر دیئے تھے۔ ان عالموں نے اپنے خیالات

کا جواز عقیدے کے قواعد و ضوابط میں سے اخذ کیا تھا جسے وہ مسلمہ خیال کرتے تھے۔ اس کے شکوک و شبہات جلد ہی اپنے عقیدے کے دیگر پہلوؤں تک پہنچ گئے۔ ایک جانب کٹر مذہب کی تعلیمات دینے اور دوسری جانب ان پر سوال اٹھانے کے اندرونی اضطراب نے اس کے روحانی بحران میں شدت پیدا کر دی۔

منطق کو وسیلہ یقین اور عقیدے کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے مضبوط بنیاد فرض کرتے ہوئے غزالی نے خود کو فلسفہ کے مطالعہ میں غرق کر لیا۔ اسے یہ جان کر یہاں بھی مایوسی ہوئی کہ منطق بھی محدود تھی۔ یہ حتمی یقین پیدا کرنے میں ناکام تھی۔ غزالی نے فلسفیوں کے درمیان اختلافات پر غور کیا اور ایسے بیس نکات پر بحث کی جن پر (غزالی کے خیال میں) انہیں مغالطے کا شکار ثابت کیا جا سکتا تھا۔

حصول طمانیت کی امید پوری نہ ہو سکنے پر غزالی کا ذہن منتشر ہو گیا۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے اس پر مایوسی کی حالت غالب آگئی۔ اس کی بھوک اور بولنے کی سکت جاتی رہی۔ فقہ یا فلسفہ کی جستجو کے ذریعہ صداقت حاصل نہ ہو سکنے پر قائل ہو کر اس نے 1095 عیسوی میں صوفیانہ سفر پر دمشق جانے کے لیے بغداد چھوڑا' اور دمشق میں ریاضت کی مشقیں کیں۔ غزالی گیارہ برس تک اسلامی سرزمینوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس کے بعد غزالی نے صرف پڑھایا پھر عزلت میں وقت گزارا۔

غزالی کا فکری سفر ڈیکارٹ کے اصولیاتی سفر سے بہت ملتا جلتا ہے کیونکہ اس نے بھی ڈیکارٹ کی طرح ناقابل حصول صداقت کی تلاش میں ہر قابل سوال چیز پر سوال اٹھایا۔ تلاش حق میں غزالی نے نفس کو کسی مخصوص مذہب کے سیاق و سباق میں رکھنے سے پہلے نفس کی اصلی عینیت یا "میں" کا سوال اٹھایا۔ علم کی بنیاد کا کام دینے والے "میں" کو جان لینے کا یقین کر کے غزالی نے کئی ایک علمیاتی معاملات میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے حسیاتی ادراک اور خود حقیقت کی ناقابل وثوق فطرت کی نشاندہی کی۔

غزالی کے مطابق عالم دین صرف اپنے نظریہ اصولیات کے لیے موردِ الزام تھے' اپنی بحث کے مافیہ (Content) کے لیے نہیں۔ (کچھ کی رائے میں عالم دین پر تنقید کے باوجود غزالی تمام عمر خود بھی عالم دین ہی رہا تھا۔) منحصر بہ منطق دینیات کے قیام کی کوشش کو غزالی نے ایک سعی لاحاصل پایا۔ اس نے کہا کہ دینیات کا آغاز مسلمہ اصولوں کے ساتھ نہیں بلکہ اس قضیے سے ہوتا ہے جس کی مستند حیثیت صرف عقیدے کی بنیادوں پر ہی قطعاً قبول کر لینی چاہیے۔

یونانی فلسفہ (اور بالخصوص ارسطو) کے ساتھ ساتھ اپنے مسلمان مفکرین پر عبور حاصل کر کے غزالی نے "مقاصد الفلسفہ" اور ارسطوئیت کی آسان فہم شرح بعنوان "تہافتہ الفلسفہ" لکھی جس میں جدلیاتی طریقہ کار کے تحت اس نے فلسفیوں کے رتبے تباہ کرنے کی کوشش کی۔

غزالی نے فلسفیوں کو تین دھڑوں میں تقسیم کیا: (۱)۔ مادیت پسند (د۔ ریون)' جو خدا کے وجود سے انکار کرتے اور دنیا کی ابدیت کی دلیل دیتے تھے' (۲) توحید پرست (الٰہی)' جو خدا کا وجود تسلیم کرتے تھے: اور ۳۔ فطرت پرست (طبیعا) جو لازمی طور پر وجود خالق کے مخالف نہیں لیکن روح کی لافانیت کے خلاف ہیں۔

فلسفیوں کی گہری تفہیم نے غزالی کو اس اعتقاد تک پہنچایا کہ صرف اور صرف علت کی تلاش مذہب اور اخلاقیت کی تباہی پر منتج ہو گی۔ لہٰذا اس نے فلسفیوں کو تین حوالوں سے کافرانہ قرار دیا: دنیا کی ابدیت قبول کرنے پر' چیزوں کے بارے میں خدا کے علم سے انکار کرنے پر اور حشر اجساد کی تردید کرنے پر۔

غزالی نے کہا کہ دنیا کو ابدی قبول کرنے کا مطلب اسے خدا کے ساتھ ابدیت میں شریک بنانا ہے' جو اعتقاد کی رو سے ناقابل قبول ہے۔ فلسفی دلیل دیتے تھے کہ دنیا کی ابدیت تین بنیادی مسلمات سے لازمی قرار پاتی ہے: (۱)۔ عدم سے کچھ بھی وجود میں نہیں آتا' یا بہ الفاظ دیگر لا شئے میں سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہو سکتا' (۲)۔ علت کا معلول لازماً ہوتا ہے: اور (۳) علت معلول سے مختلف اور خارجی ہے۔

غزالی ان مسلمات کے خلاف دلائل کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہے جنہیں فلسفیوں نے عیاں بالذات قرار دیا۔ کئی دلائل میں اس نے ان مسلمات کے اندرونا موافقتوں کی جانب اشارہ کیا۔ چیزوں کے بارے میں خدا کے علم سے انکار لازمی طور پر خدا کو نسبتاً لاعلم بنا دیتا ہے' جو اسلامی عقیدہ کے لیے ناقابل قبول ہے۔ مزید برآں' حشر اجساد سے انکار اس بارے میں متعدد قرآنی آیات کے منافی ہے۔ غزالی کہتا ہے کہ حشر اجساد سے انکار کی بنیاد کے طور پر فلسفی مندرجہ ذیل تین دعوے کرتے ہیں: (۱) اجساد کی طبیعی صورتوں میں حشر کی کوئی منطقی ضرورت نہیں' (۲) اگر مرنے کے بعد جسد نہیں رہتے تو اگلی دنیا میں دکھ ہو سکتا ہے اور نہ ہی خوشی اور (۳) جنت و دوزخ اپنے طبیعی مفہوم میں موجود نہیں' ان کی فطرت خالصتاً روحانی ہے۔ اس کے بعد غزالی نے ارسطوئی طریقہ استدلال استعمال کرتے ہوئے مندرجہ بالا قضیوں کے خلاف دلائل دیئے۔ غزالی بالخصوص ہیں گمراہ کن آراء رکھنے کے لیے فلسفیوں کو نشانہ تنقید بناتا ہے۔ منطق کا استعمال ان

آراء کے قیام کی وجہ تھا۔ غزالی کی جانب سے ارسطوئیوں سے منسوب کردہ گمراہ کن نظریات میں سے کچھ یہ ہیں: دنیا بے ابتداء و بے انتہاء ہے' خدا نے کائنات کو Ex- nihilo("لا") سے نہیں بنایا تھا' خدا آسان فہم ہے اور کوئی قابل تمیز خاصیت نہیں رکھتا۔ خدا اپنے سوا کچھ بھی نہیں جان سکتا' اجرام فلکی حیوانی نفس رکھتے اور مرضی سے حرکت کرتے ہیں۔ معجزات ناممکن ہیں' انسانی ارواح لافانی نہیں' موت کے بعد طبیعی زندگی ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا گمراہ کن آراء پر اپنی تنقید میں غزالی کہتا ہے کہ صرف اور صرف اعتقاد کے ذریعہ ہی کوئی شخص سچائی تک پہنچ سکتا ہے' منطق پر انحصار محض پریشانی اور اختلافات رائے تک لیجاتا ہے۔

غزالی کو معلوم تھا کہ فلسفی اپنے متعدد دلائل کی بنیاد قانون علت و معلول کو بناتے ہیں' اس نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کی تنقید' جو ڈیوڈ ہیوم کی منطق سے بہت ملتی جلتی ہے' کے مطابق علت و معلول کے درمیان تعلق کوئی منطقی لزوم نہیں۔ آگ اور جلنے یا پانی اور نمی کے درمیان علتی تعلقات کا علم حسیاتی مشاہدے پر منحصر ہے نہ کہ لازمی تعلقات کے متعلق دلیل بازی پر۔

اخلاقی مسائل کی وضاحت غزالی نے کافی تفصیل سے کی' قرآنی تصورات کو بنیاد بناتے ہوئے وہ کچھ ایک پیچیدہ معاملات پر روشنی ڈالنے کے لیے ارسطوئی نظریات استعمال کرتا ہے۔ جن معاملات میں غزالی نے سب سے زیادہ دلچسپی لی ان میں ایک آزاد اختیار اور ارادے کا مسئلہ ہے' اور یہ کہ انسانی قوت انتخاب کس طرح ان کے ساتھ مربوط ہے۔

غزالی آزاد ارادہ کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر جنت اور دوزخ کا کوئی مطلب نہیں۔ انسانی ارادے کی اضافیاتی (Relative) فطرت بیان کرنے کے بعد غزالی اچھائیوں اور برائیوں اور اچھے کام کرنے کے لیے آزاد ارادے کے تحفے کو استعمال کرنے کے انسانی فرض پر بحث کرتا ہے۔ وہ برائیوں کو جسم اور ذات کی خواہشات (نفس) کے طور پر بیان کرتا ہے جو جسمانی بے اعتدالیوں' مثلاً جنسی بے راہروی' کھانے کی حرص' بدکلامی' زر' حیثیت' نام کی ہوس تک لے جاتی ہیں۔ نفس کی بیماریاں بھی موجود ہیں جنہیں دنیاوی خواہشات کے تیاگ' جسمانی لذت سے احتراز' توبہ' روحانی غربت یا خالی پن (جو الوہی سچائی سے بھرپور ہونے کی خواہش اور اہلیت کی علامت ہے)' تحمل و بردباری' خدا کو دنیا کا مرکز مان کر اس پر بھروسہ رکھنے' اور آخر میں تمام نیکیوں میں افضل ترین نیکی یعنی محبت کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔ غزالی کے خیال میں محبت انسان اور خدا (عارف) کے درمیان وجدان کا ایک براہ راست وسیلہ ہے۔

شہرستانی

(1076ء ---- 1153ء)

حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد ایک سو سال میں مسلمانوں نے خود کو اندلس سے لے کر افغانستان تک ایک وسیع ثقافتی دنیا کا وارث پایا۔ اگلی چار صدیاں دھماکہ خیز عقلی ترقی کا دور تھیں کیونکہ مسلمان مفکرین نے اپنی روایات اور اپنے ساتھ تعلق میں آنیوالے لوگوں کی رسوم کو دریافت کیا۔

شہرستانی محمد ابن عبدالکریم الشہرستانی' جسے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں درست طور پر "مشرقی عہد وسطیٰ میں مذہب کا اہم ترین تاریخ دان" کہا گیا' نے مدتیرانہ (Mediterranean) 'مشرق قریب اور جنوب ایشیائی دنیا میں عالمی مذاہب اور فلسفوں کے ثقافتی اختلاط اور نظریاتی ترقی کو دیکھنے کا ایک مختلف طریقہ کار پیش کیا۔ اس کی زندگی کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ اس نے فقہ اور دینیات کا مطالعہ کیا۔ اس کے ذاتی فلسفیانہ و مذہبی رجحانات اختلافات رائے والا معاملہ ہے۔ اپنی شاہکار "کتاب الملل والنحل" (مذہبی اور فلسفیانہ برادریوں کی کتاب) کے علاوہ اس نے فلسفیوں کا مناظرہ اور دینیات پر ایک محترم کتاب "نہایت الاقدام" بھی لکھی۔ تاہم یہ پہلی کتاب ہے جس پر اس کی موجودہ شہرت واثر ورسوخ کا انحصار ہے۔

متکلم عالمان دین پر شہرستانی کی مشہور بحث (متکلم) کی بنیاد مکاتب اور ذیلی مکاتب کی زمرہ بندیوں (Categories) پر ہے۔ یہ زمرہ بندیاں کئی ایک موضوعاتی معاملات پر ان کے نکتہ نظر کے مطابق کی گئی جن میں توحید اور قدر بھی شامل ہیں۔

روزانہ پانچ مرتبہ اذان اور نماز میں "لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) پڑھ کر توحید کی توثیق کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معبود

صرف ایک ہے' کسی اور کی عبادت کرنا شرک ہوگا۔ اگر خدا صرف ایک ہے تو قرآن میں دیکھنے' سننے' جاننے اور محبت رکھنے جیسی الوہی صفات کا تعلق خدا کے ساتھ کیسے بنتا ہے؟ کیا وہ صفات خدائی جوہر کا حصہ ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا ہم یہ تصور کر لیں کہ جاننے' سننے' دیکھنے جیسی قوتوں کی تکثیرت (Multiplicity) ازل سے موجود ہے اور کیا کثیر و ازلی قوتوں کی موجودگی پر یقین رکھنا بھی شرک کی ہی ایک صورت نہ ہوگی؟ تاہم' اگر صفات الوہی جوہر کا حصہ نہیں تو کیا خدا تغیر کا شکار ہے؟ کیا وہ حادثے اور ہنگامی صورتحال کے تحت کسی وقت سمیع ہوتا ہے اور کسی وقت نہیں؟

شہرستانی کوئی مخصوص عقائدانہ جواب نہیں دیتا بلکہ یہ واضح کرتا ہے کہ مختلف مکاتب میں یہ بحث کس طرح زیادہ گہرے سوالات پر منتج ہوئی۔ شہرستانی خدا کی جانب قرآن پاک کے ان اشاروں پر بھی غور کرتا ہے جو سمیع و بصیر ہے' دو ہاتھوں کے ساتھ تخلیق کرتا اور تخت نشین ہے۔ کچھ فرقے (مثلاً معتزلہ) نے انہیں تشبیہات خیال کیا' یعنی خدا کی انسانی صفات سے تشبیہ' جس طرح بت پرست لکڑی یا پتھر کے بت میں دیوتا کی صورت گری کرتے ہیں۔ وہ "تاویل" کے حق میں تھے جو وضاحت کرتی ہے کہ کلام کی ایسی خصوصیات کیسے واحد الوہی قوت کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

شہرستانی ہمیں دکھاتا ہے کہ دینیاتی بحث نے کس طرح نئے نکتہ نظر پیدا کیے۔ کچھ عالموں نے کہا کہ بصارت' سماعت وغیرہ جیسی صفات (جن میں انسان بھی شریک ہے) خلقی طور پر تشبیہی ہیں' لہٰذا خدائے واحد سے تعلق رکھنے والی صفات مثلاً قوت' علم اور عزم کی توثیق ہیں۔ دیگر نے کہا کہ تمثیلی تفسیر (تاویل) قرآن کی وضاحت کرنے کا طریقہ ہے۔

الوہی قدر یا اختیار کل (Predetemination) شہرستانی کی دوسری دینیاتی زمرہ بندی ہے۔ قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر خدا کے علی کل شئی قدیر ہونے پر اس انداز میں زور دیا گیا جو انسانی ارادے یا انتخاب سے خارج لگتا ہے: مثلاً خدا نے کہا کہ قرآن کا پیغام نہ ماننے والوں کے "کان بند کر دیئے گئے۔" دیگر آیات براہ راست پیغمبرانہ ہدایت ہیں کہ سامع پیغمبرانہ حکمت والی راہ کا انتخاب کرے۔ اگر سامع کا ردعمل پہلے سے قادر مطلق اور بصیر و علیم خدا نے متعین کر دیا ہے تو پھر ان ہدایات کی کیا حیثیت ہے؟ کیا انسانوں کو کسی ایسے فعل کا انعام یا سزا دینا منصفانہ ہوگا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہوا؟

آگے چل کر وہ یہ سوال پیش کرتا ہے "کیا وہ کوئی بات میرے مقدر میں لکھ دیتا اور پھر مجھے سزا دیتا ہے؟" معتزلیوں کے مطابق خدا حکیم و دانا ہے اس لیے اپنی مخلوقات کے مفاد میں اور

عدل کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ انسان درست اور غلط کو سمجھنے کی پیدائشی استعداد رکھتے ہیں، جس کے بغیر وہ پیغمبرانہ وحیوں کو قبول ہی نہیں کر سکتے۔ مخالفین کے خیال میں ایسی باتیں الوہی علم و اختیار سے انکار ہیں: خدا جو کچھ بھی کرتا ہے وہ فطرت کے مطابق منصفانہ ہے اور منصفانہ کے بارے ہم انسانی کم فہمی کو بنیاد بنا کر خدا پر تنقید نہیں کر سکتے۔ اور وحی کے ذریعہ خدا کی عطا ہی در حقیقت صحیح اور غلط کو جاننے اور نسل انسانی کو دستیاب عدل کی تفہیم ہے۔

جنہوں نے شدید طور پر خدا کے قادر ہونے کی تردید کی انہیں "قادریہ" کہا گیا' جب کہ جبریت کی توثیق کرنیوالوں کو "جبریہ" کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ جنہوں نے اصحاب رسول ﷺ کی تشریحات پر توجہ دی اور عام انسانی استدلال کو ان سوالوں کے جواب دینے کی دینیاتی کوششوں کو مسترد کر دیا انہیں "سلف" یعنی روایت پرست کہا گیا۔ لیکن اس گروپ نے بھی آخر کار اپنے اصلی مخالف نکتہ نظر کا دفاع کرنے کے لیے دینیاتی لبلاغ کی ایک صورت قبول کر لی۔

ایک اور اہم گروپ کو "صفاتیہ" کا نام دیا گیا جو بالاصل دینیاتی "الاشعری" سے نکلا۔ الاشعری صفات کے غیر تشبیہی ہونے اور خدائی قدرت دونوں پر زور دیتے تھے' تاہم اس کے مکتبہ نے بعد ازاں ان دونوں معاملات پر ایک درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کی اور اسلام میں سب سے زیادہ مقبول دینیاتی مکتبہ فکر بن گئے۔ کچھ نے خدائی "احوال" پر بات کی جو ازلی طور پر خدائی جوہر کے ساتھ منسلک خدائی صفات ہیں اور نہ ہی ایسے اتفاقات وحادثات جو خدا پر بسیط ہو گئے۔ خدائی قدرت کے بارے میں شہرستانی کہتا ہے کہ انہوں نے خدا کو تمام اعمال کا خالق بیان کر کے انسانوں کو اس عمل میں حصہ لیتے وقت قوت عمل حاصل کرنے کے طور پر پیش کر کے درمیانی راہ اختیار کی۔

کچھ مصنفین نے بعد ازاں اشعری مکتبہ فکر کو "راسخ العقیدہ" خیال کیا اور کچھ نے شہرستانی کو اس مکتبہ سے سمجھا۔ تاہم' اگرچہ وہ اپنی رائے دینے کا خواہشمند تھا' لیکن جوبات شہرستانی کے کام کو عظیم مفکروں کا رنگ دیتی ہے وہ کسی خاص نکتہ نظر کے لیے اس کے دلائل نہیں بلکہ مختلف نکتہ ہائے نظر کو اس انداز میں پیش اور واضح کرنیکی اہلیت تھی جس سے بنیادی دینیاتی مسائل ایک مرکز میں اکٹھے ہوئے اور یہ نظر آیا کہ اسلامی روایات نے خود کو کس طرح ان مسائل کو حل کرنیکی کوشش کے گرد تشکیل کر لیا۔

علم کائنات (یا تکوینیات) کے بارے میں شہرستانی کے خیالات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ قبل از سقراط فلسفیوں پر اپنی بحث میں وہ نئی قبل از سقراط اسلامی فکر کے خدوخال پیش

کرتا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر خیالات تھیلس' ایمی ڈوسلز اور دیگر قبل از سقراط فلسفیوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں' لیکن یہ "تمام صورتوں کا ماخذ" ابتدائی عنصر کے سوال کی جانب زیادہ مسلسل رجوع کی بنیاد پر زیادہ موضوعی وحدت کے ساتھ ایک نیا نکتہ نظر پیش کرتا ہے۔ کسی اور شہادت کی عدم موجودگی میں یہ جاننا مشکل ہے کہ کس قدر موضوعی وحدت اسلامی مکاتب کی اپنی ہے اور کس قدر شہرستانی کے کام کی۔

ہران کے علاقہ Sabaeans پر اس کا مضمون شاید سب سے زیادہ شاندار ہے۔ بالائی دجلہ کے نزدیک واقع قدیم شہر ہران ہر عیسائی کی بجائے رسوماتی تقویمات کی پیروی کرنیوالے فلسفوں کا قدیم اسلامی مرکز تھا۔ شہرستانی ہرانیوں کو "حنیفوں" کے ساتھ ایک بحث میں پیش کرتا ہے۔ "حنیف" لفظ کا استعمال ابتدائی اسلام میں توحید پرستوں (بالخصوص عرب کے اسلامی توحید پرستوں) کے حوالے سے کیا گیا تھا۔ ابراہیمؑ کو اولین حنیف سمجھا جاتا ہے۔

ہرانی کائنات کو عرشوں پر مشتمل سمجھتے تھے' جن پر روحیں آباد ہیں اور فلسفے کا مقصد ان روحوں سے مقابلہ کے لیے بالائی عرشوں کی طرف جانا یا روحوں کو نیچے زمین پر معبدوں میں کھینچ لانا تھا۔ روحوں سے حقیقی ترغیب ملتی ہے۔ حنفیوں کے مطابق سچائی کے حقیقی عامل پیغمبر یا نبی مختلف عرشوں کے محافظ ہیں' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے واقعہ معراج میں بتایا گیا۔

شہرستانی کے دلائل کلاسیکی اسلامی فکر میں روحانیت پرستوں اور انسانیت پسندوں کے درمیان بنیادی تناؤ کو عیاں کرتے ہیں۔ روحانیت پرست فلسفے کا مقصد زیادہ روحانی' یا جیسا کہ ابن سینا کے معاملے میں نظر آتا ہے زیادہ عقلی سمجھتے تھے۔ جب کہ انسانیت پسندوں کے خیال میں فلسفے کا مقصد زیادہ انسانی تھا' اور وہ انسانی پیغمبروں کو سچائی کے وسیلے سمجھتے تھے۔ اس طرح شہرستانی عرشوں پر مشتمل کائنات کی ہر تفصیل کی علامتی اہمیت' عرشوں کے محافظین کی شناخت کرنے' عرشوں میں سے ہو کر اوپر جانے کے طریقے' ہر عرش پر ہونے والی آزمائشوں اور انجام کار الوہی تخت تک رسائی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ مثال اسلام کے علاوہ عیسائیت اور یہودیت میں بھی موجود ہے اور ان تینوں کے درمیان بہت سے اختلافات کی بنیاد بھی۔ اس نمونے میں اقدار کا ایک مربوط نظام بھی ہے جس پر بحث کی ذریعہ شہرستانی نے اسے مزید واضح بنایا۔

وحدت الٰہی اور الوہی قدر' قبل از سقراط مفکرین کے فلسفیانہ علم کائنات' اسلامی افلاطونی فکر کی صوفیانہ جہت' تشبیہی عرشوں اور ان کے محافظوں کے بارے میں دینیاتی بحثوں کا تجزیہ شہرستانی کی فلسفیانہ تحقیق کی چند ایک مثالیں ہیں۔ ان معاملات اور اپنے اہم ترین کام میں وہ یہ

دکھانے کے لیے مختلف مکاتب کی زمرہ بندی استعمال کرتا ہے کہ بنیادی سوالات، مخمصے اور علامتیں کس طرح اسلامی فکر کی بہ لحظہ بڑھتی ہوئی پیچیدہ تر صورتوں کی ترقی کا سانچا بن گئیں۔ شہرستانی نے 1153ء میں وفات پائی۔

ابن باجہ

(گیارھویں صدی کا آخر---- 1138ء)

گیارھویں صدی کے آخر میں جب کہ ابو بکر محمد ابن یحییٰ ابن باجہ کی ولادت سرغوس
میں ہوئی تو اندلس کا شاندار ملک طوائف الملوکی کا شکار ہونے والا تھا۔ شمال کی جانب سے اہل
اندلس پر عیسائی بانکوں کی چڑھائی تھی جو ان سے کم تعلیم یافتہ لیکن قوی اور بہادر تھے۔ اس موقع پر
مرابطین کے بربری خاندان نے جو سپانیہ کے عیش پرست فرماں روا خاندان کے مقابلے میں زیادہ
راسخ العقیدہ ہی نہیں بلکہ زیادہ مدبر بھی تھا اس ملک پر قبضہ کر کے اسے ڈوبنے سے بچایا۔ اب معلوم
ہوتا ہے کہ آزاد علوم اور آزاد تحقیق کا زمانہ ہو چکا۔ صرف وہ محدث تصنیف و تالیف کے میدان
میں قدم رکھ سکتے تھے جو سختی سے شرع کے پابند تھے۔

لیکن کبھی نہ کبھی وحشی حکمرانوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ اپنے محکوموں کی تہذیب کو کم سے
کم ظاہری حیثیت سے اختیار کریں۔ چنانچہ ابو بکر ابن ابراہیم نے جو مرابطی بادشاہ علی کا ہم زلف تھا
اور کچھ دن سرغوسہ کا حاکم بھی رہا تھا' ابن باجہ کو اپنا معتمد اور وزیر بنایا جس کی وجہ سے اس کے فقیہہ اور
سپاہی اس سے شدت سے ناراض ہو گئے۔

ابن باجہ ریاضی بالخصوص ہیئت اور موسیقی اور طب میں کمال رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ
اسے منطق' فلسفہ طبیعی اور مابعد الطبیعیات میں بھی دخل تھا۔ وہ متعصب لوگوں کے نزدیک بالکل
مخبوط الحواس اور لامذہب آدمی تھا۔

ابن باجہ کی خارجی زندگی کی نسبت ہمیں اتنی معلومات اور ہیں کہ وہ 1118ء میں سرغوسہ
کی فتح کے بعد اشبیلیہ میں تھا اور یہاں اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے بعد وہ غرناطہ میں اور
فیض میں المرابط کے دربار میں نظر آتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ اسے ایک طبیب سے حسد کے سبب
سے زہر دلوا دیا گیا تھا۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس کی زندگی راحت کی زندگی نہ تھی۔ اسے مالی

شکلات نے لیکن اس سے زیادہ ذہنی تنہائی نے عاجز کر دیا تھا۔ اس کی چند تصانیف جو بچ رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہد اور اپنے ماحول سے مانوس نہ تھا۔

وہ بالکل مشرق کے خاموش اور عزلت گزیں فلسفی فارابی کا پیرو تھا۔ اس نے بھی اپنے فلسفے کو بانظام بنانے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ اس کی طبعزاد کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ زیادہ تر اس کی تصانیف میں ارسطو اور دوسرے فلسفیوں کی شرحیں ہیں۔ اس کے خیالات منتشر ہیں۔ پہلی نظر میں اس کے خیالات بالکل بے ربط معلوم ہوتے ہیں۔ اور بڑی الجھن ہوتی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس رو میں 'جو بظاہر ہمارے فلسفی کو تاریکی میں بہائے لیے جاتی ہے' وہ اپنی راہ اچھی طرح جانتا ہے۔ حق کی تلاش کرتے کرتے اسے ایک اور چیز ہاتھ آجاتی ہے یعنی وحدت حیات اور نشاط زندگی۔ اس کے نزدیک غزالی کا یہ خیال سہل انگاری پر مبنی ہے کہ انسان محض اس حقیقت کے علم سے جو ہدایت الٰہی کی روشنی میں نظر آتی ہے سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ فلسفی کو چاہیے کہ حق کی خاطر اس لطف کو ترک کر دے جو باطنی مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ معرفت الٰہی اصل میں سوائے خالص تفکر کے جو حسی لذات سے پاک ہو کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اپنی منطقی تصانیف میں ابن باجہ فارابی سے بہت قریب ہے۔ اس کے طبیعی اور مابعد الطبیعی نظریات بھی عموماً استاد کے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اس کے نزدیک وجود دو قسم کا ہوتا ہے 'متحرک اور غیر متحرک۔ متحرک وجود مجسم اور محدود ہوتا ہے۔ مگر اس کی دائمی حرکت کا سبب یہ محدود جسم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس نا محدود حرکت کی توجیہ کے لیے ضرورت ہے ایک نا محدود قوت یا جوہر ازلی یعنی عقل کی۔ مجسم یا طبیعی وجود خارج سے حرکت میں لایا جاتا ہے۔ عقل خود غیر متحرک ہے مگر مجسم اشیاء میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان نفس ہے جو اپنی ذات سے متحرک ہے۔

ابن باجہ اس مفروضے سے ابتداء کرتا ہے کہ ہیولے کا وجود بغیر صورت کے ممکن نہیں البتہ صورت کا وجود ہیولے سے الگ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تغیر کا امکان ہی نہ تھا کیوں کہ تغیر جوہری صورتوں کے آنے اور جانے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صورتیں محسوسات سے لے کر معقولات تک ایک سلسلہ بناتی ہیں۔ جو بعینہ عقل کے مدارج سے مطابق ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ تمام معقول صورتوں کا ادارک حاصل کرے سب سے پہلے تمام محسوس چیزوں کی صورتوں کا' پھر نفس کی محسوس معقول صورت کا' پھر عقل انسانی کا' پھر اس سے بالا عقل فعال کا' اور آخر کار خالص معقول فلکی کا۔ انسان درجہ بدرجہ منفرد اور محسوس اشیاء سے گذر کر جن کی صورت عقل کے لیے

بمنزلہ ہیولیٰ کے ہے' مافوق الانسان عقول اور ذات الٰہی تک پہنچتا ہے۔ اس میں اس کی مدد فلسفہ یعنی کلیات کا علم کرتا ہے جو جزئیات کے علم پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اسے بصیرت بخش عقل فعال کی توفیق حاصل ہو۔

ہر شخص مشاہدے کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اکثر لوگ اندھیرے میں ہر طرف بھٹکتے پھرتے ہیں۔ انھیں صرف رموز حقیقت کا سایہ نظر آتا ہے اور خود ان کی زندگی سائے کی طرح معدوم ہو جائے گی۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض کو کچھ روشنی نظر آتی ہے۔ یہ اور گوناگوں عالم موجودات بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایسے بہت ہی کم ہیں جو اپنی دیکھی ہوئی چیزوں کی حقیقت جان سکیں۔ انھیں معدودے چند مبارک لوگوں کو ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے جہاں وہ خود سراپا نور بن جاتے ہیں۔

مگر اب یہ سوال ہے کہ انسان اس معرفت اور سعادت کے درجے تک کیوں کر پہنچ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عقل کے مطابق کام کرنے سے اپنے قوائے ذہنی کی آزاد نشوونما سے۔ عقل کے مطابق کام کرنے کے معنی ہیں آزادی سے اور اپنے مقصد کو نظر میں رکھتے ہوئے کام کرنا۔

انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے اور معقول کام کرنے کے لیے بعض اوقات اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کی صحبت کو ترک کر دے۔ ابن باجہ کے نظام اخلاق کا نام ہی ایسا ہے جس کے معنی فرد واحد کی ہدایت کے ہیں۔ وہ اپنی تربیت آپ کرنے پر بہت زور دیتا ہے لیکن بالعموم انسان دوسروں کے ساتھ رہنے کے فوائد حاصل کر سکتا ہے اور نقصانات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ دانشمند لوگ چھوٹی یا بڑی جماعتیں بنا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ریاست کے اندر ایک دوسری ریاست بناتے ہیں۔ یہ لوگ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اس لیے ان کے یہاں نہ طبیب کی ضرورت ہے نہ قاضی۔ وہ عوام الناس کے ادنیٰ خیالات اور لذات سے دور رہتے ہیں۔ دنیا کے دھندوں میں وہ اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں اور انھیں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ ابن باجہ نے خود بھی ایسی ہی زندگی گزارنے کی کوشش کی اور 1138ء میں وفات پائی۔

ابن طفیل

(بارہویں صدی کی ابتداء----- 1185ء)

محمد ابن تومرت نے 1121ء میں مہدی بن کر خروج کیا تھا۔ اس کے جانشینوں ابو یعقوب یوسف (1163ء تا 1184ء) اور ابو یوسف یعقوب (1184ء تا 1198) کے زمانے میں ان کی سلطنت جس کا مرکز مراکش تھا۔ معراج ترقی کو پہنچی۔ مہدئین نے علم دین میں زبردست تجدید کی۔ اشعری اور غزالی کا نظام جو اب تک کفر سمجھا جاتا تھا اب مغرب میں اختیار کیا گیا۔ اب تک عقیدے کے معاملے میں استدلال کو دخل نہیں دیا جاتا تھا اور اس کے بعد بھی مدبروں اور فلسفیوں کا یہ خیال رہا کہ عوام الناس کے عقائد کو نہیں چھیڑنا چاہیے اور نہ ان عقائد کو علم کے درجے تک ترقی دینا چاہیے۔ تاہم ابو یعقوب اور اس کے جانشینوں نے' جہاں تک انہیں سیاسی مصالح نے موقع دیا' دنیاوی علم کی ایسی قدر دانی کی کہ ان کے دربار میں کچھ دن کے لیے فلسفے کو پھر ایک بار فروغ حاصل ہو گیا۔

لہذا ابو بکر محمد ابن عبدالملک ابن طفیل القیسی ابو یعقوب کے وزیر اور طبیب خاص کے رتبے پر فائز ہوا۔ اس کی پیدائش اندلس کے چھوٹے سے شہر قادز میں ہوئی تھی اور اس کی زندگی بظاہر تغیرات اور نشیب و فراز سے خالی تھی۔ اسے انسانوں کی بہ نسبت کتابوں سے زیادہ محبت تھی اور اپنے آقا کے عظیم الشان کتب خانے میں اس نے بہت سی کتابیں پڑھیں جن کی اسے اپنے فن کے لیے ضرورت تھی یا جن سے اس کی علم کی پیاس تسکین پاتی تھی۔ وہ مغرب کے فلسفیوں میں سے تھا جنہیں خود علمی کام کرنے کے بجائے مطالعے کا لطف اٹھانے سے زیادہ رغبت تھی۔ تصنیف و تالیف کی طرف اس نے بہت کم توجہ کی۔ اس کا دعوی تھا کہ میں نظام بطلیموسی کی اصولی اصلاح کر سکتا ہوں' جس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ بہت سے عربوں نے یہ دعویٰ کیا ہے لیکن ان میں سے کسی نے اسے پورا نہیں کیا۔

ابن طفیل کے شاعرانہ افکار میں سے چند نظمیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس کی اصلی کوشش ابن سینا کی طرح یہ تھی کہ یونانی علوم کو مشرقی حکمت کے ساتھ ملا کر ایک جدید تصور کائنات قائم کرے اور ابن باجہ کی طرح اس کا موضوع بحث فرد اور جماعت کا علاقہ تھا لیکن وہ اس بحث میں ابن باجہ سے بہت آگے بڑھ گیا۔

اپنی کتاب حی ابن یقظان میں وہ وضاحت کے ساتھ اپنا نصب العین پیش کرتا ہے۔ قصہ کا محل وقوع دو جزیرے ہیں۔ ایک جزیرے میں انسانی نظام معاشرت اپنے تمام تکلفات اور لوازمات کے ساتھ ہے۔ دوسرے میں ایک فرد رہتا ہے جو فطرتی اصول پر نشوونما پاتا ہے۔ پہلے جزیرے میں کل معاشرہ ادنی خواہشات کا غلام ہے جن کی ایک مخصوص مہذب کسی قدر روک تھام کرتا ہے لیکن اس جماعت کے دو آدمی جو سلمان اور اسال کہلاتے ہیں ترقی کر کے خواہشات نفس پر قابو پاتے ہیں اور عقل کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ پہلا جس کی افتاد مزاج معلٰی ہے بہ ظاہر عوام کا مذہب اختیار کرتا ہے اور ان پر حکومت کرتا ہے۔ لیکن دوسرا جو نظری رنگ اور صوفیانہ منش رکھتا ہے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے جزیرے میں، جسے وہ غیر آباد سمجھتا ہے، چلا جاتا ہے اور وہاں تحصیل علم اور ریاضت میں زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔

لیکن اس جزیرے میں ہمارا حی ابن یقظان رہتا ہے جو ترقی کر کے کامل فلسفی کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔ وہ بچپن میں اس جزیرے میں ڈال دیا گیا تھا یا فطری نمو کے ذریعے سے خود بخود پیدا ہو گیا تھا اور ایک ہرنی نے دودھ پلا کر اس کی پرورش کی تھی۔ اس کے بعد اس نے رابنسن کروسو کی طرح آہستہ آہستہ اسباب معیشت فراہم کئے مگر فرق اتنا ہے کہ اسے سب کچھ اپنی عقل سے کرنا پڑا۔ علاوہ اس کے مشاہدے اور غور فکر سے اس نے عالم طبیعی، افلاک، ذات الٰہی اور خود اپنے نفس کی معرفت حاصل کی، یہاں تک کہ سات سال بعد وہ اعلی مرتبے تک یعنی صوفیانہ مشاہدے یا وجدان کے عالم تک پہنچ گیا۔ اس حالت میں اسال اسے پاتا ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگتے ہیں (کیوں کہ ابتداء میں حی کوئی زبان نہیں جانتا تھا) تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ایک کا فلسفہ اور دوسرے کا مذہب ایک ہی حقیقت کی دو شکلیں ہیں۔ حی یہ سن کر کہ سامنے کے جزیرے میں ایک قوم کی قوم خطا کی تاریکی میں سرگرداں ہے قصد کر لیتا ہے کہ وہاں جائے اور لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کرے۔ لیکن وہاں اسے یہ تجربہ ہوتا ہے کہ عوام الناس حقیقت محض کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ حضرت محمد ﷺ کی دانشمندی تھی کہ انہوں نے عوام کو بجائے نور کامل کے محسوس نقوش دکھائے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ اپنے دوست اسال کے ساتھ غیر آباد جزیرے میں واپس جاتا ہے اور

اپنی عمر عقل محض یعنی ذات ایزدی کی عبادت اور حقیقت کے مشاہدے میں بسر کر دیتا ہے۔

ابن طفیل نے اپنے افسانے کا بہت بڑا حصہ حی کی نشوونما کے ذکر کے لیے وقف کر دیا ہے، لیکن غالباً اس کا منشا یہ نہ ہو گا کہ کوئی شخص تن تنہا محض فطرت کے زیر سایہ بغیر معاشرے کی مدد کے اتنی ترقی کر سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کے خیالات میں تاریخی رنگ اس سے زیادہ ہے جتنا گزشتہ صدی کے یورپی روشن خیالوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی تصانیف کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقامات پر نظر آئے گا۔ حی ان لوگوں کی مثال ہے جو وحی و تنزیل کے اثر سے باہر ہیں۔ جو ارتقاء اس کی ذات میں ہوتی ہے وہ اصل میں ہندی' ایرانی' یونانی حکمت کی نشوونما ہے۔ سب سے پہلے یہ بات معنی خیز ہے کہ حی کا مسکن ابن طفیل نے لنکا کا جزیرہ قرار دیا ہے جس کی آب و ہوا میں فطری نمو کی خاصیت بتاتا ہے' جہاں قدیم روایت کے مطابق آدم پیدا ہوئے تھے اور جہاں ہندوستان کے بادشاہ پر حکمت الٰہی کا نزول ہوا تھا۔ جب حی شرم اور تجسس کی بدولت ابتدائی حیوانی حالت سے نکل چکا تو سب سے پہلی چیز جسے اس نے مذہبی عقیدت کی نظر سے دیکھا آگ تھی جو خود اس نے دریافت کی تھی۔ ممکن ہے کہ یہاں ایرانی مذہب کی طرف اشارہ ہو اور اس کے مزید تخیلات یونانی عربی فلسفے سے اخذ کیے گئے ہوں۔

ابن طفیل کا رستم داستان نوع انسانی کی عقل کا نمائندہ ہے جسے عالم بالا سے بصیرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ اصل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک ہے۔ جو اقوال اس پیکر مثالی کی طرف منسوب ہیں ان کی تعبیر بھی تمثیلی رنگ میں کرنا چاہیے۔

غرض ابن طفیل بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے جس پر اس کا مشرقی پیشرو ابن سینا پہنچا تھا۔ عوام الناس کے لیے مذہب کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ ان کی حد پرواز اس سے آگے نہیں ہے۔ یہ شرف محض معدودے چند آدمیوں کو حاصل ہے کہ وہ مذہبی تمثیلات کو سمجھیں۔ انسان اعلیٰ حقیقت کا بے حجاب مشاہدہ صرف کامل تنہائی کے عالم میں کر سکتا ہے۔

بلاشبہ یہ بات بڑھاپے میں نصیب ہوتی ہے جب انسان کو کوئی ہمدرد دوست بھی مل چکا ہو اور وہ مادی اشیاء کے شوق اور علوم و فنون کی تحصیل کے مدارج سے گزر کر ذہنی تکمیل حاصل کر چکا ہو۔ چنانچہ ابن طفیل اپنی درباری زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو ندامت کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔

ان فلسفیانہ خیالات سے' جو حی نے اپنی زندگی کی سات منزلوں میں حاصل کیے تھے' ہمیں پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ اس عملی زندگی پر بھی ابن طفیل خاص طور سے توجہ کرتا ہے۔ اس کے یہاں صوفیانہ ریاضتیں' جو مشرق میں صوفیوں کے حلقوں میں اب تک رائج ہیں اور جن کی

تلقین اس سے پہلے افلاطون اور نوفلاطونیوں کے یہاں کی جاتی تھی' اسلامی فرائض عبادت کی قائم مقام ہو گئی ہیں اور اپنی زندگی کے ساتویں دور میں حی اپنا علم اخلاق مدون کرتا ہے جو فیثاغورثی نظام سے مشابہت رکھتا ہے۔

اپنے عمل کا انتہائی مقصد حی نے یہ قرار دیا ہے کہ ہر چیز میں ذات واحد کو تلاش کرے اور وجود مطلق و واجب سے واصل ہو جائے۔ اس کی نظر میں تمام فطرت اسی اعلیٰ ذات تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس عقیدے سے کہ زمین پر جو کچھ ہے انسان کے لیے ہے' وہ گذر چکا ہے۔ اس کے نزدیک حیوانات اور نباتات بھی انسان کی طرح اپنے لیے اور خدا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ انسان کو یہ حق نہیں کہ انہیں جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ اب وہ اپنی جسمانی حاجتوں کو صرف اشد ضروری چیزوں تک محدود کر دیتا ہے۔ وہ پختہ پھلوں کو ترجیح دیتا ہے جن کے بیجوں کو وہ زمین کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بے حد احتیاط کرتا ہے کہ اس کی ہوس کے سبب سے کوئی نوع بالکل فنا نہ ہو جائے۔ انتہائی ضرورت کے وقت وہ حیوانی غذا استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ آدمی کو اتنا کھانا چاہیے جتنا جینے کے لیے کافی ہو لیکن سونے کے لیے ناکافی۔

جہاں تک اس کے جسم کے اور زمین کے تعلق کا ذکر تھا' تو افلاک سے اس کا رابطہ عقل حیوانی کے توسط سے ہے۔ افلاک کی تقلید میں وہ اپنے ماحول کو فائدہ پہنچانے اور عفت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ درختوں کی پرداخت اور حیوانوں کی حفاظت کرتا ہے تاکہ اس کا جزیرہ رشک جنت ہو جائے۔ وہ اپنے جسم اور اپنے لباس کو نہایت پاک صاف رکھتا اور اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اپنی تمام حرکات میں ویسی ہی موزونیت پیدا کرے جیسی اجرام فلکی کی حرکات میں ہے۔

اس طرح وہ بتدریج یہ قابلیت حاصل کرتا ہے کہ اپنے نفس کو آسمان اور زمین سے بالا عقل محض تک بلند کرے۔ یہ وجدان کی حالت ہے جو نہ کبھی خیالات الفاظ اور تصور میں سما سکی ہے اور نہ ان کے ذریعہ سے ظاہر ہو سکی ہے۔ ابن طفیل نے 1185ء میں مراکش کے شاہی محل میں وفات پائی۔

ابن رشد

(1126ء ---- 1198ء)

ابن رشد کی پیدائش 1126 عیسوی میں بمقام کارڈوبا ہوئی۔ اس کا باپ اور دادا مشہور قاضی تھے۔ دادا کارڈوبا اور اندلس میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا۔ ابن رشد کی زندگی کے ابتدائی بیس سالوں کے دوران اندلس میں بہت زیادہ سیاسی ابتری رہی۔ برسر اقتدار سلطنت مورابیہ اندرونی پھوٹ کا شکار ہو کر ابھرتی ہوئی الموہاد فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکی جن کی رہنمائی مشہور جنگجو عبدالمومین کر رہا تھا۔ ابن رشد سے متعلق معلومات کے مختلف ذرائع یہ اس کی تعلیم کا دور بتاتے ہیں ---- یعنی اس دوران اس نے خود کو فقہ، طب، دینیات اور قدرتی علم سیکھنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مطالعہ کے حوالے سے ابن رشد کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے صرف دو راتوں کے سوا اپنی زندگی کی تمام راتوں میں مطالعہ کیا۔ ان دو راتوں میں ایک رات شادی کی اور دوسری باپ کے مرنے کی تھی۔

اگرچہ وہ اپنی نظری کامیابیوں کے سبب حکمرانوں کے مشیر اور قاضی کے طور پر عملی کارکردگی کے لیے مشہور ہے، لیکن تیس سال کی عمر تک ابن رشد کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق کچھ بھی سننے میں نہیں آتا۔ 1153 عیسوی میں اس وقت کی الموہاد سلطنت کے حکمران عبدالمومین نے ابن رشد کو مراکیچ بلوایا اور پوری سلطنت میں سکول و علمی مراکز تعمیر کرنے کے پُر شکوہ منصوبے کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت تک وہ منطق پر رسالہ ترتیب دے چکا تھا۔ ابن رشد کی زندگی کا اہم ترین واقعہ، یعنی عبدالمومین کے بعد تخت پر بیٹھنے والے ابو یعقوب کے سامنے ابن طفیل کا اسے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پیش کرنا جو ارسطو کی کتابوں پر شرحات لکھنے کے لیے موزوں ترین تھا، پندرہ برس بعد رونما ہوا۔

مؤرخین نے ابو یعقوب کو انتہائی وجیہہ، خوبصورت، فیاض، ذہین اور تعلیم یافتہ شخص بتاتے ہوئے بہت سراہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے سائنس سے محبت تھی اور اس نے طب کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ در حقیقت ابو یعقوب کے ساتھ ابن رشد کی پہلی ملاقات کا ایک

بیان حکمران کی فلسفیانہ تعلیم وتربیت پر زور دیتا ہے: اس نے ابن رشد سے اس متعلق رائے مانگی کہ اس کے خیال میں دنیا کی نسبت کیا ہے' یہ قدیم ہے یا حادث؟ یہ سوال وسیع دینیاتی اطلاقیت رکھتا ہے۔ ابو یعقوب نے جواب دینے میں ابن رشد کی پریشانی دیکھ کر سوال کی تحقیق کے لیے ابن طفیل سے رجوع کیا اور اس مسئلہ کے بارے میں فلسفیوں کی تعلیمات پر ایسا عبور دکھایا کہ ابن رشد کو اس سلسلہ میں ابو یعقوب کی خلوص دلی کا یقین ہو گیا۔

اس تعارف کے بعد ابن رشد کو اشبیلیہ کا قاضی مقرر کیا گیا اور یہ عہدہ تیرہ برس تک اس کے پاس رہا۔ انجام کار 1182 عیسوی میں اسے ابو یعقوب کے ذاتی طبیب کی حیثیت میں مراکیچ بلایا گیا۔ ان تیرہ سال میں اس نے ارسطو کی منطقی کتابوں' طبیعی سائنس سے متعلق بیشتر اہم تحریروں' مابعد الطبیعیات اور Nichomachean اخلاقیات پر درمیانی تفاسیر تحریر کیں۔ علاوہ ازیں' ارسطو کی دیگر کتب ---- جانوروں کے اعضاء' جانوروں کی نسل اور Parva Naturalia کے موضوع پر کتب کی مختصر تشریحات کے ساتھ ساتھ دو رسائل بھی لکھے: ایک عقل اور معقولات کی اطلاقیت اور دوسرا افلاکی گروہ کے جوہر پر۔ ابن رشد نے ارسطو کی Posterior Analytics پر بھی ایک بہت بڑی شرح لکھی۔ ارسطو اور ارسطوئی تحقیقات سے متعلق تحریروں کے علاوہ ابن رشد نے ایسے موضوعات پر بھی رسائل مرتب کئے جو ساتھی مسلمانوں کے لیے فوری اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں "فیصلہ کن رسالہ" "بمعہ تعارف (الضمیمہ)" "کشف مناہج العدیلہ" اور الغزالی کی مشہور "تردید تہافتہ التہافتہ" (بے ربطی کی بے ربطی) شامل ہیں۔

افلاکی کروں سے متعلق رسالہ (1178 عیسوی) اور زلزلوں کی Meteorologica میں حوالے یہ عیاں کرتے ہیں کہ ابن رشد نے ان سالوں کے دوران بہت زیادہ سفر کیا۔ اول الذکر مراکیچ اور موخر الذکر کارڈوبا میں لکھا۔ ابو یعقوب کے ذاتی طبیب کی حیثیت میں کام کرنا صرف چند ماہ کا معاملہ تھا۔ بعد ازاں 1182 عیسوی میں اسے کارڈوبا کا قاضی تعینات کر دیا گیا۔ دو سال بعد Santarem کے محاصرہ میں ابو یعقوب اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اس کے بیٹے یعقوب ابن یوسف نے اس کی جگہ سنبھالی (جو بطور ابو یوسف اور بطور المنصور بھی جانا جاتا ہے۔) ایک عظیم سپہ سالار اور عظیم معمار حکمران کے طور پر اسے بہت سراہا جاتا ہے۔ اس حکمران کے ساتھ ابن رشد کا تعلق بہت قریبی تھا' لیکن فلسفہ اور "قدیموں کے علوم" میں بہت زیادہ مشغول ہو جانے پر دیگر قابل ذکر محققین کے ساتھ ساتھ اسے بھی سزا دی گئی۔

سزا 1195 عیسوی میں 'ابو یوسف کی حکومت کے ایک درجن برس بعد دی گئی اور اس

میں Lucena میں ابن رشد کی جلاوطنی شامل تھی' جو کارڈوبا کے نزدیک ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ان نسبتاً پر سکون بارہ برس کے دوران ابن رشد نے ارسطو کی "طبیعیات" "افلاک پر" "روح پر" اور "مابعد الطبیعیات" کی تفاسیر لکھیں۔ علاوہ ازیں گیلن کی "بخاروں پر" کی درمیانی تفسیر اور "روحانی مسرت" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی کتاب بھی تحریر کی۔ ابن رشد کی جلاوطنی صرف دو سال تک رہی : مراکیچ میں واپس دربار میں آنے پر کچھ ہی عرصہ بعد 198 عیسوی میں اس کی وفات ہو گئی۔

عمومی طور پر ابن رشد کی تصانیف کو اس طرح درجہ بند کیا جا سکتا ہے: (1) ارسطو اور دیگر اہم مفکرین کی تفسیریں' اور (2) مخصوص سوالات حل کرنے کے لیے گاہے بگاہے لکھے ہوئے رسائل۔ اس کی تعلیمات کو پہلی قسم کی تصانیف' بالخصوص ارسطو کی "علم بیان" اور افلاطون کی "جمہوریہ" پر تفسیروں میں موجود بتایا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی تصانیف اس کے کچھ زیادہ وسیع موضوعات پیش کرتی ہیں۔ بالخصوص دو رسائل "فیصلہ کن رسالہ" اور "کشف مناہج العدیلہ" فلسفہ اور خدائی قانون کے درمیان تعلق کے بارے میں ہیں۔ یہاں ہم اس پر توجہ دیں گے کہ ابن رشد نے مختلف اقسام کے حکومتی نظاموں' اور سب سے بڑھ کر بہترین نظام حکومت کے بارے میں کیا کہا تھا' کیونکہ اس سے متعلق اس کی بحث نے ہی زیادہ عمومی طور پر اسے دیگر اہم سیاسی سوالات پر غور وخوض تک پہنچایا۔

افلاطون کی "جمہوریہ" پر ابن رشد کی تفسیر کے مطابق بہترین نظام حکومت وہ ہے جس میں نیکیوں یا اچھائیوں اور عملی فنون کے مابین فطری ترتیب کو عزت دی جائے۔ عملی فنون اور اخلاقی راستبازیوں کے درمیان سلسلہ مراتب کا تعلق چاہے کوئی بھی ہو----- یہ سب نظری راستبازیوں کی خاطر وجود رکھتے ہیں۔ جب یہ فطری نظام' نظام حکومت کی تنظیم اور انتظامیہ میں منعکس ہو' صرف تبھی اس بات کی کوئی یقین دہانی ہو سکتی ہے کہ تمام راستبازیاں اور عملی فنون ویسے ہی وظائف سر انجام دیں گے جیسے کہ انھیں دینے چاہئیں۔ پھر درست عملدر آمد کے لیے ان قوانین و قواعد کو سمجھنا واجب ہے جن پر ان کا انحصار ہے۔ یعنی نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان نظم اور باہمی ربط۔ ہر چند وہ بھی ارسطو کی "علم بیان" پر اپنی درمیانی تفسیر میں بہترین نظام حکومت کی شناخت ایک ایسے شہر کے طور پر کرتے ہوئے عین اسی نتیجے پر کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ پہنچا کہ جس کے افعال و اقوال نظری علم کے تجویز کردہ افعال و اقوال کے ساتھ مطابقت میں ہوں۔

ان قواعد نے ابن رشد کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے اردگرد نظر آنیوالے حکومتی نظاموں

میں نقائص کا تعین زیادہ واضح طور پر کر سکے۔ وہ یا تو غلط قسم کے مقصد کو ہدف بنانے کی وجہ سے ناقص ہیں، یا پھر اس لئے کہ وہ انسانی نیکیوں کے درمیان کسی نظام کو تنظیم دینے میں ناکام رہے۔ چنانچہ وہ جمہوریت کو الزام دیتا ہے کہ یہ انفرادیت پر زیادہ اصرار کرتی ہے اور شہریوں کی خواہشات کو با نظم کرنے کی اہل نہیں۔ افلاطون کی "جمہوریہ" پر اپنی تفسیر میں اس نے پہلے عوام کے لیے زیادہ توجہ کو فروغ دینے اور انفرادی خواہش کی پکار کو کم کرنے پر زور دیا اور اس کے بعد یہ نشاندہی کرنے کی خاطر قطعی انسانی مسرت پر بحث کی کہ خواہشات کو مناسب انداز میں کس طرح منظم کرنا چاہیے۔

ابن رشد جھوٹ، دغابازیوں اور ناانصافیوں کو منظور کرتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں خالص سچ ہمیشہ دلنشین نہیں ہوتا، کہ منطق عموماً غلبہ حاصل نہیں کر پاتی۔ زیادہ تر نوجوان اس لحاظ سے بچے ہیں کہ انہیں درست چیز کے بارے میں تربیت دینا پڑتی ہے اور اس قسم کی تربیت کے لیے زبردستی کے ساتھ ساتھ فریب کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جب تک شہریوں کو اس اچھائی پر یقین کرنے میں راغب نہ کیا جا سکے جو ان کے اپنے براہ راست مفاد سے بالاتر ہو، اتنی دیر تک وہ راستباز نظام حکومت کے قیام اور کارکردگی کے لیے لازمی قربانیاں نہیں دیں گے۔ آخر کار چند ایک یہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں ذاتی مفاد کو عوامی بھلائی سے پیچھے کیوں رکھنا چاہیے اور ایک زیادہ دور افتادہ نیکی کی خاطر اپنی فوری خواہشات کو کیوں دبانا چاہیے، لیکن زیادہ تر لوگ یہ نہیں سمجھ پائیں گے۔ "فیصلہ کن رسالہ" میں ابن رشد قرآن پاک کے ایک مشہور اقتباس کا حوالہ دیتے ہوئے اس مسئلہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ لوگوں کو ان کے لیے موزوں طریقوں کے مطابق تربیت کی مختلف سطوحات پر مخاطب کرنے کی ضرورت سے متعلق بیشتر اہل فکر میں اتفاق رائے کو دیکھتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ قرآن نے بھی بالکل اسی چیز کی منظوری دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کی طرح مذہب بھی یہ کہتا ہے کہ کہنے کے مختلف انداز اور حتیٰ کہ مختلف قسم کے افعال قابل توجیہہ ہیں۔ اس کے علاوہ الہامی قانون کے اس انداز کارکردگی سے انکار کرنیوالے لوگ شہریوں کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ منطق پر چلنے کی قابلیت نہ رکھنے والوں کے سامنے ایمان کے پیچیدہ معاملات کی وضاحت کرنے سے یہ متوقع اساتذہ کم خداداد صلاحیت رکھنے والوں کو ذہنی ابتری اور عموماً بے اعتقادی تک لے جاتے ہیں۔

شہاب الدین سہروردیؒ

(1153ء ----- 1191ء)

شہاب الدین سہروردی المشہور "شیخ الاشراق" اور "مقتول" ایک فارسی مسلمان فلسفی تھے جنہوں جس نے مکتبہ اشراق کی طرح ڈالی۔ متنازعہ خیالات رکھنے کی وجہ سے انہیں شام کے سپہ سالار اور سلطان مصر صلاح الدین ایوبی کے حکم پر 38 سال کی عمر میں قتل کر دیا گیا تھا۔

سہروردی شمالی ایران کے شہر زنجان سے قریب ایک گاؤں میں 1153ء میں پیدا ہوئے ان کا پورا نام شہاب الدین یحیٰی ابن حبش ابن امیرک ابو الفتوح سہروردی تھا۔

وہ چھوٹی عمر میں Maragheh شہر گئے اور وہاں پر مجد الدین جیلی کے ساتھ حکمت کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اصفہان کی جانب سفر کر کے ظاہر الدین الفارسی کے ساتھ فلسفہ اور عمر ابن صالح کی "البصائر" کا مطالعہ کیا۔ تب وہ صوفی اساتذہ سے ملنے کے لیے اسلامی ممالک میں طویل سفر پر روانہ ہو گیا اور راستے میں ریاضت کی مشقیں کرتے رہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے برابر کی روحانی بصیرت رکھنے والے آدمی کو تلاش کیا' لیکن ناکامی ہوئی۔

چونکہ سہروردی اس قسم کی عقل کے حامی تھے جو راسخ العقیدہ فقہاء کے نظریات سے غیر مطابق تھی' اس لئے فقہاء نے انجام کار صلاح الدین کے بیٹے مالک ظاہر سے کہا کہ کافرانہ خیالات پھیلانے پر سہروردی کو مار دیا جائے۔ مالک ظاہر کے انکار پر انہوں نے ایک درخواست پر دستخط کر کے صلاح الدین ایوبی کو روانہ کر دی جس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ سہروردی کو مار دیا جائے۔ مالک ظاہر نے تذبذب کے ساتھ اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی اور سہروردی کو سن 1191 عیسوی میں مار ڈالا گیا۔

اوپر بتائے گئے عوامل کی روشنی میں ہم سہروردی کو ایک ایسے فارسی شخص کے طور پر دیکھ سکتے ہیں جسے زرتشتی عناصر سے بھرپور ثقافت وراثت میں ملی' جو ماہر فلسفی' اور ایک ایسا صوفی تھا جس نے یہ عیاں کرنے کی کوشش کی کہ تمام الوہی طور پر الہامی عقلی روایتوں کے دل میں ایک ہی

ہمہ گیر سچائی موجود ہے۔

سہروردی کے دور میں فلسفہ کے دو مکاتب تھے اور تصوف کو نا قابل مواقفت خیال کیا جاتا تھا' در حقیقت الغزالی کے فلسفی سے تبدیل ہو کر صوفی بن جانے کے بعد استدلالی فلسفے کا اثرو رسوخ کچھ گھٹ گیا تھا۔ سہروردی نے کہا کہ تصوف اور فلسفہ نا قابل مصالحت نہیں اور فلسفہ کے غیر متغیر اصولوں کے کار آمد ہونے کی تصدیق عقل کی بصیرت افروزی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

سہروردی نے کہا کہ استدلالی منطق حصول بصیرت کے لیے بنیادی شرط ہے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے متعدد رسالے مرتب کیے جن میں ارسطوئی فلسفہ سے متعلق روایتی موضوعات کی کافی تعداد کی تفسیر کی گئی۔ بحیثیت مجموعی جہاں وہ بطور فلسفی بات کرتا ہے وہاں پر ارسطوئی ہے' جس کی آراء ابن سینا سے ملتی جلتی ہیں۔ اسلامی فلسفہ میں اہم ترین بحث' یعنی وجود اور ماہیہ (جوہر) کے درمیان امتیاز' کے بارے میں سہروردی ان کی روایتی ارسطوئی تفہیم سے کنارہ کر جاتا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ماہیہ پر وجود کی تقدیم پر بحث اس امر کو نظر انداز کر گئی کہ ماہیہ وجود کا ہی ایک حصہ ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ طبیعی اشیاء صورت اور مادے کا امتزاج ہیں۔ وہ مادے کو ایسے سادہ مرکب کے طور پر بیان کرتے ہیں جو انواع کی صورتیں قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ طبیعی خدوخال کی خاصیات میں تخفیف کرتا ہے جنہیں ان کے مابعد الطبیعیاتی رتبے کے حوالوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

سہروردی یہ کہہ کر روایتی اسلامی مابعد الطبیعیات سے جدا ہوتے ہیں کہ معروض کا ماخذ محض نور ہے۔ ہر چیز کی بصیرت کے لیے نور کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اسے لازمی فرض کرتے ہوئے دنیا میں تمام معروضات کو ان کے مابعد الطبیعیاتی رتبے اور ان کی تنویر کے درجے کی بنیاد پر بیان کیا گیا۔ نور الانوار سے زیادہ نزدیک معروضات زیادہ شفاف اور مابعد الطبیعیاتی لحاظ سے اعلیٰ ترین ہیں۔ نور ایک خود عیاں سچائی کے طور پر عارضی انوار کے لامحدود تسلسل سے مل کر بنتا ہے' اور نور اپنے سے نچلے نور کی وجودی علامت ہے۔ مطلق نور' جو بعینہٖ واجب الوجود ہے' جیسے جیسے معروض اور نور الانوار کے درمیان مابعد الطبیعیاتی فاصلہ بڑھتا ہے' ویسے ویسے تاریکی چھانے لگتی ہے اور حتیٰ کہ معروض نور کے لیے قابل سرایت بن جاتا ہے۔ سہروردی نے ایسے معروضات کی دنیا کو اس طبیعی دنیا کی مطابقت میں قرار دیا ہے جس میں ہم زندہ ہیں۔

سہروردی کے مطابق تاریکی بھی بالکل روشنی کی طرح شدت کے درجے رکھتی ہے۔ اگرچہ اس نے روشنی کی درجہ بندی اس وسعت کی مطابقت میں کی جس تک روشنی ضرورت کے

تحت موجود ہوتی ہے۔ لیکن معروضات کے وجودیاتی رتبے کا تعین کرنے کے لیے اس کا معیار یہ ہے کہ وہ خود آگاہ ہیں یا نہیں۔ روشنی سے عاری چیز خود آگاہ نہیں ہوتی۔

سہروردی نے اپنے وجودیاتی نظام کو بنیاد بناتے ہوئے کمیت کو کیفیت میں بدلا۔ اس کے خیال میں دو گز لمبی چھڑی کا ایک فٹ لمبی چھڑی سے لمبا ہونا اصل معاملہ نہیں، بلکہ یہ تعلق "زیادہ" یا "کم" کے حوالوں میں بیان ہونا چاہیے۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ دو گز لمبی چھڑی ایک گز لمبی چھڑی سے "زیادہ" لمبی ہے۔ سلسلہ، مراتب کی وجودیات کے سیاق و سباق کے اندر یہ "زیادہ" اور "کم" بامعنی ہو جاتا ہے۔ کوئی معروض نورالانوار سے جس قدر نزدیک ہو وہ اتنا ہی زیادہ "ہست" ہے اسی لیے کچھ معروضات دوسروں سے زیادہ "ہست ہیں"، یعنی نورالانوار سے قربت کے درجہ کی بنیاد پر۔ انسانوں پر اس نظریئے کو لاگو کرتے ہوئے سہروردی کہتا ہے کہ استدلالی اور فکری بصیرت میں زیادہ مہارت اور ریاضت کشی کی مشقیں کرنیوالے نور کے مابعد الطبیعیاتی مفہوم میں زیادہ "منور" ہیں، لہٰذا نورالانوار سے نور اور تاریکی کی غیت استعمال کر چکنے کے بعد آگے چل کر سہروردی نے ملائکہ کے زرتشتی نظریہ کی بنیاد پر مفصل ملکوتیات (Angelology) بنائی۔ اس طرح انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسلام اور زرتشت کی دو مذہبی کائناتوں کو یکجا کر دیا۔

سہروردی کے مطابق تمام موجودات نورالانوار کی تنویر ہیں، جس نے ہر حلقہ میں اپنے نائب بھیج رکھے ہیں۔ روح انسانی میں نورالانوار کا نائب مختار "حاکم نور" ہی اس وقت انسانوں کی مسرت کا باعث ہوتا ہے جب وہ آگ یا سورج کو دیکھتے ہیں۔

نورالانوار اور اس کے عین مخالف قطب، یعنی طبیعی دنیا کے درمیان نور کے مدارج اور مراحل موجود ہیں، جنہیں سہروردی نے ملکوتی سلسلے کی مختلف سطوحات کے بالعین بتایا۔ سہروردی کے ہاں زرتشتی تشبیہت کا استعمال ایک حد تک یہ دکھانے کے لیے اس کے عالمگیر فلسفہ کے جذبہ میں ہے کہ تمام مذاہب کی داخلی صداقت بالکل ایک ہی ہے، اس لیے ایک مذہبی روایت کے کچھ تصورات کو کسی اور روایت کے تصورات کی تعبیر اور توضیح میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

نورالانوار سے "طولی" ملکوتی سلسلہ نکلتا ہے، جسے سہروردی نے مردانہ پہلو (مثلاً اقتدار) کے ساتھ شناخت کیا۔ جبکہ غور و فکر اور آزادی "عرض بلدی" سلسلہ پیدا کرتے ہیں۔ سہروردی عرض بلدی ملکوتی سلسلہ کو افلاطونی خیالات کے ساتھ بالعین قرار دیتے ہیں۔ طولی سلسلہ کے نسوانی پہلو سے افلاک اور متعین ستارے وجود میں آئے۔

سہروردی کے مطابق روشنی کی ہر سطح کے درمیان پردہ موجود ہے، جو بطور "برزخ" کام

کرتا اور روشنی کی ایک مخصوص مقدار کو ہی گزرنے دیتا ہے۔اس نظام کی قدیم 'اصلی اور وسیع وبسیط قدرت (جس کے ذریعہ سہروردی نے کئی ایک باطنی عقائد بیان کئے) اس قسم کی ہے کہ وہ اسے "الامہات" (ماں) قرار دیتا ہے' کیونکہ تمام موجودات کا ماخذ یہی سلسلہ مراتب ہے۔لہذا' یہ اپنے اندر وہ تصورات ("اعیان") لئے ہوئے ہے جن کا مظہر یہ دنیا ہے۔

سہروردی کے فلسفہ میں ملکوتیات دہرا نظریہ ہے: اول' یہ دنیا کا نقشہ کھینچنے کی ایک کوشش ہیں۔دوم' ملکوتی تشبیہیت کے ذریعہ سے انسان بطور عالم اصغر (micro) اور کائنات بطور عالم اکبر (macro) کے درمیان ربط مزید عیاں ہوتا ہے۔

سہروردی کا کہنا ہے کہ انسان پانچ بیرونی حواس کے علاوہ پانچ اندرونی حواس بھی رکھتا ہے' جو طبیعی اور روحانی دنیا کے درمیان پل کا کام دیتے ہیں۔وہ پانچ اندرونی حواس یہ ہیں: تخیل' ادراک' تصور' حافظہ اور حس اصیعہ (Sensus Communis) چیزوں کی فطرت کو نور قرار دینے کے بعد سہروردی چیزوں کی عینیت کے مطابق ان کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ مثلاً جن چیزوں میں سے روشنی گزر جاتی ہے (جیسے ہوا) وہ ان چیزوں سے مختلف وجودیاتی زمرے میں آتی ہیں جو روشنی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ (جیسے مٹی)۔

موسمیاتی مظہر کی وضاحت میں سہروردی نے ابن سینا اور ارسطو کی پیروی کی 'لیکن وہ چیزوں کے اندر ہی تبدیلی سے متعلق ان کے خیالات مسترد کرتے ہیں۔ مثلاً ارسطو کے مطابق آگ کے ایٹموں کا تعلق پانی کے ایٹموں کے ساتھ بننے کے نتیجہ میں پانی کھولتا ہے' جب کہ سہروردی کہتے ہے کہ کھولاؤ پانی میں موجود ایک کیفیت پر منحصر ہے۔پانی آگ سے قریب آنے پر ابلنے کی مخفی صلاحیت حقیقی صورت اختیار کر لیتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ آگ پر رکھے ہوئے برتن میں جب پانی ابلتا ہے تو آگ اور پانی کا آپس میں تعلق بنتا ہے اور نہ ہی پانی کی مقدار بدلتی ہے۔ سہروردی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پانی کے اندر کوئی خصوصی خاصیت یا صفت موجود ہے جو حرارت کا اثر قبول کرتی ہے۔

سہروردی پاکیزگی اور تنویر کے حوالے سے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتا' اور ان کی پاکیزگی اور اگلی دنیا میں ان کے وجودیاتی مقام کے درمیان ایک علتی تعلق قائم کرتا ہے۔ تین گروہ مندرجہ ذیل ہیں: (1)۔ جو لاعلمی کی تاریکی میں رہتے ہیں۔ (2) ۔ جو کچھ حد تک اپنے آپ کو پاکیزہ کر لیتے ہیں۔ (3)۔ جو پاکیزہ ہو کر تنویر پالیتے ہیں۔

"حکمت الدنیا" (یا حکمت العتیق) کے نظریات سے لگاؤ رکھنے والے سہروردی کہتے ہیں کہ الوہی طور پر الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان ابدی صداقت ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس

کے خیال میں فلسفہ صرف استدلالیت کی بجائے عقل عوام کے ساتھ عینیت رکھتا ہے۔

سہروردی کے خیال میں علم کے مدارج میں لوگوں کی چار قسمیں موجود ہیں:

1۔ "حکیم" جنہوں نے استدلالی فلسفہ اور روحانی علم میں عبور حاصل کر لیا۔

2۔ ایسے فلسفی جو علمی حکمت علم کے عالم ہیں اور خود کو استدلالی فلسفہ میں نہیں الجھاتے۔

3۔ ایسے فلسفی جو استدلالی فلسفہ جانتے ہیں لیکن رحوانی علم سے بے تعلق رہتے ہیں' مثلاً الفارابی اور ابن رشد۔

4۔ متلاشی علم جو حکمت کی دو شاخوں یعنی استدلالی یا عملی فلسفہ میں سے کسی ایک میں بھی عبور نہیں رکھتے۔

اسلامی فلسفہ میں سہروردی کا فلسفہ اس لحاظ سے ایک اہم موڑ تھا کہ یہ تصوف اور استدلالی فلسفہ کے درمیان مصالحت کروانے کی پہلی سنجیدہ کوشش پیش کرتا ہے۔

سہروردی کے تمام تر فلسفہ کا بنیادی مسئلہ نفس انسانی کا اپنے منبع صدور کی جانب مکمل سفر دکھانا ہے۔ استدلالی فلسفہ میں مہارت حاصل کر کے ایسے استاد کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے جو روحانی خطرات کے گورکھ دھندے میں شاگرد کو راہ دکھا سکے۔ صرف عملی اور نظری حکمت کے امتزاج کے ذریعے ہی وہ حالت حاصل کی جا سکتی ہے جہاں مراقبہ کے بغیر براہ راست طور پر روحانی علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ابن عربی

(1165ء ----- 1240ء)

محی الدین ابن عربی 1165ء میں مرشیا اندلس میں پیدا ہوا۔ لڑکپن میں وہ اس وجہ سے خاصا مشہور ہو چکا تھا کہ فلسفی ابن رشد نے اس کو سامعین میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ اس نے اپنے دور کے تمام علمی مراکز سے ول (Seville) کارڈوبا' مراکیچ' تیونس' قاہرہ' قونیہ' مکہ' بغداد اور دمشق میں سفر کیا۔ دمشق میں اس کی وفات ہوئی اور وہیں پر اس کا مقبرہ اب مشہور مزار بن چکا ہے۔

ابن عربی کے خیالات نے صوفیانہ فکر کے تیسرے بڑے دور کو پیش کیا اور نکتہ عروج تک پہنچایا۔ پہلے دور میں رابعہ بصری' جنید اور بسطامی' جیسے مفکرین نے عارفانہ تجربہ کے صوفی نظریہ کو انسانی نفس سے ماورا ہونے اور اس تجربہ میں مرکوز ایک صوفیانہ زندگی اور وحدت الوجود کے طور پر پیش کیا تھا۔ دوسرے دور میں سلمی' سراج' مکی اور الغزالی تھے۔ اس دور میں وحدت الوجود اور صوفیانہ زندگی رسوماتی اسلام اور اسلامی دینیات کے ساتھ زیادہ صریح طور پر ہم رنگ ہے۔

ابن عربی کے ہاں صوفیانہ وصل نہ صرف توثیق وحدت میں مرکزی لمحہ بلکہ صوفیانہ زبان کے اندر ایک ایسا مرکزی واقعہ بھی بن جاتا ہے جو حقیقت مطلق سے متعلق ساری زبان' ظہور مکرر' کی بنیادی اعتبار سے تبدیلی ہیئت اور کبھی کبھار موضوع اور معروض' انسان اور خدا' پہلے اور بعد' ذات اور غیر کی دوئی کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔

ابن عربی کی تحریریں اس کا فلسفہ "جاودانی تقلب" منعکس کرتی ہیں۔ اس کی تقریباً 200 سے زائد تصنیفات فقہ' تقابلی فلسفہ' اسلامی دینیات' باطنی علوم (الکیمیا' علم نجوم' عددی اشاریت اور طلسمات)' تفسیر قرآن' حدیث' ریاضت' نظریہ' نبوت اور خدا رسیدگی پر اظہار خیال کرتی ہیں۔ وہ ایک نظام اور یقیناً تمام اشیاء کے "مجموعہ" کے طور پر وحدت کی حقیقت کا ٹھوس فلسفہ

تشکیل دینے کی بات نہیں کرتا۔ (ابن عربی کے مقلدین اور مفسروں نے یہ تصور پیدا کیا ہے) اس کے بجائے اس کی تصنیفات خطی پیش رفت کے ذریعہ تحدید اور تحلیل کے خلاف ہیں۔ مختلف فریموں سے بنی ہوئی متحرک تصویر کی طرح غیر متغیر فریموں کا سلسلہ متحرک شبیہہ ہے' جو بامعنی ہے۔ یہ انداز تحریر ابن عربی کے فلسفہ کی زبردست قوائیت (Potentiality) کا کامل عکس ہے۔

ابن عربی کی فکر کو "عرفانیت" کا عنوان دیا گیا ہے' لیکن اس کی اصلیت اور انتہائی پائیدار شراکت تشبیہاتی علم بیان کے میدان میں ہے' جسے کبھی کبھار "منفی دینیات" کہتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق ناقابل بیان معاملات سے ہے۔

تشبیہاتی انداز فکر استعمال کرنیوالے دیگر مفکرین کی طرح ابن عربی نے مطلق کا حوالہ دیا اسے نام دینے کی کسی بھی کوشش پر تنقید کے ساتھ آغاز کیا۔ اور وہ مکمل مطلقیت اور مکمل باطنیت کی بیک وقت جدلیاتی توثیق پر اختتام کرتا ہے۔ ابن عربی کے نکتہ ہائے نظر علم الکلام کی سابق محاذ آرائیوں پر بنیاد رکھتے ہیں۔ ترقی کی کئی صدیوں کے بعد اسلامی علم الکلام سینکڑوں مکتبہ ہائے فکر میں بٹ چکا تھا جو سب کے سب خدا کی وحدت مطلق کو قرآن پاک میں اس سے منسوب ننانوے مختلف صفات کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش میں تھے۔ کیا قہار' جبار' ناظر' سامع وغیرہ جیسی یہ صفات بھی بالکل خدا کی ماہیت جیسی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر خدا ابدی طاقتوں کا مجموعہ ہے۔ اگر صفات ہم ابد نہیں ہیں تو خدا تغیر واتفاق کے تابع ہے: یعنی مثلاً وہ ایک لمحے میں غیر سامع کی حالت میں ہے اور اگلے لمحے سامع کی حالت میں۔

یہ تذبذب حدیث پر بحث میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا' جو عہد نامہ عتیق میں ایک اقتباس کے مساوی ہے' جس میں بتایا گیا کہ خدا نے آدم کو "اپنی شکل جیسا" تخلیق کیا ہے۔ اگر "اپنی" سے مراد خدا کی صورت ہو تو کوئی انسان ایک "شکل" میں محدود خدائے مطلق ولا محدود کا ادراک کیسے کر سکتا ہے؟ ابن عربی کی نظر میں اس مسئلہ کا حل نظریہ وصال الٰہی کو نظریہ انسان کامل کے ساتھ ملا دینا تھا۔ آدم انسان کامل' یعنی انسانی شعور کے اولین نمونے کے طور پر وہ آئینہ ہے جس میں خدا اپنی صفات آشکار کرتا ہے' اور وہ منشور ہے جس میں سے اس کی غیر ممیز وحدت گذر کر مختلف صفات میں منعطف ہوتی ہے۔

صفات الٰہی بالذات وجود نہیں رکھتیں اور نہ ہی انسانی تخیل کی خالصتاً زمرہ بندیاں ہیں۔ وہ صرف اس نکتہ پر حقیقت کا روپ اختیار کرتی ہیں جب شعور انسانی کا آئینہ شفاف ہو اور اس میں

عکس نظر آئے۔ کائناتی اور انفرادی عالم اکبر اور عالم اصغر کو باہم ملاتے ہوئے ابن عربی آئینے کو شفاف بنانے کا یہ عمل محبوب حقیقی کے ساتھ وحدت میں سما جانے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ قشیری اور رابعہ بصری کی بنائی ہوئی صوفیانہ راہ پر چلتے ہوئے جب صوفی فنائے ذات کے نکتہ پر پہنچتا ہے تو خدا صوفی کے آئینہ دل میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نکتے پر خدا:

> وہ سماعت بن جاتا ہے جس کے ساتھ وہ سنتا ہے' بصارت جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے' ہاتھ جس کے ساتھ وہ چھوتا ہے' پاؤں جن سے وہ چلتا ہے' زبان جس کے ساتھ بولتا ہے۔

ابدیت کے نکتہ نظر سے یہ خود آشکاری ہمیشہ سے واقع ہوتی ہے۔ تاہم وقت کے نکتہ نظر سے یہ عارضی ہے۔ اس کا مالک نہیں بنا جا سکتا۔ ابن عربی ابتدائی صوفیوں' مثلاً قشیری کے پیش کردہ قوائی نظریہ "وقت" کو اپنی صوفیانہ جدلیات کا مرکز بناتا ہے۔ خدا کے ہر وقت ہر لحہ ایک مختلف حالت میں موجود ہونے سے متعلق قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ابن عربی ابدی اور لا محدود کی وہ صورت بیان کرتا ہے جب وہ دائمی تقلب کی حالت میں وقت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہر شبیہہ اس شخص کے لسانی' تصوراتی' فلسفیانہ اور نفسیاتی زمروں سے تشکیل شدہ ہے جس میں یہ ظاہر ہوتی ہے۔ ہر شکل خدا کی کار آمد تجسیم ہے۔

مرکزی عقلی خطا' مذہبی اور فلسفیانہ جھگڑوں اور تشدد کے باعث خدا کو کسی خاص معین شبیہہ میں "محدود" کرنے کی کوشش ہے۔ انسان کی تحلیلی عقل اس اصول بندش کی مطابقت میں وظائف سر انجام دیتی ہے۔ یہ صرف و نحو اور منطق دونوں کو باندھنے یا محدود زمروں کے مطابق تعمیر کرتی ہے: ذات اور غیر' موضوع اور اس کا اثبات' پہلے اور مابعد' ادھر اور ادھر۔ جب زبان پر منطق کو محدود کرنیوالی زمرہ بندیوں (Categories) کا اطلاق خدا پر کیا جائے تو خدا کی ایک صورت تشکیل پاتی ہے۔ یہ صورت کار آمد ہے---- لیکن صرف "لحہ بھر کے لیے۔"

چنانچہ محدود کرنے کی عقلی سرگرمی کو دائمی تقلب سے مکمل کرنا لازمی ہے۔ قلب انسانی کا شفاف آئینہ (منبع جذبات دل نہیں بلکہ اعلیٰ علم والا دل) ہر شکل اختیار کرنیکا اہل ہے۔ "ہر شکل اختیار کرنے کا اہل" کا یہ مصرعہ ابن عربی کی عشقیہ شاعری کے مشہور مجموعہ "مفسر خواہشات" میں بنیادی تصور کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کتاب میں بعد کے تفسیری کھیل بھی شامل ہیں جنہیں عشقیہ شاعری اور فلسفیانہ فکر کے درمیان تخلیقی تناؤ (جو صوفیانہ فکر میں بہت اہم ہے) کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ ابن عربی نے اپنی تمثیل نگاری میں عاشق سے محبوبہ کی جدائی کا استعارہ استعمال کیا

ہے جو قبیلے کی عورتوں کے ساتھ کہیں چلی جاتی ہے اور شاعر سے دور جاتے ہوئے اپنے سفر کے دوران مختلف جگہوں پر "قیام" کرتی ہے۔

ابن عربی کے لیے محبوبہ اور اس کے قبیلے کی عورتیں الحق کی تشبیہی صورتوں یا مظاہر کے شانہ بشانہ ہیں۔ حج کے دوران مختلف قیام کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی علامت کی مانند محبوب کی جانب بڑھنا عالم انسان سے "پرے" خدائی مظاہر کی حرکت بالعین ہیں۔ بشریت کی بنیادی حالت کو قبول کر لینے والا انسان مسلسل مسرت اور مسلسل دکھ کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ وصال الٰہی میں اس کے گزارے ہوئے ہر ہر لمحے میں محبوب اس کے شفاف آئینہ دل میں عکس بن کر جھلکتا ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ انسان اس شبیہہ کے فوری غائب ہو جانے کو اس طرح تسلیم کرتا ہے کہ کوئی نئی شبیہہ اس کی جگہ پر آجاتی ہے۔ تخلیق آدم پر فرشتوں نے اعتراض کیا:

"اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں' انہوں نے کہا کہ کیا تو اس میں (اس شخص کو بھی) پیدا کرے گا جو اس میں فساد کریں گے اور خون بہائیں گے اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تجھ میں سب برائیوں کے پائے جانے کا اقرار کرتے ہیں......" (البقرہ۔ آیت 31)

اس اعتراض کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے کردار انسانیت کے تصور کو الوہی اظہار کے مسلسل عکس نما کے ماخذ کی حیثیت میں سمجھنے میں ناکام ہو گئے تھے۔

جب عارف دائمی تقلب کی یہ حالت پالیتا ہے تو وہ دائمی ہم خلقی میں بھرپور حصہ لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ صوفیانہ تخصیص اور متکلمانہ دینیات کے مابعد الطبیعیاتی تقلب میں دنیا ہر لمحے فنا اور دوبارہ تخلیق ہوتی ہے۔ تاہم' معروضی دنیا کی تخلیق مکرر کسی آزاد خالق خدا کے ہاتھوں ہونے کی بجائے صوفیانہ تخلیق مکرر قلب انسانی کے شفاف آئینہ کے اندر صفات الٰہی اور انسانی زمرہ بندیوں کی باہمی تعمیر ہے' جو ہر وقت تجدید یافتہ ہوتی رہتی ہے۔

ابن عربی دعویٰ کرتا ہے کہ ہر صورت اختیار کرنے کی اہلیت رکھنے والا قلب تمام کار آمد مظاہر کی توثیق اور تحصیل کر سکتا ہے: توریت' قرآن' عیسائی خانقاہیں' بت خانہ' غزالوں کی چراگاہیں۔ ابن عربی نے اپنی ایک انتہائی مقبول نظم میں لکھا ہے کہ "کاروان عشق" جہاں کہیں بھی لے جائے گا' وہی اس کا مذہب اس کا عقیدہ ہے۔ یہ مشہور فقرہ بردباری یا کمزور سی نیکی کے لیے اپیل نہیں جس پر کوئی شخص دیگر اعتقادات کو گوارا یا نظر انداز کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ اس کی بجائے یہ تمام مظاہر حقیقت میں مکمل مجذوبیت اور اسے قبول کرنے کی اپیل ہے۔

ابن عربی کے خیالات کی تدوین بعد ازاں اس کے پیروکاروں نے کی تھی اور کلاسیکی اسلام کے سارے دور میں ابن عربی کا اثر مرکزی تھا۔ جدید دور میں یہ اثر کچھ مجددین کی جانب سے حملوں کا شکار ہوا۔ حالیہ برسوں کے دوران ابن عربی میں عالمگیر سطح پر دلچسپی پیدا ہوئی ہے' وہ اسلامی صوفیانہ فلسفہ میں "الشیخ الاکبر" کے طور پر مشہور ہے۔ اس کی وفات 1240ء میں دمشق میں ہوئی۔

مولانا جلال الدین رومی

(1207ء----1273ء)

جلال الدین رومی 30 ستمبر 1207ء کو پیدا ہوا۔ وہ مولانا روم کے نام سے بھی مشہور ہے۔ شاید اس خطے کی نسبت سے جہاں وہ مقیم رہا۔ رومی اپنے بچپن میں بھی کوئی غیر معروف شخص نہیں تھا کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو کئی نسلوں سے صوبہ خراسان کے شہر بلخ میں مقیم تھا۔ اس خاندان نے بڑی تعداد میں فقہاء اور فضلاء پیدا کیے۔ رومی کے والد امام غزالی سے بہت متاثر تھے اور برسر عام فلسفیوں اور عقلیت پسندوں کے خلاف جوشیلی تقریریں کیا کرتے تھے اور اسلام کے احکام کا نئے سرے سے مطالعہ کرنے پر زور دیتے۔ رومی کو پانچ سال کی عمر میں اپنا گھر چھوڑ دینا پڑا اور ایک بچے کی حیثیت میں ہی سمرقند کے غریب عوام کے ہولناک قتل عام کا تماشا بھی دیکھا جو خوارزم کے بادشاہ کے حکم پر کیا گیا۔ پھر بچپن میں ہی گھر واپس لوٹا لیکن تیرہ چودہ برس کی عمر میں دوبارہ گھر چھوڑنا پڑا۔ اس مرتبہ اپنے ضعیف والد کے ساتھ طویل اور ناگوار سفروں کا معاملہ درپیش تھا۔ نیشاپور میں رومی کی ملاقات فارسی شاعر عطار سے ہوئی۔ جو اس پر بہت مہربان ہوا اور اپنی تصنیف کی ایک جلد بطور ہدیہ دی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں رومی کی شادی خواجہ لالائی سمرقندی کی بیٹی گوہر خاتون سے کر دی گئی جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ چوبیس سال کی عمر تک مولانا رومی نے حساب، منطق، طبیعیات، سیاسیات اور فلسفہ اخلاق کے علاوہ قرآن و حدیث کا بغور مطالعہ کیا۔ حلب اور دیگر شہروں کی درسگاہوں میں اکتساب علم کے بعد وہ چونتیس برس کی عمر میں اہل فکر کا مسلمہ رہنما بن گیا۔

رومی کا عرصہ حیات تقریباً ساری تیرھویں صدی پر محیط تھا۔ اس دور میں اسلام ایک خستہ و شکستہ تعمیر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ منگولوں کے حملے سے ایشیاء اور یورپ کو شدید دھچکا لگا۔ یہی عہد اسلام اور مسیحیت میں تصوف کا عظیم عہد ثابت ہوا۔ تیرھویں صدی کی ابتداء میں اسلام

بری طرح محصور ہو چکا تھا' مشرق میں وحشی منگولوں کے گھڑ سوار تیر انداز اور مغرب میں زرہ بکتر سے آراستہ صلیبی جاں باز۔ اس گھیراؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا لیکن اسی صدی کے آخری حصے میں صورتحال بالکل بدل چکی تھی۔ ال خان کے سلسلہ کے کئی حکمران عیسائیت سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے لیکن ساتویں حکمران نے اسلام کو سرکاری مذہب کے طور قبول کر لیا۔ اسلامی فتح سے پہلے کے مایوس دور میں مولانا روم ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرح کھڑا نظر آتا ہے۔ اس کی قائم کردہ روایت' اس کی فکر اور زبان نے آئندہ صدیوں میں بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔ رومی کے بعد فارسی کی شدبد رکھنے والے ہر صوفی نے اسے اپنا مرشد تسلیم کیا۔

رومی کا آبائی شہر قونیہ ہی وہ نقطہ ماسکہ ہے جہاں رومی کی زندگی کے اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس شہر نے اسے تب اپنے دامن میں پناہ دی جب ایک افراتفری کے شکار ملک میں پناہ حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ وہاں رومی کو اپنے والد کے لائق وارث کی حیثیت سے باقاعدہ رسم کے مطابق سند نشین کیا گیا۔ اس نے وعظ کا سلسلہ شروع کیا اور اسلام کے خوش بیان شارح کی حیثیت میں شہرت حاصل کر لی۔ خود بادشاہ وقت اس کے مریدوں کے حلقے میں آبیٹھتا۔ حتی کہ رومی پر وجدان کا مرحلہ آن پہنچا اور اس نے رسمی تہذیب و متانت کا لبادہ کھسوٹ پھینکا۔ وہ شہر کی گلیوں میں گاتا' ناچتا پھرتا۔ ظاہری آداب کی مطلق پروا نہ کی۔ اسے اسلام کا بہت بڑا ترجمان سمجھنے والوں کو بیحد تعجب اور مایوسی ہوئی۔ یہیں رومی کی ملاقات شمس تبریز سے ہوئی اور یہیں مفارقت بھی۔ قونیہ میں ہی رومی سخت اضطراب و اذیت میں مبتلا رہا۔ یہاں رومی کی روحانی پیدائش ہوئی۔ اسے قونیہ میں داخل ہوتے سات سو سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور وہ آج بھی وہاں کی ہواؤں میں رچا بسا ہے۔ قونیہ مشرقی سلطنت کا دارالخلافہ تھا اور اقونیم کے نام سے مشہور تھا۔ اس شہر کا ہر باشندہ آج تک یہی خیال کرتا ہے کہ وہ فرشتوں کے شہر میں رہتا ہے جس کی وجہ ایک قدیم روایت ہے۔

شمس تبریز کے ساتھ رومی کی ملاقات نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ شمس تبریز حسن بن صباح کے فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دادا انور الدین محمد حسن بن صباح کا ایک رفیق تھا۔ اپنے وزنی دلائل فجر کے ذریعہ وہ 1210ء میں فوت ہوا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اس کا جانشین مقرر ہوا۔ لیکن وہ باپ کی پالیسی ترک کر کے مسلمان بن گیا۔ شمس تبریز اسی کا بیٹا تھا۔ شمس قونیہ میں آیا تو اس کی عمر 60 برس تھی۔ دولت شاہ کی روایت ہے کہ شمس تبریز کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اس کی روحانی رازداری کا شریک بن سکے اور اس کے جذباتی تجربے کے اخذ و قبول کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس نے ایک مرتبہ رومی کو شاگردوں کی قیادت کرتے ہوئے

سرائے کے پاس سے گذرتے دیکھا۔ شمس نے اسے روکا اور پوچھا: "علم کا مقصد کیا ہے؟" رومی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنا اور ان تک رسائی پانا۔ شمس تبریز بولا کہ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے۔ رومی نے پوچھا کہ پھر علم کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ "علم وہ شئے ہے جو تمہیں اس کے سر چشمے تک لے جائے" شمس نے جواب دیا۔ کہا جاتا ہے رومی اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً شمس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس ملاقات نے رومی میں ایک انوکھا سکون اور اضطراب پیدا کر دیا۔ یہ اس کے لئے جہان تازہ کی نمود تھی۔ شعور کے اس انوکھے تجربے نے مضمر توانائی کو مزید تابدار کیا۔

ان ملاقاتوں کا نتیجہ اس قدر اہم تھا کہ مخفی نہ رہا۔ دینیات کا فاضل اور راسخ العقیدہ استاد درس و تدریس کا سلسلہ ترک کر کے شمس تبریز کا والہانہ شیدائی بن گیا۔ رومی کے طلبہ اور عقیدت مند اس سے مایوس ہونے لگے کہ اب تک موسیقی کو ناپسندیدہ قرار دینے والا شخص اس کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ رومی گھنٹوں موسیقی سنتا اور وجد و سرور کی کیفیت میں رقصاں ہو جاتا۔ رومی کے عقیدت مندوں کے لئے شمس قطعاً پسندیدہ شخص نہ تھا لیکن رومی اسے اپنے گھر کی روشنی خیال کرتا۔ شمس تبریز قتل کر دیا گیا اور قتل کی سازباز کرنے والوں میں رومی کا اپنا بیٹا بھی شامل تھا۔ لہٰذا رومی نے بیٹے کی نماز جنازہ تک میں شرکت نہ کی۔ شمس کے داغ مفارقت کے بعد رومی کا اضطراب ناقابل برداشت ہو چلا تھا۔ اس نے خود کو سماع و رقص میں ہی محو کر لیا۔ معاصر علماء اس کا بڑا احترام اور اس کی ایسی بے خودی پر اظہار افسوس کرتے۔ لیکن سماع و رقص سے دل بستگی رومی کے روحانی دکھوں کا مداوا نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس بگولے کی تندی مدھم پڑنے لگی۔ یہ ذہنی آویزش رفتہ رفتہ "مثنوی" کے شعری حسن و جمال میں ڈھلنے لگی۔

انہی دنوں رومی کی ملاقات ایک چاندی کے ورق کوٹنے والے شخص سے ہوئی۔ بازار میں سے گذرتے ہوئے رومی کو موسیقی کے سر تال سنائی دیئے تو وہ آواز کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ لیکن یہ موسیقی کی بجائے چاندی کو تننے والے کی ہتھوڑی کی ضربیں تھیں۔ رومی مستانہ وار رقص کرنے لگا۔ ہتھوڑی کی ان ضربوں نے رومی کے وجود کو بھی لطیف بنا دیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب وہ خاک گلی بنی، اور اسے سمت راہ نو کی کامرانیاں نصیب ہوئیں۔ دمشق میں شمس تبریز کی تلاش کرتے ہوئے رومی کو اپنی ہی لافانی ذات سے وصال نصیب ہوا۔ رومی کی غزلوں کا اصل جذبہ عشق ہے۔ یہ عشق غیر فانی ذات کی دریافت کی ارفع اور ناقابل تعرض لگن ہے۔ رومی مذہب عشق کے سوا کسی اور مذہب سے واقف نہیں۔ عشق ملک، مسلک اور رنگ کی حد بندیوں سے فائق ہوتا ہے۔ رومی محض ایران یا روم کا شاعر نہیں بلکہ ایسا مغنی ہے جو ساری کائنات کے لئے نغمہ سرا ہے۔

اپنی غزلوں میں رومی لازمی طور پر زندگی کا نغمہ خواں ہے۔ وہ سادہ تجربات کو بھی جوش اور ولولے کا لہجہ بخشتا اور انہیں شوخ وواضح نقوش کے ذریعہ سے پیش کرتا ہے۔ اس کی غزلوں میں مذہب اور فلسفے کے پیچیدہ اصول معقولی دائرے سے نکل کر عام لوگوں کی زندگی کا جزو بن گئے۔ یہی تکنیک بعد ازاں اسے مثنوی کی تخلیق میں استعمال کرنا تھی۔ مثنوی کو پہلے پہل مخفی وملکوتی حقائق کا ایک بے مثال اظہار ہی سمجھا جاتا تھا۔ حتی کہ جامی نے اسے "زبان پہلوی میں الہامی کتاب" کہا اور شاعر کے بارے میں لکھا: "وہ پیغمبر تو نہیں لیکن صاحب کتاب ہے۔"

رومی نے اپنی غزلیات کے مجموعے کو "دیوان شمس" کا نام دیا اور مثنوی کو "حسامی نامہ" کہا۔ شمس دیوان کا ہیرو تھا اور حسام الدین مثنوی کا محرک۔ اس کی بدولت یہ مثنوی معرض تحریر میں آئی۔ رومی نے تقریباً بارہ برس کی مدت میں 25.700 اشعار حسام الدین کو املاء کرائے۔

دیباچے میں وہ بلا تکلف اقرار کرتا ہے: "یہ عطیات میں سب سے اعلیٰ اور انعامات میں سب سے بیش قیمت ہے..... یہ ہمارے احباب کے لئے ایک نور ہے اور اخلاف کے لئے ایک خزانہ۔" مثنوی کا آغاز تمثیلی انداز میں ایک نغمے سے ہوتا ہے۔ جس میں استعارةً بتایا گیا ہے کہ نے نیستاں سے جدا ہو کر جدائی کی شکوہ سنج ہے۔ رومی کہتا ہے کہ تمام موجودات کا خالق اور خود حیات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ساری ہستی روحانی اقلیم میں موجود ہے۔ روح جسم سے مستور نہیں ہوتی' دونوں کا باہمی رابطہ بڑا گہرا ہے اور آفاقی ذات میں سے ظہور پذیر ہونے والی شخصیت کو اس کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ شعور روح میں منطق نہیں بلکہ عشق جان ڈالتا ہے۔ کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کا ایک عمل ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تخلیق کائنات کے وقت اپنے آپ کو مکان ابعاد میں شامل نہیں کیا۔ انسان وہ کائنات اصغر ہے جس نے اپنی ترکیب میں عالم اکبر (کائنات) کو مسحور کر رکھا ہے۔ رومی "ذات" کو وہ صفر عظیم سمجھتا ہے جس کے بغیر کوئی مساوات مکمل نہیں ہو سکتی۔ عقل وادراک کی قوت روحانیت کی بلند منزلوں تک رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے پیر' راہنما اور رفیق کی مصاحبت ضروری ہے۔ رومی کے خیال میں رسول اللہ کامل ترین راہنما ہیں۔ وہ اس نظریئے کا علمبردار ہے کہ ارضی وملکوتی زندگی میں کوئی تضاد و تصادم نہیں۔ دونوں ایک ہی وحدت کے اجزاء اور لازم و ملزوم ہیں۔ ہم اس دنیا کی زندگی سے منہ موڑ کر محض سکوت واستغراق میں دوسری زندگی کا انتظار نہیں کر سکتے۔ زندگی انسان کا مہلک ترین تحفہ ہے۔ اس کے مہلک پن سے ڈر کر بھاگنا ہمیں اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں کر سکتا۔ آزمائش و مصائب کا صحرا پار کرنے کے بعد ہی کہیں خودی کے مقام بلند تک رسائی ممکن ہے۔ ایک منزل ایسی

بھی آتی ہے جب خودی کے عزم اور کائناتی خودی کے عزم کی ہم آہنگی ایسی مکمل ہو جاتی ہے کہ جبر و اختیار کی ساری بحث ہی لایعنی ٹھہرتی ہے۔ اپنی ذات کے اعلیٰ اوصاف کو بروئے کار لانے کے لئے ان تمام قوتوں سے نبرد آزمائی ضروری ہے۔ جو ہماری نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ مثلاً لالچ' حرص' طمع' اور نفرت۔ حیات لطیف ہی مثنوی کا بنیادی موضوع ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ مولانا رومی نے 17 دسمبر 1273ء کو وفات پائی۔

امیر خسرو

(1253ء ----- 1324ء)

امیر خسرو 3521ء میں آگرہ کے قریب ایٹہ کے قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود چینی ترک تھے۔ وہ منگولوں کی شکست و ریخت کے زمانے میں یہاں آئے اور سلطان التمش کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے سلطان کے رادت عرض عماد الملک کی بیٹی سے شادی کر لی اور پٹیالی میں جہاں ان کو کچھ زمین ملی ہوئی تھی رہنے لگے۔ امیر خسرو وہیں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا خاندان ہندی النسل تھا۔ اس طرح امیر خسرو باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے ہندوستانی تھے۔ ان کی آبائی زبان فارسی اور مادری زبان برج بھاشا (ہندوی) تھی۔

امیر خسرو کی ابتدائی تعلیم دہلی کے مکتبوں میں ہوئی۔ امیر سیف الدین محمود خود تو اَن پڑھ سپاہی تھے مگر ان کی دلی آرزو تھی کہ بیٹا پڑھ لکھ کر دنیا میں نام پیدا کرے لیکن خسرو کا دل درسی کتابوں میں نہ لگا۔ چنانچہ وہ اپنے پہلے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "میرے استاد خواجہ اسد الدین محمد مجھے خطاطی سکھانے کی کوشش کرتے تھے مگر میں خط و زُلف کی تعریف میں شعر نظم کرتا رہتا تھا۔۔" خوش قسمتی سے نہ تو استاد نے سرزنش کی نہ والدین نے ٹوکا اور امیر خسرو بدستور شاعری کی مشق کرتے رہے۔

امیر خسرو نے شعر گوئی سے متعلق اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دوسرے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ایک روز خواجہ آصل کوتوال نے میرے استاد خواجہ اسد الدین کو ایک خط تحریر کرنے کے لئے بلوا بھیجا۔ اُستاد چلنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ کوتوال کے مکان پر اُن دنوں ملک کے ایک بڑے عالم فاضل بزرگ خواجہ اعز الدین مقیم تھے۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو خواجہ صاحب ایک بیاض سے حاضرین کو اشعار سنا رہے تھے۔ میرے استاد نے اُن سے کہا کہ میرا یہ ننھا شاگرد شعر بڑے لحن سے پڑھتا ہے۔ آپ سُنیں گے تو بہت محظوظ ہوں گے۔

تس پر خواجہ صاحب نے بیاض میری طرف بڑھادی۔ میں نے بہت سے شعر ترنم سے پڑھے اور حاضرین کو میری شعر خوانی بہت پسند آئی۔ تب میرے اُستاد نے کہا کہ دوسروں کے شعر پڑھنا تو آسان ہے' آپ اس بچے کی شعر گوئی کا امتحان لیں۔ اس پر خواجہ اعزالدین نے مجھے چار لفظ--مُو' بیضا' تیر اور خربوزہ دیئے اور فرمایا کہ ان کو رُباعی میں نظم کرو۔ میں نے اُسی وقت سب کے سامنے یہ رُباعی نظم کردی۔

ہر موئے کہ درد وزُلف آن صنم است
صدبیضہ عنبریں برآں موئے صنم است
چوں تیر مدان راست دلش را زیرا
چوں خربزہ دندانش میان شکم است

(ترجمہ) اُس صنم کی دونوں زلفوں کے ہر بال میں عنبر کے سینکڑوں دانے گھلے ہوئے ہیں لیکن یہ نہ سمجھو کہ تیر کی مانند اُس کا دل بھی سیدھا ہے بلکہ خربوزے کی طرح اس کے دانت بھی پیٹ میں پوشیدہ ہیں۔

خواجہ اعزالدین میری حاضر کلامی پر بہت خوش ہوئے۔ میرے باپ کا نام پوچھا اور دُعا دی کہ خدا کرے تمہارے اشعار اقصائے عالم میں شہرت پائیں۔

امیر خسرو آٹھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اب وہ اپنے نانا عمادالملک کے پاس رہنے لگے۔ عمادالملک سلطان ناصرالدین محمود کے وزیر اور معتمدین خاص میں تھے۔ وہ شعر وشاعری اور رقص وموسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور بڑی شان وشوکت سے رہتے تھے۔ اُن کے دیوان خانے میں علما کی مجالس برپا ہوتیں' مشاعرے ہوتے اور گانے کی محفلیں سجتیں۔ امیر خسرو کبھی نانا کی اجازت سے ان صحبتوں میں شریک ہوتے اور کبھی چھپ چھپ کر ان کا لُطف اٹھاتے۔ اُن کو موسیقی کا شوق غالباً اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ البتہ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ حتی کہ انھوں نے شاعری کی دیرینہ روایت کے مطابق نہ فنِ عروض سیکھا نہ کبھی کسی استاد کی شاگردی قبول کی۔

عمادالملک ہی کی سرپرستی کے زمانے میں امیر خسرو کو خواجہ نظام الدین اولیا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انھوں نے سلطان المشائخ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ارادت مندی اور دوستی کا یہ رشتہ روز بروز زیادہ مضبوط ہوتا گیا اور آخر دم تک نہ ٹوٹا۔

1273ء میں عمادالملک کا انتقال ہو گیا مگر اس وقت تک امیر خسرو کی شہرت دُور دُور

تک پھیل چکی تھی اور ان کا شمار چوٹی کے شعراء میں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک علاؤالدین کشلو خاں (ملک چھجو) نے جو سلطنت کا سب سے بااثر امیر تھا خسرو کو اپنا ندیم خاص بنالیا۔ اس طرح سرکار دربار سے وابستگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ امیر خسرو ملک چھجو سے قطع تعلق کر کے پہلے بلبن کے دوسرے بیٹے بغرا خان کے مصاحب ہوئے پھر ولی عہد سلطنت شہزادہ محمد کے مصاحب ہو کر پانچ سال تک ملتان میں رہے۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد ملک امیر علی سرجان دار سے وابستہ ہو گئے اور بلبن کی وفات کے بعد کیقباد تخت پر بیٹھا تو اس نے امیر خسرو کو اپنا درباری شاعر مقرر کر دیا۔ (1288ء) امیر خسرو کی عمر اس وقت 53 برس تھی اور ان کی شاعری کا بھی شباب تھا۔ کیقباد کی موت کے بعد وہ یکے بعد دیگرے چار بادشاہوں (جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق) کے درباری شاعر رہے اور مسلسل 63 سال تک یہ خدمت انجام دے کر 1324ء میں انتقال کیا۔

امیر خسرو بڑے پُر گو شاعر تھے اور بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ کسی نواب کی حویلی یا شاہی دربار سے بلاوا آتا تو بطور نذر ایک قصیدہ لکھ کر ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ کچھ محققین کا دعوی کہ فارسی، اردو، ہندی، بنگالی، سندھی غرضیکہ برصغیر کا کوئی شاعر تخلیقات کی ضخامت اور تنوع میں امیر خسرو کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ بعض تذکروں میں تو ان کی تصنیفات کی تعداد 99 بیان کی گئی ہے، لیکن اب تک فقط اڑھائی درجن کتابوں کا سراغ ملا ہے۔ ان کی تصنیفات میں قصیدے ہیں، مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیات، شہر آشوب، فارسی اور ہندی غزلیں، خالق باری، دو سخنے دوہے، مکرنیاں اور پہیلیاں سبھی کچھ شامل ہیں۔ وہ اپنی فارسی کی غزلوں کو اور ہندی شاعری کو بالکل اہمیت نہیں دیتے تھے (حالانکہ آج ان کی شہرت کا باعث وہی ہیں)۔ البتہ اپنی مثنویوں اور قصیدوں پر بہت فخر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے فارسی کلام کو بڑی کاوش اور احتیاط سے خود ہی مرتب کیا ہے اور ہر مجموعے کی ابتدا میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیباچے نہایت مفید تاریخی دستاویز ہیں۔ ان میں امیر خسرو نے مندرجات کی شان نزول کے علاوہ اپنے عہد کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے حالات زندگی بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ مندرجات کی فہرست، اشعار کی تعداد اور سن ترتیب بھی دے دیے ہیں۔

امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری اپنے عہد کے تہذیبی امتزاج کا حسین مرقع ہے۔ چنانچہ مثنوی قران السعدین کی تمہید میں سید حسن برنی صاحب لکھتے ہیں کہ: "خسرو کی مادری زبان ہندوستانی تھی، جسے وہ اس قدر عزیز رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا آلہ

بناتے تھے۔اسی وجہ سے ان کی شاعری بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے اس دلچسپ دور کا آئینہ ہے ملک کے مختلف عناصر میں امتزاج واختلاط ہو رہا تھا اور اہل ملک کے لئے زبان' جذبات اور خیالات کی آمیزش اور موافقت کی شاہراہ تیار ہو رہی تھی۔ ملک کی اس مشترکہ تہذیب کی ترقی میں خسرو کا خاص حصہ ہے۔وہ وطن کی محبت کو ایمان سمجھتے تھے۔اس حق کو انہوں نے خوب ادا کیا ہے۔"

امیر خسرو کے کلام میں تہذیبی امتزاج کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے فارسی اشعار میں ہندی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ (لیکن بادشاہوں کے درباروں' امیروں کی ڈیوڑھیوں اور ہم عصروں میں یہ چلن اگر عام نہ ہوتا تو امیر خسرو' جو پاکیزہ فارسی کے بڑے دلدادہ تھے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ ہرگز نہ شامل کرتے)۔ تہذیبی امتزاج کی دوسری مثال ان کی مشہور نظم خالق باری ہے جس میں آدھے الفاظ فارسی کے ہیں اور آدھے ہندی کے۔اسی سے ملتی جلتی ان کی وہ غزل ہے جس میں امیر خسرو ہندی روائت کے مطابق اپنے جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے کرتے ہیں۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں' نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زُلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک ازدل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں' زمہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں' نہ انگ چینا' نہ آپ آویں' نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب' خسرو
سپیت منکے درائے راکھوں' جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

امیر خسرو کا بڑا امتیازی وصف اُن کی حب الوطنی ہے۔وہ ترکی النسل تھے مگر ہندوستانی ہونے اور ہندوستانی زبان جاننے پر بڑا فخر کرتے تھے۔

تُرک ہندستانیم مَن ہندوی گویم جواب
شکرِ مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن

(میں ہندوستانی ترک ہوں اور تمہیں ہندی میں جواب دے سکتا ہوں۔ میرے پاس

مصری شکر نہیں کہ عرب اور عربی کی باتیں کروں)

وہ اپنے اشعار میں جابجا یہاں کے موسم' پھل پھول' چرند پرند' ناچ گانے' زبان' علم و حکمت' مصنوعات' اختراعات اور رسم و رواج کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں۔ وہ کیوڑہ' جوہی' بیلا' رائے چمپا' مولسری' دونا' کرنا' سیوتی اور ہزارے وغیرہ کی خوبیاں فرداً فرداً بیان کرتے ہیں۔ اور پھر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ایرانی پھول ہمارے پھولوں کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ان میں تو بس رنگ ہوتا ہے خوشبو کہاں ہوتی ہے۔ آم' خربوزہ اور پان کے بارے میں بھی ان کی گلفشانی گفتار کا یہی انداز ہے۔ وہ ہندوستانی عورتوں کے قامت و رنگ کے اتنے گرویدہ ہیں کہ کسی دوسرے ملک کی عورت ان کی نظر میں نہیں سماتی۔ ایرانی عورتوں میں خراسانی پھولوں کی مانند مہک نہیں ہوتی۔ روم سے روس تک کی عورتیں برف کی سل کی طرح سفید اور ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ تاتاری عورتوں کو ہنسنا نہیں آتا۔ خُتن کی عورتوں میں نمک نہیں ہوتا۔ سمرقند اور قندھار کی عورتوں میں مٹھاس نہیں۔ اور مصر کی عورتوں میں چستی اور چالاکی نہیں ہوتی۔ (مثنوی قران السعدین)

مثنوی نہ سپہر میں جو 76 سال کی عمر میں لکھی گئی تھی امیر خسرو کی حب الوطنی کی بنیادیں زیادہ گہری اور پختہ ہو جاتی ہیں۔ وہ ہندوستان کی قدرتی چیزوں کی فوقیت میں سات دلیلیں دینے کے بعد یہاں کے علم و دانش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " مجھے معلوم ہے کہ اس ملک میں دانائی اور بصیرت کے بے حساب خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ یونان اپنے فلسفہ کی وجہ سے مشہور ہے لیکن ہندوستان بھی اس علم سے بے بہرہ نہیں ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں فلسفے کے تمام شعبے مل جائیں گے۔ منطق' نجوم' علم کلام بجز فقر (تصوف)' طبیعات' حساب' جوتش' غیب دانی وغیرہ۔ البتہ الٰہیات کے بارے میں ہندوؤں کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ مگر دوسروں کا بھی تو یہی حال ہے۔ گو وہ ہمارے مذہب کو نہیں مانتے لیکن ان کے بہت سے عقائد ہمارے جیسے ہیں۔ مثلاً وہ خدا کی وحدانیت اور ابدیت کے معتقد ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی ذات عدم سے وجود کی تخلیق پر قادر ہے۔ لہٰذا وہ ثنویوں' مسیحیوں' اختریوں' عنصریوں (مادئین) اور مشبہیوں سے کہیں بہتر ہیں۔ وہ پتھروں' جانوروں' پودوں اور سورج کی بے شک پرستش کرتے ہیں لیکن وہ ان چیزوں کو خدا کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ البتہ ان کا احترام اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے اجداد کا مسلک یہی تھا۔"

اس کے بعد وہ ہندوستانیوں کی فوقیت کی مثالیں دیتے ہیں: (1) علم و فہم ان میں بہت عام ہے' (2) وہ دنیا کی سب زبانیں ٹھیک لہجے میں بول سکتے ہیں' (3) عالم و فاضل لوگ یہاں تحصیل علم کے لئے دنیا کے گوشے گوشے سے آتے رہے ہیں لیکن یہاں سے کوئی اس غرض سے باہر نہیں

گیا' (4) علم ہندسہ یہاں ایجاد ہوا' (5) کلیلہ ودمنہ یہاں لکھی گئی' (6) شطرنج یہاں ایجاد ہوئی' (7) یہاں کی موسیقی جس سے قلب وروح میں شعلے اٹھنے لگتے ہیں تمام دنیا کی موسیقی سے اعلیٰ ہے۔ ہندوستانی موسیقی انسانوں کا کیا ذکر جانوروں کو بھی مسحور کر لیتی ہے اور (8) پھر دنیا کے کسی ملک میں خسرو کا سا سحر آفریں شاعر موجود نہیں ہے۔

اس سرزمین سے اور اس سرزمین پر رہنے والوں سے سچی محبت کا جو اظہار ہمیں امیر خسرو کے کلام میں ملتا ہے وہ عہد مغلیہ کے کسی فارسی یا اردو شاعر میں (بہ استثنائے نظیر اکبر آبادی) نہیں ملتا۔ امیر خسرو فارسی ہندی کے شاعر تھے' مورخ تھے' صوفی تھے' موسیقار تھے' اور متعدد راگوں اور باجوں کے موجد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی خاک سے ایسی جامع کمالات شخصیت پھر کبھی نہ اُٹھی۔

یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ قوالی کے موجد حضرت امیر خسرو ہیں لیکن مسعود سعد سلمان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ قوالی لاہور میں امیر خسرو سے صدیوں پہلے بھی گائی جاتی تھی۔ اور پیشہ ور قوال یہاں موجود تھے۔

جونپور کے فرماں روا سلطان حسین شرقی (1457ء-1483) کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے راگ جونپوری سمیت سترہ راگ ایجاد کیے تھے۔ مگر شاعری کی مانند موسیقی کے میدان میں بھی سب سے اونچی اور سریلی آواز امیر خسرو ہی کی ہے۔ وہ فن موسیقی کے اسرار اور رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق انہوں نے موسیقی پر کئی رسالے بھی تحریر کیے تھے۔ لیکن یہ رسالے اب نایاب ہیں۔ شاید انہوں نے لکھے ہی نہیں۔ چنانچہ غرۃ الکمال کے دیباچے میں ایک موسیقار سے شاعری اور موسیقی پر بحث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے موسیقار سے کہا کہ میں دونوں علوم میں فاضل ہوں اور میں نے دونوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ میں نے شاعری میں تین دفتر تیار کیے ہیں اور اگر موسیقی پر لکھتا تو اس میں بھی تین دفتر تیار ہو جاتے۔"

برنی کے اس بیان سے بھی کہ "خسرو علم موسیقی میں کمال رکھتے تھے" طوطی ہند کے دعوی کی تصدیق ہوتی ہے۔ البتہ وہ ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ تھے اور اپنے وطن کی موسیقی کو دوسرے ملکوں کی موسیقی پر فوقیت دیتے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ ہندی اور یہاں کی دوسری زبانوں میں اشعار کو گا کر پڑھنے کا رواج تھا اور موسیقیت شاعری کا ضروری عنصر سمجھی جاتی تھی۔

موسیقی میں امیر خسرو کی جدت طبع اور کمال فن کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے

بارہ راگوں میں ردوبدل کر کے یا دو تین راگنیوں کو ملا کر نئی شکلیں اور نئے نام دیے۔ منسوب راگوں کے نام یہ ہیں: موافق، مجیر، غنم، زیلف، فرغنہ، عشاق، سرپردہ، فرودست، یمن، سازگری، باخرز، صنم----- مگر یہ دراصل پوربی، ٹوڈی، بلاول، کانڑا اور ایمن وغیرہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ راگ درپن اور بادشاہ نامے کے مصنفین لکھتے ہیں کہ قول، ترانہ، سوہلہ، قلبانہ، ٹوڈی، براری، اور ٹوڈی اساوری امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔ بعض انترے اور آستائیاں بھی انہیں سے منسوب ہیں، مثلاً "امیر خسرو بل بل جاویں حضرت نظام الدین کے دربار گاویں۔" سازوں میں پکھاوج کی جگہ ڈھولک اور بین کی جگہ ستار بھی انہیں کی اختراع کہے جاتے ہیں۔

ابن بطوطہ

(1304ء-----1377ء)

مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ 25 فروری 1304ء میں مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ اس نے ساری زندگی سیر و سیاحت میں بسر کرنے کے بعد 1369ء یا 1377ء میں مراکش ہی میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوا۔ ابن بطوطہ نے دور دراز علاقوں کے طویل سفر کیے اور اپنے سفری تجربات و مشاہدات کو اپنے مشہور زمانہ سفر نامہ میں قلمبند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن بطوطہ کا شمار دنیا کے صف اول کے سیاحوں میں ہوتا ہے۔

ابن بطوطہ کا پورا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن یوسف اللواتی الطنجی تھا اس کے خاندان کا تعلق بربری قبیلے لواتہ سے تھا۔ جو اپنے عہد کا معتبر قبیلہ تھا۔

ابن بطوطہ 13 جون 1325ء کو گھر سے حج کے ارادے سے نکلا اور تقریباً ربع صدی بعد نومبر 1349 میں واپس مراکش پہنچا۔ اس مدت میں اس نے ایشیا کے بیشتر ممالک اور مشرق بعید میں چین تک کی سیاحت کی۔ ابن بطوطہ 1326ء میں شمالی افریقہ سے ہوتا ہوا مصر پہنچا جہاں سکندریہ کے مقام پر اس کی ملاقات ایک عالم برہان الدین سے ہوئی جس سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ برہان الدین نے ابن بطوطہ کو حصول علم کے لیے ہندوستان اور چین جانے کی ترغیب دی۔ ابن بطوطہ جس کے ذہن میں سیر و سیاحت کا خیال پہلے سے موجود تھا اس ترغیب سے بہت خوش ہوا۔ برہان الدین نے اسے ہندوستان کے چند ایسے علماء کے نام بتائے جن سے اس کی ملاقات ضروری تھی۔ لیکن سفری مشکلات کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا اور شام اور فلسطین سے ہوتا ہوا حجاز شریف پہنچ گیا جہاں اس نے فریضہ حج ادا کیا۔ حج کر چکنے کے بعد ابن بطوطہ عرصہ تک عراق اور ایران میں سیاحت کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ مکہ آگیا اور دو سال کا عرصہ مکہ میں گزار دیا۔ ایک تیسرے سفر میں وہ

جنوبی عرب سے ہوتا ہوا مشرقی افریقہ گیا اور واپسی پر خلیج فارس پہنچا۔ یہاں سے وہ تیسری بار مکہ روانہ ہوا اور حج ادا کیا۔ وہاں سے وہ اسوان پہنچا اور مصر و شام سے ہوتا ہوا ایشیائے کوچک اور کریمیا چلا گیا۔ ابن بطوطہ نے قسطنطنیہ کی بھی سیر کی اور وہاں قیصر انڈرونیکوس سوم سے ملاقات کی۔ پھر دریائے وولگا سے گزر کے خوارزم' بخارا اور افغانستان ہوتا ہوا براستہ ہندوکش ہندوستان وارد ہوا۔ یہاں سلطنت دہلی کے مشہور فرمانروا سلطان محمد تغلق نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اسے قاضی کے عہدے پر فائز کیا۔ اس نے کچھ عرصہ ہندوستان میں سکونت اختیار کی لیکن سیاحت کے جنون نے اسے یہاں بھی آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ ہندوستان میں تقریباً دو سال گزارنے کے بعد اس نے چین کا قصد کیا لیکن مالدیپ پہنچ کر پھر رک گیا۔ یہاں ڈیڑھ سال تک عہدہ قضا پر فائز رہا۔ 1344ء میں وہ مالدیپ سے نکلا اور لنکا' مالابار' بنگال اور ہند اقصیٰ کی سیاحت کرتا ہوا چین جا پہنچا۔ چین کی سیر کے بعد وہ سماٹرا کے راستے عرب واپس آگیا۔ ایران' عراق' شام اور عرب میں سفر کرنے کے بعد اس نے مصر سے مکہ جا کر چوتھی مرتبہ حج کیا۔ شام میں ایک طویل عرصے کے بعد اسے گھر کے بارے میں معلومات ملی تھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ پندرہ برس قبل فوت ہو چکا ہے' لیکن اس کی والدہ ابھی زندہ ہے۔ لہٰذا حج سے فارغ ہو کر شمالی افریقہ کے راستے واپس ہوا اور نومبر 1349ء کو چوبیس سال بعد فیض (Fez) میں داخل ہوا۔ یہاں تھوڑی دیر قیام کے بعد ابن بطوطہ پھر سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا اور سپین جا نکلا۔ یہاں سے وہ افریقی ریاست مالی پہنچا اور ٹمبکٹو اور گاؤ کے شہر دیکھے۔ توات اور اگدیز کے نخلستانوں سے گزر کر وہ 1354ء میں واپس مراکش پہنچا۔ یہیں اس کی 28 سالہ سیاحت کا ہنگامہ خیز دور ختم ہوا جس کے دوران میں اس نے قریباً 75000 میل کا سفر طے کیا۔

ابن بطوطہ نے فیض کے سلطان ابو عنان کے حکم پر ایک سپانوی عالم ابن جزی الکلبی کو اپنے سفر کے حالات لکھوائے۔ ابن جزی' ابو عنان کے دربار میں ملازم تھا اور انشاء پردازی کا ماہر تھا۔ اس نے بڑی توجہ اور محنت سے ابن بطوطہ کا سفرنامہ مرتب کیا اور اسے کتابی شکل دی۔ ابن جزی نے 1356ء کے قریب وفات پائی۔ اس کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا ایک حصہ پیرس کے قومی کتاب خانے میں محفوظ ہے۔

ابن بطوطہ کے سفرنامے کا اصل مقصد حصول علم تھا۔ ان دنوں رواج یہ تھا کہ جو لوگ حج کی غرض سے نکلتے' وہ راستے میں مختلف علاقوں کی سیاحت کرتے اور علم حاصل کرنے کی غرض سے علماء کی صحبت اختیار کرتے۔ ابن بطوطہ بھی علم حاصل کرنے کے لیے نکلا تھا' مگر بعد میں سیر کا شوق علم حاصل کرنے کے شوق پر غالب آگیا۔

ابن بطوطہ نے زیادہ وقت مسلمان ممالک میں گزارا۔ غیر مسلم ممالک میں قیام کے دوران بھی اس نے مسلمان علماء اور صوفیاء تک رسائی حاصل کی اور ان کی صحبت میں وقت گزارا۔ اسے سیاحت کے دوران دو تین دفعہ قاضی کے عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا۔ پہلے وہ مراکش سے مصر جاتے ہوئے قافلے میں قاضی چنا گیا' پھر ہندوستان میں قاضی کے عہدے پر مامور ہوا۔ پھر مالدیپ میں بھی اسے قاضی مقرر کیا گیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ اسلامی فقہ اور قانون کا علم رکھتا تھا۔ اگر وہ مراکش سے نہ نکلتا تو شاید وہاں بھی اسی شعبے میں نام کماتا۔

ابن بطوطہ دوران سیاحت جہاں بھی گیا' اسے گراں قدر تحائف سے نوازا گیا۔ بعض فرمانرواؤں نے اسے وظائف بھی دیئے۔ یہ تحائف اور وظائف اس کا بڑا سہارا تھے۔ وہ ان سے سفر کے اخراجات بھی پورے کرتا اور اپنا اور اپنے ساتھیوں کا خرچ بھی چلاتا۔ سلطان تغلق کی طرح بعض حکمرانوں کی فراخدلی کا ذکر اس نے خاص طور پر کیا ہے۔ گاہے گاہے اس نے تجارت کا شوق بھی پورا کیا۔ بعض شادیوں کے نتیجے میں بننے والے تعلقات بھی اس کے لیے مفید رہے۔ یہ تعلقات مالی طور پر اس کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ وہ سفرنامے میں اکثر ان عورتوں کا ذکر کرتا ہے' جن کے ساتھ اس نے مختلف مقامات پر شادی کی۔ سفر میں بہت سی کنیزیں بھی اس کے ہمراہ رہتی تھیں۔ وہ اپنے بہت سے بچوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے کئی بیٹے بیٹیاں تو ایسے تھے جن کے ساتھ وہ سیاحت کی وجہ سے دوبارہ مل بھی نہ سکا۔

وہ اپنی ضمنی مہمات کی تفصیل بے ربط انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس نے کئی ایسے تاریخی واقعات کا ذکر بھی کیا ہے' جن کا مشاہدہ اس نے خود نہیں کیا۔ یہ واقعات اس نے دوسرے لوگوں سے سنے اور انہیں اپنی طرف سے بیان کر دیا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کی پیش کردہ معلومات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

سفرنامے میں ابن بطوطہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن سفرنامے سے اس کا مقصد صرف اپنی زندگی کے حالات و واقعات قلمبند کرنا ہرگز نہیں تھا۔ اس کا اصل مقصد قاری کو دنیا کے مختلف خطوں میں ہونے والے اہم واقعات اور حیرت انگیز چیزوں سے روشناس کرانا تھا۔ ابن بطوطہ اپنا یہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے کام کو مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

ابن بطوطہ فقہ اور دوسرے مروجہ علوم پر کسی قدر دسترس ضرور رکھتا تھا' لیکن اسے ایک مستند عالم یا محقق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی مہمات کے پیچھے کوئی علمی یا تحقیقی مقصد کارفرما نہیں

تھا۔ اسے جو چیز بھی اہم یا عجیب لگی' اس نے اسے آگے بیان کر دیا۔ ابن بطوطہ روحانیات پر گہرا اعتقاد رکھتا تھا۔ اس کے سفرنامے میں درویشوں' ولیوں اور خدا رسیدہ لوگوں کی کرامتوں کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔

سفرنامے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوابوں اور پیش گوئیوں پر بھی یقین رکھتا تھا۔ وہ دوسرے ملکوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات اور ان کے حکمرانوں کے کارناموں میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ مختلف علاقوں کے رہن سہن اور رسم و رواج کو بڑی گہری نظر سے دیکھتا ہے۔ شادی بیاہ اور پیدائش اور موت کی رسمیں اسے خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ وہ بعض جگہ بڑی باریک بینی سے کام لیتا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ہندوستانی پلنگوں کی ساخت اور چین میں استعمال کیے جانے والے ایندھنوں کا ذکر کرتا ہے۔ کریمیا میں چلائی جانے والی گاڑیوں کے متعلق بتاتا ہے اور مختلف کیڑوں مکوڑوں سے نجات حاصل کرنے کے مروجہ طریقوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ مختلف خطوں کے حیوانات' نباتات اور معدنیات کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ ان چیزوں کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے جو مختلف علاقوں کے لوگ اپنے کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً ناریل کے متعلق اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ جزائر مالدیپ میں قیام کے دوران اس نے خود بھی ناریل کو غذا کے طور پر استعمال کیا۔ اس نے جنوبی عرب' ہندوستان اور مالدیپ میں پیدا ہونے والے اناج' پھلوں اور درختوں کے بارے میں بڑی وضاحت سے لکھا۔ اس کے سفرنامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آثار قدیمہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ اسے عمارتوں سے بھی اتنا شغف نہیں۔ وہ کیمیاگری کو مانتا ہے۔ مذہبی قصوں اور روایتوں کے بارے میں بھی خاصا خوش اعتقاد نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بعض محیر العقول مظاہر فطرت کے بارے میں شک کا شکار لگتا ہے۔

اس کے سفرنامے کا تقریباً پانچواں حصہ ہندوستان سے متعلق ہے۔ یہ حوالہ جات بہت اہمیت کے حامل ہیں اور ہمیں ان سے چودھویں صدی کے ہندوستان کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ سفرنامے میں مالدیپ' جنوبی روس اور خصوصاً سیاہ فام افریقہ کے متعلق فراہم کردہ معلومات بھی بہت اہم ہیں۔ ان علاقوں کے بارے میں بعض معلومات تو صرف ابن بطوطہ کی بدولت ہمارے سامنے آتی ہیں۔

حافظ ابن کثیر

(1324ء----1398ء)

عربی کی شہرہ آفاق تاریخی کتاب "البدایہ والنہایہ" جو 14 جلدوں پر مشتمل ہے اس کے عالمی شہرت یافتہ مصنف امام' حافظ' الحاج' مستند مورخ' مفسر' محدث' صاحب علوم و فضائل عماد الدین ابو الفدا' اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر قریشی دمشقی شافعیؒ کے علاوہ اطراف و اکناف عالم کے علمی حلقوں میں عموماً ابن کثیر کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ابن کثیر کی ولادت "بصرے" کی قلمرو قریہ "جدل" میں 1324ء میں ہوئی۔ والد کا تعلق بصرے اور والدہ ماجدہ کا خاندانی تعلق قریہ "جدل" سے تھا۔ بزرگ عالم اور ماہر انساب عرب شیخ مزیؒ نے بہ لحاظ حسب و نسب اشراف عرب میں شمار کیا ہے اور اس وجہ سے انہیں اکثر و بیشتر عربی کتابوں میں "قرشی" لکھا گیا ہے' بلکہ خود انہوں نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں اپنے والد کے نام کے ساتھ "قرشی" لکھا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ والد کے انتقال کے بعد دمشق چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی والدہ سے قرآن پاک حفظ کیا' عربی زبان کے قواعد صرف و نحو حفظ کئے' نیز کتاب التنبیہ حفظ کی اور اس کی شرح کے لیے علامہ تاج الدین نزاری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور انہی سے اصول فقہ کے منتخاب کی تحصیل کی۔ ابن کثیر نے ابتداء میں اپنے بڑے بھائی کمال الدین عبدالوہاب کی صحبت میں علمی مشاغل جاری رکھے جس کے بعد انہوں نے مزید حصول تعلیم کے لئے دیگر علمائے عصر سے رجوع کیا۔ قرآن پاک انہوں نے 711 ہجری میں حفظ کر لیا تھا اور علم تجوید بھی حاصل کیا۔

ابن کثیرؒ نے فقہ کی تعلیم شیخین یعنی کمال الدین انفراری اور کمال الدین بن قاضی شہید سے حاصل کی اور فروع شافعیہ میں کتاب التنبیہ مصنفہ شیرازی اور مختصرات الحاجب اصول میں پڑھے' نیز حافظ ابو الحجاج مزی کے پاس رہ کر ان کی عظیم تالیف' جو سیر الرجال کے موضوع پر ہے پڑھی۔ اس کتاب کا نام "تہذیب الکمال" ہے جس کے کچھ حصے ابن کثیر نے موصوف کی بیٹی

زینب سے ویسے ابن کثیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور انہوں نے علامہ موصوف سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

حافظ ذہبیؒ نے انہیں "معجم المختص" میں "امام، مفتی، محدث البارع، فقیہ، متفنن، محدث، متقن اور مفسر نقال" لکھا ہے جب کہ ابن حجر وغیرہ نے ابن کثیرؒ کو حافظ ذہبی کے حوالے سے ان جملہ صفات سے متصف کیا ہے۔

مصنفؒ کے ایک شاگرد شہاب الدین حجی کہتے ہیں: "ہم نے انہیں حفاظ میں افضل ترین پایا۔ کیونکہ ہم نے ان سے کتب احادیث کے متن بالکل اس طرح سنے جیسے کوئی بہترین حافظ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے نیز ہمیں ان کی علمی فضیلت اس طرح معلوم ہوئی کہ وہ مطالب و مفاہیم قرآن و حدیث کے استخراج میں کمال رکھتے ہیں اور انہیں اس کی صحت و اسقام پر مکمل عبور حاصل ہے جس کا اعتراف ان کی تقاریر سننے والے جملہ بزرگان علوم دین بھی کرتے ہیں۔ انہیں تمام تفاسیر و تواریخ زبانی یاد ہیں، وہ کسی بات کو بہت کم بھولتے ہیں، حد سے زیادہ سمجھ رکھنے والے فقیہ اور صحیح الذہن عالم ہیں، انہیں کتاب التنبیہ از اول تا آخر حفظ ہے، عربی زبان و آدب پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے، وہ شعر گوئی میں بھی درجہ کمال پر فائز ہیں۔ میں نے اکثر اوقات ان کی صحبت میں گزارے ہیں اور ان کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے۔" (کتاب الدارس از نعیمی)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی صحبت و خدمت میں رہ کر انہوں نے جو عملی، دینی اور اخلاقی تربیت حاصل کی اس نے نہ صرف انہیں علم و فضل میں ایک امتیازی حیثیت بخشی بلکہ اس سے دوسروں نے بھی بعد میں بہت استفادہ کیا۔ وہ اپنی رائے میں استحکام و استقلال رکھتے تھے۔ وہی کچھ فرماتے تھے جن کا ثبوت و دلائل صحیح رکھتے تھے۔ نہ اپنے مذہب و عقائد میں متعصب تھے نہ اس سلسلے میں دوسروں سے تعصب رکھتے تھے، ان کی تفسیر جلیل بڑی عظیم تصنیف ہے جس سے ہم نے ان کے شافعی المذہب ہونے کے بارے میں استفادہ کیا۔ وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خاص انصار میں شامل تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے شیخ یعنی شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی کے مابین وجوہ اختلاف کیا ہیں، لیکن انہوں نے اس معاملے میں سختیوں پر سختیاں جھیلنے کے باوجود شیخ الاسلام سے اپنا فدایانہ و نیاز مندانہ تعلق نہیں توڑا۔

جب ان کی شہرت مصر و دمشق سے دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچ چکی تھی تو اسی زمانے، یعنی 1384ء کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود بیان کرتے ہیں: "ایک نوجوان بلاد تبریز و خراسان سے بظاہر یہ ارادہ لے کر میرے پاس آیا کہ مجھ سے بخاری و مسلم، جامع المسانید اور زمخشری کی کشاف

پڑھے۔ لیکن وہ پہلے درس بخاری میں (غالباً) میرا امتحان لینے کے لیے شریک ہوا جس کے بعد مطمئن ہو کر (دوسرے اسباق میں شرکت کے بعد) بولا: "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں یہ احادیث (آپ کی تشریحات کے ساتھ) اپنے ہم وطنوں کو جا کر بنادوں کیونکہ آپ کے علم و فضل کی شہرت وہاں تک پہنچ چکی ہے"

ان سطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ " جامع المسانید" بھی ابن کثیر کی کتابوں میں شامل ہے اور اس کی شہرت بھی بلاد مشرق تک پہنچی ہوگی۔

ابن کثیر کے اوصاف میں اور ان کے کردار کی خوبیوں میں یہ وصف بطور خاص قابل ذکر ہے کہ ان سے جب بھی کسی ایسے مسئلے میں فتوی طلب کیا گیا جو بظاہر ارادے کے لحاظ سے صرف استفتاء تک محدود تھا لیکن اس میں فتوے کے خواہشمند کی در حقیقت کوئی سیاسی غرض بھی شامل تھی یا انہیں اس میں اس کی کسی ذاتی غرض کا ذرا سا بھی شبہ ہوا تو انہوں نے ہمیشہ اصول فقہ و شریعت کو پیش نظر رکھا' خواہ اس میں فتوی طلب کرنے والا کوئی مقتدر حاکم ہی نہ رہا ہو۔ اور اس کے خلاف منشاء فتوی صادر کرنے میں اس کے بغض و غضب کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو۔

ان کی فتوؤں کے سلسلے میں صاف گوئی و حق پرستی نے انہیں آخر عمر میں بھی اکثر مشکلات و نقصانات سے دوچار کیا۔ ان کا انتقال 1398ء میں ہوا اور تدفین ان کی وصیت کے مطابق شیخ الاسلام کے مقبرے کے پاس دمشق کے باہر مقبرہ ملونیہ میں ہوئی۔

ابن کثیرؒ کی تصانیف و تالیفات بے شمار ہیں جن کی صحیح تعداد بتانا ہمارے لیے ناممکن ہے کیونکہ ان میں سے اکثر اب مفقود ہیں اور اگر وہ کہیں موجود بھی ہیں تو اب تک ان کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ البتہ انہوں نے اپنی کتب تفسیر میں جگہ جگہ حسب موقع ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ بہر حال جو اس وقت دستیاب ہیں ان میں اہم اور مشہور ترین "البدایہ والنہایہ" ہے یہ نہایت نفیس اور مشہور تاریخی کتاب پہلی بار 1368ء میں مصر میں طبع ہوئی۔ اسے خود مصنف نے 14 جلدوں یا حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں تخلیق کائنات سے لے کر اپنی وفات سے 6 سال قبل تک کے تاریخی حالات درج کیے ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں التفسیر' السیرۃ النبویہ' السیرۃ' اختصار علوم الحدیث' جامع المسانید والسنن' التکمیل فی معرفتہ' الثقات والضعفاد المجاہیل اور دیگر کئی رسالے و شرحات شامل ہیں۔

ابن خلدون

(1332ء ---- 1406ء)

تیرھویں اور چودھویں صدی میں عیسائیوں کی فتوحات کے آگے مسلمانوں کا نہ صرف مادی بلکہ ذہنی تمدن بھی پسپا ہو رہا تھا۔ اندلس افریقہ بن گیا تھا اور وہاں بربریوں کی حکومت تھی۔ حتیٰ کہ ان ممالک میں مسلمانوں کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا تھا۔ مسلمانوں کا مغربی تمدن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر زمانے کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا منزل فنا کی طرف جا رہا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ بالکل معدوم ہو جائے اس نے ایک شخص پیدا کر دیا جس نے تمدن کی نشوونما کا قانون مرتب کر کے ایک نئے علم فلسفہ تمدن یا فلسفہ تاریخ کی بنا ڈالی۔ یہ عجیب و غریب شخص ابن خلدون ہے۔ اس کا خاندان اشبیلیہ کا رہنے والا تھا اور طنجہ میں مقیم تھا۔ یہاں 1332ء میں ابن خلدون کی ولادت ہوئی اور وہیں اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے بعد ایک معلم سے جس نے کچھ دن مشرق میں تحصیل علم کی تھی فلسفہ پڑھا۔ علم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اس کا شغل کبھی سرکاری ملازمت اور کبھی سیر و سیاحت رہی۔ مگر ہر حالت میں وہ حکیمانہ نظر سے مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے مختلف بادشاہوں کے ہاں سیکرٹری کی خدمات انجام دیں اور اندلس اور افریقہ کے کئی درباروں میں سفیر رہا۔ چنانچہ وہ اشبیلیہ میں ظالم پیٹر کے مسیحی دربار میں اور دمشق میں تیمور لنگ کے دربار میں بھی گیا۔ 74 سال کی عمر میں اس نے دنیا کا بہت وسیع تجربہ حاصل کیا تھا۔ اپنی سیرت کے اعتبار سے شاید وہ کسی بڑے درجے کا مستحق نہ قرار پائے لیکن جس نے اپنے معاصرین سے کہیں زیادہ اپنی زندگی علوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہو اس میں اگر تھوڑی سی خود پسندی ہو اور وہ ہمہ دانی کا دعوے کرے تو درگذر کے قابل ہے۔

ابن خلدون نے درسی فلسفے کی جہاں تک تحصیل کی اور اس کے جو معنی سمجھے اس سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس فلسفے کے بنے بنائے چوکھٹے میں دنیا کی وہ تصویر نہیں سماتی تھی جو ابن خلدون

کے پیش نظر تھی۔ اس کے خیال میں کائنات اتنی بڑی ہے کہ ہمارا ذہن اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ انسان کے علم میں جتنی ہستیاں اور اشیاء آسکتی ہیں دنیا میں اس سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔ وَ یَخلُقُ مَا لَا تَعلَمُونَ۔ یہ خیال خام ہے کہ محض منطقی اصول کے ذریعے سے انسان حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔ اہل علم کا کام یہ ہے کہ جو چیز تجربے کے معروض کی حیثیت سے دی ہوئی ہے اس پر غور کریں اور انہیں صرف اپنے تجربے پر اکتفا نہیں کرنی چاہیے بلکہ تنقیدی احتیاط کے طور پر نوع انسانی کے مجموعی تجربے پر بھی نظر ڈالنا چاہیے۔

فطری حالت میں نفس انسانی علم سے خالی ہوتا ہے لیکن اسی فطری حالت میں اس میں یہ قوت موجود ہے کہ دیے ہوئے تجربے پر غور کرے اور اس میں تصرف کرے۔ غور و فکر سے اکثر یک بہ یک گویا الہام کے ذریعے سے صحیح راہ ذہن میں آجاتی ہے۔ منطق سے (نیا) علم نہیں حاصل ہوتا بلکہ یہ ہمیں صرف غور و فکر کا طریقہ بتاتی ہے۔ منطق ہمیں دکھاتی ہے کہ ہم کس طرح علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے قوائے ذہنی کو تیز کرتی ہے اور خیال میں صحت پیدا کرتی ہے۔

ابن خلدون ایک سنجیدہ اور محتاط مفکر ہے۔ الکیمیا اور نجوم کی وہ مخالفت کرتا ہے اور اس کے دلائل بیان کرتا ہے۔ فلسفیوں کی پراسرار عقلیت کے مقابلے میں' خواہ سچے عقیدے کی بناء پر خواہ سیاسی مصالح سے' اکثر مذہب اسلام کے سیدھے سادے احکام کی حمایت کرتا ہے۔ لیکن اس کے علمی خیالات پر مذہب کا اثر زیادہ نہیں۔ افلاطون کی "ریاست" فیثا غورثی افلاطونی فلسفہ اور اس کے مشرقی پیش رووں کی تاریخی تصانیف' وہ عناصر ہیں جن کا اثر اس کے خیالات کی نشوونما پر سب چیزوں سے بڑھ کر پڑا ہے۔

ابن خلدون اس دعوے کے ساتھ اٹھتا ہے کہ وہ فلسفے کی ایک نئی شاخ کی بناء ڈالے گا جو ارسطو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ فلسفہ اصل میں اس علم کا نام ہے جس میں موجودات سے بحث کی جاتی ہے اور اسباب و علل کے مطابق ان کی نشوونما دکھائی جاتی ہے لیکن فلسفی عالم مثال اور ذات الٰہی کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ اس احاطے سے خارج ہے۔ یہ لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں جو ثابت نہیں کی جا سکتیں۔ ہم اپنی انسانی دنیا کا بہتر علم رکھتے ہیں اور مشاہدے اور داخلی نفسی تجربے کے ذریعے سے اس کی تھوڑی بہت یقینی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں واقعات کا ثبوت دیا جا سکتا ہے اور ان کے اسباب ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ تاریخ جہاں تک ان شرائط کو پورا کرتی ہے (یعنی جس حد تک تاریخی واقعات اپنے اسباب کی طرف منسوب کیے اور قوانین کے ماتحت لائے جا سکتے ہیں) علم کی حیثیت رکھتی ہے اور فلسفے کا جزو کہلانے کی مستحق ہے۔ اس طرح تاریخ کا علمی تصور واضح

ہو جاتا ہے۔ اسے تجسس تفاخر، رفاہ عام اور نصیحت و موعظت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ علم زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے ماتحت ضرور ہے لیکن بجائے خود اس کا مقصد سوائے واقعات کی تحقیق اور ان میں علت اور معلول کا علاقہ تلاش کرنے کے اور کچھ نہیں۔ یہ کام ناقدانہ نظر سے بلا تعصب کرنے کا ہے۔

پھر فلسفہ تاریخ کا موضوع کیا ہے؟ ابن خلدون جواب دیتا ہے کہ یہ موضوع معاشرتی زندگی ہے یا دوسرے الفاظ میں جماعت یا معاشرے کا مجموعی مادی اور ذہنی تمدن۔ تاریخ کو یہ دکھانا چاہیے کہ لوگ کس طرح محنت کرتے اور اپنی روزی کماتے ہیں۔ وہ کیوں آپس میں لڑتے ہیں اور الگ الگ سرداروں کے ماتحت بڑی بڑی جماعتوں میں مربوط ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں کیوں کر حضری زندگی میں اتنی فرصت ملتی ہے کہ اعلیٰ علوم وفنون کی طرف توجہ کریں؟ کس طرح بدویانہ زندگی رفتہ رفتہ ایک شائستہ تمدن بن جاتی ہے اور پھر کس طرح تمدن دوبارہ معدوم ہو جاتا ہے: ابن خلدون کے خیال میں اجتماعی زندگی حسب ذیل یکے بعد دیگرے اختیار کرتی ہے (1) خانہ بدوشی، (2) قبائل کی زندگی، (3) شہری زندگی۔ معاشرتی زندگی میں سے مقدم یہ مسئلہ ہے کہ خورد و نوش کا سامان کس طرح مہیا کیا جائے۔ معاشرے اور قومیں اپنے طرز معیشت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ ضروریات سے مجبور ہو کر لوگ لڑتے بھڑتے اور لوٹ مار کرتے ہیں اور آخر انہیں ایک سردار کی اطاعت قبول کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح قبیلے کی نشوونما ہوتی ہے اور قبیلہ اپنے قیام کے لیے بستی بساتا ہے جہاں تقسیم محنت اور تعاون سے اسے مرفہ الحالی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا انجام خلاف فطرت آرام طلبی اور عیش پرستی ہے۔ ابتداء میں یہ مرفہ الحالی افراد کی ذاتی محنت سے حاصل ہوئی تھی لیکن تمدن کے اعلیٰ مدارج میں کچھ لوگ دوسروں سے اپنے لیے محنت کراتے ہیں۔ اکثر بجائے تعاون کے ایک طرف سے (یعنی غریبوں کی جانب سے) غلامی اور اطاعت اور دوسری طرف سے (یعنی امیروں کی جانب سے) سخت گیری اور دباؤ سے بھی (معاشرے کی مجموعی) خوشحالی حاصل ہوتی ہے، لیکن اس طرح بعض انسان دوسروں کے پابند ہو جاتے ہیں ضروریات ہمیشہ بڑھتی جاتی ہیں اور محصول کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ سپاہیانہ زندگی کی جگہ طرز معاشرت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس لیے لوگوں میں مدافعت کی قوت باقی نہیں رہتی۔

ہر شعبہ زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ اس وقت کوئی تازہ دم خانہ بدوش صحرائی نسل اٹھتی ہے اور کمزور شہر ٹوٹ پڑتی ہے۔ تب ایک نئی ریاست قائم ہوتی ہے جو پرانے تمدن کی مادی اور ذہنی دولت کو اپنے قبضہ تصرف میں لے آتی ہے۔ پھر وہی اگلا سا قصہ ہوتا ہے۔

اندلس، مغربی افریقہ اور صقلیہ کی گیارھویں سے لے کر پندرھویں صدی تک کی تاریخ ابن خلدون کے نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود ابن خلدون کی تاریخ محض ایک تالیف ہے۔ تفصیلات کے لحاظ سے دیکھیے تو اسے اکثر روایات اور واقعات کو اپنے نظریئے کے مطابق ثابت کرنے میں ناکامی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے مقدمہ میں اکثر گہرے نفسیاتی اور سیاسی مشاہدات ملتے ہیں اور مجموعی حیثیت سے یہ ایک بڑے معرکے کی تصنیف ہے۔

ابن خلدون پہلا شخص تھا جس نے جان بوجھ کر اور محکم دلائل کے ساتھ انسانی فطرت کی نشوونما کو قدرتی اسباب سے سمجھنے کی کوشش کی اور ملکوں کے حالات مثلاً نسل، آب و ہوا، پیداوار اشیاء وغیرہ کا جو اثر انسان کے نفس کی محسوس، معقول ساخت پر پڑتا ہے اس کو واضح کر دیا۔ وہ ہر جگہ مکمل فطری اسباب کی جستجو کرتا ہے۔ ابن خلدون اپنے نئے علم کی داغ بیل ڈالنے کے بعد صرف خاص خاص مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے امید ہے کہ اس کے بعد اور لوگ پیدا ہوں گے جو عقل سلیم اور یقینی علم کے ساتھ اس کی تحقیقات کو جاری رکھیں گے اور نئے مسائل کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوں گے۔

ابن خلدون کی امید پوری ہوئی، لیکن عالم اسلام میں سے نہیں۔ وہ 1406ء میں قاہرہ میں وفات پا گیا۔ پندرھویں صدی کے بعد جو مسلم مدبرین یورپی بادشاہوں اور حکمت عملی کے ماہرین کو زچ کر دیا کرتے تھے ان میں سے اکثر ابن خلدون کے مقلد تھے۔ مشرقی عملی سیاست پر اس کا اثر بہت گہرا تھا۔

مادھولال حسینؒ

(1538ء ------ 1599ء)

پنجابی زبان کے عظیم شاعر لال حسین 1538ء میں پیدا ہوئے۔ زیادہ مستند مورخین کے مطابق آپ کی پیدائش لاہور کے ایک اندرونی محلہ ٹیکسالی دروازہ میں ہوئی۔ کچھ ایک جائے پیدائش پنڈ دادخان ضلع جہلم کے گاؤں ڈھڈی بتاتے ہیں۔ لال حسین کے والد کا نام شیخ عثمان اور پیشہ وذات جولاہا تھی۔ شیخ کی نسبت نو مسلم ہونے کی وجہ سے پڑی۔ بعض کتابوں میں آپ کے دادا کا نام کلجس رائے یا کلس رائے ملتا ہے جس نے فیروز شاہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔ روایت کے مطابق شاہ حسین نے ابتدائی تعلیم ٹیکسالی دروازہ کے باہر ایک مسجد میں بزرگ شیخ حافظ ابوبکر سے حاصل کی، چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک کے سات پارے حفظ کیے اور باقی تمام علم اور دانش لوگوں میں رہ کر ان کے جذبات کا ادراک کرتے ہوئے حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ 36 برس کی عمر میں ایک فاضل بزرگ شیخ سعد اللہ سے درس سنتے ہوئے قرآن مجید کا یہ ارشاد سنا کہ دنیا لہو ولعب کے سوا کچھ نہیں تو آپ مکتب سے بھاگ نکلے اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ یہیں سے قضاؤقدر کے پہلو پر غورو فکر کا آغاز کیا۔ اصل میں جن بزرگوں کے مزار زیارت گاہیں بن جاتی ہیں وہاں جانے والے لوگ اکثر انہیں مذہبی لحاظ سے متقی اور صاحب کرامات بتانے کے لیے بہت سے قصے ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ لیکن شاہ حسین کی فکر اور علامتی و حقیقی کردار اپنے عہد کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کا آئینہ دار ہے۔

1556ء میں مغل بادشاہ اکبر نے دربار دہلی سنبھالا۔ اس دور کا پنجاب کافی برسوں سے سلاطین کی باہمی لڑائی کے باعث افراتفری کا شکار تھا۔ کئی صدیوں تک حملہ آور پشاور اور لاہور سے گذر کر لوٹ مار کرتے ہوئے پنجاب میں آئے اور گئے۔ لال حسین کا شہر لاہور آج بھی کافی حد تک سولھویں صدی جیسا ہی ہے جہاں منڈی کا معاشرہ اور منڈی کی اقدار انسان کو ایک دوسرے اور خود

سے جدا کئے ہوئے تھیں۔ درباروں کی اشرافیہ کسانوں اور کاریگروں کے رزق کی ڈور جب چاہے کھینچتی اور جب چاہتی کاٹ دیتی۔ حکمران طبقے نے سیاست، علم اور دین میں لوگوں کو اپنا محتاج رکھنے کے لیے مذہبی طبقے کو ہمیشہ استعمال کیا۔ یہ مذہبی طبقہ قاضی القضاۃ سے لے کر گلی محلے کی عبادت گاہوں تک شاہانہ اقدار کو سہارا دینے اور پھیلانے کے لیے کوشاں تھا۔ پنڈت اور ملا لوگوں کے دکھ درد سے بے اعتناء ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ انسانی رشتہ قائم نہیں کر سکتے۔ لوگوں کو اپنی ذات میں شامل کرنے کا حوصلہ ان کے پاس نہیں۔ وہ صرف دوسروں کو نصیحت کر سکتے ہیں۔ "ماضی' ملامتیں دیندے' کھرے سیانے راہ بیندے' عشق کی لگے راہ دے نال۔" جس معاشرے میں رزق اگانے والے محنت کش اور ہوں اور کھیتوں کی کمائی سنبھالنے والے کوئی اور تو وہاں سب کچھ دغابازی اور ٹھگی بن جاتا ہے۔ کاشتکار اور کسان اپنی شبانہ روز محنت کی کمائی حکمرانوں کی کوٹھیوں میں جاتے دیکھتے ہیں لیکن اس لوٹ پر رواج' قانون کی مہر ہوتی ہے' فوجیں اور پہرے داریاں ہوتی ہیں۔ لال حسین سولہویں صدی کے اہل لاہور کا ترجمان ہے۔ وہ ان کی زبان بولتا ہے جو خود انہوں نے بھی سننا چھوڑ دی ہے۔ اسی دور میں ایک دلا بھٹی بھی ہے جسے استعارۃً لال حسین کا انتقامی روپ قرار دیا جاسکتا ہے۔ دلا بھٹی مہاجنوں مہاراجوں کے گھر لوٹ کر لوگوں کی لوٹی ہوئی دولت واپس چھینتا ہے تو لال حسین انہیں اپنے آپ کی شناخت لوٹاتا ہے۔

لال حسین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو رمز یا استعارے میں چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا اندر اور باہر یکساں ایماندار ہے۔ حکمرانوں کی قائم کردہ دنیا کی بے ثباتی اور دغابازی کا اعلان اس کے کلام میں نمایاں ہے: کہ جنہوں نے لاکھ کروڑ جمع کیا وہ بھی موت سے نہیں بچیں گے' دنیا چار دن کی ہے' اس دنیا کی چمک دمک شبنم کے موتی جیسی ہے' جھوٹا اور فریبی ہی جھوٹ اور فریب پر مان کرتا ہے' دولت دنیا' مال خزینہ قبر میں ساتھ نہیں جائے گا' بقاء صرف سائیں (خدا) کے نام کو حاصل ہے' تمہارے اندر جھوٹ ہی جھوٹ ہے جس کی صفائی کرنے پر تمہاری توجہ نہیں' خوراکیں کھانا اور پوشاکیں پہننا موت کے بکرے کو پالنے جیسا ہے' تمہیں قبر بلا رہی ہے کہ اب گھر آجاؤ' اونچے اونچے محل بنانے والو قبر تمہارا گھر ہے' تمہیں مرنے کی حقیقت کیوں بھول گئی' موت اسے مٹ رہی ہے' کبھی اپنے اندر نگاہ ڈالو...... المختصر "دغاباز سنسار تے گوشہ پکڑ حسین۔"

نجم حسین سید کہتے ہیں کہ لال حسین صفر بن کر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی دوسروں کو صفر بن کر رہتے دیکھ سکتا ہے۔ وہ محض سہنا نہیں بلکہ جینا اور "ہونا" چاہتا ہے۔ وہ انسانوں کی ہڈیوں میں

دوبارہ حیات کی گرمائش کا خواہشمند ہے۔ لوگوں کو اپنے آپ (ہیر) سے جدا کر دینے والے حکمران (کھیڑے) لال حسین (رانجھے) کو بغاوت سے نہ روک سکے۔ اس نے پرچھائیوں کی دنیا سے تعلق ناطہ توڑ لیا۔ اسے کسی چیز کی ملکیت حاصل کرنے کا شوق نہیں۔ یہاں تک کہ اپنے کپڑے بھی اتار پھینکے۔ یہ تیاگ ذاتی ملکیت کے دیوانوں کا توڑ ہے۔ اس کی ہستی میں جھوٹوں کو اپنا عدم نظر آتا ہے اس لیے وہ اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ کھیڑا شاہی میں عورت اور مرد کے رشتے بھی کاغذی اور جھوٹے ہیں۔ اگر کاروبار منافع بخش ہے تو سیکس کی نقلی کھیل بھی جاری رہتی ہے' اگر کاروبار میں ہار ہوئی تو یہ کھیل بھی ختم۔ کھیڑوں کے نمائندے قدرت کے قوانین کو توڑتے ہیں۔ لہذا لال حسین ان کی تحقیر کرتا ہے۔ اس کا عشق لوٹ کھسوٹ اور زور زبردستی والے سماج میں بے یارومددگار ہو چکی عورت کے لیے نہیں۔ عورت ان کھیڑا شاہی اصولوں کو سنبھالنے اور لوگوں کو ان کے سامنے جھکانے کے لیے واسطے کا کام کرتی ہے۔ لال حسین کی نظر کسی پر پڑی بھی تو ہندو لڑکے مادھو پر۔ وہ لڑکا بھی سب کچھ تیاگ کر لال حسین پر فدا ہونے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مادھو کے عشق میں دو رمزیں ہیں: اول' یہ کہ کھیڑا شاہی میں سیکس کے سرچشمے سوکھ گئے ہیں۔ دوم' یہ عشق دکھاتا ہے کہ اصل رشتہ کیا ہوتا اور کیسے مردہ روحوں میں جان ڈالتا ہے۔ کھیڑوں کی بستی میں لال حسین سوکھی شاخیں گرانے والی سرخ آندھی بھی ہے اور نئی کونپلوں کو شگفتگی بخشنے والی باد نسیم بھی۔ وہ نئی زندگی کی پکار ہے۔ اس کا مستی میں ناچنا کھیڑا شاہی کے قواعد و ضوابط کی توہین ہے۔ لال حسین ہماری رانجھاہن جانے کی تڑپ کا نام ہے۔ وہ ہماری تہذیب اور معاشرے کی دغابازیوں کا بھانڈا بیچ چوراہے لا پھوڑتا ہے۔

لال حسین کے لیے تحصیل ذات ہی خدا کو پانے کا وسیلہ ہے جس کی خاطر فکر کی چھاننی اور آگہی کے جھاڑو سے تکبر اور غرور کی صفائی کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ خدا کی نظر کرم ہو جائے تو کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ تن طنبور اور رگیں تاریں بن جائیں تو سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لال حسین حکمرانوں کے خدا کو بھی نہیں مانتا جو ان کا حامی و مددگار ہے۔ اس کا خدا ہستی کے ہر ہر گوشہ میں جلوہ گر ہے: "اندر توں باہر توں ہیں روم روم وچ توں۔" بیشتر وحدت الوجودی صوفیوں کی طرح لال حسین بھی اپنی دھرتی کی قدیم فلسفیانہ روایت سے بندھا ہوا ہے۔ اس نے موت اور فنا کے حوالے سے عمل کی دعوت دی۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ وقت کو کھیل کود یعنی دنیاوی لذائذ میں گذارنا احمقوں کا کام ہے۔ اس دنیا کی مدت چار دن ہی سہی لیکن عقلمند لوگ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کی کافی میں عمر خیام کا رنگ آجاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ چار دن کی جوانی کے مزے لوٹ لو' آخر تو مٹی میں ہی سمانا ہے۔

لال حسین عقیدے کے اعتبار سے اگرچہ مسلمان سہی لیکن اس نے اپنے عہد اور گرد و پیش میں موجود دیگر عقائد کو بھی اپنی سوچ اور شاعری کا حصہ بنا کر ہمہ گیریت کا اظہار کیا۔ اسی لیے روح عصر ان کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ہندوستان آکر اسلام نے بھی ایک نیا اور مختلف رنگ اختیار کیا۔ لال حسین بھی صرف دو پشت پہلے کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے اندر اپنی دھرتی اور روایات سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ وہ جہاں ہندو یوگیوں اور سادھوؤں کی طرح زندگی گذارتا ہے وہاں اپنی کافیوں میں بھی اس اختلاط کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیگر صوفی شعراء کی طرح اس نے بھی بڑی آزادی سے بھگتی تحریک کی زبان استعمال کی۔ اس کے کلام میں یم (موت کا دیوتا) کنت' شوہ' پیا' پریتم' سادھ' (طمع) کام (سیکس) کرودھ (غضب) اہنکار (غرور) سنسار' آواگون' جیسے لفظ جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ بھگتی تحریک کا آغاز دکن سے ہوا تھا۔ پندرھویں صدی میں بڑے بڑے شاعر اور بھگت پیدا ہوئے جنہوں نے اس تحریک کو سارے ملک میں پھیلا دیا۔ شاعری پر اس تحریک کا وہی اثر ہوا جو تصوف کا فارسی شاعری پر ہوا تھا۔ اس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے : ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت کی فضاء قائم کرنا' (2) ظاہری پوجا پاٹھ کی بجائے دل کو لالچ' نفرت' حسد اور غصے سے پاک کرنا' (3) لوگوں کی زبان کو استعمال کرنا اور فروغ دینا' (4) ذات پات کی تقسیم کی مذمت کر کے نیچ ذاتوں کو ان کا انسانی رتبہ واپس دلانا۔ اس دانشورانہ تحریک میں شامل بہت سے شعرا صرف مابعد الطبیعیاتی مسائل میں پھنس کر رہ گئے۔ انہوں نے دنیا کی عارضی زندگی کو در خور اعتناء نہ سمجھا۔ لیکن لال حسین فکری لحاظ سے اس تحریک کا حصہ ہونے کے باوجود بہت زیادہ عملی اور انقلابی خیالات پیش کرتا ہے۔ "شمع دے پروانے وانگوں جلدیاں انگ نہ موڑیئے ---- ہاتھی عشق' مہاوت رانجھا' انکس دے دے ہوڑیئے۔"

کہتے ہیں کہ جس وقت باغی دلا بھٹی کو پھانسی دی جا رہی تھی تو مجمع میں لال حسین بھی موجود تھا۔ اس کی سوچ کا جسم اس کے سامنے موت کو گلے لگا رہا تھا۔ پھانسی کا انتظام کرنے والا ملک علی کوتوال ایک عرصے سے لال حسین کی تلاش میں تھا۔ بھیڑ میں اسے دیکھ کر وہ دے بھٹی کو بھول گیا۔ اس نے فوراً پیادوں کو حکم دیا کہ لال حسین کو زنجیریں ڈال دی جائیں لیکن زنجیریں اس کے بدن پر ٹھہرتی ہی نہ تھیں۔ یہ رمز نشاندہی کرتی ہے کہ اس لمحے تاریخی لال حسین ماورائی لال حسین بن گیا۔ وہ دلے بھٹی کی موت سے ماورا ہے' کیونکہ وہ اپنے عہد کے لوگوں کا سچ ہے۔ اکبر نے ملک علی کوتوال کو حکم دے رکھا تھا کہ دلا بھٹی پھانسی کے وقت جو کچھ بھی کہے حرف بہ حرف اسے آکر بتائے۔ کوتوال نے دلا بھٹی کی تمام گالیاں آسنائیں۔ اکبر نے غصے میں آکر حکم دیا کہ ملک

علی کے سفرہ میں میخیں ٹھونک کر اسے مار دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ یہ لال حسین ہی کی کرامت تھی اکبر نے بھی جب لال حسین کے بارے میں سنا تو اسے اپنے پاس بلو لیا۔ وہ اکبر کے حضور پہنچا تو شراب کی بوتل ہاتھ میں تھی۔ اکبر نے کہا "اے فقیر یہ کیا معاملہ ہے غیر شرع ہونا اچھا نہیں ہوتا۔" یہ بات سن کر لال حسین نے ایک جام اس بوتل سے بھر کر اسے دیا اور کہا" دیکھ اس میں کیا ہے۔" اکبر نے دیکھا تو اس میں دودھ تھا۔ اس نے امتحان کی غرض سے خود شراب کی بوتل منگوا کر لال حسین کو دی اور آٹھ بار جام بھرا لیکن ہر مرتبہ کوئی مختلف میٹھا مشروب نکلا۔ حیرت زدہ اکبر نے مزید کرامت کا مطالبہ کیا۔ وہ لال حسین کو ایک حجرہ میں بند کر کے محل کے اندر گیا تو لال حسین کو ایک کمرہ میں اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھے دیکھا حجرہ میں آکر دیکھا۔ تو حسین وہیں موجود تھا۔ لال حسین نے کہا "" ہم کو جانے دے ورنہ ایک دم تیری سلطنت برباد ہو جائے گی۔ " تشبیہاتی طور پر دیکھا جائے تو یہ لال حسین ماورائی ہی تھا۔

لال حسین کے دور میں لاہور کا قاضی القضاۃ مخدوم الملک تھا۔ اس نے جب سنا کہ لال حسین نامی ایک شخص داڑھی مونچھ تراش کر نشے میں مست قوالوں کے ساتھ شہر میں ناچتا پھرتا ہے (تو تعزیر کے ارادے سے آن پہنچا۔ لال حسین نے اس کے گھوڑے کی لگامیں پکڑ کر کھڑا کر لیا اور کہا: " قاضی صاحب ارکان مسلمانی کتنے ہیں؟" جواب ملا "توحید' حج' زکوۃ' نماز' روزہ۔" لال حسین نے کہا"" توحید میں ہم دونوں شریک ہیں۔ حج اور زکوۃ کو تم نے ترک کر دیا اور نماز روزہ میں نے۔ تو پھر میں ہی لائق تعزیر کیوں ہوں؟ تم کیوں نہیں؟" یہ سن کر قاضی خاموشی سے واپس چلا گیا۔

27 سالہ ملامتی زندگی گذارنے کے بعد لال حسین نے 63 سال کی عمر میں 1599ء میں وفات پائی اور شاہدرہ میں دفن کیا گیا۔ 13 سال بعد راوی میں سیلاب آیا اور قبر تباہ ہو گئی تو وہاں سے نکال کر بابو پورہ (باغبانپورہ) لاہور میں دفن کر دیا گیا۔ مادھو کا مزار بھی ساتھ ہی ہے۔ آج لوگ اسے مادھو لال حسین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لال حسین کے مزار پر آج بھی میلہ چراغاں لگتا ہے لیکن اس کی رونق وہ نہیں رہی جو ڈیڑھ سو سال قبل نور احمد چشتی (1829ء تا 1867ء) نے "تحقیقات چشتی" میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میلہ چراغاں کا تو یہ حال ہے کہ ہزاروں لوگ میل ہا میل پیدل چل کر زیارت کرنے آتے ہیں اور شالامار باغ اس قدر وسیع ہونے کے باوجود قدم رکھنے کو جگہ نہیں ملتی...... امرتسر سے تقریباً 70 ہزار افراد بذریعہ ریل آتے ہیں۔ قلم کا کیا یارا کہ اس میلے کا حال تفصیل سے لکھے...... "لاہور کے معمر افراد بیان کرتے ہیں کہ تیس چالیس سال پہلے تک

میلہ چراغاں یہاں کا سب سے بڑا تہوار تھا۔ ظاہر ہے کہ "کھیڑا شاہی" کو لال حسین کسی بھی طرح عزیز یا قابل برداشت نہیں ہو سکتا۔ لہذا انہوں نے میلہ چراغاں کے مقابلہ میں ایسے بزرگوں کے عروس کو اپنا لیا جو ان پر تنقید نہیں کرتے اور نہ ہی لوگوں کے حق کی بات کرتے ہیں۔ آج میلہ چراغاں سکڑتے سکڑتے ایک گلی کی بھیڑ بن کر رہ گیا ہے۔

ملا صدرالدین شیرازیؒ

(1571ء-----1641ء)

صدرالدین شیرازی، المشہور "ملا صدرا" 1571ء میں ایک ایرانی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی شاہ عباس اول کے دور کے ساتھ ہم وقوع تھی، جس کے دور حکومت میں شیعہ ازم اور فقہ کی ترویج، فلسفہ اور الہیات ایران میں اپنے نکتہ عروج پر پہنچے۔ اس نے خود کو عقلی علوم کے مطالعہ میں منہمک کر لیا تھا۔ خاص طور پر ابن سینا، سہروردی اور نوفلاطونی (بالخصوص ابن عربی) فلسفے پڑھے۔ فلسفہ میں اس کے زبردست مطالعہ نے کچھ راسخ العقیدہ فقہاء کو خوف میں مبتلا کر دیا، جو زیادہ تر سیاسی قوت کے مالک تھے اور فلسفہ کو کافرانہ کام سمجھتے تھے۔ فلسفہ میں سنجیدہ کوششوں سے راسخ العقیدہ مذہبی افراد کو ہونے والی پریشانی کی وجہ سے ملا صدرا کو اصفہان چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ شہر قم کے نواح میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں چلا گیا۔ جلاوطنی کے دوران ملا صدرا نے بارہ برس غور و فکر اور مرتاضانہ مشقوں میں گزارے، جنہوں نے اس کی عقلی بصیرت کو مضبوط تر کر دیا۔

اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں ملا صدرا کئی ایک وجوہات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ اول، اس کی "الاسفار الاربعہ" (نفس کے چار سفر) تاریخ فلسفہ اسلام کا خلاصہ ہے۔ اپنے پیشروؤں کے خیالات بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے بعد ملا صدرا ان کے فلسفیانہ تصورات پر تنقید اور تحقیق پیش کرتا ہے۔ دوم، ملا صدرا نے مکتبہ اصفہان کو مجتمع کیا، جس کو اس کے استاد میر دماد نے قائم کیا تھا۔ ایرانی فلسفہ اسلام کی تاریخ میں یہ فلسفیانہ مکتبہ ایک اہم موڑ تھا اور اس نے اسلامی فلسفہ کے کچھ عظیم اساتذہ پیدا کئے۔ ملا صدرا جیسے معلمین سے کمال یافتہ مکتبہ اصفہان کی فلسفیانہ روایت "ماورائی حکمت" کے طور پر مشہور ہوئی، یعنی استدلالیت، عقلی وجدان اور عملی حکمت کی مصالحت۔

ملا صدرا نے تین مختلف قسم کی کتابیں لکھیں: تفسیر قرآن و حدیث، مناظرانہ کتابیں اور فلسفیانہ رسائل۔ مختلف قرآنی سورتوں (مثلاً نور) پر اس کی تفسیریں اس کے اپنے باطنی مطالعہ کی

علامت ہیں۔

ملا صدرا نے دینیاتی متنوں' ابن سینا کی مابعد الطبیعیات اور ابن عربی کی صوفیانہ فکر میں مصالحت پیدا کی۔ نتیجتاً حکمت کی ایک روایت پیدا ہوئی جس نے دینی عالموں کے روایتی خیالات' فلسفیوں کی استدلالی منطق اور صوفیوں کے براہ راست تجربہ کو آپس میں مربوط کیا۔ ملا صدرا خاص طور پر دو شخصیات سے متاثر تھا ایک ابن سینا' نفس کا فلسفی' اور دوسری سہروردی' نور کا فلسفی اور اسلامی فلسفہ میں اشراقی مکتبہ کا بانی۔ ملا صدرا نے سہروردی کی وجودیات میں کچھ بنیادی تشکیلات نو کرتے ہوئے ابن سینا کے فلسفہ کی سہروردی کے نکتہ نظر سے تشریح کی۔

دینیات' جو ملا صدرا کے دور تک کافی ترقی کر چکی تھی' بالکل فلسفیوں والے ذخیرہ الفاظ پر ہی انحصار کرتی تھی۔ ملا صدرا نے فلسفیوں اور دینی عالموں کے ہاں ایک ہی جیسی تکنیکی اصطلاحات کے استعمال کی یکسانیت اور ان کے طریق ہائے کار پر غور کیا۔ جس دوسرے نکتے کی جانب ملا صدرا نے اشارہ کیا وہ یہ ہے کہ اسلامی دینیات نے بطور عقلی سائنسوں کی ایک خود مختار شاخ کی بجائے ایک ایسے قاعدے کے تحت ترقی کی جس کا تعلق بنیادی طور پر فقہ (اسلامی قانون) کے ساتھ ہے۔

"کلام" کے بارے میں اپنے اسلوب میں ملا صدرا ایک طرف منطق طریقہ کار کے خلاف ہے جبکہ دوسری جانب دینی عالموں کے معروضات حق کی توثیق کرتے ہوئے دورخی رویہ اختیار کرتا ہے۔ ملا صدرا یہ دکھاتا ہے کہ دینیاتی دلائل اپنے مدعائی نتائج ثابت کرنے میں کیسے اور کیوں ناکام ہیں' اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بارے میں بھی پوری طرح محتاط ہے کہ کہیں دینیاتی عقائد کا جواز چیلنج نہ ہو جائے۔ ابدیت بمقابلہ زمانی تخلیق اور جسمانی معادیات کے مسئلہ پر اپنی تصنیف میں ملا صدرا فلسفیوں کے کچھ متنازعہ نکتہ ہائے نظر کو دینی عالموں کے خیالات سے بہت قریب لے آیا۔

ملا صدرا اسلامی صوفیوں سے بہت زیادہ متاثر تھا' تصوف کی نظری اور عملی دونوں جہتوں سے۔ نظری تصوف کے حوالے سے عظیم اندلسی صوفی ابن عربی نے اسے زبردست متاثر کیا۔ درحقیقت بہت سی تکنیکی اصطلاحات جو ملا صدرا نے استعمال کیں انہیں ابن عربی اور اسلامی عرفانیت پر اس کی ضخیم شرح سے مستعار لیا۔ ملا صدرا نے بالخصوص اس قسم کے معاملات پر ابن عربی کے تاثرات کو خدا کے تجربے کی انسانی تفہیم اور اس تفہیم کے ساتھ وابستہ مختلف مسائل کو بالکل بصیرت افروز جانا۔

ملا صدرا نے علم کو دو قسموں میں تقسیم کیا :...... جو حسیاتی ادراک یا ہدایت سے حاصل

ہوتا ہے : اور وہ جو ذہنی بصیرت سے سیکھا جاتا ہے۔ ذہنی بصیرت کا وسیلہ یکسوئی اور عدم دریافت کی خصوصیت رکھتا ہے۔ حسیات یا ہدایت کے ذریعہ سیکھا جانے والا علم خود بھی علم کی روایتی تقسیم، یعنی نظری اور عملی علم میں تقسیم ہے۔ نظری علوم منطق، فطرتی فلسفہ اور مابعد الطبیعیات پر مشتمل ہیں۔ جبکہ عملی حکمت میں اخلاقیات، سیاسیات اور معاشیات شامل ہیں۔

ملا صدرا علم کے ایک توحیدی نظریئے پر عمل کرتے ہوئے علوم کی ذیلی تقسیم کرتا ہے، جو علم کی مختلف شاخوں کی کثرت کے باوجود صدری فلسفہ کے دل میں موجود وحدت علم کی فہم تک لے جاتی ہے۔ علم (حکمہ) کا یہ نکتہ نظر تفہیم کے مختلف واسطوں (بشمول عملی حکمت) کو یکجا کرتا ہے، کیونکہ ملا صدرا کے نزدیک علم نہ صرف اطلاعی بلکہ منقلب کرنے والا (Transforma-tive) بھی ہے۔

اسلامی فلسفہ کے بارے میں ملا صدرا کے انسائیکلو پیڈیائی علم نے اسے اپنے پیشروؤں کے فلسفیانہ خیالات کا بصیرت افروز تجزیہ کرنے کی بنیادیں مہیا کیں۔ اس نے اسلامی فلسفہ کے میدان میں تین اہم کام سرانجام دیئے : 1۔ "وجود" پر اس کی تفسیر جو نظریہ وحدت الوجود تک لے جاتی ہے، 2۔ حرکت میں تغیر و قوع پذیر ہونے سے متعلق اس کا بیان جو "معقول حرکت" کہلاتا ہے، اور 3۔ عالم، علم کے معروض اور خود علم کی وحدت کا نظریہ۔

ملا صدرا کہتا ہے کہ "وجود" موجود شئے کا بنیادی اور ابتدائی پہلو ہے اور ماہیات (Es-sences) وجود کے اتفاقات ہیں۔ مزید برآں، وجود یا ہست (جو ملا صدرا سمیت زیادہ تر اسلامی فلسفیوں کے لئے بالکل ایک ہیں) ایک آزاد وجود رکھتا ہے، جبکہ ماہیات منحصر بالوجود ہیں اور اس لئے اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

نقوش اول کے افلاطونی نظریہ کو ملا صدرا "ارباب الانواع" کے طور پر قبول کرتا ہے۔ اس کے مطابق طبیعی دنیا نے وجود کی ایک سطح کے طور پر اولین نمونے کی دنیا سے اپنے خدوخال اخذ کیے۔ طبیعی دنیا کی اپنے اولین نمونے کی دنیا سے علیحدگی "قاعدہ امکان الاشرف" تک لے گئی۔ یہی اصول ملا صدرا کی شہرت کا باعث ہے۔ اس کے مطابق طبیعی دنیا میں غیر کاملیت سے کاملیت کی جانب سفر کرنے والی ہر چیز کا غیر طبیعی دنیا میں ایک ہمہ گیر متقابل موجود ہے۔

اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں ملا صدرا کی شخصیت اس لحاظ سے بے نظیر ہے کہ وہ "الحرکت الجوہریہ" یعنی جوہر میں حرکت کی موجودگی کی بات کرتا ہے۔ یہ ابن سینا سے روگردانی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں جوہر حرکت میں مسلسل تغیر اور شئے کی عینیت تشکیل دینے والی خصوصیات کے

ضیاع تک لے جاتی ہے۔

ملا صدرا نے اپنے نظریہ "الحرکت الجوہریہ" کی حمایت میں کئی ایک دلائل استعمال کیے۔ جب سیب پک جاتا ہے تو عارضی خاصے ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ سیب کا جوہر بھی لازماً تبدیل ہو جاتا ہے۔ ملا صدرا کہتا ہے کہ دراصل جب کوئی مخفی ہیئت حقیقت کا روپ اختیار کرتی ہے تو یہ خاصیت کے ساتھ ساتھ جوہر میں بھی تبدیلی کا اشارہ ہوتا ہے۔ ملا صدرا کے مطابق خواص میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کے لئے جوہر میں بھی اسی مطابقت سے تبدیلی آنا لازمی ہوتا ہے' کیونکہ خاصیات خواص کے لئے اپنے جوہر پر انحصار کرتی ہیں۔ چنانچہ سیب میں تبدیلی تخلیقی ضابطے کی مثال ہے اور یہ متعدد نکات کی جانب اشارہ کرتی ہے: اول' دنیا مسلسل رواں دواں دریا کی مانند ہے۔ دوم' تبدیلی ضرورت کے تحت واقع ہوتی ہے' اور خدا کے سوا کچھ بھی پائیدار نہیں۔ سوم' یہ تبدیلی کائنات میں ایک اتفاق نہیں بلکہ اس کی انتہائی فطرت ہے۔ ملا صدرا کے مطابق یہ تبدیلی کائنات کو ہست کی جانب حرکت دینے والی قوت کے طور پر کام کرتی ہے۔ ہست ہونا بنیادی طور پر ایک روحانی سفر ہے' جس کی تمنا تمام موجودات کرتی ہیں۔ نظریہ زماں پر روشنی ڈالنے کے لئے ملا صدرا یہی نظریہ "الحرکت الجوہریہ" استعمال کرتا ہے۔ اس کے خیال میں' مثلاً ارسطو کے لئے' زماں مقدار حرکت ہے' جبکہ ملا صدرا کے لئے اس سے علاوہ مقدار میں تبدیلی جوہر میں تبدیلی کی مقدار ہے۔ زماں کو محض مقداری نکتہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ یہ ایک وجودیاتی پہلو بھی رکھتا ہے۔ جوہر میں حرکت کا ملیت کا پیمانہ بھی ہے' چنانچہ یہ ایک مقصد اور سمت رکھتا ہے اور اپنے ساتھ احساس لزوم لئے ہوئے ہے۔

عالم' معروض علم اور علم کے درمیان وحدت ملا صدرا کے فلسفہ کی گہرائیوں میں سرایت پذیر ہے۔ چونکہ خدا کی ماہیئت اور وجود عین ہیں اور تمام چیزوں کا ظہور خدا میں سے ہوا' اس لئے وہ بیک وقت عالم' معلوم اور علم ہے۔ لہذا کسی بھی شخص کو بالکل ایسا رتبہ پانے کے لئے خدا کے ساتھ وحدت حاصل کرنا ہوگی اس کے برعکس بھی درست ہے: وحدت کا علم حاصل کرنے والا اپنے انتہائی وجود میں عالم' معلوم اور علم ہے یعنی وحدت کا علم حاصل کرتے ہوئے اسے وحدت مل جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ملا صدرا کی "الاسفار الاربعہ" میں خدا سے علیحدگی سے لے کر دوبارہ وحدت حاصل کرنے تک نفس کے سفر کی تشبیہ دی گئی۔

ملا صدری کا فلسفہ ایک دور تنزل میں سے گزرا اور اٹھارہویں وانیسویں صدی کے دوران ایران میں سبزواری' علی غوری' احسائی اور نونوزی خاندان جیسی قابل ذکر شخصیات نے اسے

دوبارہ زندہ کیا۔ ملا صدرا اور اس کے طالب علموں کی تعلیمات کو برصغیر پاک و ہند کے اسلامی فلسفیوں نے قبول کر لیا اور اس کی کچھ کتابیں روایتی مکاتب کی باضابطہ کتابیں بن گئیں۔ ایران اور اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں آج کا اسلامی فلسفہ ابھی تک ملا صدرا اور اس کی تعلیمات سے متاثر ہے۔

شیخ احمد سرہندیؒ

(1564ء ---- 1624ء)

شیخ احمد سرہندی بنیادی طور پر صوفی مفکر اور گرو تھے۔ اہم صوفی تصورات کی تشکیل نو میں ان کی کارگزاریوں پر انہیں "مجدد الف ثانی" کا لقب دیا گیا' کیونکہ ان کی زندگی میں ہی اسلامی کیلنڈر کا دوسرا ہزار شروع ہوا تھا۔ حضرت محمد ﷺ سے منسوب ایک روایت کے مطابق ہر صدی کے آغاز میں مذہب کو نیا کرنے کے لیے ایک عظیم مسلمان رہنما پیدا ہو گا۔ اپنی سوچ میں سرہندی نے اس "مجدد" کے کردار کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا' اور آج بھی وہ مجدد کے طور پر مشہور ہیں۔ جب کہ جس نقشبندی سلسلے کی انہوں نے بنیاد رکھی' وہ "مجددی" کہلاتا ہے۔ انجام کار اس سلسلے کے اثرات ہندوستان سے باہر عرب' مشرق وسطیٰ' وسطی ایشیاء' ترکی اور دیگر خطوں تک پھیل گئے اور عصر حاضر کی مسلم دنیا میں یہ بدستور اہم ترین روحانی اور کہیں کہیں سیاسی قوتیں ہیں۔

محققین عموماً سرہندی کی سوچ میں دو مراحل کی بات کرتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں اسلامی عقلی روایت میں تربیت اور اہم صوفی سلسلوں (چشتی اور قادری) کی ابتداء شامل تھی' جس کے بعد انہوں نے مغل شہنشاہ اکبر کے دربار میں اسلامی مفکر کے طور پر ایک باعزت مقام حاصل کیا۔

ان کی زندگی کا دوسرا دور 1598 عیسوی کے دوران شروع ہوا جب وہ دہلی میں خواجہ باقی باللہ سے ملے۔ افغانستان سے آنیوالا یہ نقشبندی صوفی کچھ ہی عرصہ پہلے ہندوستان آیا تھا۔ اس عالم استاد کی سرکردگی میں سرہندی نے روحانی شعور کی ارفع حالتیں حاصل کیں' جس نے انہیں اسلامی روایت کی راسخ العقیدہ تقلید کو عارفانہ تجربہ کے ساتھ ملانے کی ضرورت پر قائل کیا۔

سرہندی نقشبندی سلسلہ میں ایک نمایاں روحانی استاد بن گئے اور انہوں نے اسلامی تصوف' الٰہیات اور اپنے روحانی تجربہ کے بارے میں کافی کچھ لکھا۔ ان تحریروں میں کچھ مخصوص مقامات پر وہ مذہبی حکمت عملیوں پر رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں جو ان کے خیال میں مغل ریاست کو

اپنانا چاہیے تھیں۔

محققین سرہندی کی فکر میں سیاسی آراء نمایاں ہونے کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ سرہندی کی تصنیفات' ان کے معاصرین اور بعد میں آنیوالوں کے رد عمل کی بنیاد پر کی جانیوالی انتہائی حالیہ مغربی تحقیقات یہ نتیجہ پیش کرتی ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک صوفی نظریات دان تھے۔ تاہم' جنوبی ایشیا میں آہستہ آہستہ ان کی شخصیت ایسی بن گئی کہ انہیں ایسے ابتدائی مسلمان قوم پرست کے طور پر پیش کیا جانے لگا جس نے مغل دربار کے ملے جلے مذہبی رجحانات کو چیلنج کیا۔ اس نکتہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے یہ امر پیش کیا جاتا ہے کہ انہیں عوامی سطح پر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور 1619 عیسوی میں سال بھر کے لیے قید بھی رکھا گیا تھا۔ آخر کار شہنشاہ جہانگیر نے انہیں قدر و منزلت سے نوازا۔ سرہندی کے خیالات میں صوفی عنصر پر زور دینے والے کہتے ہیں کہ شہنشاہ جہانگیر نے سرہندی کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں ان کی جانب سے کسی مخصوص سیاسی تجویز پر اعتراض کرنے کی بجائے ان کی خود نمائی اور نظریات کی شکایت کی۔

قید سے چھوٹنے کے بعد وہ واپس سرہند چلے گئے اور باقی ساری زندگی کے دوران ادبی اور روحانی تعلیمات کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے بیٹوں' بالخصوص محمد معصوم (وفات 1668ء) اور بعد میں آنیوالوں نے "مجددی" صوفی سلسلہ کو جاری رکھا اور اپنے عارف مورث اعلیٰ کی روایت میں مکتوبات کے اپنے مجموعے اور عملی صوفی رہنما کتب چھوڑیں۔

سرہندی کا اہم ترین ادبی ورثہ بلاشبہ ان کی "مکتوبات" پر مشتمل تین جلدیں ہیں جن میں سے زیادہ تر فارسی میں تحریر کردہ ہیں۔ البتہ کچھ پورے کے پورے خطوط اور کئی ایک کے حصے عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ 534 خطوط تین شاگردوں نے ان کی زندگی کے دوران ہی اکٹھے کیے تھے۔ تقریباً دو تہائی خطوط ان سے پوچھے گئے سوالوں کے جوابات کی صورت میں ہیں۔ تقریباً نصف خطوط بیس سے کم سطروں کے ہیں۔ تاہم کچھ ایک بیس صفحات پر محیط بھی ہیں۔ ذاتی خطوط کی شکل میں' لیکن قارئین کی وسیع تعداد کو ذہن میں رکھ کر اپنے اہم خیالات تحریر کرنے کی روایت اس تصوف کے دور میں عدیم المثال ہے۔ جنوبی ایشیا کے اندر اور باہر اس کی مثال نہیں ملتی۔ بہت سے ایسے مجموعے موجود ہیں۔ ان خطوط کو احتیاط کے ساتھ پڑھنا ہی سب سے بڑا چیلنج ہے' کیونکہ ان میں پیش کیے گئے اصول موضوع کے اعتبار سے بے ترتیب یا بے قاعدہ انداز میں ہیں۔

مکتوبات میں زیر بحث لائے گئے اہم نکات میں "وحدت الشہود" عملی تصوف اور نبی اور ولی کے بالترتیب رتبے کے نکات بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک موضوع پر آپ سرہندی کی

ساری فکر میں اندرونی ذات اور خارجی دنیا دونوں کی اصلاح میں انسانی کارگزاریوں کی اہمیت اور مقصد کی توثیق کرنے کے فاعل مفہوم میں ایک انسانیت پسندانہ عامل کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

وحدت الشہود کا تصور بنیادی طور پر خالق اور مخلوق کے درمیان رشتے سے متعلق ہے۔ تصوف میں بعد کے ادوار میں شدید طور پر زیر بحث لائے گئے معاملات میں ایک معاملہ متصوفانہ فکر میں وحدت اور دوئی کے درمیان تناؤ تھا۔ تصوف کے یہ فلسفیانہ عقائد بہت مجرد علامتوں اور طریقوں میں بیان کیے گئے۔ اس لیے صوفی فلسفی ابن عربی (وفات 1240ء) جیسی شخصیات کی خصوصیات اور خدوخال تفصیلاً بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ابن عربی کے بعد میں آنیوالوں کی سوچ اور صوفیانہ شاعری جیسے ذرائع کی مدد سے ان کے تصورات کی عوامی قبولیت کو بنیاد بنا کر متعدد صوفی یہ خیال کرنے لگے کہ "وحدت الوجود" کا نظریہ (جسے وہ ابن عربی سے منسوب کرتے تھے) غیر مصالحانہ طور پر توحیدی تھا۔

اس مابعد الطبیعیاتی حوالے سے توحید اور اخلاقی لحاظ سے اضافیاتی نکتہ نظر کے جواب میں سرہندی نے ایک پیچیدہ الہیاتی نظام پیش کیا جو خدا اور دنیا کے درمیان رشتے کو اس انداز میں تفصیلاً بیان کرتا ہے کہ مخلوقات اور انسانی سرگرمیوں کا زیادہ مثبت وجودیاتی رتبہ مہیا ہوتا ہے۔

ان کا نظریہ "وحدت الشہود" کہلایا۔ اس نظریہ کی تشکیل میں وہ "شیخ الشیوخ" (ابن عربی) کی تعلیمات کے کچھ پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں، لیکن دیگر سے بہت زیادہ متاثر رہے اور گاہے لگاہے ابن عربی کو درست بھی مانتے ہیں۔ سرہندی کے فلسفیانہ نظام کے خدوخال میں یہ تصور موجود ہے کہ عمل تخلیق کے دوران خدا کے ذہن سے الوہی اسماء دنیا میں ظاہر ہوئے، جہاں انہیں مکمل طور پر قابل ادراک تجربہ ہونے کے لیے تضادات کا سامنا کرنا لازمی تھا۔ چنانچہ دنیا بعینہ خدائے مطلق جیسی نہیں بلکہ خود اپنی پرچھائیں یا جھلک جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو خدا سے علیحدہ مقام پر پیش کر کے سرہندی مطلق توحید کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اضافیت کی مخالفت میں شیطان کے حقیقی وجودیاتی رتبے کی توثیق کرنے کے قابل ہوئے۔

سرہندی کے خیال میں انفرادی تطہیر اور شعور والی راہ تصوف پر چلنے کے لیے اسلام کے راسخ عقائد اور وظائف کے مطابق زندگی بسر کرنا لازمی شرط ہے۔ اس راہ کا بنیادی مقصد باطنی علم کی جائے اعتقاد کا تیقن ہے۔ تاہم 'اسلامی قانون (شریعت) کی اندرونی جہت یا جوہر کو سمجھ لینے والے ان سے اعلیٰ رتبہ پر ہیں جو محض خارجی رسمی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

سرہندی نقشبندی صوفیا کی اجتناب پسند خصوصیت والے عنصر پر مسلسل زور دیتا ہے۔

اس پس منظر میں انہوں نے رقص، سماع یا وجدانی حالتوں والی صوفیانہ مشقوں کو نامنظور کیا۔ وہ خدا کے نام اور آیات کے ورد کی حمایت کرتے ہیں۔ سرہندی کے مطابق روحانیت کے متلاشی صوفی استاد کی نگرانی اور رہنمائی میں ایک روحانی ترقی کی منازل طے کرتے ہیں جو طبیعی صورت میں الوہی حقیقت کے نزول کا الٹ عمل ہے۔

نبی اور ولی کے بالترتیب رتبوں کی وضاحت توحید اور دوئی کے بارے میں سرہندی کے تناظر کا ایک اور پہلو تھا۔ انسانی کوششوں کی قدر واہمیت اور معنویت کی پرزور حمایت کرتے ہوئے سرہندی نے کہا کہ درجہ نبوت فلاحی مشن پر توجہ اور متین طریقہ کار کے ساتھ دنیا میں واپس آنے کے لیے خدا کے ساتھ وصال اور سرشاری کے ولایتی درجہ سے ماورا بھی ہے اور پیوستہ بھی۔ ایک حدیث ---- میرے شیطان نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں ---- بیان کرتے ہوئے سرہندی نبی کے رتبے کو ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کرتے ہیں جو فنافی اللہ کی اعلیٰ ترین سطوحات پالینے کے بعد بھی واپس دنیوی وجود کی گہرائیوں میں اترنے کی خواہش کرتے ہوئے اپنے آپ اور دنیا دونوں کی تبدیلی ہیئت کرنے کا مشن پورا کرے۔

سرہندی کی تعلیمات کا ایک دلچسپ اور متنازعہ پہلو اپنے خصوصی مشن کے لیے ان کا تصور تھا۔ اگرچہ ان کی تصنیفات میں اس جانب علامتی انداز میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ تنازعہ کا باعث بن گیا۔ حتیٰ کہ کچھ معاصرین نے کفر کے الزامات بھی عائد کیے۔ "مبداء و معاذ" میں ایک مخفی حوالے میں سرہندی دعوی کرتے ہیں کہ اسلام کے دوسرے ہزار سال کی ابتداء کے ساتھ ایک نیا دور شروع ہوا ہے، جس میں "محمد ﷺ کی حقیقت" کے طور پر معلوم کائناتی درجہ "کعبہ کی حقیقت" کے ساتھ وحدت اختیار کرلے گا۔ اس کے نتیجہ میں "احمد کی حقیقت" کہلانے والا ایک نیا مخلوط برتر درجہ بنے گا، جو مسلمانوں کے لیے روحانی ترقی اور تکمیل کے ایک نئے دور میں حاجب ہو گا۔ یہ یقیناً کافی مخفی انداز میں ان کے اپنے نام "احمد" کی جانب اشارہ ہے۔

ان کے زیادہ متجاوز اور تقریباً مسیحانہ دعوے اسلامی صوفیانہ فکر کی تاریخ میں مکمل طور پر اجنبی نہ تھے۔ چنانچہ سرہندی کے بیانات واضح طور پر متنازعہ ہونے کے باوجود ان کی زندگی میں ہی کفر کے لیے ان کی مذمت ہمہ گیر طور پر نہ کی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوپاک کے مسلمانوں کے لیے سرہندی کی شخصیت اسلام کے زبردست مصلح کی صورت اختیار کرگئی۔ انہوں نے 1624ء میں وفات پائی۔

بُلھے شاہ

(1680ء------ 1757ء)

بُلھے شاہ کا اصلی نام عبداللہ شاہ تھا۔ عبداللہ شاہ سے ہی بُلھا شاہ یا بُلھے شاہ ہو گیا۔ پیار سے کوئی بابا بُلھے شاہ'' کوئی سائیں بُلھے شاہ اور کوئی صرف بُلھا کہتا ہے۔

بُلھے شاہ کے زمانے کے بارے میں کھوجیوں کی مختلف آراء ہیں۔ عام طور پر ان کی حیات کا دور 1680 سے 58-1757 عیسوی تسلیم کیا جاتا ہے آپ کی جائے پیدائش ریاست بہاولپور (پاکستان) کے گاؤں اُچ گیلانیاں مانی جاتی ہے۔ بُلھے شاہ کی چھ ماہ کی عُمر تک ان کے والدین اسی گاؤں میں آباد تھے۔ بعد ازاں کسی سبب سے وہ گاؤں ملکوال (ضلع ساہیوال ملتان ڈویژن) چلے گئے جہاں ان کی برادری کے کئی گھر آباد تھے۔ وہاں آئے ہوئے انہیں ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ گاؤں پانڈو کے کے ملک کو اپنے گاؤں کی مسجد کے لیے امام کی ضرورت پڑی۔ وہ ملکوال کے لوگوں کی سفارش پر بُلھے شاہ کے والد شاہ محمد درویش کو پانڈو کے لے آیا۔ گاؤں کی مسجد میں امامت کے علاوہ آپ کو بچوں کی ابتدائی تعلیم کا کام بھی سونپا گیا۔

بُلھے شاہ، جن کو بُلھے شاہ قادری شطاری بھی کہا جاتا ہے کامل صوفی فقیر ہوئے ہیں۔ آپ کی پاکیزہ طرز زندگی اور اعلیٰ درجے کی روحانی رسائی کے سبب ہندو، مسلمان، سِکھ مختلف مذہبی عقیدوں کے لوگ آپ سے یکساں محبت کرتے ہیں۔ علماء اور درویش آپ کو ''شیخ ہر دو عالم''، ''مرد حقانی''، ''پوشیدہ رازوں کا محرم'' وغیرہ کئی قابل عزت خطابات سے نوازتے ہیں۔ آپ کے کلام کو '' صوفی کلام کی چوٹی' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے کلام کے کئی پہلوؤں کا موازنہ عظیم صوفی فقراء مولانا روم و شمس تبریز وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔

بُلھے شاہ کے والد شاہ محمد درویش کو عربی فارسی اور قرآن میں دستگاہ حاصل تھی۔ وہ روحانی رحجان والے نیک دل انسان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خاندان میں سے بُلھے شاہ کے ساتھ ان کی

ہمشیرہ کا سب سے زیادہ خلوص تھا۔ بلھے شاہ کی طرح آپ کی ہمشیرہ نے بھی ساری عمر کنواری رہ کر عبادت اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی۔ بھائی بہن دونوں کی شخصیت پر ان کے والد کے اعلیٰ اخلاق کا گہرا اثر تھا، جن کی نیک سیرت کے سبب انہیں درویش کہہ کو نوازا جاتا تھا۔ آج بھی بلھے شاہ کے والد کا مزار پانڈو کے بھٹیاں میں موجود ہے جہاں ہر سال عرس ہوتا ہے اور رات کو بلھے شاہ کی کافیاں گائی جاتی ہیں۔

مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے بلھے شاہ کے دل میں ایک چنگاری روشن ہو گئی، اور جس حقیقت کی حیران کن صفات بلھے شاہ نے ان کتابوں میں پڑھیں، اس کے دیدار کی تڑپ اس کے دل میں جاگ اٹھی۔ یہ تڑپ اور جستجو ہی بلھے شاہ کو مرشد کامل حضرت شاہ عنایت قادری کے در پر لے آئی۔

حضرت عنایت شاہ اپنے وقت کے رسائی والے قادری صوفی فقیر تھے۔ تاریخی نظریئے سے قادری صوفیوں کا تعلق بغداد میں ہوئے صوفی فقیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہے۔ حضرت جیلانی کو "پیر دستگیر" یا پیران پیر کہہ کر بھی نوازا جاتا ہے۔ بلھے شاہ نے خود اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔ "ہمارا پیراں دا پیر" بغداد میں ہوا ہے، لیکن مرشد لاہور شہر کا ہے۔

بلھے شاہ نے شاہ عنایت کا دامن ایسا پکڑا کہ پھر کبھی نہ چھوڑا۔ ان کے کلام میں مرشد کے عشق اور اس کی تعریف میں عقیدت سے لبریز جو بیان ملتے ہیں ان میں مستی بھی ہے اور رنگینی بھی۔ اس تعریف میں اس نے مرشد اور خدا میں کوئی تمیز نہیں رکھی۔ اس نے شاہ عنایت کو ہدایت کرنے والا "ہادی" اور خدا سے وصال کرانے والا مرشد کامل کہا ہے، اور اس کو خصم، شوہ، سائیں، دلبر، سجن، اور یار وغیرہ کہہ کر اپنے حقیقی عشق کا اظہار کیا۔ بلھے شاہ کی ذات سید جبکہ عنایت شاہ کی آرائیں تھی۔ حضرت محمدؐ کے خاندان کے ایک عالم فاضل سید کا معمولی آرائیں کو اپنا مرشد مان لینا اہل زمانہ کی نظر میں معمولی بات نہ تھی۔ اس دھماکے نے سارے گرد و نواح میں ہلچل مچا دی۔ بلھے شاہ کو اپنے مذہب، ذات اور برادری کے لوگوں کی مخالفت اور کئی قسم کے طعنے سہنے پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ستانے پر بلھے شاہ نے گدھے خرید لئے تاکہ دنیا آپ سے نفرت کرنے لگ جائے۔ آپ کو لوگ "کھوتیاں والا" کہہ کر پکارنے لگے۔

عشق کا ابتدائی سفر بہت دلکش ہے۔ لیکن اس کی راہ پر خطر اور منزل دور ہے۔ عاشق کی ذراسی ناسمجھی یا کوتاہی معشوق کی ناراضگی کا باعث بن جاتی ہے اور عاشق کے لیے مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا کر دیتی ہے۔ یہی حال بلھے شاہ کا ہوا، جب اس کی کوتاہی کے سبب مرشد اس سے ناراض ہو گیا۔

کچھ کھوجیوں نے مرشد کی ناراضگی کا سبب یہ بتایا ہے کہ بُلھے شاہ نے کھلے عام شریعت پر نکتہ چینی کرنی شروع کر دی تھی' جو مرشد کو پسند نہ آئی۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں لگتی' کیونکہ شریعت پر نکتہ چینی تو تمام صوفی اپنے اپنے طریق سے ہمیشہ کرتے آئے ہیں اور قادری فرقہ کے صوفی بھی شریعت کے پابند نہیں تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ اپنے حجرہ میں بیٹھے خدا کی بندگی میں مشغول تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ آپ کے کچھ مرید حجرہ کے باہر بیٹھے گاجریں کھا رہے تھے۔ قریب سے چند روزہ دار مسلمان گزر رہے تھے۔ ایک فقیر کے تکیے پر مومنوں کو روزہ توڑتے دیکھ کر غضبناک ہو کر بولے "تمہیں شرم نہیں آتی' رمضان کے مہینے میں چر رہے ہو' وہ بھی ایک فقیر کے تکیے پر۔" مریدوں نے کہا" بھائی مومنو! اپنی راہ لو ہمیں بھوک لگی ہے تبھی تو کھا رہے ہیں"

مومنوں کو شک ہوا کہ شاید یہ مسلمان نہیں۔ انہوں نے پوچھا "ارے تم کون ہو؟" انہوں نے کہا" مسلمان ہیں! کیا مسلمانوں کو بھوک نہیں لگتی؟" مومنوں نے پھر تنبیہہ کی لیکن مرید باز نہ آئے۔ مومن جو گھوڑوں پر سوار تھے نیچے اتر آئے مریدوں کے ہاتھوں سے گاجریں چھین کر دور پھینک دیں' اور انہیں تھپڑ بھی مارے۔ واپس جانے لگے تو انہیں خیال آیا کہ ان کا پیر بھی شاید ایسا ہی ہو گا۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوں گے۔ پھر سوچا کہ اس کو جا کر پوچھیں تو سہی کہ اپنے مریدوں کو کیسی عقل دی ہے؟ حجرہ میں جا کر بولے "" ارے تو کون ہے؟" آپ آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ آپ نے بازو اونچے کر کے ہاتھ ہلا دیئے۔ انہوں نے پھر پوچھا" ارے بولتا کیوں نہیں' کون ہوتا ہے؟" آپ نے پھر بازو اونچے کر کے ہاتھ ہلا دیئے۔ مومن آپ کو دیوانہ سمجھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کی دیر تھی کہ مرید دہائی دیتے ہوئے حجرہ میں داخل ہوئے اور شکایت کی کہ انہوں نے ہمیں مارا ہے۔

بُلھا :۔ تم لوگوں نے ضرور کوئی قصور کیا ہو گا؟ مرید :۔ نہیں حضور! ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔ بُلھا :۔ انہوں نے تم سے کیا پوچھا تھا؟' مرید :۔ تم کون ہوتے ہو؟ ہم نے کہا "ہم مسلمان ہیں" بُلھا :۔ بس بچو! کچھ بنے ہو تو مار کھائی ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں بنے۔ ہمیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

وہی اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے جو نفس اور مادیت کے دائرے میں قید ہے۔ جس کو حق کا دیدار ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل بن جاتا ہے۔ وہ مذہبوں ملکوں اور ذاتوں پاتوں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں جگہ جگہ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ خدا کی طرح روح کا نہ کوئی مذہب ہے' نہ ملک' نہ ذات پات' سب مذہب وقت اور مقام کے قیدی ہیں' لیکن روح ازلی اور ابدی ہے۔ اس کا نہ کوئی اول ہے نہ آخر نہ کوئی مذہب ہے نہ ملت۔ آپ کہتے ہیں کہ میں صرف روح کا

خدا کے ساتھ ازل سے چلا آرہا رشتہ ہی پہچانتا ہوں۔ دنیا میں رائج کوئی دوسری تقسیم منظور نہیں کرتا ہے ---بُلھا کیہ جاناں میں کون......

بلھے شاہ ایسے خدا رسیدہ درویش فقیر کامل اور عاشق حقیقی تھے جنہوں نے مرشد کے عشق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے عشق کی منزل طے کی۔ آپ کے عشق میں شدت سوز اور تڑپ کے ساتھ ساتھ صدق دلی' قربانی اور اعلیٰ ترک کا جذبہ نمایاں تھا۔ آپ نے اپنی اونچی ذات اور علمیت عشق کی دہلیز پر نذر کر دی اور ہجر کی آگ میں تپتے ہوئے بھی مرشد میں اپنے اعتقاد کو لمحہ بھر کے لئے ڈگمگانے نہ دیا۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کی طرح آپ کا کلام عشق مجازی کا زینہ لے کر عشق حقیقی کے رتبہ کو پانے کی راہ دکھاتا ہے' جو دنیا کے تمام خدا پرستوں کا مشترکہ راستہ ہے۔

بلھے شاہ "کرکتن ول دھیان کڑے" والی کافی میں نصیحت کرتے ہیں کہ جب تک سانسوں کا سلسلہ جاری ہے تب تک مرشد کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق زندگی کی رات میں عرفان کی شمع روشن کر کے خدا کی عبادت کا سوت کات لینا چاہئے' کیونکہ وقت آخر جب موت کے فرشتے سرہانے آکر کھڑے ہوں گے' تو کچھ نہ بن پائے گا۔

کامل پیر فقیروں اور ولی اولیاء نے انسانی زندگی کا یہ بنیادی راز عیاں کیا ہے کہ دنیا اور دنیاوی اشیاء کی رغبت انسان کو آواگون کے چکر میں پھنساتی ہے' لیکن خدا اور اس کے کلمہ کا عشق اس کو ان بندھنوں سے آزاد کر کے خدا سے ملا دیتا ہے۔

بلھے شاہ کا کلام اس عاشق کے دل کا درد ظاہر کرتا ہے جس کے اندر محبوب کے وصال کی تڑپ کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔ آپ اشارہ کرتے ہیں کہ روح کا اپنے اصل کی طرف رجحان کوئی حال کی بات نہیں' یہ ازل سے ایک کھلا فسانہ ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے۔ جونہی انسان کے اندر خدا کے ساتھ وصال کی خوابیدہ محبت بیدار ہو جاتی ہے' اس کے لیے جدائی کی تپش کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہجر کی آگ تن کو تپاتی' جگر کو چیرتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے جسم کو کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال کر جلا رہی ہو۔ ایک عجیب سا درد کلیجے میں گھر کر لیتا ہے۔

آپ کے کلام میں صرف ہجر کے درد بھرے بیان ہی نہیں بلکہ وصل کے خوبصورت لمحات کا دلکش ذکر بھی ملتا ہے۔ اس طرح کی سب سے خوبصورت کافی "گھڑیالی دیو نکال نی' ہن پی گھر آیا لال نی" ہے۔ محبوبہ چاہتی ہے کہ اب جب کہ محبوب گھر آگیا ہے وقت تھم جائے اور فراق کی سب صورتیں ختم ہو جائیں' تاکہ محبوب کا وصال اور اس کا حقیقی ہنر ور کبھی ختم نہ ہو۔

آپ کے دل میں عشق الٰہی کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ آپ نے خداوند کریم کو قادر مطلق

'عالم مطلق' وحدت الوجود' حاکم' رازق' خالق وغیرہ ظاہر کرنے پر کم' لیکن محبوب حقیقی یا دلبر جانی ثابت کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "عشق اللہ کی ذات ہے" اس لیے آپ نے اپنے آپ کو محبوبہ اور خدا کو محبوب کے طور پر ظاہر کیا ہے۔ آپ کے لیے وہ خدا سجن یا ساجن' ماہی یا سائیں' شوہ یا شوہر' رانجھا یا رانجھن' پنوں اور کرشن ہے۔ آپ اس محبوب حقیقی کو لیلیٰ' مہینوال' ڈھولا' پریتم' جانی دلبر' یار اور "سوہنا یار" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کا محبوب کے ساتھ ایسا انوکھا رشتہ ہے کہ آپ اسے چھلیا' جادوگر' چور اور ٹھگ بھی کہہ دیتے ہیں۔

مالک کل دنیا کے پردے کے پیچھے چھپا نور کا سرچشمہ ہے۔ بلھے شاہ کے لیے وہ ایک ایسا معشوق ہے۔ جس نے عاشق کو تڑپانے کے لیے اپنے جمال کو چلمن کی اوٹ میں چھپالیا ہے "

اس دا مکھ اک جوت ہے گھونگھٹ ہے سنسار

خدا کو حسب و نسب' زبان و بیان اور ذات پات سے بالاتر کہا گیا ہے۔ بلھے شاہ اس ذات مطلق کے اس خاصہ کو بھی ایسی پر لطف شوخی کے انداز میں بیان کرتے ہیں" وہ ذات لامحدود بھی نزدیک ترین پیارے محبوب کی شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

کامل فقیروں نے اشارہ کیا ہے کہ جب خداوند کریم نے کائنات کو پیدا کیا تو کوئی روحیں ذات مطلق سے علیحدہ ہو کر عالم آب و گل میں آنے کے لیے راضی نہ تھیں' مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ کہہ کر مادی دنیا میں بھیج دیا کہ میں تمہیں عالم ارواح میں واپس لانے کے لیے خود خاکی دنیا میں آؤں گا۔ بلھے شاہ یہ لطیف نکتہ بھی نہایت پر لطف انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔ آپ ذات حق سے شکوہ کرتے ہیں قادر مطلق خداوند کریم سے نہیں' بلکہ اپنے محبوب حقیقی سے --- کہ تو نے ہم سے جھوٹا اقرار کر کے مادی دنیا میں بھیج دیا اور بعد میں خود پردہ نشین ہو کر ہمیں حرص و ہوا کی دنیا میں لا کر اس قدر بھر مادیا کہ اب بحر حیات سے نجات پانا ہماری طاقت سے باہر ہے۔

آپ نے اپنی کافی "رہ رہ وے عشقا ماریا ای" میں اپنے محبوب کے انوکھے ڈھنگ میں عمل پیرا ہونے کا رمزیہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ عیسیٰ' رام' موسیٰ' کرشن میں اپنا نور رکھنے والا بھی وہی محبوب ہے۔ زکریا۔ سرمد' شمس تبریز اور شاہ شرف وغیرہ میں عشق حقیقی کی خاطر طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرنے والا بھی وہی محبوب ہے۔ یوسف زلیخا لیلیٰ مجنوں' سسی پنوں' ہیر رانجھا' مرزا صاحباں وغیرہ میں عشق کی آگ بھڑکانے والا بھی وہی ہے۔ شیطان' نمرود' فرعون' ہرناکش' راون اور کوروں وغیرہ میں خودی اور تکبر پیدا کر کے ان کو نیست و نابود کرنے والا

بھی وہی محبوب حقیقی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی محبوب کا رنگین ناٹک ہے۔ آپ "کتھوں لامکانی وسدے ہو' تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے" ہو کافی میں بھی دنیائے فانی کو محبوب حقیقی کے عشق کا کھیل کہتے ہیں

خدا کا عشق تمام اوصاف کی کان ہے۔ خدائی محبت کی جڑ کے بغیر نیکی اور اخلاص کے درخت کبھی خوشنما' مضبوط اور تناور نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ خوشگوار' خوبصورت اور میٹھے پھول اور پھل لا سکتے ہیں محبت کی کمی کسی دوسری شئے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی ہر کمی کی دوا محبت ہے 'لیکن محبت کی کمی کی دوا سوائے محبت کے اور کچھ نہیں۔

محبت سے پیدا ہوئے عمل میں جان ہوتی ہے سرور ہوتا ہے۔ پیار سے خالی مجبوری میں کیے گئے اعمال میں نہ کوئی وصف ہوتا ہے نہ ہی بھلائی۔ پیار بھرا عمل ہی صحیح معنوں میں مقدس عمل ہے۔

بلھے شاہ کہتے ہیں کہ علم کا مقصد ہماری قوت تمیز کو تیز کرنا ہے۔ علم سچ اور جھوٹ غلط اور صحیح' اچھے اور برے کی تمیز سکھاتا ہے 'لیکن خود عالم کہلانے والے اور دیدہ ور ہونے کا دعوے کرنے والے دراصل حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نیک و بد' مومن و کافر کی پہچان نہیں کر سکتے 'جس کے سبب وہ دین اور دنیا دونوں بگاڑ لیتے ہیں۔ جس علم کے باعث حرص و ہوس کی آگ ٹھنڈی ہونے کی بجائے اور بھڑک اٹھے یا جو علم دیانتداری کی بجائے بدنیتی سکھائے اللہ تعالیٰ ایسے علم سے خوش نہیں ہوتا۔ وہ تو قناعت اور ایمانداری سے خوش ہوتا ہے 'حرص و ہوس اور بے ایمانی کے شعلے بھڑکانے والے علم سے نہیں۔ بدنیت عالم سے صاف دل ان پڑھ بدرجہا بہتر ہے۔

مذہبی کتابوں کا اصل مقصد ہمیں عالم فاضل نہیں' عامل بنانا ہے۔ بلھے شاہ نے ایک نہیں بلکہ کئی کافیوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ درگاہ الٰہی میں رسائی کے لیے مرشد اور کلمہ کے عشق کے ایک الف کے علاوہ کسی دوسری 'ب' پ' ت' کی ضرورت نہیں ہے۔

بلھے شاہ کا کلام زیادہ تر کافیوں کی صورت میں ہے۔ ان کے زمانے میں کافی لکھنے کا رواج عام تھا۔ کافی بھگتوں کے شبد یا بشن پدوں سے ملتی جلتی نظم جیسی ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کسی روحانی مضمون کو --- عام طور پر مرشد یا رب کے عشق اور اس کی جدائی کی تڑپ --- ہلکے پھلکے مگر سنجیدہ انداز میں بیان کرتا تھا۔ کافی گائے جانے کے لیے لکھی جاتی تھی اور کئی صوفیوں نے اپنی کافیاں کلاسیکل یا پکے راگوں میں لکھی ہیں۔ عام طور پر لوگ صوفیوں کے تکیوں پر اکٹھے ہو کر نصف دائرے کی شکل میں بیٹھ جاتے تھے اور کافیاں گاتے تھے۔ لیکن بعض اوقات صرف قوال ہی کافی گاتے

تھے۔ صوفیوں کی پنجابی زبان میں لکھی گئی کافیوں میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور اسلامی مذہبی کتب کے کئی حوالے ملتے ہیں' مگر مجموعی طور پر ان میں مقامی زبان' محاورات اور تمدن کا رنگ حاوی ہے۔

شاہ حسین جیسے صوفی شاعروں کی مانند بلھے شاہ نے بھی بہت سی تشبیہیں اور استعارے عام پنجابی زندگی سے لیے ہیں۔ ان تشبیہوں اور استعاروں کا تعلق چرخوں' پونیوں' گوہڑوں' تکلوں' ترنجنوں' پتن' پور' لج' گھڑا' گھڑولی وغیرہ سے ہے۔ اس دنیا (لوک) کو مایکا اور عاقبت (پرلوک) کو سسرال کہا گیا ہے اور روح و خدا کے رستے کو بیوی اور شوہر کے رشتے سے اور پھر اسی رشتے کو ہیر رانجھا' سسی پنوں' ستی ڈھولا' یوسف زلیخا' لیلی مجنوں وغیرہ کے رشتے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اپ نے ایرانی صوفیوں کی مانند' بلبل' چمن' پیر مغاں' میخانہ' شراب' پیالہ صراحی وغیرہ علامتوں کے ساتھ ساتھ کرشن کا ہن گائے' بندرابن' بنسی' رام' راون' لنکا وغیرہ کے الفاظ استعاروں کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح کلمہ یا کلام کے معنوں میں شبد نام' انحد شبد' انحد مرلی' انحد ناد وغیرہ ہندوستانی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ مرشد کے لیے گورو اور ستگورو کے الفاظ ان کے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔ انسانی قالب کی ہری مندر ٹھاکر دوارا سے مناسبت ظاہر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے سب مذاہب کے مشترکہ خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ بھی ملے جلے اور عام فہم استعمال کیے ہیں۔

بلھے شاہ کی زبان عام طور پر پنجابی ہے' مگر آپ نے کچھ کافیاں اور دوہڑے ہندوی اور سادہ بھاشا کے ملے جلے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ باراں ماہ میں پنجابی اور ہندوی دونوں زبانیں اکٹھی استعمال کی گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ زبان کے بارے میں آپ کا نظریہ بہت وسیع تھا۔ آپ کا اصل مقصد خیالات کی ترجمانی تھا جس کسی زبان میں بھی کوئی خیال عام فہم اور خوبصورت انداز میں بیان ہو سکا' آپ نے کر دیا' کیونکہ آپ کے قارئین اور معتقدوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔

بلھے شاہ کے سارے کلام میں جذبات کی پرزور روانی نمایاں ہے۔ یہ کلام خودرو جھرنے کی مانند از خود دل کی گہرائیوں سے نکلتا معلوم پڑتا ہے۔ اس کلام میں بے خودی اور بے پروائی ہے' مستی اور خمار ہے رمزیہ نزاکت اور لطیف شوخی ہے۔ اس میں ایک مٹک' لچک' دلیری اور ترغیب ہے۔ اس کلام میں جہاں خوشگوار گیتوں کی بہار ہے' وہاں ہجر کے دلسوز جذبات کی فراوانی بھی ہے۔ یہ کلام کہیں موسیقی کی میٹھی دھن بن جاتا ہے تو کہیں ناچ کی رقت آمیز دھمک۔ یہ پہیلیاں بھی بجھاتا ہے اور

رمزیں بھی کھولتا ہے۔ یہ کلام جس قدر عام فہم اور دلکش ہے اتنا ہی سنجیدہ اور پر معنی بھی ہے' اور خود بخود دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ جو بھی کوئی ایک بار اس کو سمجھ کر پڑھ لیتا ہے بار بار اسے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے۔ بلھے شاہ کی اچانک موت کے وقت ان کے انقلابی فکر و عمل کے باعث ملاؤں نے انہیں برادری کے قبرستان میں دفن کی اجازت نہ دی۔ آج اس بلھے شاہ کا خستہ حال مقبرہ ہی قصور کے بیرونی حصہ میں قصبے کے کوڑے کرکٹ کے انباروں سے مبرا ایک پاک و صاف جگہ ہے۔ شہر کے نامور لوگ' جنہوں نے اس وقت بلھے شاہ پر کافر ہونے کا فتوے عائد کر کے اسے برادری سے خارج کر دیا تھا' آج زیادہ سے زیادہ دولت صرف کر کے ان کے نزدیک دفن کئے جانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ

(1703ء ---- 1762ء)

شاہ ولی اللہ کا دور وہ تھا جب "حکمت" کے طور پر جانی جانیوالی اسلامی روایت پھل پھول رہی تھی اور فلسفہ' دینیات اور تصوف کے روایتی مذہبی علوم میں مصالحت ہو رہی تھی۔ تاہم' ما قبل جدید دور یا کلاسیکی انداز کا نکتہ نظر مختلف فرقہ وارانہ' سیاسی اور سماجی دباؤ کے تحت اپنے ٹوٹنے کی علامتیں دکھا رہا تھا۔

چنانچہ شاہ ولی شاہ اللہ کی تعلیمات اور تصنیفاتی سرگرمیوں کا اصل مقصد اہم اسلامی عقلی قواعد کے نکتہ ہائے نظر کے ذریعہ اسلامی مذہبی علوم کے مطالعہ کو دوبارہ مجتمع کرنا اور اہم بنانا تھا۔ ان عقلی قواعد میں فقہ' دینیات' تصوف اور خاص طور پر قرآن و حدیث پر غور و خوض شامل تھا۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے تقریباً چالیس کتابیں اور رسائل مرتب کیے اور ایک مذہبی محقق اور روحانی رہنماء کا فریضہ سرانجام دیا۔

شاہ ولی اللہ کا جنم ایک کٹر مذہبی اور مشہور گھرانے میں ہوا۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم مشہور فقیہہ اور محقق تھے جنہوں نے دہلی میں اسلامی تعلیمات کے ادارے "مدرسہ" کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اپنے معقل بیٹے کو قرآنی تعلیمات' عربی زبان اور نقشبندی صوفیانہ روایت سیکھنے میں رہنمائی دے کر سترہ برس کی کچی عمر میں اپنا وارث بنا دیا۔ چنانچہ 1719ء میں باپ کی وفات پر شاہ والی اللہ نے اپنی حیثیت سنبھالی۔

1730ء میں حج کے سفر نے شاہ ولی اللہ کی سوچ پر طاقتور اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے مکہ اور مدینہ المنورہ کے مقدس شہروں میں انتہائی سرکردہ اور معزز صوفی اساتذہ اور اس دور کے محققین حدیث کے ساتھ ساتھ سال گزارا جنہوں نے ان کی قابلیت کو تسلیم کیا اور اپنے حلقہ میں شامل کر لیا۔ انہیں عربی زبان میں اس قدر عبور حاصل تھا کہ ان کی اہم تصنیفات اسی زبان میں لکھی

ہوئی ہیں۔ مزید بر آں بہت سی فارسی میں بھی ہیں۔

دنیائے اسلام کے فکری' مذہبی اور تہذیبی مرکز میں گزارے ہوئے وقت نے اسلامی قانون کے معاملات میں شاہ ولی اللہ کو ایک ہمہ گیر نکتہ نظر عطاء کیا۔ اس لئے ان کی کتابوں میں زیادہ مقامی حلقے کی بجائے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی مخاطب کیا گیا۔ چونکہ مکی اساتذہ مطالعہ حدیث کی روایت میں ڈوب گئے تھے' اس لئے شاہ ولی اللہ نے یہ نکتہ نظر اپنالیا کہ رسول اللہ کے اقوال کا مطالعہ اور شرع اسلام پر چلنے کے لیے مختلف طریقوں کو متحد کرنا اور نیا بنانا لازمی ہے۔

سعودی عرب سے واپسی کے بعد شاہ ولی اللہ نے دہلی میں اپنی عملی اور صوفیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں' اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ میں پڑھایا اور راہ تصوف کی پیچیدگیوں میں شاگردوں کی رہنمائی کی۔

انہوں نے اپنی اہم کتاب "حجتہ البالغہ" حج سے واپسی پر لکھی تھی۔ اس دو جلدوں پر مشتمل کتاب میں انہوں نے کل علم کائنات کا جائزہ پیش کیا۔ پہلی جلد میں وہ تخلیق کا بنیادی مقصد' انسانی نفسیات کی توانائیت (Potentiality)' انسانی سوچ اور اعمال کی بلند تر اہمیت' انسانی سماجی و سیاسی نظاموں کی ترقی اور سب سے آخر میں مذہبی مکاشفہ اور اس کی شرح پیش کرتے ہیں۔ جلد دوم میں وہ اسلامی قانونی ہدایات کے زیادہ گہرے روحانی پہلوؤں کی تفہیم پیدا کرنے کے لیے اپنا طریقہ کار مخصوص احادیث پر لاگو کرتے ہیں۔ اسلام کی اندرونی اور بیرونی جہتوں کو واضح اور ہم آہنگ کرنے کے اس کارنامے کی وجہ سے عموماً عظیم مفکر اور صوفی الغزالی (وفات 1111ء) کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

ان کا مابعد الطبیعیاتی نظام بھی الغزالی اور ابن عربی (وفات 1240ء) دونوں کی فلسفیانہ صوفی روایت سے زبردست متاثر ہے' جنہوں نے معنی کے مثالی درجے کے افلاطونی تصور کو اس دنیا کے وقوعات کے ساتھ جوڑا۔ حقیقت کی خالصتاً مادی جہتوں کے درمیان رابطہ نظر آنیوالی ایک مائع سی تہہ "اعیان کی دنیا" کہلاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسے وہ تعلیم خیال کیا جس میں مذہبی استعارے مخصوص مذہبی ہدایات میں اپنی جوڑبندی سے قبل تشکیل دیئے گئے تھے۔ ان مخصوص مذہبی ہدایات کی پیروی کرنے کا اصل مطلب ان کے بیرونی وقوعات کی مخصوص مثالوں کی بجائے اس بلند تر سطح پر تلاش کرنا چاہیے۔ اس نکتہ نظر پر عمل کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے ایک نظریہ استعاریت اور معنی و اطلاقیت کی ٹھوس تاریخی صورت حالات میں اس کے ظہور کی توضیح کی جس کے مطابق استعارے ایک طرح سے اپنی افادیت رکھتے ہیں۔ اخذ کردہ نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی

قانون (شرع) پر عوامی سطح پر عملدرآمد کرنا چاہیے تاکہ اس کے اندرونی روحانی مفادات کا حصول ہو سکے۔

اپنے نظریہ 'مذہبی مکاشفہ' میں وہ اسلام کو ایک ہمہ گیر مذہب خیال کرتے ہیں جس نے تاہم ساتویں صدی کے عرب میں عہد حضرت محمد ﷺ کے دوران ٹھوس صورت اختیار کی تھی۔ چنانچہ ان کی سوچ میں "دین" (جو تمام افراد کے مزاج میں رچا بسا ہے) کے مثالی تصور اور اسلام کی خصوصی تاریخی صورت کی تمام وقتوں میں اطلاقیت کے دعویٰ کے درمیان کچھ تفاوت موجود ہے۔

ان کے نظام میں بنی نوع انسان مذہبی قوانین کے محض مجہول تاثر پذیر ہی نہیں۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنیوالے آئندہ مقدر کی تشکیل کرنے میں حصہ لینے کے قابل ہیں کیونکہ بعد از موت بھی ان میں بیشتر مزید انسانی سماجی و روحانی نشوونما کی رہنمائی کرنے کے کام میں حصہ لینے کے لیے "مجلس اولیٰ" کے فرشتوں میں شامل ہوں گے۔

اگرچہ عربی سے فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ شاہ ولی اللہ نے پہلی مرتبہ نہیں کیا تھا (جیسا کہ کچھ کہتے ہیں) لیکن یہ اس اعتبار سے تاریخ ساز ہے کہ اس میں شاہ ولی اللہ نے ایک تو حد سے زیادہ اولی اور دوسرے محض کتاب کا لب لباب پیش کرنے والے سابق تراجم کے مابین ایک حیران کن متوازن قائم کیا۔

مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں میں قیام کے دوران قانون اور حدیث میں شاہ ولی کی باقاعدہ تربیت نے انہیں مالک ابن انس (وفات 795ء) مکتبہ کے حدیث سے متعلق طریقہ کار اور الشافعی (وفات 819ء) قانونی مکتبہ کے نظری آلات کا حمایتی بنا دیا۔ جنوبی ایشیاء کے زیادہ تر مسلمانوں کی طرح انہوں نے خود حنفی مکتبہ قانون کی پیروی کی۔ اس قسم کی انتخابیت "تطبیق" کہلاتی تھی: یعنی مطابقت میں سے متفاوت عناصر کو عیاں کرنا۔ قانون اور حدیث پر ان کی کچھ تصنیفات نظریہ اور شرح کا تکنیکی معائنہ ہیں' جبکہ دیگر میں وہ چار بڑے سنی مکاتب قانون کے درمیان عدم اتفاقات کے تاریخی ماخذوں پر غور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان اختلافات تک لیجانے والے عناصر کو ان کی ترقی کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔ اسلامی قانون سازی کے بنیادی ماخذوں یعنی قرآن و حدیث کی تفسیر کرنے پر اہل افراد کی قابلیت کے بارے میں ان کا نکتہ نظر مکمل طور پر انقلابی نہیں 'بلکہ وہ اہل فقہیہ کی جانب سے اجتہاد کی ایک مخصوص تک اجازت دیتے ہیں۔

تصوف پر عمل کرنے سے متعلق شاہ ولی اللہ کا نکتہ نظر انتخابی اور اصلاحی دونوں طرح کا تھا۔ دیگر اسلامی اصولوں کی طرح صوفی طریقہ کار اور نظریہ سے متعلق ان کا رویہ یہ تھا کہ ہر

صوفیانہ سلسلہ اپنی اپنی بے مثال تاریخ اور توانائیاں رکھتا ہے۔ روحانیت کے متمنی کو ایسے صوفیانہ عناصر پر عمل کرنے کی تربیت دینی چاہیے جو اس کی اپنی خلقی فطرت سے انتہائی ہم آہنگی رکھتے ہوں، چاہے وہ عناصر استغراقی، دین دارانہ یا پھر فکری ہوں۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے دور کے اہم صوفی سلسلوں کی رہنمائی کا دعویٰ کیا اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ منسلک ہونے کی بجائے خود اپنے قسم کا انتخابی طریقہ کار قائم کرنیکی کوشش کی ہو گی، جو پھل پھول نہ سکا۔ تصوف پر اصول کی ایک مختلف شکل کے طور پر اصرار نسل بعد نسل کم ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اور ان کی کچھ اولادوں نے صوفی عناصر کو تشکیل دینے کی کوشش کی تاکہ اسلامی اعتقاد اور چلن کے بنیادی عناصر کو زیادہ روحانی بنایا جا سکے۔ مثلاً اعلیٰ تربیت کے ایک اعلیٰ اسلامی ادارے دیوبند "مدرسہ" کی بنیاد ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز (وفات 1823ء) کے پیروکاروں نے رکھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت میں تبدیلی کے دور میں رہتے اور مغلیہ سلطنت میں انتشار اور اس کے بعد استعماری دور کے نکتہ آغاز پر مد و جزر کا تجربہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ پرانی اسلامی اصلاحی تحریکوں کے مخصوص رجحانات کی بطور مثال پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب کے وہابیوں کے برخلاف انہوں نے محترم مسلمان اولیاء کے طریقہ کار کو رد نہ کیا اور اس بات پر اعتقاد رکھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک متواتر روحانی رابطہ رکھتے تھے، جو کسی بھی عقیدت مند کے لیے قابل رسائی ہے۔

یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ آج مسلمان جنوبی ایشیاء میں تمام اہم مذہبی تحریکیں شاہ ولی اللہ کو اپنا فکری جد امجد مانتی ہیں۔ زیادہ تر صوفی مخالف نکتہ نظر رکھنے والے دیگر جنوبی ایشیائی مسلمان ---- مثلاً اہلحدیث ---- اور حتیٰ کہ مولانا مودودی کے پیروکار بھی اسلامی قانونی نظام کی بنیادوں کی طرف شاہ ولی اللہ کی رجعت اور خارجی اثرات کی سیاسی تردید کرنے پر انہیں اپنے اصلاحی عقائد کا نقیب سمجھتے ہیں۔ اسلامی جدت پسندوں نے شاہ ولی اللہ میں ایک ایسا مفکر دیکھا جس نے مخالف قانونی اور نظریاتی فرقوں کو قریب لاتے، اجتہاد کی بات کرتے ہوئے اور مذہبی روایت کی کتابی ہدایات میں مخفی جذبہ کی تلاش کرتے ہوئے اپنے دور کے بحران کا جواب دیا۔ انہوں نے 1762ء میں وفات پائی۔

سید وارث شاہ

(اٹھارہویں صدی عیسوی)

سید وارث شاہ کے سن پیدائش کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اپنی وجہ شہرت بننے والی کتاب "ہیر" میں انہوں نے اس کا سن تصنیف 1180 ہجری لکھا ہے۔ تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا کہ ہیر کی تکمیل کے وقت وہ بھرپور جوان تھے' اور اپنی محبوبہ بھاگ بھری کی جدائی کا داغ ان کے سینے میں سلگ رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جدائی کے دکھ میں انہوں نے ہیر کا قصہ جوڑا' لیکن ان کے تمام تر علم و فن کو صرف ایک ذاتی واقعہ سے منتج کر دینا موزوں نہیں ہوگا' کیونکہ "ہیر وارث شاہ" میں اس دور کا پورا معاشرہ منعکس ہو رہا ہے: پیداواری رشتے' خاندانی نظام' ملائیت' سیاسی ابتری' لوگوں کی اقدار' ثقافت اور بول چال و علم کی زبان سب کچھ "ہیر" میں موجزن ہے۔

وارث شاہ نے جب ہوش سنبھالا تو مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ 1707ء میں اورنگزیب شہنشاہ کی موت کے بعد شہزادوں کی باہمی جنگ نے خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی۔ دربار سازشوں اور قتل و خون ریزی کا مرکز بن گیا۔ ایسے میں افغانی حملہ آوروں نے لوٹ مار کے لئے پنجاب پر حملے شروع کئے۔ لوگ نادر شاہ کی خونریزی اور تاخت و تاراج سے لرزاں تھے۔ اس کے حملے کو وارث شاہ نے بھونچال سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے نتیجہ میں سلطنت مغلیہ کا محل زمیں بوس ہو گیا تھا۔ پھر محمد شاہ رنگیلے کا عہد فسق و فجور و لذت پرستی آیا۔ وہ 1748ء میں فوت ہوا تو احمد شاہ بادشاہ بنا مگر چار سال بعد ہی مر گیا۔ اس کا بیٹا عزیز الدین عالم گیر ثانی تخت نشین ہوا تو مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش کے نتیجے میں 1759ء میں قتل ہوا۔ 1764ء میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور شاہ عالم کو بادشاہ بنا دیا۔ اس پر آشوب زمانے کی افراتفری کو وارث شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ول ڈیورانٹ نے کہا ہے کہ زندگی کی طرح تہذیب بھی اپنی کمال کو پہنچائی ہوئی چیزوں کو خود ہی تباہ کر دیتی ہے۔ سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب پر یہ بات صادق آتی

ہے، لیکن معاشرتی سطح پر درست نہیں کیونکہ تہذیب صرف درباری زندگی اور مضبوط حکومت کا ہی نام نہیں۔ مضبوط مغلیہ سلطنت بھی یہاں کی تہذیب کو کھوکھلا کر چکی تھی۔ رزق اگانے والا رزق کو ترس رہا تھا۔ ہر کہیں چودھری اپنے اپنے حلقوں میں خود مختار حاکم بنے بیٹھے تھے اور رعیت کے جان و مال پر متصرف ہو گئے تھے: "اشراف دی گل منظور ناہیں اتے چودھری چور لنڈور کیتے۔"

وارث شاہ کا سماجی شعور ان کی تخلیق میں جا بجا نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس سماجی شعور نے انہیں عام لوگوں کی بات کرنے پر اکسایا۔ وہ بار بار مختلف پیرایوں میں عوام کی زبوں حالی اور مظلومیت کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے کٹھ ملاؤں اور قاضیوں کی ریاکاری اور مکر و فریب کا پردہ بھی بڑی بے رحمی سے چاک کیا اور کہتے ہیں کہ "رب کے مارے" ہوئے شریعت کے احکام بالائے طاق رکھ کر ہمیشہ روپے پیسے والوں کی حمایت کرتے ہیں۔

بادشاہت کے نتیجہ میں پنجاب میں طبقاتی تضاد وارث شاہ کے دور تک آتے آتے کافی واضح ہو گیا تھا جسے انہوں نے "ہیر" کی بنیاد بنایا۔ سطحی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہیر رانجھے کی داستان محض ایک "ناکام" محبت کی داستان ہے۔ لیکن یہ اپنی مجازی گہرائیوں میں "کامیاب" عشق کا سفر ہے۔ عام کچلے ہوئے لوگوں کی انسانیت کا نمائندہ، رانجھا اس وقت اپنے آپ کو بے مول اور بے وقعت محسوس کرتا ہے جب ملکیتی سماج کے نمائندے بھائی اور بھابیاں اسے دھوکے سے بنجر زمینیں دے دیتے ہیں۔ جس معاشرے میں ملکیت ہی تمام اوصاف کا سرچشمہ قرار پاتی ہے۔ چنانچہ رانجھا بے گن ہو گیا۔ بھابیاں اس کی بانسری کو باعث طعن اور بیکاری کا شغل سمجھتی ہیں جس کی تانوں سے وہ مٹیاروں کے دل موہ لیتا ہے۔ نجم حسین سید کے خیال میں اپنی ونجھلی (بانسری) کی وجہ سے رانجھا تخت ہزارے کے ملکیتی سماج کے علمبرداروں کو برا لگتا ہے۔ سر اس وقت "شئے" نہیں بنے تھے اور نا ہی ان کے ذریعہ کاروبار ہوتا تھا۔ ابھی تک سر ایک سحر ہی تھا۔ رانجھا بانسری بجاتا تو عورتیں اس کی جانب متوجہ ہو جاتیں، جو کہ ایسے سماج میں ملکیت ہی قرار پاتی ہیں: سونے سے لدی ہوئی، کھیتوں اور بچوں (مستقبل کے زوروں) کی دیکھ بھال کرنے والی، ہد ھنوں اور روایتوں کو قائم رکھنے والی اور رانجھے کو اس کی "غیر کاروباری" ذہنیت پر برا بھلا کہنے والی عورتیں۔ روپے پیسے کی بنیاد پر بننے والے رشتوں کو سبھی اندر سے برا سمجھتے اور خلوص و احترام خود کو قابل قدر گردانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دریا کے اس پار بیٹھی ہوئی ہیر رانجھے کی بھابیوں کی نظر میں بھی قابل ستائش ہے۔ اس لئے بھابیاں اسے کہتی ہیں کہ اے رانجھے تو ہمارے ٹکڑوں پر پل رہا ہے، گھر سے نکل کر بھوکا مرے گا تو سب "خرمستیاں" بھول جائیں گی۔ اگر تجھے "اپنے اوپر اتنا ہی ناز" ہے تو جا کر سیالوں کی لڑکی ہیر

کو بیاہ لا۔ یوں لگتا ہے جیسے ہیر رانجھے کی خودی ہے جسے حاصل کیے بغیر اس کے پاس اپنے اوپر فخر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ ہیر کا حصول، لیکن دولت و ملکیت کے بغیر 'بظاہر خارجی لیکن فی الحقیقت داخلی سفر ہے۔ پنجاب کی روایت کے مطابق ریاضت کے لیے سفر کرنا 'بن باس لینا' تکلیفیں اٹھانا اپنا آپ گنوانے اور دوئی کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ تصوف کی زبان میں یہ دوئی خارجی اور داخلی انسان کا تضاد ہے جسے دور کرنے کی راہ "عشق" یا سرمستی و بے خودی ہے۔ وارث شاہ نے ہیر کا آغاز ہی اس فقرے سے کیا: "اول حمد خدا ئیدا ورد کیجیے عشق کیتا سو جگ دا مول میاں۔" یعنی خالق اعلیٰ و مطلق نے تخلیق عالم کی بنیاد ہی عشق پر رکھی۔ جس طرح فنکار اپنے شاہکار یا تخلیق میں اپنا آپ دیکھتا ہے 'اسی طرح تخلیق کائنات بھی خدا کا "عشق" ہے۔

بھابیوں نے جب رانجھے کے ساتھ مکالمے کے آخر میں کہا کہ اگر تجھے ہمارا حسن پسند نہیں تو سیالوں کی ہیر بیاہ کر لے آ'اور پریم کی بانسری بجا کر اسے پھانس لے۔ یہ سن کر رانجھا کہتا ہے کہ تم دیس رکھو ہم چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اور اپنے سفر کا قصد کیا۔ رانجھے کا یہ قصد انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ سارتر نے اپنے ایک لیکچر میں کہا "جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان خود کو منتخب کرتا ہے تو ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے متعلق لازماً خود فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری مراد یہ بھی ہے کہ اپنے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان ساری نسل انسانی کے متعلق بھی فیصلہ کرتا ہے۔ انسان کے تمام اعمال میں سے' جو وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنی تخلیق کے لیے کرتا ہے' ایک بھی ایسا نہیں ہے جس سے بیک وقت انسان کی کوئی ایسی شبیہہ نہ بنتی ہو جس پر اس کے خیال میں ہر انسان کو پورا اترنا چاہئے۔ دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرتے وقت دراصل منتخب شئے کی اہمیت کا اقرار بھی کیا جاتا ہے...... اگر میں صابر و شاکر بننے کا انتخاب کرتا ہوں تو میں سب کو ایسا ہی دیکھنا چاہوں گا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو وارث شاہ کا رانجھا جب بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ ملکیت کی بنیاد پر قائم رشتے توڑ کر دریا پار جانے کا قصد کرتا ہے تو وہ دراصل ہمیں اپنی راہ انتخاب کے متعلق بتاتا ہے۔ جھوٹے رشتوں اور اپنے آپ سے عشق کے درمیان انتخاب' رانجھے نے ملکیت کے حوالے سے شناخت پانے والے معاشرے کو خیرباد کہا اور راہ عشق پر نکل کھڑا ہوا جس میں کس نے کچھ پایا ہے مگر اپنے سوا: "وارث شاہ ایس عشق دے ونج وچوں کسے پلے نہ بدھی دمڑی اے۔" رانجھے کو رات تخت ہزارے میں ہی ایک مسجد میں گذارنا پڑی۔ جہاں ملکیتی سماج کی الوہی توثیق کرنے والا ملاں "جھگڑیاں دی پنڈ" اس کی بانسری' پٹے اور غیر شرعی کپڑے دیکھ کر کہتا ہے کہ تو منصور حلاج کی طرح مرے گا۔ لیکن رانجھا جس سماج کو تیاگ آیا

ہے اب اس کی اقدار بھی اس کے لیے بے معنی ہو گئی ہیں۔ وہ ملاں کو اس کی بد کرداریوں اور رشوت خوریوں کا احساس دلاتا لیکن مسجد میں رات گذارنے کی درخواست بھی کرتا ہے کیونکہ ابھی وہ تخت ہزارے سے باہر نہیں نکلا جہاں رہنے کی شرائط میں اسے جوں کا توں قبول کرنا اور سہارا دینا بھی شامل ہے۔ صبح جونہی دودھ میں مدھانیاں پڑیں اور چڑیاں چہچہانے لگیں رانجھے نے کوچ کیا۔ وہ ساتھ کوئی رقم نہیں لے کر چلا' سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ لیکن دریا پار کرنے کے لیے لڈن ملاح پیسے مانگتا ہے۔ ناامید ہو کر رانجھا جب تیر کر دریا عبور کرنے کی غرض سے چھلانگ لگاتا ہے تو کشتی میں سوار عورتیں اور مرد اسے کشتی پر سوار کر لیتے ہیں۔ وہ جس پلنگ پر لیٹتا ہے وہ ہیر کا ہے۔ ہیر کو اپنے پلنگ پر کسی غیر مرد کے سوئے ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سہیلیوں کے سنگ آئی اور خوابیدہ رانجھے کو چھڑیاں مار کر جگایا۔ "رانجھے اٹھ کے آکھیا واہ سجن ہیر ہس کے تے مہربان ہوئی" دونوں کا عشق میں گرفتار ہو جانا وارث شاہ نے صرف ایک فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ اصل بات دریا کو پار کرنا تھی۔ یہی عمل اپنے مقصود کو پانے کا ذریعہ قرار پایا۔ بیشتر لوک داستانوں اور عشقیہ قصوں میں عاشق اور معشوق' متلاشی اور منزل کے درمیان ہم صحرا یا دریا کو حائل دیکھتے ہیں۔ نجم حسین سید اپنے ایک پر فکر مضمون میں دریا کی بابت ہر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: دریا ہمارا نگران ہے۔ وہ ہمیں وسعت و رفعت پانے سے روکتا ہے کہ ہم اپنے آپ سے باہر نہ نکل سکیں۔ دریا اپنی "میں" سے نکل کر "تو" کی جانب جانے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ بغاوت کرنے والوں کے دل میں اسے پار کرنے کی تمنا ہوتی ہے لیکن وہ اس کی منہ زوری سے ڈرتے بھی ہیں۔ لیکن اگر سر تلی پہ رکھنے کا حوصلہ ہو تو دریا اپنے محبوب کی نگری کا دروازہ بھی ہے۔ رانجھے نے دریا پار کیا تو اپنے آپ کو پہچاننے کی راہ پر روانہ ہوا۔ اس نے اپنی "میں" کو وسعت اور رفعت دے کر "تو" کے ساتھ گہرا تعلق جوڑا۔ چناب پار کر کے اس نے تخت ہزارے میں روا ظلم و جبر سے بغاوت کی۔ پرانے انداز حیات کی جڑیں اس کے اندر سے اکھڑ گئیں۔

پہلی ملاقات کے بعد ہیر اور رانجھے میں قول و اقرار ہو گئے۔ ہیر نے اپنے باپ سے کہہ کر اسے بھینسیں چرانے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد کی ساری کہانی کا مرکزی کردار ہیر بن گئی۔ عشق کا قصہ عام ہوا تو اس نے سارے سماج سے ٹکر لی جو تخت ہزارے والے سماج ہی کی طرح انسانوں کو ملکیت سمجھتا ہے۔ کیدو نے انہیں لاڈ پیار کرتے دیکھ کر ہیر کے والدین کو خبر کی تو ہیر نے اسے زدوکوب کیا۔ جو چوری وہ فقیر بن کر رانجھے سے بطور ثبوت لایا تھا' تاکہ اپنے بھائی اور ہیر کے باپ کو دکھا سکے' وہ ہیر چھین لیتی ہے۔ ہمارے سماج میں کیدو کی شرع نافذ ہے۔ اسے دانشمند اور سیانا

گنا جاتا ہے اور ریت رواج کا محافظ بھی۔ وہ زرداروں کے غرور کو غیرت کا نام دے کر ان کی چوکیداری کرتا ہے۔ وہ ظاہر کے پردے کے پیچھے جھانکنے کو کفر سمجھتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ اور پست کی تفریق سے زخم خوردہ ہے لیکن چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر یہ تفریق قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہیر کے والدین سے کہتا ہے کہ رواتیوں کا تحفظ ہی ان کی زندگی ہے۔ کیدو کی شرع میں رنگ و حسن ممنوع ہے۔ نیا پن کفر ہے 'چاہے دل کے اندر بد صورتیاں ہی پل رہی ہوں۔

ملکیتی سماج میں خاندان 'گھر' روایات اور اشیاء پر فخر ہی تمام چیزوں اور انسانوں کی اساس ہے جس کے خلاف ہیر نے بغاوت۔ جب ہیر نے سنا کہ ماں باپ اسے سیدے کھیڑے سے بیاہنے جا رہے ہیں تو اس نے اپنے بھائی سلطان کے سامنے بھی برملا کہہ دیا کہ وہ جان پر کھیل جائے گی لیکن رانجھے کا دامن نہیں چھوڑے گی۔ لیکن معاشرہ صدیوں سے قائم تھا اور اس کی روایات بھی بہت مضبوط۔ سیدے کھیڑے کی بارات آئی تو روایات کا محافظ مولوی نکاح پڑھانے آیا۔ ہیر نے روتے ہوئے "ماں" کہا تو اسے "ماں" سنا اور بتایا گیا۔ اس موقع پر ہیر اور قاضی کا طویل مکالمہ ہوا۔ وہ شرع کا دفتر کھول کر بیٹھ گیا اور ہیر عشق کا۔ قاضی کے لئے ہیر کی زبان ناقابل فہم تھی۔ لہٰذا اس نے کہا کہ جس کو تم عشق کہتی ہو وہ تمہاری بد مستی اور ہوسناکی ہے۔ لیکن یہ فتوای سن کر ہیر خاموش نہ رہی اور بولی کہ عشق کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو شہدائے کربلا کا رتبہ ملتا ہے۔ ملاؤں اور قاضیوں جیسے پاجی جان نثاری کو کیا سمجھیں گے۔ درگاہ باری تعالیٰ میں صادق عشاق کے سجدے ہی قبولیت پاتے ہیں۔ نکاح ہو چکنے کے بعد ہیر موقع پا کر رانجھے سے ملی اور بصد حسرت رخصت ہوئی: "ہن مل لیئے رنجھ لا بکے تے چھپی گھت کے بانہہ الار جانی" رانجھا اس موقع پر بیجا شکایت کرتے کہ حسن کے باغ بہشت دکھلا کر وہ داغ جدائی دے رہی ہے۔ حالانکہ ہیر نے قبل ازیں رانجھے سے کہا تھا کہ چل تخت ہزارے بھاگ چلیں۔ رانجھا جدائی کو قسمت کا لکھا تصور کرتا ہے۔

ہیر اپنے سسرال اور رانجھا جنگلوں میں اداس ہو گیا۔ رانجھے نے جوگ لے لیا جو یا تو اس کی غیر فعالیت کا اظہار ہے یا پھر وار فتگی کا۔ ہیر نے چٹھی لکھ کر اسے اپنے حسن سے فیضیاب ہونے کی دعوت دی تو وہ جوگی کے روپ میں ہیر کے دوار جا پہنچا۔ دونوں کے نین چار ہوئے اور انہوں نے باغ میں ملنے کا وعدہ کیا۔ ملاقات کے موقع پر "پتنگ پر آگ جل گئی"۔ جدائی کی آگ میں پھنکتے اور ناآسودہ تمناؤں کے ستائے ہوئے عشاق تنہائی میں ملے تو یارائے ضبط نہ رہا۔ اس کے بعد رانجھے نے تدبیر کر کے ہیر کی نند سہتی کو بھی اپنے محبوب مراد بلوچ کے ساتھ نکل بھاگنے کا موقع فراہم کیا۔ کھیڑے جس آگ کو بجھانے کا ذریعہ بنے تھے وہی ان کے اپنے گھر میں لگی۔ دھوکہ دہی کے الزام

میں کھیڑے رانجھے کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے اور فتویٰ حاصل کیا۔ رانجھے نے ابھی تک تو کھیڑوں کا گھر جلایا تھا لیکن اب عشق کی قوت سے سارے شہر کو آگ لگا دی۔ راجہ نے ڈر کر ہیر رانجھے کے حوالے کر دی۔ رانجھا ہیر کو ساتھ لے کر اس کے باپ کے پاس آگیا۔ جس نے رانجھے سے کہا کہ تخت ہزارے جا کر بارات لائے گا تو ہیر سے بیاہ کر دیا جائیگا۔

رانجھا ہیر کو بیاہنے کی خاطر بھائیوں اور پرانے رشتوں کی بارات جمع کرنے واپس تخت ہزارے آیا۔ اس نے یہ نہ جانا کہ ہیر اس بارات کے ذریعہ حاصل نہیں ہو گی۔ ان رشتوں کو توڑ کر ہی وہ ہیر تک پہنچا تھا اور ان کی طرف واپسی کا مطلب ہیر سے محروم ہو جانا تھا اور خود سے بھی۔ رانجھے نے واپس دریا کے دوسرے کنارے جا کر جیسے وعدہ توڑا اور بغاوت کا رنگ جھٹلایا۔ پیچھے سے ہیر بیمار پڑ گئی اور اسی حالت میں اسے زہر دے کر مار دیا گیا۔ رانجھے نے یہ خبر سنی تو صدمے کی تاب نہ لا کر جاں حق ہو گیا۔

ادب میں بے مثال فن پارے "ہیر" کے خالق وارث شاہ پہلے عظیم شاعر ہیں جن کے کلام میں پنجابی زبان اپنی پوری تابناکی' وسعت اور لچک کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ ان کے پاس الفاظ وتراکیب کا ایک لازوال ذخیرہ ہے جس میں عربی' فارسی' ترکی' سنسکرت بھاشا کے الفاظ موجود ہیں' لیکن بے ساختگی کے باعث نامانوس معلوم نہیں ہوتے۔ ہیر وارث شاہ کے مطالعہ سے پنجابی زبان کے تمول کے ساتھ ساتھ اس کی قدامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔

وارث شاہ جامع کمالات تھے "ہیر" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں تفسیر' حدیث' فقہ تاریخ وسیر پر عبور کامل تھا۔ تصوف وعرفان کے اسرار ورموز پر ان کی گہری نظر تھی۔ طب' علم نجوم اور موسیقی سے بہرہ ور تھے۔ عربی' فارسی' ہندی اور پشتو جانتے تھے۔ یوگ ویدانت' پرانوں اور ہندو دیومالا پر بھی انہیں وقوف حاصل تھا۔ ہیر میں کثرت سے ملکی تلمیحات دکھائی دیتی ہیں جو اس امر پر شاہد ہیں کہ وارث شاہ لوک کہانیوں قصوں اور لوک سنگیت کی خاصی جانکاری رکھتے تھے۔ انہوں نے "ہیر" میں پورے عہد کے دیہاتی اور عوامی کلچر کو محفوظ کر دیا۔ وارث شاہ نے تقریباً 60سال کی عمر پائی۔

مرزا غالب

(1796ء-----1869ء)

اردو اور فارسی زبان کے عظیم شاعر اسد اللہ بیگ خاں غالب 1796ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا نوشہ عرف نجم الدولہ' دبیر الملک اور نظام جنگ ان کے خطاب تھے۔ ابتداً اسد تخلص کرتے تھے مگر بعد میں بوجوہ غالب اختیار کر لیا۔ مولانا غلام رسول مہر اس تبدیلی تخلص کی وجہ فارسی شعر گوئی قرار دیتے ہیں۔ مرزا غالب ایک ترک قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ بقول غالب ان کا سلسلہ نسب توران ابن فریدون سے ملتا ہے۔ خاندان توران جب کیانی خاندان کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوا تو افراد خاندان مختلف اطراف میں نکل بھاگے۔ غالب کے اجداد میں سے ایک شخص ترسم خاں نے سمرقند میں پناہ لی۔ یہ غالب کا پردادا تھا۔ گمان ہے کہ ان کے دادا محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔ اور لاہور میں معین الملک کے پاس ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں طوائف الملوکی کے باعث دہلی چلے آئے اور یہیں نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کی وساطت سے اچھی ملازمت تلاش کی۔ یہیں غالب کے والد مرزا عبد اللہ بیگ کی پیدائش ہوئی۔ خواجہ حالی کے بقول غالب کے دادا کی زبان ترکی تھی۔ غالب کو اپنے نام و نسب پر فخر رہا ہے۔ آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا' لہذا غالب نے ہمیشہ اپنی شاعری پر اس موروثی سپاہ گری کو فوقیت دی: "کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔"

غالب پانچ سال کے تھے کہ سایہ پدری نہ رہا۔ چچا نے اپنے سایہ عاطفت میں لیا مگر چار سال بعد وہ بھی اٹھ گئے۔ پھر نانا کی آغوش امارت نصیب ہوئی اور غالب کا بچپن امیرانہ انداز میں گذرا ۔شطرنج اور چوسر کی بازیاں پتنگ اڑانے کا شغل' دوستوں کی محفلوں کی بے فکریاں اور بادہ نوشی کی دائمی عادت اسی دور کی پیداوار تھی۔ خواجہ حالی نے آگرہ کے ایک مشہور معلم شیخ معظم کو غالب کا استاد بتایا۔ بعض دیگر لوگ نظیر اکبر آبادی کو استاد قرار دیتے ہیں۔ البتہ فارسی کی تعلیم ایک نو مسلم

ایرانی پارسی ہرمزد (اسلامی نام عبدالصمد) نے دی۔ چنانچہ "حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی۔"

13 سال کی عمر میں غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ حالی کے بقول مرزا کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی، مگر ان کے خطوط ایک مختلف حقیقت کے عکاس ہیں "......1810ء کو میرے واسطے حکم جس دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی...... نظم و نثر کو مشقت ٹھہرلیا......" خانگی زندگی نے بھی مسرت و سکون نہ دیا: "......میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں...... خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجالاتا تھا' خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا...... جس لوہے کا طوق (بیگم) اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔" فارسی کے ایک مصرعے میں خیال طراز ہیں...... آں مرد کہ زن گرفت دانانہ بود۔" شاعر کی رند مزاجی' افتاد طبع' ذہنی تنہائی۔ سیلانی طبیعت' زنداں میں بھی خیال کی بیاباں نوردی' یار باشی' طے شدہ اور مروجہ مذہبی رویوں سے بے تعلقی بیوی کی دلچسپیوں اور مفادات سے متصادم تھی۔ بقول حالی "بیگم نے ازراہ کمال اتقاء اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لیے تھے۔" غالب کے مزاج کی افتاد کسی ایک کا پابند ہو کر رہنے میں مانع تھی۔ مرزا حاتم علی کو لکھا: "مناجان نہ سہی چنا جان سہی' میاں ہوش میں آؤ اور کہیں اور دل لگاؤ۔"

خانگی زندگی کی ناہمواری ان کے فکر و فن پر نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں رسوماتی مذہب سے بیزاری معاشرتی ماحول بھی اہم عوامل ہیں۔ ہمارے شاعر کو معلوم تھا کہ حرام و مباح کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے مذہبی عقیدے کے مطابق دوزخ ان کا مقدر بنے گی: "اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا' بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔" فرقے سے وابستگی ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اور مناسک مذہب سے لاتعلقی بھی۔

مرزا غالب کا عمومی ماحول بڑی عجیب خصوصیات کا حامل ہے۔ برصغیر میں قدرت کی فراخ دستی لوگوں کو طبعاً آرام پسند بنائے ہوئے تھی' کیونکہ تھوڑی بہت محنت کر کے بھی روزی کمانا ممکن تھا۔ گرمی اور سردی کی شدت بھی جذباتی مزاج کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ' یخنی' بھنا ہوا گوشت کباب' آم' شراب غالب کی پسندیدہ چیزیں ہیں' جن کے انسانی مزاج پر اثرات محتاج بحث نہیں۔ غالب ایک عبوری دور کے فرد تھے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور

مغلیہ آفتاب کی واپسیں نگاہیں اور آخری سانسیں تھیں جو غالب نے دیکھیں۔ یوں انہوں نے شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر کے ادوار حکومت دیکھے مگر یہ بات واضح تھی کہ پرانی طرز زندگی تنزل پذیر تھی۔ پرانی اقدار مٹ رہی تھیں، لیکن نئی اقدار کے لئے کوئی بنیاد نہیں بن پائی تھی۔ قدیم اقدار کو سینے سے لگا کر بیٹھے ہوئے لوگ خوف اور ناپسندیدگی کے ساتھ نئے کو قبول کرنے پر مجبور تھے۔ خود مرزا غالب بھی اس بے چینی کا شکار تھے اور ایک خوددار آدمی کے مانند اقتصادی خوشحالی حاصل کر کے اپنی سماجی حیثیت کو قائم رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ معاشی اور سیاسی کشمکش کا عکس فکر اور خیالات پر لازماً اپنے اثرات مرتب کر کے انہیں بھی اپنے جیسا بنا دیتا ہے: "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ پہنچتا ہے تو کہتا ہوں 'لو غالب کے ایک اور جوتی لگی...... "اپنے آپ سے بیگانگی یا خالی پن اور لغویت (Absurdity) کا یہی احساس ان کی شاعری میں پختہ صورت اختیار کر گیا۔ دوسری جانب انانیت، خودسری، تفاخر ذات وغیرہ حالات حال سے متصادم تھے۔ شاعر کی رومانیت اور انفرادیت نے انہیں خودنگری سکھائی۔ یہ تمام عوامل انسان کو ہر چیز...... خالق، مخلوق، دنیا، اپنی ذات کے متعلق متشکک بنا دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ مگر غالب کو یہ تشکیک یا اپنی حقیقت حال پر مرثیہ خوانی نہیں بلکہ اپنی ہستی کا بوجھ اپنے کندھوں اٹھانے کا عمل فکری اور ادبی اعتبار سے ممتاز کرتا ہے۔ ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان پہلے زندگی کو قبول نہ کر لے۔ اگرچہ غالب کے شعروں میں ہمیں زندگی سے بیزاری نظر آتی ہے، لیکن دراصل یہ زندگی کی بجائے اس کی بے معنویت سے بیزاری ہے۔

وہ چیزوں کو یکسر تبدیل نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ان سے باغی ہیں۔ اور ایک باغی شخص اپنے آپ کو تکلیف دینے والی بری چیزوں کو تحفظ بھی دیتا ہے تاکہ ان کے خلاف بغاوت کرنا جاری رکھے۔ وہ موجودہ نظام کو تباہ کرنے کی بجائے اس سے بلند تر ہونا چاہتا ہے۔ وہ جتنا زیادہ اس پر حملہ کرتا ہے اتنا ہی زیادہ باطنی طور پر اس کا احترام بھی کرتا ہے۔

غالب نے اپنی زندگی میں وجود یا ہستی کے جس انتشار کو تکلیف کے ساتھ سہا وہ ان کے مجرد خیالات کو سمجھنے کے لیے ایک اہم کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انتشار دنیا میں اپنی تخلیق کا مقصد سمجھ نہ آسکنے نتیجہ ہے۔ بودلیئر نے کہا تھا: "میں تہہ دل سے یہ یقین کر لینے کا خواہشمند ہوں کہ کوئی نظر نہ آنے والی خارجی ہستی میری قسمت میں دلچسپی رکھتی ہے...... لیکن ایسے یقین کا کوئی کیا کرے......" غالب بھی محرمی حسن ازل کو ترستے رہے، حالانکہ جسم کا ایک ایک ریشہ چشم بینا کا کام

دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہستی کی غایت دریافت کرنے کے لئے داخلی اور خارجی دونوں نگاہوں کے منتظر نظر آتے ہیں لیکن ہر دو اقالیم میں پہنچ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ ہمہ گیر تنہائی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان پر مبہم انداز میں ظاہر ہوا کہ واغ کا سرمایہ دود تھا۔ مکتب علم میں حاصل کردہ ان کا تمام علم محض یہی ہے کہ "رفت" "گیا اور "بود" تھا۔ یہ عارضی وقتی 'فانی انسان کی حقیقت کی جانکاری ہے۔ لیکن ہم کسی ایسی جانکاری سے بھلا کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ہمیں خوفزدہ کردے اور بدلے میں کچھ بھی نہ دے سکے۔ زیادہ تر لوگ اس جانکاری کے نقش جلد از جلد محو کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا شاعر ایسی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے خود کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا۔ تلاش نے اسے اور اس نے تلاش کو محو و فار کھا: "کس قدر زوق گرفتاری ہم ہے ہم کو۔" اس نے نظارہ کرتے ہوئے خود پر نظر رکھی۔ تاکہ خود کو نظارہ کرتے ہوئے دیکھ سکے۔ اپنی ذات اور موجودات کے بارے میں دراصل یہ اس کا اپنا شعور تھا جس پر اس نے غور و فکر کیا...... آنکھ خود کو نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی شخص اپنے وجود کی توجیہہ کرنے کا بوجھ دوسرے کے کندھوں پر نہیں ڈال سکتا۔ یہی تنہائی کا قانون ہے۔ تنہائی ہمارے شاعر کو خوف سے بھر دیتی ہے۔ اس نے ہمیشہ تنہائی کو اپنا مقدر جانا: "کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے۔" وہ اس تنہائی کو مجہول طور پر قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ جوش و تندی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوا۔ تنہائی کا خوف بےمثال ہونے کی قیمت ہے۔ ہمارا شاعر خود کو بےمثال محسوس کرتا ہے اور اس بے نظیری کے احساس کو لذت و خوف کی انتہائی حدوں تک لے گیا: "جوش جنوں میں کچھ نظر آتا نہیں اسد ---- صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے۔"

"ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے" جیسی آگہی کے باوجود وہ ہستی مطلق سے سوال کرتے ہیں کہ جب تیرے بن کوئی اور موجود ہی نہیں تو یہ ہنگامہ کس بات کا؟ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟ شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ ان باتوں کا جواب خارجی کی بجائے داخلی یعنی وحدت الوجودی حوالے سے دینا ہی ممکن ہے: "کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے 'کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستان کا" اور "وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن" یا "ہم کہاں ہوتے 'اگر حسن نہ ہوتا خود بیں" شوق حسن ازل کا نظارہ کرنے کے لیے غالب کے خیال میں واحد راہ ہے۔

اسی عشق میں وہ زیست کا مزہ پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے انہیں صوفی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں سے نئے سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے: "مانع وحشت خرامی ہائے لیلی کون ہے' خانہ

مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا۔ "اگر وہ صدائے ہستی مطلق چنگ ورباب میں سماع ہے تو دم سماع تن سے جان کیوں نکلنے لگتی ہے؟ اصل میں شہود و شاہد مشہود ایک ہے تو پھر مشاہدہ کس حساب میں؟...... ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔ انسانی تاریخ میں یہ سوالات ہمیشہ سے فلسفہ کا موضوع بنے رہے۔ لیکن جواب ڈھونڈنے کے متمنی کے سوال کا کوئی جواب نہیں۔ انبیاء 'اولیا' متقین اور مفکرین کی "تلاش" ہمیں جواب نظر آنے لگتی ہے۔ تلاش و جستجو میں واقع ہونے والی کلفت' آشفتگی' پریشانی' رنج و غم اور کشاکش ہمارے شاعر کا مقدر بن گئیں۔ اکثر وہ اپنے جنون نارسا کی اس دکھ انگیزی میں تلاش کو بھی بھلا بیٹھے: "واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں۔"

شمع ماتم خانہ کا احساس مٹانے کے لیے غالب کے خیالات میں دو راہیں واضح نظر آتی ہے۔ اول ابیقوریت (Epicureanism) یعنی نشاط کار اور ہوس آرزو...... "پھر ہوا وقت کہ ہوبال کشا موج شراب۔" دوم 'نوامیدیٔ شوق اور عجز و انکسار کے ساتھ منصور و سرمد کی طرح فنافی اللہ ہو کر جواز ہستی پانے کی تمنا جس میں نغمہ ہائے غم بھی غنیمت نظر آتا ہے: "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا۔" بقول ژاں پال سارتر' زندگی محض ایک کھیل ہے۔ انسان کو احکام' انتباہ یا مشورے کا انتظار کیے بغیر اپنا مقصد چننا پڑتا ہے۔ اس زندگی میں جبراً منتخب کردہ مقصد کے سوا اور کوئی مقصد موجود نہیں...... ایک مرتبہ انسان اس سچائی کو جان لے تو پھر اسے مقصد ڈھونڈنے کی کوئی بڑی خواہش بھی نہیں رہتی: "فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر۔"

بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو غالب کی محبوبہ عورت نہیں بلکہ "زندگی" ہے بہ الفاظ دیگر زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں' لطافتوں' دشواریوں اور سمجھ نہ آنے والی پہیلیوں سمیت عورت کی صورت میں غالب کے بت خانہ خیال میں جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ شاعر اپنی نسائی محبوبہ زندگی میں اپنی ذات کا عکس دیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اس کی دورنگی کے ہاتھوں عدم تیقن کا شکار بھی ہے۔ غالب کے لئے ساری کائنات حلقہ دام خیال ہے جس میں وہ خود بھی پھنسا ہوا ہے اور اسی شکار خوردہ حالت میں اپنی حالت پر غور کرتا ہے۔ لیکن یہ غور و خوض اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے آپ اور اپنی زندگی کو الوہی یا معروضی آنکھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ الوہی آنکھ صوفیا کے خیال میں انسان کی اپنی ہی چشم بینا ہے جو آئینہ دل میں دنیا کو منعکس ہوتے دیکھتی ہے۔ لیکن دنیا کو اپنے اندر اور خود کو دنیا میں دیکھنا شاید ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ موضوعیت یا ماورائیت انسان کو حاصل نہیں ہو پاتی کہ جس کے تحت وہ اپنی معروضیت کا مشاہدہ کر سکے۔ انسان کی اس بے کسی پر

غالب روتا بھی ہے اور ہنستا بھی۔ وجود و عدم کے مسائل پر فلسفیانہ غور و فکر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا احساس تضحیک و تحقیر اکثر اسے مجبور کرتا ہے کہ سب چیزوں کو قہقہے کی بھینٹ چڑھا دے یا اسی طرح اس کی تضحیک و تردید کرے جیسے اپنی ہوئی: "کعبے میں جا بجائینگے ناقوس" یا "الٹے پھر آئے در کعبہ گر وانہ ہوا" ایک قسم کے انتقامی رد عمل ہیں۔ یہ مذاق اڑانا ہرگز "مزاحیہ" نہیں بلکہ اتنا ہی المیہ ہے جتنا کہ اپنی ہستی پر غور و فکر اور نتیجتاً احساس شکستگی۔

مرزا غالب اردو شاعری کی طرح نثر میں بھی ایک منفرد اور اجتہادی مقام رکھتے ہیں۔ اردو نثر میں انہوں نے ایسا اسلوب ایجاد کیا جو ان سے ہی شروع ہوا اور ان پر ہی ختم ہو گیا۔ مرزا کی نثر ان خطوط کی صورت میں ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں اپنے دوستوں اور بے تکلف شاگردوں کو تحریر کئے۔ پروفیسر حمید خاں کے بقول غالب کو اصل شہرت اپنے خطوط کے ذریعہ ملی۔ شاعری نے بعد میں اپنے مداح پیدا کئے۔ خط و کتابت میں جدید اسلوب' القاب و تخاطب سے کلی احتراز اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہ راست حرف مطلب پر آجانا یقیناً انگریزی اسلوب کے تاثر سے پیدا ہوا ہوگا۔ چاند پوری نے سوانح غالب میں لکھا: "جس وقت غالب کی نثر نگاری کا آغاز ہوا فورٹ ولیم کالج میں زبان کو آسان بنانے کی کوششیں بروئے کار آچکی تھیں...... غالب جدید تہذیب کے شروع ہی سے پرستار تھے۔" غالب نے قدیم انداز خط نویسی کو "محمد شاہی روشیں" کہہ کر ان کا مذاق اڑایا۔ اول اول انہیں اپنے خطوط کی طباعت واشاعت منظور نہ تھی۔ لیکن پہلا مجموعہ "عود ہندی" ان کی زندگی میں ہی (1868ء میں) شائع ہوا۔ ان خطوط کے نسخوں کی پنجاب میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ غالب کی نثر میں سادگی اور سلاست ہے۔ جبکہ شاعری میں انہوں نے مرزا بیدل کی طرح خاصی خوبصورت اور مکلف زبان استعمال کی۔

مرزا غالب کے اوپر تلے سات بچے پیدا ہوئے مگر پندرہ مہینے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے پہلے ہی فوت ہوتے گئے۔ مرزا کو اپنے آباؤاجداد کی سرکاری خدمات کے عوض سرکار انگریزی سے پنشن ملا کرتی تھی۔ 1857ء کی جنگ کے بعد جب یہ پنشن بند ہو گئی تو انہیں شدید مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے اپنے مکان پر قمار بازی کا اڈہ بھی چلایا۔ مگر انہوں نے کبھی اپنے عیوب کو چھپانا نہ چاہا: "آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں۔" تنگدستی اور غربت کے باوجود وہ فراخ دل اور شاہ خرچ تھے۔ انہوں نے انگریز سرکار کی طرف سے پنشن کی بحالی کے لئے بڑی کوشش کی' بہت سفارشیں کرائیں' حاکموں سے ملے اور کلکتہ جیسے دور دراز مقام کا سفر کیا۔ ادھر سے مایوس ہو کر رام پور پہنچے نواب نے وظیفہ مقرر کر دیا کہ یہاں رہو تو 200 روپے اور کہیں اور قیام کرو تو 100 روپے ماہوار

ملیں گے۔ تین برس بعد پنشن بھی جاری ہوگئی مگر سارا
روپیہ قرض اور سود میں ادا ہو گیا۔ اسی کسمپرسی کے عالم میں انہوں نے 1869ء میں انتقال کیا:
"دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے....

جمال الدین افغانیؒ اسد آبادی

(1839ء----1897ء)

سید جمال الدین افغانی 1254ھ کے مہینہ شعبان مطابق نومبر 1839ء میں جلال آباد کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کو امیر دوست محمد خان نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت جمال الدین افغانی کی عمر آٹھ سال تھی۔ وہ گاؤں سے کابل چلے گئے جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

1848ء میں جب ان کی عمر دس سال کی ہوئی تو مزید علوم کی تحصیل کے لئے ان کے والد انہیں قزوین نامی شہر لے گئے۔ حصول علم کا انہیں اس حد تک ذوق و شوق تھا کہ جمعہ اور عید کے دن بھی چھٹی نہ کرتے۔ والد بہت اصرار کرتے کہ شہر کی تفریح کے لئے چلو تو وہ جواب دیتے کہ مٹی کے بنے ہوئے گھروں کو دیکھ کر وہ کیا کریں گے۔ ناچار والد گھر کو تالا لگا کر چلے جاتے۔ جب واپس پلٹتے تو دیکھتے کہ کتابوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے اور اس انبار میں ان کا نونہال بیٹھا مطالعہ میں غرق ہے۔

قزوین میں دو سال گزارنے کے بعد 1850ء میں جبکہ ان کی عمر کے صرف بارہ سال گزرے تھے ان کے والد انہیں تہران لے آئے اور اپنے دوست سلیمان خان کے گھر ٹھہرایا جو اسد آباد کے سابق حکمران بھی تھے۔ تہران میں سید جمال الدین نے اس وقت کی مشہور شخصیت سید صادق مجتہد کو اپنی ذکاوت و نبوغ سے متاثر کیا اور پھر وہ اپنے والد کے ساتھ عراق کی جانب روانہ ہو گئے تاکہ اسلامی علوم کے مرکز نجف میں باقی علوم حاصل کر سکیں۔

نجف میں اپنے والد کے ہمراہ شیعوں کے عالمی پیشوا شیخ مرتضیٰ انصاری کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ انصاری نے اس کم سنی میں یہ نبوغ اور تعلیم و تعلم کی اتنی غیر معمولی استعداد دیکھ کر ان کے لئے ایک گھر کا انتظام کیا۔ سید جمال چار سال تک اسلامی و غیر اسلامی علوم کی تحصیل کرتے رہتے

ہیں۔ انہوں نے علم تفسیر' حدیث' فقہ' اصول کلام اور عقلی علوم یعنی منطق' فلسفہ یا حکمت الٰہیہ' علم طبیعی (Physics) ریاضی اور ہیئت و نجوم میں مہارت حاصل کی اور ان کے تمام ماخذ کو کھنگال ڈالا ۔وہ اب ایک طالب علم نہ رہے تھے بلکہ کمسن مفکر اور ایسے اہل نظر بن گئے تھے جس کے سینے میں علوم وافکار کا ایک سمندر تھا۔ ان کی شہرت نجف کے علمی حلقوں تک پہنچ گئی تھی اور اب ہر محفل میں ان کا چرچا تھا۔ ان کے افکار کی زد میں کچھ ایسے علماء بھی آگئے جو فکری جمود کے حامل تھے اور ہر طرح کی اصلاحات کے خلاف تھے۔ اس طرح بحث و مباحثہ کا دروازہ کھل گیا اور سید جمال پوری جرات کے ساتھ اپنی بات کہتے تھے۔

1855ء میں بمبئی میں مغربی طرز پر انہوں نے جدید علوم حاصل کئے۔ وہ ایک سال اور کچھ ماہ تک بمبئی میں رہے اور پھر حج کی نیت سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ہندوستان خود کو جنگ ازادی کے لئے تیار کر رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ واضح نہیں کہ اس جنگ آزادی میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا' لیکن اتنا واضح ہے کہ ان کی غیر معمولی شخصیت اور افکار و نظریات نے اس تحریک کے سرکردہ افراد کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔

1864ء میں امیر دوست محمد خان نے انہیں اپنا مشیر بنالیا اور اپنے بیٹے محمد اعظم خان کا اتالیق بھی۔ دوست محمد خان کے انتقال پر اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی جس نے افغانی کو پھر ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی' مقامی علماء سے ان کا مکالمہ نہ ہو سکا اس لئے وہ مصر چلے گئے۔ مگر برطانوی دباؤ کے تحت مصر کی حکومت نے چالیس دن کے اندر اندر ملک سے باہر نکال دیا۔ وہ ترکی گئے مگر وہاں سے بھی تنگ نظر علماء نے دباؤ ڈال کر نکلوادیا۔ 1873ء میں دوبارہ مصر آگئے اور وہاں تعلیمی اور سماجی شعبوں میں قابل قدر کام کیا۔ انہوں نے اخبار بھی نکالے۔ اب کے پھر انہیں مصر سے نکال دیا گیا اور وہ دوبارہ ہندوستان میں آکر حیدر آباد کن اور بمبئی میں رہے۔

سید جمال حیدر آباد کن میں تھے کہ انہیں ریاضی کے ایک ٹیچر کا خط موصول ہوا۔ اس خط میں نامہ نگار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ان دونوں ہندوستان میں ہر جگہ نیچر' نیچر کا شور ہو رہا ہے۔ کیا نظریہ نیچریہ (Naturalism) دین اسلام کے خلاف ہے یا اس کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اگر مطابق ہے تو اس میں اور دین میں کیا نسبت ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے نیچریوں کے خلاف اپنا مشہور تحقیقی مقالہ نیچریہ (Refutation of materialism\naturalism) کا جواب لکھا سب سے پہلے یہ جواب فارسی زبان میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اور پھر اردو زبان میں

ترجمہ ہو کر کلکتہ سے 1883ء میں شائع ہوا۔

اس تحقیقی مقالے میں سید جمال نیچریوں کو دہریہ یعنی خدا کا منکر قرار دیتے ہیں اور ان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو تین سو یا چار سو سال قبل مسیح سے مختلف شکلوں اور رنگ وروپ میں ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ ان کے عقائد پر ذرا سا غور وفکر کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ کس طرح معاشرے میں انتشار اور اجتماعی اضمحلال کو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ دین ہی معاسرے کے افراد کو ایک دوسرے سے پیوست رکھتا ہے اور دین کے بغیر ہرگز تمدن (Civilization) استوار نہ ہو سکے گا' حالانکہ اس گروہ کی بنیادی تعلیم مذہبوں اور ادیان الٰہی کو صفحہ ہستی سے مٹانا ہے۔

سید جمال نے آغاز میں کائنات کے بارے میں فطرت گرائی (naturalism\materialism) کے نظریات کو بیان کیا' ڈارون کے نظریہ پیدائش کو بھی عقلی دلائل' تجربہ اور مشاہدے کی مدد سے مسترد کر دیا۔ بعد ازاں وہ یورپی فلاسفرز کے مادی نظریات کی طرف اشارہ کرتے اور پھر موضوع سخن کو کیونزم اور سوشلزم کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اشتراکیت نے کس طرح اقوام عالم کو غلط اور فرسودہ نظریات میں الجھائے رکھا۔ آخر میں وہ دین اسلام اور اس پر ایمان لانے کی اہمیت اور امتیاز کو ثابت کرتے ہیں۔

سید جمال لکھتے ہیں کہ مذہب انسان کے لئے تین عقیدے لے کر آیا اور انسانی جان میں تین صفات ودیعت کرتا ہے۔ پہلا عقیدہ یہ ہے کہ انسان یقین کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔ تیسرا یہ عقیدہ کہ انسان اس لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ اس سے زیادہ وسیع عالم میں پہنچنے کی تیاری کرے اور ظلم' ناانصافی اور اچھائیوں اور برائیوں سے ملی جلی اس تنگ وتاریک دنیا سے نکل کر ایسے پاک وپاکیزہ عالم میں جانے کا رخت سفر باندھے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جو تین صفات مذہب ودیعت کرتا ہے وہ حیا' امانتداری اور سچائی ہے۔

حکومت برطانیہ نے انہیں کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔ نظر بندی کے خاتمہ پر وہ افغانستان چلے گئے۔ مہدی سوڈانی کی تحریک کے دوران انہوں نے مصر اور برطانیہ میں بات چیت کرانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے۔ آخر وہ روس چلے گئے جہاں انہوں نے روسی حکومت کو باور کرایا کہ وہ مسلمانوں پر لگائی گئی مذہبی پابندیاں اٹھا لے۔ اس میں انہیں کامیابی ہوئی۔ اسی دوران انہوں نے ایران کا بھی مختصر سا دورہ کیا اور روس واپس چلے گئے۔ دو برس بعد وہ جرمنی کے راستے پیرس پہنچ گئے

پھر ایران آئے۔ شاہ ایران کو اصلاحات کے نفاذ کے لیے کہا مگر شاہ نے اصلاحات مسترد کر دیں اور افغانی کو ایران بدر کر دیا۔ وہ لندن گئے جہاں سے ترکی پہنچے۔ 19 مارچ 1897 میں قسطنطنیہ میں انتقال کر گئے۔

جمال الدین نے ایرانی مجتہدین سے اصالتاً اور خط و کتابت کے ذریعہ تعلق قائم رکھا۔ جمال الدین کو معلوم تھا کہ اغیار کی بالادستی کے باوجود ایرانی علماء کا عوام میں اثر و رسوخ مسلمہ حقیقت ہے لہذا اس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی اصولوں کے مطابق انقلابی اقدامات کرنے چاہئیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایران کی سرزمین سے انقلاب برپا ہوتا ہے تو عین ممکن ہے کہ عالم اسلام کی تقدیر بدل جائے۔ جمال الدین خود انقلابی رجحانات کے حامل تھے اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان مشکلات کو حل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ یہی تڑپ انہیں نہ صرف بہت سے ممالک میں لے گئی بلکہ انہوں نے اس سیر و سفر کے دوران اہم قائدین سے رابطے اور ذاتی مراسم قائم کیے۔ ان رابطوں کا محرک اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ جمال الدین کی شکل میں ہم ایک ایسے انقلابی مفکر سے متعارف ہوتے ہیں جس نے صرف تحریر و تقریر کے ذریعہ سیاسی شعور بیدار کرنے اور نظام اسلام کے فوائد کا احساس نہیں دلایا بلکہ خود ملک ملک جا کر عملی اقدامات کرنے اور تدبیر منزل کے لئے سٹرٹیجی تیار کرنے کا عمل بھی جاری کیا۔ ان کی مساعی کا اثر ہوا اور بعض ممالک میں پان اسلامزم کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ جمال الدین کے سیاسی شعور اور اہداف کے حصول کی تڑپ کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ایرانی روحانی قائدین کو لکھے اور جنہیں تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔

افغانی مطلق العنان شخصی حکومت کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس قوم کو اپنے معاملات خود طے کرنے کا اختیار نہیں وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ نہ وہ جہالت اور نہ ہی افلاس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ حکومت عدم استحکام پیدا کرتی ہے اور عدم استحکام تباہی لاتا ہے۔ وہ جمہوریت کے حامی ہیں مگر کہتے ہیں کہ امور مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو اہل اور اعلیٰ اخلاق کے حامل اور قومی مفادات کے محافظ ہوں۔

افغانستان میں سید جمال الدینؒ کی جانب سے کی جانے والی اصلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اصلاحات پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی اقامت کے دوران انجام دیں۔ انہوں نے افغانی قوم میں شعور پیدا کرنے اور بیداری کی روح ڈالنے کے لئے افغانستان پر ایک مختصر سی تاریخ لکھی جس کا عنوان ہے "تتمۃ البیان فی تاریخ الافغان" اس کے علاوہ شمس

النھار نامی جریدے کو شائع کیا اور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے افغانیوں کو برطانیہ کی سازشوں سے آگاہ کیا اور ان کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

دوسرا حصہ ان اصلاحی آراء پر مشتمل ہے جنہیں وہ روانگی سے قبل امیر شیر علی خان کے سپرد کر گئے تھے تاکہ انہیں عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ غلام جیلانی اور قاسم رشتیا دو افغانی مورخ مجلّہ کابل میں ان اصلاحی تجاویز کی تفصیل یوں پیش کرتے ہیں :

"سیاسی استقلال کا اعلان' دربار کے امور کی اصلاح' وزراء پر مشتمل کابینہ کی تشکیل' فوج و سپاہ کی تنظیم' فوجی اور سول امور کی نگرانی کے لئے تعلیمی اداروں کا قیام' قومی زبان پشتو کی طرف توجہ' فوجی و عسکری القابات و اعزازات کو بیرونی زبان سے افغانی زبان میں منتقل کرنا' اخبار و جرائد کا قیام' شفاخانہ' ڈسپنسری ہوٹل' مسافر سرا اور پوسٹ آفس جیسے اداروں کا قیام عمل میں لانا اور نئے شہر کی بنیاد ڈالنا شامل ہے۔

ان کی یہ اصلاحات افغان قوم کو ایک مقصد کے قریب لانے میں بہت موثر ثابت ہوتی ہیں اور کچھ سال گزرنے کے بعد اسی افغانستان میں برطانیہ کے قونصل جنرل سمیت دس ہزار سے زیادہ سپاہیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور یوں افغانستان اپنی شجاعت اور حریت کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے ابھی تک بیرونی اقوام اسے اپنی تقدیر کا فیصلہ خود سے نہیں کرنے دیتیں اور آپس میں الجھائے رکھتی ہیں۔

علامہ محمد اقبال

(1873ء----- 1938ء)

سر علامہ محمد اقبال1873ء میں صوبہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ان کی پیدائش 1857ء کی بغاوت (تحریک آزادی) سے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی اور ایسے دور میں پرورش پائی جب برطانوی استعماریت کے طلوع سے قبل مسلمان اقتدار تنزل پزیر تھا۔اقبال زندگی بھر اپنے وطن میں اسلام کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی اطلاقیات کے ساتھ نبرد آزمارہے۔ اپنے دور میں ان کی بھرپور ادبی اور فلسفیانہ کتب عدیم المثال تھیں، جنہوں نے اس عمل کو سمجھنے اور اسلام کو دنیا میں اس کا جائز مقام واپس دلانے کی خاطر ایک انتہائی سنجیدہ کوشش متعارف کرائی۔

اقبال نے مذہبی علوم، عربی، فارسی اور انگلش میں اپنی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ لاہور اورینٹل کالج میں 1893ء سے لے کر 1897ء تک سر ایڈون آرنلڈ کے ساتھ تحصیل علم کرتے ہوئے ہی اقبال نے پہلی مرتبہ جدید فکر کا مطالعہ کیا تھا۔1899ء میں یہاں سے ایم۔اے فلسفہ کیااور عربی، منظوم شاعری پڑھانا شروع کی اور معاشرتی و معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ ان کی شاعری فارسی اردو کی کلاسیکی طرز کی ہے، لیکن یورپی ادب بالخصوص ورڈز ورتھ اور کولرج کے اثرات بھی دکھاتی ہے۔

یونیورسٹی آف کیمبرج سے لاء کرنے کے لیے اقبال نے 1905ء میں ہندوستان چھوڑا، لیکن یہ فلسفہ ہی تھا جس نے ان کی سوچ پر غلبہ کر لیا۔ٹرینٹی کالج میں ہیگل اور کانٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ یورپی فلسفہ کے بنیادی رجحانات سے واقف ہوگئے۔فلسفہ میں دلچسپی نے انہیں 1907ء میں ہائیڈلبرگ اور میونخ پہنچایا، جہاں نٹشے نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اقبال نے وہیں "ایران میں روحانی ترقی" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ کر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔ ایک برس بعد، 1908ء میں، انہیں انگلستان میں لنکن ان کے مقام پر بار میں آنے کی دعوت دی

گئی۔اس برس وہ وکیل اور فلسفی بن کر ہندوستان واپس آئے۔

واپسی کے بعد جلد ہی وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ پڑھانے لگے۔اس کے علاوہ انہوں نے برطانوی راج کے محکوم ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کو عیاں کرنے میں گہری دلچسپی لی۔ یورپ روانگی سے قبل اقبال ایک آزاد خیال قوم پرست اور انڈین نیشنل کانگریس کے ہمدرد تھے۔اب وہ اپنے نکتہ نظر میں مسلمانوں کی علیحدگی پسندی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت کرنے والے علیحدگی پسند بن گئے تھے۔1922ء میں انہیں "سر" کے خطاب سے نوازا گیا۔

چار سال بعد' 1926ء میں اقبال پنجاب مجلس قانون ساز میں منتخب ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ سے نزدیک تر ہو گئے۔انہوں نے آزادی کے بعد ہندو حکومت کو تسلیم کرنے کی بجائے ایک علیحدہ مسلمان وطن کے لیے زیادہ سے زیادہ حمایت کا اظہار کیا۔ در حقیقت' شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ مسلمان وطن بنانے کا تصور سب سے پہلے اقبال نے ہی 1930ء میں پیش کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ سب سے پہلے ایک فکری قوت تھے اور مسلمان ثقافتی زندگی میں ان کا مقام انہی حوالے سے ہے۔

دینیات' تصوف' مشرقی و مغربی فلسفہ اور انسانیت کے مقدر کو سمجھنے اور اس کی وضاحت کرنے کے لیے فارسی اردو شاعری کے رمزیہ اور نازک انداز کو استعمال کرنے میں اقبال کو اپنے ہم عصر مسلمان فلسفیوں میں عدیم المثال مقام حاصل ہے۔وسعت سے آرپار جانے میں یہ اقبال کی اہلیت ہے جو فلسفہ کو سماجی ثقافتی مسائل سے جدا کرتی ہے اور جس نے انہیں ایک فلسفی اور ثقافتی ہیرو بھی بنا دیا۔

اقبال نے کہا کہ روحانی نجات اور سیاسی آزادی کا حصول مسلمانوں کی تقدیر ہے۔ اسلام اس کی کنجی ہے: کیونکہ مسلمانوں کی زندگی میں عقیدے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

کافی حد تک اسلامی مجددین کی طرح اقبال اسلام کی ابتدائی تاریخ کو مثالی تصور کرتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے دور میں ہی مسلمان اپنی روحانی اور دنیاوی قوت کی اوج تک پہنچے تھے ---یعنی انسانی مقدر کے مکمل حصول تک۔ماضی کے اسی منظرنے مستقبل کے لیے ان کے نسخوں کی رہنمائی کی۔وہ اس بات پر قائل تھے کہ انسان صرف اسلام کی تعمیر نو کے سیاق و سباق میں ہی اپنے مقدر کی پوری توانائیت حاصل کرنے کے قابل تھا۔ تاہم اقبال کے تصورات رجعت پسندانہ نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے ابتدائی اسلامی تاریخ کو مثالی جانا۔اقبال نے جدید اقدار اور اخلاقی ضابطوں کو بھی اس مثالی تصور میں اس طرح شامل کیا کہ مسلمان برادری اور مسلمان عقیدے کے بنیادی اصول

سب اس میں مجسم ہو گئے جو اقبال کے مطابق جدید مغرب میں "اچھا" تھا۔ اقبال پر مغربی اثرات بہت گہرے تھے اور ان کے نظریہ دنیا کے تانے بانے میں صاف نظر آتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے بہت سے پہلوؤں' بالخصوص سیکولرازم پر ان کی تنقید "پیام مشرق" میں ان وسیع اثرات کو بس تھوڑا سا ہی چھپاتی ہے۔

مسلمانوں کو اپنے زوال کا عمل الٹا کرنے اور منزل پانے کے لیے اپنے مذہب کی صداقت تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔ انہیں اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہیے کہ موجودہ حالت میں اسلام غیر خالص تھا۔ صرف اسی صورت میں وہ باطنی صداقت پانے کے لیے اسلام کی مقبول صورتوں سے پرے دیکھ سکتے تھے۔ اقبال کی ابتدائی کتابوں "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" نے مسلمانوں کو عشق اور آزادی کے نغمات گاتے ہوئے ایسا ہی طرز عمل اپنانے کے لیے بڑھاوا دیا۔ رومانوی عشق یا سیاسی آزادی نہیں بلکہ اسلام کے اس نکتہ نظر سے خلوص اور آزادی کے ساتھ عشق جو ثقافتی میل جول کی عنایت تھا۔

اقبال نے تقدیر پرستی کو رد کیا۔ انہوں نے تاریخ کو ایسا میدان خیال نہ کیا تھا جس کے لئے خدا کا ظہور ہوا (جیسا کہ مسلمان کرتے تھے) بلکہ وہ اسے انسان کے لیے احساس خودی کا میدان سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی زندگیوں اور تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لیں اور تاریخ میں مہروں کا کام دینے کی بجائے اس کی صورت گری کریں۔

تاریخ کی سمت کو متعین کرنے اور اپنے عقیدے کی ایک استدلالی تشریح کے ذریعہ اس کی تہیں کھولنے کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اقبال نے معتزلہ فلسفیوں کی بازگشت پیش کی' جنہوں نے صدیوں قبل اشعریوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا لیکن اسلامی فکر میں بعد کی ترقی کی کوئی شکل دینے میں ناکام رہے۔

اقبال نے یہ جانا کہ اسلام کا باقاعدہ اجتہاد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان کی صرف ایک ہی تعریف موجود ہے نتیجتہ انہوں نے مختلف فرقوں' اصولوں اور مکتبہ ہائے فکر کی بنیادی وحدت کو اجاگر کرنے کی امید میں اسلامی عقیدہ کا تنوع کم کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ "زبور عجم" کی فصیح شاعری ظاہر کرتی ہے' وہ اسلام کی مختلف ترکیبوں میں کم اور عقیدے کے بنیادی اصولوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے' یعنی جو مسلمانوں میں کم سے کم فرقہ واریت کا سبب بنیں۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے اسلام کی ابتدائی اسلامی تاریخ کو مثالی قرار دیا۔ اس دور میں عقیدے میں کوئی پھوٹ یا تقسیم موجود نہ تھی۔ اسلام کے بارے میں ان کا نظریہ سادہ اور خالص ہے۔

اقبال کا تناظر اتنا زیادہ سیاسی نہیں بلکہ فلسفیانہ ہے' البتہ مسلم سیاست پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انسانی ترقی اور سماجی تبدیلی کا ایک محیط کل نظریہ مخترع کرتے ہوئے اس نے نطشے کے "سپرمین" کو تصوف کے "الانسان الکامل" کے ساتھ ملا دیا۔ انہوں نے خدا کو ایک کامل خودی خیال کیا' لیکن بایں ہمہ ایک ایسی خودی جو خدائے قدیم کی نسبت زیادہ قریب اور قابل محسوس ہے۔ "جاوید نامہ" میں پیش کردہ نکتہ نظر کے مطابق خدا اعلیٰ ترین تصور ہے' جس میں انسانی ترقی کے لیے اقبال کی حکمت عملی اپنے نقطہ عروج تک پہنچتی ہے۔ خدا کا یہ تصور صوفیانہ نظریہ "الانسان الکامل" سے قریبی مشابہ ہے' اور بلاشبہ نطشے کے "سپرمین" کا ہم پلہ۔

اپنے خیالات بیان کرنے میں اقبال نے انسانی خودی کو بلند کرنے کا اصول استعمال کیا ---- جو صوفی بزرگ جلال الدین رومی (73 -1207ء) نے پیش کیا تھا۔ رومی نے صوفی واردات کی وضاحت ایک الکیمیائی عمل کی نسبت سے کی جس میں انسانی خودی کی اصل دھات تبدیل ہو کر خدائی کاملیت کا سونا بن جاتی ہے۔ اقبال کی "بال جبریل" میں رومی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

انسانی زندگی اس ہست و فنا میں سے گذر کر خود کو مکمل کرتی ہے۔ چونکہ انسانیت کی رفعت مادی نظام کی تعمیر نو کے ساتھ بندھی ہوئی تھی' اس لیے اقبال نے فتح مند مرد کامل کے ظہور کی راہ ہموار کرنے کے لیے پرانے مسلمان نظام کے لیے رومی کی منظوری پر انحصار کیا۔ اس طرح انسانی اور سماجی ترقی صوفیوں کی بتائی اور نطشے کی سوچی بچاری حالت تکمیل پر پہنچنے تک جاری رہے گی۔ اقبال نے اس کاملیت کی تعریف ایک ایسی حالت کے طور پر کی جہاں عشق اور علم ---- مشرق اور مغرب کے استعارے ---- ایک ہی عقلی مقام پر خوشی قابض ہو جاتے ہیں۔

ایک زیادہ کامل معاشرے میں انسان اپنے ہر جنم کے ساتھ بلند روحانی حالت حاصل کر سکتا ہے' کیونکہ انسان ایسے "جوہر" کا مالک ہے جس کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ یہ عمل صرف اور صرف اسلام کے توسط سے وقوع پزیر ہوتا ہے' کیونکہ اسلام میں اس کا بنیادی ڈھانچہ موجود ہے۔ جس طرح غور و فکر اور مراقبہ روحانی بلندی کے لیے صوفی کی روح کو تیار کرتے ہیں' اسی طرح اقبال کی فطری حکمت عملی میں فعلی ارادیت (Activism) --- یعنی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے حق میں تقدیر پرستی سے دستبردار ہو جانا ---- عین یہی وظیفہ سرانجام دیتی ہے۔ وہ فعلی ارادیت "اسلامی حالت" میں نقطہ عروج پر پہنچتی ہے۔ اقبال نے اس اسلامی حالت کو صوفیانہ تصور وجدان و مسرت کے برابر قرار دیا۔

یہاں اقبال پر تصوف کی چھاپ واضح اور کافی دلچسپ ہے۔ بالعموم اقبال نے تصوف کو یہ کہتے ہوئے رد کیا کہ اس کا تعلق صرف فرد کی روحانی نجات سے ہے' جب کہ انہیں یقین تھا کہ انفرادی نجات کو دنیاوی نظام کی تعمیر نو سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم تصوف پر تنقید کو ان کی تعلیمات اور نظریات کے ان پہلوؤں کو مسترد کرنے میں بنیاد نہیں بنایا جا سکتا جنہیں انہوں نے بہت دلنشین پایا تھا۔ اقبال کے مختلف دیوانوں کے عنوانات ان کی فکر پر صوفیانہ تخیل اور عینیت کے اثرات کی توثیق کرتے ہیں۔

اقبال بلاشبہ انتہائی تخلیقی اور سکہ بند دانشور تھے۔ انہوں نے اسلامی زندگی اور سوچ کی بہت سی انواع کو یکجا کرنے' مسلمان عقیدے کو نیا رنگ دینے اور اسے جدید فکری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی سعی کی۔ انہوں نے اسلامی فکر کو مغربی فلسفہ کے ساتھ جوڑا اور روحانی نجات کو ذہنی تبدیلی اور سماجی ترقی کے ساتھ مربوط کیا۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک شاعر کی حیثیت میں انہوں نے انتہائی پر زور انداز میں یہ خیالات اپنے سننے والون تک پہنچائے۔ اگرچہ اقبال سے کوئی ممتاز مکتبہ فکر منسلک نہیں' لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسلامی فکر کی قوس قزح سے پرے بہت سے دانشوران کے پیش نامہ کی دانش اور ان کے طریقہ کار کی منطق کی جانب جھک گئے اور' انہوں نے اپنے عقیدہ کی بحالی اور اپنے معاشروں کی تعمیر نو میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کی۔

اقبال کی وفات 1938ء میں ہوئی۔

سید محمد حسین طباطبائی

(1903ء ---- 1981ء)

سید محمد حسین طباطبائی 1903ء میں 'بمقام تبریز' ایران اسلامی محققین اور بزرگوں کے ایک مشہور گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی تعلیم عربی زبان میں مکمل کی اور مذہبی علوم تبریز میں سیکھے۔ 1923ء میں طباطبائی نجف (عراق) روانہ ہوا جہاں اس نے شہر کی بڑی درسگاہوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ نجف میں اس نے فقہ اور کلام کا مطالعہ مرزا محمد حسین نعیمی اور شیخ محمد حسین اصفہانی کے ساتھ کیا۔ بہر حال اسے فلسفہ' عقلی علوم اور اسلامی تصوف و عرفان میں زیادہ دلچسپی تھی' جس کے لئے اس نے اپنی زیادہ تر فکر کو وقف کیا۔ اس نے سید حسین بدکوبائی کے ساتھ اسلامی فلسفہ کی اصولی کتب اور مرزا علی قاضی کے ساتھ صوفیانہ کتب (خصوصا محی الدین ابن عربی کی تصنیفات) کا مطالعہ کیا۔ نجف میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1934ء میں طباطبائی واپس تبریز آیا اور تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ وہ فقہ اور کلام میں ماہر تھا' لیکن اس نے تدریس فلسفہ پر ہی اپنی تمام تر توجہ مرکوز کی۔

طباطبائی تبریز سے 1945ء میں شیعہ تعلیم کے اہم مرکز قم کو گیا۔ اس وقت تبریز جنگ عالم دوم کے اثرات سے دوچار تھا اور ایران میں کمیونسٹ کارگزاری کے مراکز میں سے ایک تھا۔ وہاں زندگی کو درپیش خطرات کی وجہ سے طباطبائی کو اپنا شہر پیدائش چھوڑنا پڑا۔

ایس۔ ایم۔ کے عصر (وفات 1977ء) کی استثنیٰ کے ساتھ طباطبائی معاصر صدری فلسفیوں میں سب سے پہلا ہے۔ اس مکتب کے ایک عالم کی حیثیت میں وہ "حکمت المطالعہ" میں دانشوروں کی ایک نئی نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا' اور اس کا مقصد نہ صرف صدری روایت کے تسلسل کو قائم رکھنا بلکہ مسلمان مذہبی رہنماؤں کی تعلیم میں فلسفہ کا مقام بھی محفوظ بنانا تھا۔ فلسفہ کی تضحیک کرنے والے کچھ علماء کی جانب سے اعتراضات کے باوجود طباطبائی نے زندگی

پھر اسلامی فلسفہ اور عرفانیت کی تعلیم دی' اور ایران کے اسلامی مفکرین' عالمان دین' مدرسوں کے طالب علموں اور عام دانشوروں کے درمیان اس کے لئے ذوق وشوق پیدا کیا۔ اپنی کلاسوں میں اس نے ابن سینائی فلسفہ پڑھایا۔ صدری مکتبہ کی ترویج و مقبولیت میں وہ بلاشبہ سب سے زیادہ مؤثر تھا۔ اس نے سالہاسال متعدد فلسفیوں کو تربیت دی' جو اس کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

جب طباطبائی قسم میں قیام پزیر ہوا تو وہ اسلام اور قومی ثقافت و شخصی شناختوں میں اس کے ہر لحظہ کم ہوتے ہوئے کردار کی توضیح و تشریح اور ایران میں عقلی بحث کو تشکیل کرنے سے متعلق بھی شدید تشویش رکھتا تھا۔ ایران میں حکومت (اور عراق میں بھی' جہاں طباطبائی نے کچھ عرصہ گزارا اور تعلیم حاصل کی تھی) نے سیکولرسٹ پالیسیاں اپنا لی تھیں' تعلیم یافتہ طبقات کھلے سیکولر بن گئے تھے اور ان کی بہت بڑی تعداد بالعموم فلسفیانہ تناظروں اور بالخصوص مارکسزم سے وابستہ ہو گئی۔ جنگ عالم دوم کے دوران' جب کیمونسٹ سرگرمی ایک افتراقی تحریک میں اختتام پذیر ہو گئی' تبریز میں اپنی زندگی کے تجربات نے اسے بلاشک وشبہ مارکسزم کی دعوت مبارزت میں خصوصاً حساس بنا دیا تھا۔ طباطبائی کو یقین تھا کہ شیعی فقہ اور کلام مغربی فکر کے عقلی اور نظریاتی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ صرف اسلامی فلسفہ ہی پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنی جانب بلانے کے ہتھیار اور دلیل بازی کا حامل تھا' جس کے نتیجے میں مغربی دھاوے سے قبل قومی ثقافت کے اسلامی کردار کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی حلقوں میں فلسفہ کے لئے دلچسپی کی بحالی صرف پہلا قدم تھا۔ اس کو ثقافت پر اثرات ڈالنے کے قابل بنانے کے لیے اس محیط ثقافت اور عام مسلمانوں کے نظریہ دنیا سے مربوط کرنے کی ضرورت تھی۔ طباطبائی نے اسلامی فلسفہ کو اس انداز میں پیش کیا جو جدید مسلمانوں کے لئے قابل فہم تھا۔ اس نے مغربی فلسفہ کے کچھ مقولے بھی استعمال کئے۔ یہ کام مغربی فکر کے ساتھ مکالمہ بازی میں شروع ہوا۔ اس وقت بھی طباطبائی کے پیش نظر یہی مقصد تھا جب 1958ء میں اس نے اسلام کے فرانسیسی محقق ہنری کوربان کے ساتھ خط وکتابت اور ذاتی مباحثے کا آغاز کیا۔ کوربن کے ساتھ بحث کا سلسلہ کوئی دو عشروں تک جاری رہا اور اس نے طباطبائی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ کوربن نہ صرف شیعہ ازم پر اعلیٰ ترین سپیشلسٹ بلکہ اسلامی اور مغربی فلسفیوں کا سنجیدہ طالب علم بھی تھا۔ اس وقت وہ شہاب الدین سہروردی (وفات 1191ء) اور اس کی اشراقی عرفانیت پر اولین محکم شخص تھا۔ وہ مارٹن ہائیڈگر کے بھی بہت قریب رہ چکا تھا' اور سب سے پہلے اس کی کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ اس طرح کوربن نے ایک پل کا کام دیتے ہوئے

طباطبائی کو اس قابل بنایا کہ وہ تقابلی فلسفہ کے اسلامی نکتہ نظر کو مغربی فکر کے ساتھ بحث اور مکالمہ بازی کے لئے بطور اساس تخلیق کرے۔ بعد ازاں طباطبائی نے تاؤمت کو بھی بحثوں میں شامل کرنے کے لیے اپنے تقابلی تناظر میں وسعت پیدا کی۔ طباطبائی کے کام کے اس پہلو سے اس کے کچھ شاگرد (مثلاً ایس۔ ایچ۔ نصر اور ڈبلیو چیٹک) قریبی طور پر بندھے ہوئے تھے۔

طباطبائی جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغربی فلسفہ کا اہم ترین عنصر ---جو پڑھے لکھے مسلمانوں پر اس کے غلبہ کی وجہ تھا--- حقیقت پسندی میں اس کی بنیادیں اور حقیقت پسندانہ طریقہ کار پر اس کا انحصار ہے۔ یہی نتیجہ فلسفہ میں حقیقت پسندی پر اس کی متاثر کن کتابوں کا محرک تھا جن میں "اصول ریئلزم" اور "اصول فلسفہ و روش ریئلزم" شامل ہیں۔ اول الذکر 1976ء میں شائع ہوئی اور موخر الذکر 1985ء میں مکمل چھپی۔ ان کتابوں میں اس نے قارئین کے لئے حقیقت پسند مکتبہ کے ضابطوں اور بالخصوص اس کے فلسفیانہ تحقیق کے طریق کار کا خاکہ کھینچا۔ پھر اس نے حقیقت پسندی پر بحث کے سیاق و سباق میں اسلامی فلسفہ کو پیش کیا۔

حقیقت پسندی پر بات کرتے ہوئے طباطبائی نے کہا کہ صدری نکتہ نظر (جس کے مطابق صرف خدا ہی واجب الوجود ہے) مغربی "ریئلزم" یا حقیقت پسندی کے مفہوم میں بالکل درست ہے۔ حقیقت پسندی کا مطلب صرف تبھی ہے اگر یہ وجود کی "حقیقت" کو قبول کرلے، جیسا کہ ملا صدرا نے کیا۔ اس تعریف کے مطابق طباطبائی حقیقت پسند تھا، اور دراصل وہ خود کو یہی سمجھتا تھا۔ اسی سے اس کا یہ نظریہ پیدا ہوا کہ مارکسزم، جو ایک "مثالیت پسندی" تھا، انسانی شعور سے پیدا ہوا تھا اور وجود کی حقیقت تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ایک مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ طباطبائی مغربی فلسفہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ لبھانے والے پہلو پر تکیہ کر رہا تھا، اور عام دانشوروں میں اسلامی فلسفہ کو مباح بنانے اور اس کے ساتھ ساتھ مارکسزم کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے اس کی منطق کا استعمال کر رہا تھا۔ یہ باعث دلچسپی ہے کہ اس نے مارکسزم کو اس کے الحاد کی وجہ سے مسترد کرنے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے سامنے یہ کوئی مضبوط دلیل ثابت نہ ہوتی۔ اس کی بجائے اس نے مارکسزم میں "استدلال" کی کمی پر اعتراض کیا۔ تاہم طباطبائی کا انداز فکر محض وضعیت سے کچھ بڑھ کر تھا۔ یہ اسلامی فلسفہ اور حقیقت پسندی کو ایک سیدھ میں لانے کے لئے ملاپ کی ایک کوشش کا آغاز تھا۔ اس نے ان دونوں کے درمیان ہم وجودی (Co-existent) تعلق کو اپنے ذہن میں متشکل کیا۔ جس طرح حقیقت پسندی نے تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اسلامی فلسفہ کو عیاں کیا، عین اسی طرح صدری انداز فکر نے مارکسی مثالیت پسندی سے

قبل حقیقت پسندی پر تکیہ کیا۔ اسلامی فلسفہ کو حقیقت پسندی کے ساتھ مقابلہ بازی کرنے کی نہیں بلکہ اس کی حمایت کرنے کی خواہش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ طباطبائی ایک نقابلیت پسند تھا' نہ کہ استرداد پسند۔

اس نے ادراک حاصل کیا کہ عقیدے اور منطق' اسلامی فلسفہ اور حقیقت پسندی کے درمیان مکمل ترین ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دراصل اس کا کہنا تھا کہ سچا ایمان...... اور اسلامی فلسفہ اس کا عکس ہے...... مکمل طور پر استدلالی ہے۔ چنانچہ اس کا مقصد اسلامی فلسفہ اور حقیقت پسندی کو منکشف کرنا تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ طباطبائی مجدد نہیں تھا۔ اس نے حقیقت پسندی کو اسلامی روایتی فلسفہ کے معاصر فلسفیانہ مسائل کے ساتھ مربوط کرنے کے لئے داخلی دروازہ خیال کیا۔

جس مسئلے کا طباطبائی نے سامنا کیا' یہ تھا کہ صدری عرفانیت کی صوفیانہ جہت کو حقیقت پسندی کے ساتھ کس طرح مرتب کیا جائے' جو صداقت کو تجرباتی خیال کرتی ہے۔ اس کی شخصیت میں یہ مسئلہ بہت حد تک حل ہو گیا۔ وہ ایک مثالی استاد اور مذہبی رہنما تھا۔ جس طرح اس کی ذات تعلیم و تربیت کی اسلامی روایت کی بہترین تجسیم اور رشک کا ایک منبع تھا' اسی طرح یہ اس کے اپنے تناظر کی صداقت کا انتہائی واضح اظہار بھی تھا۔ اس کی شخصیت میں فلسفہ اور تصوف' اور عرفانیت و حقیقت پسندی کا امتزاج موثر بھی تھا اور واضح بھی۔

اسلامی فلسفہ کو حقیقت پسندی کا ہم پلہ ثابت کرنا ہی نہیں بلکہ فلسفیانہ مسائل پر گفتگو میں بھی حقیقت پسندانہ طریقہ کار اپنانا اس کا اصل کام ہے۔ اس نے اپنی تصنیفات میں شعوری طور پر دلیل بازی کے روایتی انداز اور ڈھنگ سے دامن چھڑایا اور اس کی بجائے حقیقت پسندانہ طریقہ کار پر انحصار کیا۔ چنانچہ اس کا انداز کار دانشورانہ اثرات کے اعتبار سے اہم تھا۔ اس نے دینیات اور فقہ کے مسائل پر بات کرنے میں حقیقت پسندی کا استعمال کیا۔ مثلاً اس کی تفسیر قرآن "نہج البلاغہ" محمد باقر مجلسی کی "بہار الانوار" کی شرح روایتی شیعہ مذہبی علوم کے اندر حقیقت پسندی کو شامل کرنے کی شعوری کوشش ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے طباطبائی کو اپنے نظریات دانوں میں سے ایک تسلیم کیا۔ یہ جزوا اس زبردست عزت افزائی کا اظہار ہے جو آیت اللہ خمینی (جو خود بھی صدری فلسفی تھے) نے طباطبائی کو دی' اور اس کی کچھ وجہ یہ ہے کہ طباطبائی کے کچھ شاگرد انقلاب میں شامل تھے۔ پھر بھی وہ محض ایک نظریہ دان سے بڑھ کر تھا۔ اس بات کی شہادت موجود ہے۔ کہ اس نے انقلاب کو تسلیم نہ کیا تھا اور 1981ء میں اپنی وفات تک سیاست سے لاتعلق رہا۔ وہ زندگی بھر سب سے پہلے فلسفی تھا اور اس کے بعد ایک مسلمان مفکر' فقہ دان اور عالم دین۔

ساتواں حصہ

سائنسدان، سیاح، محقق

جابر بن حیان

(731ء----815ء)

جابر بن حیان کو دنیا کا پہلا مستند کیمیادان خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی اندازاً تاریخ پیدائش 731 عیسوی' اور مقام پیدائش طوس یا خراسان تھا۔ دواسازی اور دوافروشی اس کا ذریعہ روزگار تھا۔ حکومت سے بغاوت کی پاداش میں اسے قید اور پھر قتل کر دیا گیا۔ شیر خواری میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ماں نے اپنے معصوم بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی فکر کی۔ جابر بن حیان نے کچھ ہوش سنبھالی تو ماں نے اسے کوفہ کے مضافات میں بدوؤں کے ساتھ پرورش پانے کے لیے بھیج دیا۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جوان ہونے کے بعد بھی وہ کوفے میں اقامت پذیر رہا۔ اس زمانے میں کوفہ میں علم و تدریس کا بڑا چرچا تھا۔ جابر نے باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت کی مروج یونانی تعلیمات نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ علم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو سونا بنانے کے جنون میں مبتلا دیکھا تو خود بھی یہی روش اپنا لی۔ کافی تجربات کے بعد بھی وہ سونا تیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن کیمیا میں حقیقی دلچسپی کی وجہ سے اس نے تجربات کا سلسلہ ختم نہ کیا۔

جابر بن حیان کے دینی خیالات کے متعلق مختلف آراء ملتی ہیں۔ کچھ مورخین کے مطابق وہ معتزلہ' قرامطہ' فاطمی' اسماعیلی' فرقہ نصیریہ اور صابیوں کے عقائد سے بہت متاثر تھا۔ اس کی زندگی' نظریات' تصانیف' عقائد' نام' استاد کے بارے میں کوئی حتمی بات موجود نہیں۔ کچھ محققین کے خیال میں ایک یونانی شخص GEBER ہی جابر تھا۔ لیکن دونوں کی تصانیف ان کی علیحدہ علیحدہ شخصیات کی آئینہ دار ہیں۔ جابر کی تصانیف کی تعداد کم از کم 22 اور زیادہ سے زیادہ 27 بتائی جاتی ہے۔ اس کے بیشتر مجموعوں کے عنوانات کسی عدد پر مبنی ہیں۔ جیسے "کتب الخمسمائۃ" (500)' "المائۃ والاعشر" (112) وغیرہ۔ 28 کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حرف تہجی اور چاند کی منازل

دونوں کی تعداد 28 ہے۔ یہ دو دیگر اعداد 4 اور 7 کا حاصل ضرب ہے۔ علم ریاضی کے سلسلہ اعداد 28، 21، 15، 10، 6، 3، 1 کا ساتواں عدد ہونے کے علاوہ یہ اپنے اجزائے ضربی 14، 7، 4، 2، 1 کا حاصل جمع ہے اور اس لیے اسے ایک کامل عدد خیال کیا جاتا ہے۔ جابر کے ہاں 8، 5، 3، 1 کے سلسلے کا بھی بہ کثرت استعمال ہے جس کا حاصل جمع 17 ہے۔ اسماعیلی عدد 17 کو بڑا مقدس اور مذہبی طور پر اہم سمجھتے ہیں۔ جابر کا نظریہ میزان عدد 17 کی بنیاد پر ہی ہے۔

جابر کی فکر میں نظریہ میزان کی حیثیت کلیدی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ میزان متعدد جگہ پر آیا۔ اس سے کائناتی توازن کے علاوہ دونوں جہاں میں اللہ کا عدل اور روز قیامت کی جزا و سزا بھی مراد ہے۔ اسلامی تصوف میں تصور میزان اہم کڑی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ میزان کی منہ بولتی تصویر ہے۔ آفتاب، ماہتاب، جمادات، حیوانات، نباتات، تمام جاندار و غیرہ جاندار اشیاء کی حرکت اور سکون کا دار مدار میزان پر ہے۔ میزان کائناتی اصولوں کا مرکز و محور ہے۔ جابر کے نزدیک 17 کا عدد اسی توازن کا مظہر ہے جس کی بنیاد پر دنیا وجود میں آئی اور قائم ہے۔ یوں انیسویں صدی کے انگریز مفکروں کی طرح جابر بن حیان نے بھی سائنسی نظام کا رشتہ اپنے دینی عقائد کے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پوری دنیا میں علمی، سائنسی اور فکری حوالے سے دوسری صدی عیسوی کے بعد کوئی اہم شخصیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ بقراط، ارسطو، اقلیدس، ارشمیدس، بطلیموس اور جالینوس کے بعد صرف سکندریہ کی آخری محقق ہائپاتیا چوتھی صدی عیسوی میں گزری تھی۔ لہٰذا علمی میدان میں چھائی ہوئی تاریکی میں روشن ہونے والی پہلی شمع جابر بن حیان تھا۔ اس کے بعد گیارھویں صدی تک مسلمان سائنسدانوں اور مفکروں کا غلبہ رہا۔

جابر بن حیان کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی کے علاوہ دیگر یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ تقریباً آٹھ نو سو سال تک کیمیا کے میدان میں وہ تنہا چراغ راہ تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جدید کیمیا کے احیاء سے قبل جابر کے نظریات کو ہی حرف آخر خیال کیا گیا۔ بطور کیمیادان اسکا ایمان تھا کہ علم کیمیا میں تجربہ سب سے اہم چیز ہے۔ اس نے عملی طور پر دنیا کو دکھا دیا کہ کچھ جاننے اور سیکھنے کے لیے صرف مطالعے یا علم کے علاوہ خلوص اور تندہی کے ساتھ تجربات کی بھی ضرورت ہے۔ وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی سوچ اور تجربے میں منہمک رہتا۔ گھر نے ہی تجربہ گاہ کی صورت اختیار کر لی۔ سونا بنانے کی لگن میں اس نے بے شمار حقائق دریافت کیے اور متعدد ایجادات کیں۔ حتیٰ کہ عباسیوں کے پایہ تخت بغداد میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا جو اس وقت علم کا بہت بڑا مرکز بن چکا تھا۔ وہ زمانہ خلیفہ

ہارون الرشید کی خلافت کا تھا۔ ان کا وزیر جعفر برمکی علم کا دلدادہ تھا۔ اسی نے جابر کو دعوت دی کہ بغداد آئے جہاں اس کی بہت عزت افزائی ہوئی اور انعامات ملے۔

جابر نے اپنے علم کیمیا کی بنیاد اس نظریئے پر رکھی کہ تمام دھاتوں کے اجزائے ترکیبی گندھک اور پارہ ہیں۔ مختلف حالتوں میں اور مختلف تناسب میں ان دھاتوں کے اجزائے ترکیبی ملنے سے دیگر دھاتیں بنیں۔ اس کے خیال میں دھاتوں میں فرق کی بنیاد اجزائے ترکیبی نہیں بلکہ ان کی حالت اور تناسب تھا۔ لہٰذا معمولی اور سستی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا ممکن تھا۔ جابر نے کئی مرتبہ گندھک اور پارے کو ملایا لیکن ہمیشہ شنگرف (Cinnabar) ہی بنتا تھا۔ چنانچہ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ سونا عام گندھک نہیں بلکہ سرخ رنگ کی خصوصی گندھک "گوگرد سرخ" سے بنتا ہے۔ بعد کی آٹھ صدیوں میں لوگوں نے اس خصوصی گندھک کی تلاش میں بہت سر مارا لیکن ناکام رہے۔

اس میں مشاہدہ' ذہانت' لگن اور انتھک محنت کرنے کی صلاحتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دوسرے وہ یہ سمجھتا تھا کہ منزل مقصود کبھی نہیں آتی' جسے پالیا وہ منزل نہیں۔ اس شعور نے اسے کائنات کی تحقیق میں آگے ہی آگے بڑھتے جانے کی دھن اور حوصلہ دیا۔ جابر قرع دانبیق نامی ایک آلے کا موجد بھی تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں کیمیادی مادوں کو پکایا جاتا' اور مرکب سے اٹھنے والے بخارات کو نالی کے ذریعہ آلے کے دوسرے حصے میں پہنچا کر ٹھنڈا کر لیا جاتا تھا۔ یوں وہ بخارات دوبارہ مائع حالت اختیار کر لیتے۔ کشید کا یہ عمل کرنے کے لیے آج بھی اسی قسم کا آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا موجودہ نام ریٹارٹ ہے۔ ایک مرتبہ اس میں سے بھورے رنگ کے بخارات اٹھے اور آلے کے دوسرے حصے میں جمع ہو گئے جو تانبے کا بنا ہوا تھا۔ حاصل شدہ مادہ اسقدر تیز تھا کہ دھات گل گئی۔ جابر نے مادے کو چاندی کے کٹورے میں ڈالا تو اس میں بھی سوراخ ہو گئے۔ چمڑے کی تھیلی میں ڈالنے پر بھی یہی نتیجہ نکلا۔ جابر نے مائع کو انگلی سے چھوا تو وہ جل گئی۔ اس کاٹ دار اور جلانے کی خصوصیت رکھنے والے مائع کو اس نے "تیز آب" یعنی تیزاب کا نام دیا۔ پھر اس تیزاب کو دیگر متعدد دھاتوں پر آزمایا لیکن سونے یا شیشے کے علاوہ سب دھاتیں گل گئیں۔ جابر مزید تجربات میں جت گیا' آخر کار اس نے بہت سے کیمیائی مادے مثلاً گندھک کا تیزاب اور ایکوا ریجیا بنائے۔ حتیٰ کہ اس نے ایک ایسا تیزاب بنایا جس سے سونے کو بھی پگھلانا ممکن تھا۔ اس نے دھات کا کشتہ بنانے کے عمل میں اصلاحات کیں اور بتایا کہ دھات کا کشتہ بنانے سے اس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ عمل کشید اور فلٹر کا طریقہ بھی اس کا ایجاد کردہ ہے۔ اس نے قلماؤ یعنی کرسٹلائزیشن کا

طریقہ اور تین قسم کے نمکیات دریافت کیے۔ اس کے علاوہ لوہے کو زنگ سے بچانے' لوہے پر وارنش کرنے' موم جامہ بنانے' چمڑے کو رنگنے اور خضاب بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

دنیا اپنی ڈگر پر چلتی رہی اور جابر اپنے تجربات و مشاہدات کی کائنات میں محو رہا۔ کیمیاوی مرکبات کو پکانے سے پیدا ہونے والے دھوئیں نے اس کی بینائی کو متاثر کیا۔ تیزابوں سے اس کی انگلیاں جھلستی رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 815ء میں وہ طوس کے مقام پر اس دنیا سے چلا گیا لیکن کیمیا کے میدان میں نوع انسانی کو ایک ایسا ابدی جذبہ اور لگن عطا کر گیا جو آج مریخ اور چاند پر زندگی کے آثار دریافت کرنے والے محققین میں بھی موجزن ہے۔

الطبری

(نا معلوم ـــــ 815ء)

الطبری ایران کے مشہور صوبے طبرستان میں پیدا ہوا۔ یہ صوبہ بحر قزوین کے جنوب میں واقع ہے۔ وہ زیادہ عرصہ اپنے آبائی علاقے میں نہیں رہا' بلکہ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بغداد میں گزارا۔ اس کی کنیت ابو حفص تھی۔ اس کے والد نے قدیم ایرانی نام فرخان اپنالیا تھا۔ فرخان ان ایرانی فضلاء میں سے ایک تھا' جو پہلویوں کی سائنسی تصانیف کو عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے اولین عباسی خلفاء کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ سب سے پہلے درباری منجموں کے ایک گروہ کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس گروہ میں اس کے علاوہ نوبخت' ماشاء اللہ اور الفزاری جیسے نامور افراد شامل تھے۔ عباسی خلیفہ المنصور نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بغداد کی بنیاد رکھنے کے لیے کسی مبارک گھڑی کا انتخاب کر کے بتائیں۔ ان سب نے متفقہ طور پر 30 جولائی 762ء کا انتخاب کیا۔ الطبری سے متعلق آخری تاریخ شوال جون تا 13 جولائی 812ء ملتی ہے' جب اس نے بطلیموس کی "کتاب الاربعہ" (Tetrabiblos) کا ترجمہ کیا تھا۔ ایک ماخذ کے مطابق الطبری نے تین سال بعد یعنی 815ء میں مامون الرشید کے عہد میں وفات پائی۔ ان تاریخوں کی روشنی میں ابو معشر کے اس قول کی تردید ہوتی ہے کہ الطبری کو مامون الرشید کے وزیر الفضل ابن سہل (متوفی 818ء) نے بغداد بلایا اور اسی نے المامون سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ ابو معشر کے اس قول کو اس کے شاگرد شاذان نے اپنی تصنیف "مذاکرات" میں نقل کیا ہے اور صاعد الاندلسی اور ابن القفطی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تائید کی ہے۔ ابو معشر کا یہ کہنا کسی حد تک معتبر سمجھا جاتا ہے کہ الطبری یحییٰ بن خالد ابن برمک (متوفی 807ء) کے قریبی لوگوں میں سے تھا۔

الطبری کے خانگی حالات کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ اس کا ایک بیٹا تھا' جس کا نام ابو بکر محمد تھا۔ اس نے بھی علم نجوم اور فلکیات پر بہت کچھ لکھا تھا۔ بد قسمتی سے معروف تذکرہ

نویس ابن الندیم نے اپنی تصنیف "الفہرست" میں ان دونوں باپ بیٹے کی تصانیف کو گڈمڈ کر دیا ہے۔
ذیل میں عمر ابن الفرخان کی تصانیف کی ایسی فہرست دی جا رہی ہے جو نسبتاً قابل اعتماد ماخذ سے حاصل کی گئی ہے :

1۔ بطلیموس کی "کتاب الاربعہ" کی "تفسیر" یہ کتاب 15 جون سے 13 جولائی 812ء تک کے دوران یعنی ایک ماہ میں مکمل ہوئی۔ اس کا مخطوطہ اپسالا کی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کے تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر ابن الفرخان نے غالباً پہلوی ترجمے سے اس کو اپنی زبان میں نقل کیا ہے' لیکن ابن الندیم کی تحقیق کے مطابق عمر نے ابو یحیی البطریق کے ترجمے سے مدد لی ہے۔ ابو یحیی نے یہ ترجمہ اصل یونانی کتاب سے کیا تھا۔ قرین قیاس یہ بات ہے کہ عمر نے البطریق کی درخواست پر پہلوی ترجمے کی مدد سے یہ کتاب لکھی ہوگی۔

2۔ سیدون (Sidon) کے ڈروتھیئس (Dorotheus) کی فلکیاتی تصنیفات کی ایک "تفسیر" : یہ کتاب پانچویں صدی کے اوائل کی پہلوی تقاریظ کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں' ایک ترکیہ میں اور دوسرا برلن میں۔

3۔ "مختصر مسائل القیصرانی" میں قیصری استفسارات کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس کے 138 باب ہیں اور اس کے بہت سے قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں قیصرانی کا نام غیر معروف رہتا ہے اور اس میں ابو یوسف یعقوب ابن علی القیصرانی کی "جامع الکتاب" سے کچھ نہیں لیا گیا۔ ابو یوسف یعقوب نویں صدی عیسوی کے آخری دور میں جرجان اور استرآباد کے درباروں سے منسلک رہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب وہی ہو' جو "کتاب الاختیارات" کے عنوان سے اسکندریہ میں موجود ہے۔

4۔ "کتاب فی الموالید" : یہ طالع بینی (genethlialogy) پر ایک مختصر کتابچہ ہے' جو عربی میں لکھا گیا ہے اور اس کا واحد قلمی نسخہ ترکیہ کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ غالباً لاطینی میں پائی جانے والی ایک کتاب سے (مشتمل بر تین حصے) بالکل ملتی جلتی ہے۔

5۔ "کتاب العلل" کے بارے میں واحد ماخذ البیرونی کی شمسی مساوات سے متعلق کتاب ہے جو "رسائل البیرونی" کے پہلے حصے کے طور پر طبع ہوئی (مطبوعہ حیدر آباد دکن 1948ء) اس کتاب میں وہ تخمینی طریقے بتاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے اپنا ایک پورا رسالہ "عمر کی فلکیات" کی ناموزونیت کو ظاہر کرنے کے لیے مختص کر دیا ہے۔ یہ بات وہ اپنی "کنایات" میں بتاتا ہے۔

ابو عثمان جاحظ

(776ء ---- 868ء)

جاحظ کا نام سائنسدانوں کے بہت کم تذکروں میں ملتا ہے۔ بعض کتابوں میں اس کا نام ایک عالم دین اسلام' دانا اور ایسے ادیب کی حیثیت سے درج ہے' جسکو عربی نثر لکھنے میں کمال حاصل تھا؟ اس لئے یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ جاحظ کا سائنسدانوں میں شمار کہاں تک درست ہے' کیونکہ سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا فکری رجحان سائنس سے زیادہ ادب کی طرف ہے۔ اس کی اکثر تصانیف' یہاں تک کہ کتاب "الحیوان" تک پر بعض دفعہ یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تفریح طبع کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ علم الحیوانات کے میدان میں اس کی کوشش کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

ابو عثمان عمرو بن بحر الفقیمی 776ء میں عراق کے شہر بصرہ میں ایک حبشی خاندان میں پیدا ہوا۔ پیدائشی طور پر اس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکلے ہوئے تھے' اس لئے لوگوں نے اس کو جاحظ کہنا شروع کر دیا۔ اس کی ابتدائی تربیت گاہ بصرہ ٹھہری' جس نے اس پر ایسا رنگ جمایا کہ ایک عمر گزارنے کے بعد بھی وہ اس کے سحر سے آزاد نہ ہو سکا۔ جاحظ ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں نہ روپے پیسے کی ریل پیل تھی اور نہ علم اور فصاحت وبلاغت ہی کے دریا بہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالی نے خزانے کی کنجی اس کے ہاتھ میں دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔ وہ بے پناہ ذہین تھا اور اس کے تجسس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ علم و حکمت کو ہم درسگاہوں کی چار دیواری یا کتابوں کے اوراق میں قید نہیں کر سکتے۔ جاحظ کے لیے کل دنیا اور زندگی درسگاہ تھی۔ اس کو نت نئے لوگوں سے ملنے اور باتیں کرنے کا چسکا تھا۔ کبھی وہ ملاحوں سے ان کے پیشے اور زندگی کے بارے میں سوال جواب کرتا اور کبھی خانہ بدوشوں سے ان کے نظریات اور طرز زندگی کے بارے میں گفتگو کرتا نظر آتا۔ جب یہ ممکن نہ ہوتا تو مسجد میں جا بیٹھتا جہاں لوگ جمع ہو کر مختلف مسائل پر اظہار خیال اور بحث و مباحثہ کیا کرتے

تھے۔ پہلے تو کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے غور سے باتیں سننے والے اس لڑکے کی موجودگی کو سنجیدگی سے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں' پیشوں' طبقات اور نظریات کے متعلق اس کی رائے بڑی صائب ہے۔ کچھ ہی دنو ں میں وہ لسانی' تحقیقاتی اور اسی طرح کے دوسرے علمی اور ادبی حلقوں میں شرکت کرنے لگا۔ یہ سب تو اس کی عملی تعلیم کا قصہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کو مطالعہ کا جنون تھا۔ جو کتاب ہاتھ لگتی' اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ یونانی تعلیمات اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں اور وہ ارسطو سے متاثر تھا۔ خوش بختی سے اس کو الاصمعی' ابو عبیدہ اور ابو زید جیسے باکمال اساتذہ سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔

بعد میں کسی وقت وہ بصرے سے بغداد چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیشتر وقت بغداد اور سامرہ میں گزرا۔ بغداد اس وقت اپنے عروج پر تھا۔ وہاں کی علمی فضا کا جاحظ کی شخصیت کی تراش خراش میں بڑا حصہ رہا۔ اگر اس کی فکری تاریخ میں بصرے کی چھاپ انمٹ تھی تو بغداد کا نقش بھی کچھ کم گہرا نہیں تھا۔ جو بیج بصرے میں بویا گیا تھا' اس کی آبیاری بغداد میں ہوئی۔ فکری اعتبار سے جاحظ کا تعلق معتزلہ سے تھا۔ اس کے اس مسلک کو بغداد میں مزید تقویت ملی۔ وہ عقلیت پرست ہے اور ہر بات کو تسلیم کرنے سے پہلے' عقلی دلائل طلب کرتا ہے۔ اس کو روایت پرستی سے نفرت ہے اور کسی کے قول کو بغیر تفتیش و تحقیق کے نہیں مانتا۔ بلکہ ان لوگوں پر کڑی تنقید کرتا ہے جو آنکھ بند کر کے ہر ایک بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نظریات و عقائد اکثر ہمعصروں کے نظریات و عقائد سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔

عربی کتب میں جاحظ کی تقریباً دو سو تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے' جن میں سے بیشتر دستبرد زمانہ ہو گئیں۔ اب بمشکل تیس دستیاب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تصانیف بڑے لوگوں کے ناموں سے منسوب کر کے ان سے معقول رقمیں وصول کیا کرتا تھا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اس نے جو کچھ کمایا اپنے زور قلم سے کمایا' کیونکہ اس کی کسی مستقل ملازمت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگرچہ اس کو گاہے گاہے دربار سے وظیفے ملتے رہتے تھے اور وہ ایک طرح کا غیر رسمی مشیر تھا۔ اس کے علاوہ خلفاء کے ساتھ نہیں لیکن امراء اور سربر آوردہ شخصیتوں کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے۔

اس کی تصانیف ہر قسم کی اور مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ بعض بہت طویل ہیں' کچھ بہت مختصر اور کچھ کی ضخامت اوسط درجے کی ہے۔ اس کے پسندیدہ موضوعات ادب' الٰہیات' مذہب اور سائنس ہیں۔ نظریات اور تجربات کی حد تک اس کو علم کیمیا میں بھی دخل ہے لیکن سونا بنانے میں

وہ کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کرتا۔ اس کی تمام تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ تو دوسرے ادیبوں اور مصنفوں کی تحریروں کے انتخاب اور ان پر تبصروں پر مبنی ہے' دوسرا حصہ طبعزاد تصانیف اور مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ تصانیف اپنے عنوانات کے تنوع کے اعتبار سے نہایت دلچسپ ہیں: کتاب الحیوان' کتاب البیان والتبیین' کتاب العثمانیہ' المعاد والمعاش' السر وحفظ اللسان' کتاب الرد علی النصاریٰ' رسالہ فی مناقب الترک اور کتاب الربیع والقدویر۔

ان تصانیف میں سے سب سے زیادہ اہم کتاب الحیوان ہے۔ ہمارے علم میں یہ اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ ضخیم کتاب سات حصوں پر مشتمل اور نامکمل ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ایک بھی مستند نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کا انگریزی' سپانوی اور دوسری یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کتاب کی ضخامت اور موضوع دیکھ کر قاری کو خیال ہوتا ہے کہ یہ علم الحیوان کے بارے میں کوئی جامع تصنیف ہوگی' لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جاحظ نے صرف ان جانوروں کا تذکرہ کیا ہے جن میں اس کو خود دلچسپی ہے یا جو اس کے مشاہدہ میں بہ آسانی آتے ہیں۔ باقی تمام جانوروں کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً بڑے ممالیہ جانوروں' کچھ پرندوں اور حشرات یعنی مکھیوں' مچھروں' بچھوؤں اور جوؤں کا ذکر ہے لیکن مچھلیوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ اس کے پاس مچھلیوں کے بارے میں مستند مواد نہیں تھا۔ وہ ارسطو کے نظریہ حیوانات سے متاثر نظر آتا ہے' لیکن اس پر مکمل انحصار نہیں کرتا۔ اس کتاب میں بھی ادبی اور ثقافتی رنگ نمایاں ہے۔ اس نے جانوروں کے بارے میں تمام قصے' کہانیاں' لطیفے اور توہمات بھی بیان کی ہیں جو عربوں میں مشہور ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود جاحظ کے مطالعے کی گہرائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے جن حیوانات کا ذکر کیا ہے' ان کے بارے میں نہایت دلچسپ اور قابل قدر معلومات مہیا کی ہیں۔ اس نے ایک ایک جانور کی عادات واطوار کا مشاہدہ کر کے تفصیل بیان کی اور بتایا ہے کہ کون سے جانور دوڑتے ہیں' کون سے رینگتے ہیں' کون سے تیرتے ہیں اور کون سے اڑتے ہیں۔ اس نے ممالیوں کی جگالی کے عمل کی بھی وضاحت کی ہے۔ وہ جانوروں کو ضرر رساں اور بے ضرر کے خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ جانور جن کو انسان نقصان دہ سمجھتا ہے نقصان دہ ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان جانوروں سے کسی اور مخلوق کو کسی اور طرح فائدہ پہنچتا ہو۔ اس کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بغیر کسی وجہ کے نہیں بنائی۔ ہر مخلوق کا کاروبار دنیا میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کو نقصان دہ قرار دینا غلط ہے۔ اس کے بجائے وہ

جانوروں کو ان کی خوراک کی بنیاد پر یعنی گوشت خور اور سبزی خور کے گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پرندوں کو اس نے شکاری اور اپنا بچاؤ نہ کرسکنے والے پرندوں میں بانٹا ہے۔ اس کو جانوروں کی اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت میں بہت دلچسپی ہے۔ اس نے ایک اور نظریے پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے نظام میں بغیر ماں باپ کے پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہے ورنہ برف میں سے مینڈک برآمد نہ ہوتے۔ اس نے جانوروں کی جنسی زندگی اور جنسی بے قاعدگیوں میں بہت دلچسپی لی ہے۔ اپنے ان تمام موضوعات کی وضاحت کے لیے اکثر وہ تصویروں کا سہارا لیتا ہے۔ سوائے ایک تصویر کے باقی تمام تصویریں ایک رنگ کی ہیں۔ یہ تصاویر جانوروں کی زندگی کے مختلف مراحل کے بارے میں ہیں۔ رنگین تصویر میں ایک شتر مرغ کو انڈوں پر بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ جاحظ کا خیال ہے کہ جانور جو آوازیں نکالتے ہیں وہ بے معنی شور نہیں بلکہ باقاعدہ بولیاں ہیں جن کے یقیناً کوئی نہ کوئی معنے ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں انسان میں ہر جانور کی کوئی نہ کوئی خصوصیت موجود ہے۔ اس لئے انسان کو ایک چھوٹی سی کائنات کہا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی نے جہاں اور بہت سے کام کئے وہاں ماضی کے دفینوں کو منظر عام پر لانے کا کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے۔ علم کے متلاشی پرانے مخطوطات کی کھوج میں رہتے ہیں۔ جاحظ کے بہت سے قیمتی نسخے دریافت ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ ایک نہ ایک دن "کتاب الحیوان" کا بھی کوئی مستند نسخہ ضرور شائع ہوگا۔

محمد بن موسیٰ خوارزمی

(780ء ---- 850ء)

محمد بن موسیٰ الخوارزمی 780ء میں خیوا (خوارزم) میں پیدا ہوا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک غریب گھرانے کا یہ چشم و چراغ تمام دنیا کو روشنی دکھا جائے گا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں بھی مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بیشتر کتابوں میں صرف تاریخ وفات درج ہے۔ شاید تاریخ سے اتنا فرق نہیں پڑتا کیونکہ محمد ابن موسیٰ خوارزمی ان لوگوں میں سے ہے جو زمان و مکاں کی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کا دور بغداد میں سائنسی ترقی کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ خلیفہ مامون اہل علم کا بڑا قدردان تھا۔ وہ دنیا بھر سے چن چن کر علماء اور ماہرین کو اپنے دربار میں بلاتا اور ان کو مناسب سہولتیں مہیا کر کے علمی اور تحقیقاتی کاموں میں ان کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات فرمائش کر کے کتابیں بھی لکھواتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں علماء کا جو گروہ اکٹھا کر لیا تھا' ان کے درمیان اکثر مباحثے اور مناظرے ہوتے تھے اور وہ خود بھی ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ بیت الحکمۃ اسی کے زمانہ خلافت میں قائم ہوا جہاں اسلامی دنیا کے بہترین دماغ تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ عرصے میں ہی بیت الحکمۃ کی وہی حیثیت ہو گئی جو زمانہ جدید میں لندن کی کیونڈش لیبارٹریز اور سائنس کی رائل سوسائٹی کی ہے۔ ہر طرف سے علم کے طالب شہد کی مکھیوں کی طرح بیت الحکمۃ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

محمد بن موسیٰ اپنے وطن میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کو کسی کی پرواہ بھی نہ تھی۔ اس کو مطالعہ کا انتہائی شوق تھا اور جو کتاب بھی ہاتھ لگتی' اسے پڑھ ڈالتا۔ یوں تو اسے ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن وہ فنی کتابیں دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں

(غالباً 825ء میں) بیت الحکمۃ کی کشش اس کو بھی بغداد کھینچ لائی۔ وہ بڑی خاموشی سے بغداد کی علمی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا تھا' اس کا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا تھا کہ کچھ کرنے کے لیے بیت الحکمۃ میں اس کی شمولیت ناگزیر ہے۔ لیکن جس شخص کو اپنے وطن میں کوئی نہ جانتا ہو اس کو بغداد میں کون پہچانتا۔ بہر حال بیت الحکمۃ کی رکنیت کا سودا ایسا اس کے سر پر سوار ہوا کہ وہ ترکیبیں سوچتا رہتا تھا کہ کس طرح اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ جدت اور اختراع تو اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کیے ہی تھے' چنانچہ ایک دن اس کو ایک انتہائی اچھوتا خیال سوجھا۔ اس نے شب و روز کی دیدہ ریزی سے علم ریاضی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔ مقالہ تیار ہو گیا تو اس نے بیت الحکمۃ بھیج دیا۔ اس مقالے کے پہنچتے ہی بیت الحکمۃ میں کھلبلی مچ گئی۔ خوارزمی کو فوراً طلب کر لیا گیا۔ دارالحکومت کے ذہین ترین علماء کا ایک بورڈ بیٹھا' اس سے اس کے مقالے کے بارے میں سوالات کیے گئے اور آخر کار اس کو بیت الحکمۃ کی رکنیت دے دی گئی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے مقالہ لکھنے کا طریقہ نکالا۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مقالہ لکھنے کا یہ طریقہ ابھی تک رائج ہے۔ اب بھی ڈگری کے امیدوار کو پروفیسروں کے ایک بورڈ کے سامنے مقالے کے بارے میں کیے گئے سوالات کا جواب دینا پڑتا ہے' جو De-fence کہلاتا ہے۔

اب خوارزمی گمنام نہیں رہا تھا۔ اب وہ مامون کے دربار کی ایک اہم شخصیت اور خلیفہ مامون کا منظورِ نظر تھا۔ مامون نے اس کے سپرد یونانی کتابوں کو اکٹھا کرنے اور ان کا ترجمہ کرنے کا کام کر دیا۔ خوارزمی کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس کا بیشتر وقت مامون کے کتب خانے میں گزرنے لگا۔ وہ سب کتابیں چاٹ گیا۔ جو وقت بچتا تھا وہ ان علماء کی صحبت میں گزارتا تھا جو اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ ادھر مامون کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہر وقت اس کو اپنے ساتھ رکھے۔ وہ خوارزمی کی بے انتہا قدر و منزلت کرتا تھا۔

وہ ایک مقتدر ماہر فلکیات' ریاضی دان اور تاریخ دان تھا۔ لیکن سائنس کی تاریخ میں اس کی اصل اہمیت ریاضی دان کی حیثیت سے ہے' مامون کی فرمائش پر اس نے ایک کتاب "علم الحساب" لکھی۔ اس کا موضوع علم ہندسہ ہے اور اس میں ریاضی کے اہم نکات اور نئے اصول و قواعد پر بحث کی گئی ہے۔ خلیفہ کو یہ کتاب بے حد پسند آئی اور اس نے خوارزمی کو دل کھول کر نوازا۔ دوسری کتاب "الجبر و المقابلہ" بھی مامون نے کہہ کر لکھوائی۔ "علم الحساب" کی طرح یہ کتاب بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ الجبرے کے علم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے خوارزمی کو

اتفاق رائے سے الجبرے کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ الجبرے کی اصطلاح بھی اس کی اپنی اختراع ہے۔ اس کتاب میں سادہ (linear) اور دو درجی (Quadratic) مساواتوں کے حسابی حلوں' ابتدائی ہندسہ اور تقسیم کے مسائل کے حل کے لیے قوانین منضبط کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ریاضی کی کلدانی' یونانی' عبرانی اور ہندوستانی روایات کے تقریباً تین ہزار برس پر حاوی ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا' اگرچہ اس پر عمل دیر میں کیا گیا۔ اہل یورپ کو الجبرے سے متعارف کروانے کا سرا خوارزمی کے سر ہے۔ اس کے دریافت کردہ قاعدے اور قوانین آج تک سکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

خوارزمی نے نہ صرف صفر کا ریاضی میں درست استعمال کیا بلکہ ایک سے لے کر نو تک کے ہندوسوں کو الگ الگ استعمال کیا۔ اس زمانے میں یورپ میں رومن ہندوسوں کا رواج تھا۔ خوارزمی کی کتب کے تراجم پڑھ کر اہل یورپ نے اپنے حساب کتاب اور ہندسوں کا نظام بدل دیا جس سے جمع تفریق اور ضرب تقسیم کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ یہ ہندسے آج تک عربی ہندسے (Arabic Figures) کہلاتے ہیں۔

عربی ہندسے	رومن ہندسے
33	XXXIII
156	CLVI

خوارزمی نے ہندسی جدولیں تیار کیں اور سائن (Sine) اور مماس (Tangent) کی مقداریں درج کیں۔

اس زمانے میں فلکیات اور نجوم دونوں علم آپس میں گڈمڈ تھے اور دونوں علوم کا بہت زور تھا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ عرب ممالک کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے آسمان بالکل صاف نظر آتا تھا اور ستاروں سیاروں اور دوسرے اجرام فلکی کا مشاہدہ اور مطالعہ آسان تر تھا۔ یوں بھی صحراؤں اور سمندروں میں راستہ بھولے بغیر سفر کرنے کے لیے ستاروں اور سیاروں سے واقفیت ضروری تھی۔ وقت کا تعین بھی اجرام فلکی کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ نماز پنجگانہ' سحر و افطار اور عیدین کے صحیح اوقات جاننے کے لیے سورج کے طلوع و غروب کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے کے ماہرین فلکیات نے ستاروں کی کئی فہرستیں مرتب کی تھیں جو "زیچ" کہلاتی تھیں۔ ان "زیچ" میں ستاروں کے مقام' چمک' رنگ وغیرہ کے بارے میں تفصیل درج ہوتی تھی۔ خوارزمی کی لکھی ہوئی زیچ کا عنوان "فی زیچ" ہے۔ اس نے نجوم کے مسائل پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس

کے علاوہ اس نے آنحضرت ﷺ کی ولادت مبارک کے وقت کی مدد سے آپؐ کا زائچہ بنایا ہے اور ستاروں کی رو سے آپ ﷺ کی بعثت کے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ مامون کے کہنے پر اس نے افلاک اور کرہ ارض کے نقشوں کی ایک اٹلس تیار کی۔ اصطرلاب پر اس کی دو کتابیں ہیں۔ "کتاب العمل بالاصطرلاب" اور "کتاب عمل الاصطرلاب"۔ اس کی ایک کتاب نام "کتاب التاریخ" ہے۔

کہنے کو خوارزمی کے بارے میں ہماری معلومات بہت مختصر ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ چند اوراق کتابوں کے ایک بوجھ پر بھاری ہیں۔

عباس ابن فرناس

(نامعلوم ----- 887ء)

عباس ابن فرناس کے نام کو بعض اوقات ایک دوسرے سپانوی شاعر عباس بن ناصح (متوفی 844ء) کے نام کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا تعلق بھی سپانیہ سے تھا۔ وہ رندہ (Ronda) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہ نسلاً بربر تھا۔ اس کا انتقال 887ء میں ہوا۔

ابن فرناس بڑے اختراعی ذہن کا مالک تھا اور اس کی جستجو کا دائرہ شاعری اور انسانیات سے لے کر فلکیات اور ٹیکنالوجی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شخصیت باکمال تھی۔ وہ اپنی قصیدہ گوئی اور علم و فضل کی بدولت متواتر تین بادشاہوں یعنی الحکم اول' عبدالرحمٰن ثانی اور محمد اول کے دربار سے وابستہ رہا۔

ابن فرناس نے اپنی اختراعات اور ایجادات کی بدولت بہت شہرت حاصل کی اہل مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرانے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ پورے سپانیہ میں واحد شخص تھا' جو الخلیل ابن احمد کی علم عروض سے متعلقہ تصنیف کو سمجھ اور سمجھا سکتا تھا۔

ابن فرناس نے عراق کا سفر بھی کیا اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں اور اداروں کو بغور دیکھا۔ واپسی پر وہ اپنے ساتھ فلکیات کی مشہور کتاب "سند ہند" بھی لے آیا' جس نے یورپی فلکیات پر گراں قدر اثرات مرتب کیے اور اس کی مزید نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔

ابن فرناس کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس نے اڑنے کے لیے ایک غلاف تیار کیا جس میں پر اور متحرک بازو لگے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے تیار کردہ غلاف کی مدد سے خود اڑنے کا خطرہ مول لیا اور ایک غلاف اور مصنوعی پروں کے ساتھ ایک بلند چٹان سے کود پڑا' لیکن اس کی پرواز زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ نیچے اترتے ہوئے وہ زخمی ہو گیا اور کئی دن تک مرہم پٹی کراتا رہا۔ اس کے مخالفین پرواز میں اس ناکامی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس

نے پرندوں کی اڑان کا مطالعہ کرتے وقت اس چیز پر غور نہیں کیا کہ وہ نیچے آتے ہوئے اپنی دم کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ابن فرناس کی اس پرواز کا ذکر عربی اور سپانوی تحریروں میں اکثر ملتا ہے۔

ابن فرناس نے اپنے گھر میں ایک سیارگاہ بھی بنائی تھی' جس میں چاند ستاروں اور بجلی کی گرج چمک کا ماحول مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے بعض تنگ نظر عناصر کی جانب سے اس پر کفر کی تہمت بھی لگائی جاتی رہی' لیکن وہ ابن فرناس کی مقبولیت کو گھٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ابن فرناس نے ایک خاص قسم کا گھڑیال بنایا اور اسفیر یعنی کرہ فلکی بھی ایجاد کیا۔ Rock Crystal کی دریافت بھی اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ جن کتابوں میں اس کی اختراعات کا ذکر کیا گیا تھا وہ اب مکمل حالت میں دستیاب نہیں۔ لہذا اس بارے میں فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ بلور کی دریافت میں اس کا کیا حصہ تھا۔ تاہم بلور کی دریافت ابن فرناس سے منسوب کرنے والوں میں E.Levi

Provencal بھی شامل ہے جسے ابن حیان کی تصنیف "المقتبس" تک رسائی حاصل تھی۔ ایک ماخذ کے مطابق "المقتبس" کے مصنف نے ابن فرناس کے کئی تذکرے اور اشعار شامل تحریر کیے۔ اسی ماخذ کے مطابق اس گمشدہ کتاب یعنی "المقتبس" کا ایک مخطوطہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ مشہور مورخین ابن سعید اور مقری کے مطابق "وہ اندلس میں بلور کو ایجاد (دریافت) کرنے والا پہلا شخص تھا" اس بیان سے کئی مطلب اخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بلور کاٹنے کا طریقہ ابن فرناس ہی نے متعارف کرایا۔ اس سے یقیناً بلاد شرقیہ (خصوصاً مصر) کو کوارٹز کی برآمد پر بہت اثر پڑا ہو گا' کیونکہ اب یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ بلور کو وہیں کاٹ کر استعمال میں لایا جا سکتا تھا' جہاں سے یہ نکالا جاتا تھا۔ اس اختراع کے باوجود شیشہ سازی کی صنعت پر کوئی اثر نہ پڑا' جو سنہ عیسوی سے کم از کم تین سو سال پہلے شروع ہوئی تھی۔

ابراہیم الفزاری

(آٹھویں صدی کا نصف ثانی)

محمد ابن ابراہیم الفزاری کے حالات زندگی کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں' البتہ اتنا پتہ ملتا ہے کہ وہ فلکیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں بقید حیات تھا۔

الفزاری کا تعلق عرب کے ایک قدیم خاندان سے تھا جو کافی عرصہ پہلے کوفہ میں آکر آباد ہو چکا تھا۔ یاقوت نے الفزاری کے سلسلہ نسب کو ستائیس پشتوں تک معلوم کیا ہے۔ الفزاری کا نام سب سے پہلے 762ء میں بغداد کی تعمیر کے سلسلے میں منظر عام پر آیا جہاں اس نے نوبخت' ماشاء اللہ اور عمر ابن الفرخان الطبری جیسے ہیئت دانوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس کے بعد وہ عباسیوں کے دربار ہی سے وابستہ رہا۔ 771ء کے لگ بھگ سندھ سے ایک سفارتی وفد نے بغداد کا دورہ کیا جس میں ایک ہندوستانی ہیئت دان (جس کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن وہ یقیناً کنکا نہیں تھا) بھی شامل تھا۔ خلیفہ المنصور نے الفزاری کو اس ہندوستانی ہیئت دان کے ساتھ مل کر علم ہیئت سے متعلق سنسکرت کے ایک مسودے کو عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ اس کام میں یعقوب ابن طارق نے بھی ہندوستانی ہیئت دان کی معاونت کی۔

فلکیات سے متعلق سنسکرت کی متذکرہ بالا کتاب کا عنوان "مہاسدہانت" تھا اور اس کا تعلق "برہماپکش" سے تھا۔ وشنودھر موتر پر ان کی "پیتا مہاسدھانت" اور براہم گپتہ کی "براہم اسپھٹ سدھانت" اس کے دو بنیادی ماخذ تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ہیئت دان نے اپنے عربی رفقائے کار کو آریہ بھٹ اول کی تصنیف "آریہ بھٹیا" کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں۔

سنسکرت کے اس مسودے کے عربی ترجمے کو "زیج السند ہند" کا نام دیا گیا۔ اس ترجمے سے اسلامی فلکیات میں ایک عظیم روایت کی ابتدا ہوئی جس کے اثرات مشرق میں دسویں صدی عیسوی کے آغاز تک' جبکہ اندلس میں بارہویں صدی عیسوی تک' موجود ہے "زیج السند ہند" کی پہلی مشق

تحریر بھی الفزاری نے خود ہی لکھی اور اس کا نام "زیج السند ہند الکبیر" تھا۔

"زیج السند ہند الکبیر" پر "برہما پکش" کے علاوہ دوسری کتابوں کے واضح اثرات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ کلپا (Kalpa) کا نظام اور سیاروں کی اوسط حرکات ان کے اوج اور راسوں سے متعلق بیانات "زیج السند ہند" کی روایات کے مطابق ہیں تاہم مساواتوں کی اکثریت کو "زیج الشاہ" اور "آریہ بھٹیا" سے اخذ کیا گیا ہے "زیج الشاہ" ہندوستانی فلکیات میں آردھ راترک (Ardhara trika) مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتی ہے "زیج السند الکبیر" کا جغرافیائی حصہ "آریہ بھٹیا" اور ہرمس سے منسوب ایک ساسانی روایت کے اثرات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ الفزاری کی اس زیج میں بہت سے متضاد حقائق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفزاری نے مختلف ذرائع سے اسان اصول اکٹھے کیے اور ان میں کسی قسم کا باہمی ربط پیدا کیے بغیر ہی جوں کا توں نقل کر دیا۔

"زیج السند الکبیر" لکھنے کے بعد الفزاری نے 790ء کے لگ بھگ "زیج علی سنین العرب" مرتب کی۔ اس زیج میں الفزاری نے ایک سے لے کر ساٹھ سورا (Saura) دنوں کے لیے ایک تا چھ سورا دنوں کے لیے (چھ سورا دن ایک فلکی سال کے برابر ہوتے ہیں) ایک سے لے کر ساٹھ فلکی سالوں کے لیے اور ساٹھ سال کی مدت کی نامعلوم تعداد کے لیے سیاروں کی اوسط حرکت کو بڑے واضح انداز میں ترتیب دیا ہے۔ الفزاری نے اس زیج میں کلپ اہرگنس (Kalpa Aharganas) کو ہجری تاریخوں میں بدلنے کے لیے جدول بھی شامل کیے۔ جداول کے اس مجموعے میں سے مجرد جدول کی نقول اب بھی موجود ہیں' جس کی مدد سے ہر عربی سال اور مہینے کے پہلے دن کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زیج سے ہمیں دنیا کے ممالک اور ان کے ابعاد کی ایک فہرست بھی ملتی ہے جسے الفزاری نے مرتب کیا۔ ان ابعاد میں دنیا کے اصل رقبے کو اس کے موجودہ محیط (جو الفزاری نے "زیج السند ہند لکبیر" میں پیش کیا ہے) سے کہیں زیادہ تصور کیا گیا ہے۔

الفزاری کی دیگر تحریروں کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ یاقوت اور الصفدی سے الفزاری کے "قصیدہ فی علم النجوم" کی چند سطروں کا پتہ ملتا ہے جبکہ ماہرین کتابیات نے مستوی اصطرلاب اور آکاس گولے کے استعمال (کہا جاتا ہے کہ اسلامی دنیا میں الفزاری ہی نے سب سے پہلے مستوی اصطرلاب بنایا) اور نصف النہار کی پیمائش کے موضوعات پر الفزاری کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ الفزاری کی زیجات سے ہمیں اس بارے میں کافی کچھ پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی تقریباً تمام تحریریں مشتق تھیں اور وہ مختلف الاصل اور بے تعلق ماخذ کو ایک مربوط شکل میں بھی پیش نہیں کر سکا۔ الفزاری کی اہمیت پر ہے کہ اس نے ہندوستانی فلکیاتی معلوم مقداروں اور حسابی طریقوں کی ایک بڑی تعداد کو اسلامی علوم میں متعارف کرانے میں مدد دی۔

اسحاق ابن حنین

(نا معلوم----910ء)

پورا نام یعقوب اسحاق ابن حنین ہے۔ اس کا سنہ پیدائش معلوم نہیں۔ اس کی وفات بغداد میں 910ء کو ہوئی۔ وہ طبی علوم کا ماہر تھا' لیکن اس کی اصل وجہ شہرت ایک سائنسی مترجم کی حیثیت سے ہے۔

اسحاق ابن حنین عربی النسل تھا اور عراق کے ایک علاقے الحیرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مذہب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شروع میں وہ ایک نسطوری عیسائی تھا' لیکن بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ بعد میں اس نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسحاق کی مادری زبان سریانی تھی' لیکن وہ یونانی زبان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ القفطی کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں وہ اپنے والد سے بھی زیادہ مہارت رکھتا تھا۔ اسحاق کا والد بھی اگرچہ عربی اور سریانی زبانوں کا ماہر تھا' تاہم اپنی تحریروں کے لیے وہ موخر الذکر زبان کو ترجیح دیتا تھا۔

اسحاق پیشے کے اعتبار سے اپنے والد حنین کی طرح ایک طبیب تھا۔ اس نے اپنے والد کی زیر نگرانی یونانی علوم اور ترجمہ نگاری کے فن کی تربیت حاصل کی۔ اسحاق کا بھائی داؤد ابن حنین بھی ایک طبیب تھا۔ اسحاق کے دو بیٹوں میں سے داؤد ابن اسحاق ایک مترجم بنا' جبکہ حنین ابن اسحاق ابن حنین نے طبیب کا پیشہ اختیار کیا۔

اسحاق کے دور حیات میں بغداد میں ترجمہ نگاری کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اس تحریک کا آغاز مامون الرشید کے عہد (813ء-833ء) میں ہوا تھا' جب اس نے اس مقصد کے لیے دار الحکمت قائم کیا۔ یوں تو شاہی طبیب ہونے کے باعث اسحاق اور اس کے والد کو عباسی خلفاء کی سرپرستی حاصل تھی' تاہم اسحاق المعتمد (870ء-892ء) اور المعتضد (892ء-902ء) کا منظور نظر تھا۔ اسحاق کا نام بعض اوقات علماء کے اس وفد کے ساتھ بھی لیا جاتا ہے' جس نے شیعہ

عالم دین الحسن ابن النوبخت سے ملاقات کی تھی۔

اسحاق کی طبع زاد تحریریں بہت کم ہیں۔ اس کی کتابیں On Simple Medicines اور Outline Of Medicine نایاب ہیں' جبکہ "تاریخ الاطباء" اب تک محفوظ ہے۔ موخر الذکر کتاب کو اسی نام سے جان فلوپونس نے تحریر کیا تھا اور اسحاق کی تحریر اسی اصل کتاب کی ترمیم شدہ حالت ہے۔ فلوپونس نے اس کتاب میں اطباء کی جو فہرست مرتب کی تھی' اسحاق نے اس میں تھوڑی بہت واقعہ نگاری کے ساتھ ان فلسفیوں کے ناموں کا اضافہ کیا ہے' جو ہر طبیب کی زندگی میں موجود ہے۔ معالجین کا یہ تذکرہ فلوپونس کے دور تک ہی محدود ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ ارسطو کی De Anima کا ایک خلاصہ بھی اگرچہ اسحاق سے منسوب کیا جاتا ہے' لیکن یہ بات دور از قیاس ہے!

اسحاق کی اصل وجہ شہرت وہ ترجمے ہیں' جو اس نے یونانی اور سریانی زبانوں سے کیے۔ اس کام میں اس کی معاونت عیسیٰ ابن یحییٰ اور جیش ابن الحسن العاصم (جو اسحاق کا عزاد تھا) نے کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ دونوں حضرات یونانی زبان سے نابلد تھے۔ طب سے متعلق کتابوں کا ترجمہ اسحاق نے اپنے والد کی مدد سے کیا۔ اسحاق نے ریاضیاتی رسالوں کے جو تراجم کیے' ان کی نظر ثانی کا کام ثابت ابن قرہ نے کیا۔ حنین کے مطابق اسحاق نے جالینوس کی بہت سی کتابوں کا نہ صرف عربی بلکہ سریانی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔ جالینوس کی کتابوں کے جو خلاصے لکھے گئے' اسحاق نے ان کے تراجم بھی کیے۔

اسحاق کے ریاضیاتی تراجم خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں اقلیدس کی تصانیف اولیات' Optics اور Data' بطلیموس کی المجسط ارشمیدس کی On the sphere and cylinder' میلاس کی Spherics کے علاوہ Autolycus اور Hypsicles کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اولیات Optics اور المجسط کے تراجم پر بعد میں ثابت ابن قرہ نے نظر ثانی کی اور انہیں ریاضیاتی لحاظ سے بہتر بنایا۔ "اولیات" اور "المجسط" کے عربی تراجم اور تقاریظ نے علمی دنیا پر جو اثرات مرتب کیے' ان کا اسلامی ریاضی اور فلکیات کی تاریخ میں کہیں کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔ چونکہ مسلمہ حیثیت کے حامل متون کی تعداد بہت تھوڑی ہے اس لیے مختلف روایات کی تخصیص ممکن نہیں ہے۔

عبداللہ ابن خرداذبہ

(820ء------ 912ء)

ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ ابن خرداذبہ 820ء کے قریب پیدا ہوا۔ اس کا سنہ وفات بھی متعین نہیں۔ یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا انتقال 912ء کے لگ بھگ ہوا۔ ابن خرداذبہ کا نام جغرافیہ' تاریخ اور موسیقی کے موضوعات کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

ابن خرداذبہ ایرانی النسل تھا۔ اس کا دادا شروع میں مجوسی تھا لیکن بعد میں اس نے برامکہ کے توسل سے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا والد طبرستان کا گورنر تھا۔ ابن خرداذبہ الجبل (میڈیا) میں ڈاک اور خبر رسانی کے محکمے کے ناظم (صاحب البرید والخبر) کے اہم عہدے پر فائز تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے یہ عہدہ کب اور کیسے حاصل کیا۔ اس کے بعد سامرہ میں اس نے خلیفہ المعتمد سے گہری دوستی گانٹھ لی۔ اس نے تاریخ' سلسلہ انساب' جغرافیہ' موسیقی اور شراب و باورچی گیری جیسے موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی علمیت اور فضیلت کا پتہ چلتا ہے کہ کیسے اس نے اس قدر مختلف موضوعات پر اتنا مواد تحریر کر دیا بلکہ یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کی سماجی و ثقافتی زندگی سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ عربی میں سوانحی کتابیات سے اس کی کم از کم نو کتابوں کا تو پتہ چلتا ہے۔ الندیم نے ان کے یہ نام بتائے ہیں:

(1)۔ کتاب ادب السماع (اس میں موسیقی سننے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے آداب بتائے گئے ہیں)

(2)۔ کتاب جمہرۃ الانساب الفرس والنواقل (ایرانیوں کے نسب ناموں سے متعلق)

(3)۔ کتاب المسالک والممالک (مختلف ملکوں اور سلطنتوں کے جغرافیائی حالات۔ یہی کتاب ابن خرداذبہ کی شہرت کا باعث ہے۔ اس کتاب کے موجودہ متن اور اس کے استفادہ کے بارے میں اصحاب علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔)

(4)۔ کتاب الطبیخ (اس میں مختلف کھانے تیار کرنے کی تراکیب دی گئی ہیں۔)

(5)۔ کتاب اللہو والملاہی (اس کتاب کے واحد قلمی نسخے کو I.A.Khalife نے مرتب کر کے بیروت سے 1964ء میں شائع کرایا تھا۔ غالباً یہی وہ کتاب ہے جس کا ذکر المعری نے اپنے "رسالتہ الغفران" میں اور "طبقات المغنین" کے تحت ذکر کیا ہے)

(6)۔ کتاب الشراب (مختلف شرابوں سے متعلق)

(7)۔ کتاب الانوا (ساکن سیاروں کے ظاہر ہونے کے بارے میں)

(8)۔ کتاب الندماء والجلساء (دوستوں اور ہم مجلس اشخاص کے بارے میں)

(9)۔ کتاب التاریخ (المسعودی نے اس تاریخ کا حوالہ دیا اور لکھا ہے کہ یہ بڑی جامع اور مبسوط تاریخ ہے۔ الندیم نے اس کتاب کا اپنی فہرست میں ذکر نہیں کیا)

متذکرہ بالا فہرست میں سے بیشتر کتابیں اب دستیاب نہیں اور ان کے صرف نام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس وقت ابن خرداذبہ کی وجہ شہرت صرف ایک ہی موضوع کے حوالے سے ہے اور وہ ہے جغرافیہ اور مختلف ممالک کے متعلق اہم جغرافیائی معلومات۔ جغرافیے کے موضوع پر اس کی اہم تالیف الموسوم بہ "کتاب المسالک والممالک" اس وقت جس حالت میں موجود ہے وہ غالباً اصل کتاب کی تلخیص ہے۔ اس کتاب کے مرتب ڈخویہ (De Goeje) کے مطابق اصل کتاب 846-47ء میں تیار ہو گئی تھی لیکن ابن خرداذبہ اس میں مزید اضافے کرتا رہا اور ان اضافوں کے بعد حتمی مسودہ 885-86ء میں تیار ہو گیا۔ موجود ملخص مسودے میں معاشی' سیاسی اور بیانی جغرافیے کے موضوعات شامل ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف عباسی دور کی اسلامی سلطنت کا احاطہ کرتی ہے بلکہ اس میں غیر اسلامی دنیا کے علاقائی جغرافیے پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ریاضیاتی اور طبیعیاتی جغرافیے کے حصے کا مواد بطلیموس اور اس موضوع پر عربی میں لکھنے والے دوسرے ہم عصر مصنفین کی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے' لیکن اس کے باوجود یہ مواد اس موضوع پر ناکافی لگتا ہے۔ اس کتاب کا زیادہ حصہ "الربع المعمورہ" (زمین کا آباد حصہ) کے رسل و رسائل اور سفری تفصیلات کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن خرداذبہ نے احسن طریقے سے ان مفید معلومات کو سائنسی طور پر پیش کیا ہے۔ جغرافیے کی اس قدیم کتاب کے بنیادی ماخذ میں اسی موضوع سے متعلق قدیم ایرانی کتب کے علاوہ حکومتی دستاویزات نیز عرب سیاحوں' سوداگروں اور جہازرانوں کے مستند حالات و مشاہدات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ موضوعاتی مواد کی ترتیب و تدوین علاقوں' ضلعوں اور تحصیلوں کے لیے فارسی اصطلاحات کا استعمال اور ان کے فارسی ناموں کے استعمال سے ابن خرداذبہ پر ایرانی اثرات کا واضح طور

پر پتہ چلتا ہے۔

ابن خرداذبہ دوسرے علاقوں کی نسبت عراق کو ایک مرکزی حیثیت دیتا ہے اور اپنے سفری کوائف بیان کرنے کے لیے بغداد کو نقطہ آغاز قرار دیتا ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغداد کو ایران شہر (نیشاپور کا قدیم نام' یہ شہر کبھی عراق میں ہوتا تھا) کے مقابل قرار دیتا ہے۔وہ اپنے حالات سفر السوادنام کے شہر سے شروع کرتا ہے۔اس شہر کو ایران کے قدیم فرمانروا ایران شہر کا دل سمجھتے تھے۔بغداد سے نکلنے والے بری اور بحری راستے چاروں سمتوں میں بکھر جاتے ہیں۔ مشرقی جانب یہ بری راستے وسطی ایشیا تک پہنچتے ہیں اور سمندری راستے ہندوستان اور چین تک جاتے ہیں۔ مغرب کی سمت یہ راستے شمالی افریقہ اور سپین تک' شمال میں آذربائیجان اور قفقاز تک اور جنوب میں ان راستوں سے جنوبی عرب تک پہنچا جاسکتا ہے۔

ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب میں مختلف علاقوں سے متعلق جو معتبر معلومات فراہم کی ہیں ان سے بعد کے جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے اور اسے اپنی بنیادی ماخذ میں جگہ دی ہے۔

المسعودی

(نامعلوم ــــــ 957ء)

ابو الحسن علی ابن الحسین ابن علی المسعودی ایک مورخ کی حیثیت سے جانا پہچانا نام ہے' لیکن اس کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم تاریخی مواد دستیاب ہے۔ اس کی اپنی تصانیف اور دوسرے مصنفین کی تحریروں سے جو خال خال معلومات ملتی ہیں' ان کے مطابق وہ بغداد میں پیدا ہوا اور مصر کے شہر الفسطاط (قاہرہ قدیم) میں وفات پائی۔ اس کی تاریخ پیدائش کہیں سے حاصل نہیں ہو سکی۔ تاریخ وفات کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا' تاہم مستند ترین روایت یہ ہے کہ اس نے 956ء یا 957ء میں ستمبر یا اکتوبر کے مہینے میں انتقال کیا۔

المسعودی نے نو عمری میں ہی سیاحت کا آغاز کیا۔ وہ بغداد سے تقریباً 915ء میں روانہ ہوا اور اپنی بقیہ زندگی سیر و سیاحت میں گزار دی۔ 941ء تک وہ خراسان' سجستان (جنوبی افغانستان)' کرمان' فارس' تومیس' جرجان' طبرستان' جبال (میڈیا)' خوزستان' عراق (میسوپوٹیمیا کا نصف جنوب) اور جزیرہ (میسوپوٹیمیا کا نصف شمال) کی سیاحت کر چکا تھا۔ 941ء اور 956ء کے درمیانی عرصے میں اس نے شام' یمن' حضر موت' شحر اور مصر کا سفر کیا۔ اس نے سندھ ہند اور مشرقی افریقہ کا سفر بھی کیا اور بحیرہ خزر' بحیرۂ احمر' بحیرۂ روم اور بحیرہ عرب کے پانیوں کی سیر بھی کی۔ تاہم اس کی دستیاب تصانیف سے اس کے ہند چین' چین اور جاوا کی سیاحت کے دعووں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بعض محققین کا یہ خیال بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے سری لنکا' مڈغاسکر یا تبت کی سیاحت کی۔ المسعودی نے عمر کا آخری حصہ مصر میں بسر کیا۔ اس کی مہمات کے دو بڑے محرکات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ دنیا کے "عجائب" دیکھنا چاہتا تھا دوسرے اس کا عقیدہ تھا کہ حقیقی علم صرف ذاتی تجربے اور مشاہدے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مسعودی کی دستیاب تصانیف اور دوسرے ذرائع سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کم و بیش

37 کتب تحریر کیں۔ اس نے تاریخ اور جغرافیے سے لے کر فقہ 'مذہبیات 'نسبیات اور فن نظامت و حکمرانی تک کو اپنا موضوع بنایا۔ ان میں سے اب صرف دو تصانیف دستیاب ہیں "مروج الذہب و معاون الجواہر" 947ء میں مکمل ہوئی اور 956ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ دوسری تصنیف "التنبیہ والا شراف" ہے جو المسعودی کی وفات سے ایک برس قبل تکمیل کو پہنچی۔ المسعودی کا سب سے بڑا کارنامہ "کتاب اخبار الزمان و من آبادہ لحد ثان" ہے۔ اس کتاب مین دنیا کی تاریخ اور جغرافیے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب تیس جلدوں میں تحریر کی گئی تھی جن میں سے صرف پہلی جلد بچ سکی ہے جو آسٹریا کے شہر ویانا میں محفوظ ہے (اس کے علاوہ برلن میں بھی ایک قلمی نسخے کا پتہ چلا ہے)

المسعودی معتزلہ مکتب فکر سے متعلق تھا اور اس کا جھکاؤ شیعہ مسلک کی طرف تھا۔ اس عقیدے پر یقین رکھتے ہوئے کہ وقت کے ساتھ ساتھ علم بھی آگے بڑھتا ہے وہ ان علما سے اتفاق نہیں کرتا جو قدماء کے نظریات کو بلا تنقید قبول کرنے کے حق میں تھے اور معاصر علما کے کام کو مناسب اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ اس روایت پرستی کا سخت مخالف تھا جس نے بارہویں صدی سے سائنسی علوم کی ترقی پر منفی اثرات ڈالے اور قرون وسطیٰ کے اسلامی معاشرے کے زوال کی بڑی وجہ بنی۔

المسعودی کا ایک مورخ کی حیثیت سے قرون وسطیٰ کی عرب تاریخ نگاری میں بڑا اہم حصہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کسی قوم کی تاریخ کی حقیقی اور معروضی عکاسی کے لئے مورخ کو اس ملک میں دستیاب بنیادی ذرائع سے اکتساب کرنا چاہئے اور اسے ثانوی ذرائع پر انحصار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان سے حقائق مسخ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس نے قدیم ایران کی تاریخ رقم کرتے وقت اس اصول کی پیروی کی۔ دنیا کی تاریخ قلمبند کرتے وقت اس نے نہ صرف متعدد عربی تاریخی کتب سے استفادہ کیا بلکہ اس میں مختلف ممالک اور بادشاہتوں میں اپنے سفر کے ذریعے حاصل ہونے والا مواد بھی شامل کیا۔ طلوع اسلام سے لے کر اپنے دور تک کی اسلامی تاریخ پر روایتی انداز میں بحث کرنے کے ساتھ ساتھ المسعودی نے اسلام سے قبل کی اہم قوموں اور نسلوں کی تواریخ کا جائزہ بھی لیا اور بازنطینی سلطنت' یورپی اقوام' ہندوستان اور چین کی معاصر تاریخ کا بھی حتی الوسع احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ کے ضمن میں اس کا زاویہ نگاہ سائنسی اور معروضی ہے۔

المسعودی کسی خطے کی تاریخ کے ادراک کے لئے اس خطے کے جغرافیے سے واقفیت کو ایک لازمہ خیال کرتا تھا۔ اسی بات کو سامنے رکھ کر اس نے تاریخ عالم بیان کرنے سے قبل جغرافیے کا بالتفصیل جائزہ لیا۔ وہ اس نظریے کی بڑی شدومد سے حمایت کرتا ہے کہ کسی خاص علاقے کے جغرافیائی حالات اس علاقے کے جانوروں اور پودوں کے کردار مزاج' ساخت اور رنگ و روپ کا تعین

کرتے ہیں۔ وہ عربی ترجموں کی وساطت سے یونان' ایران اور ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور نظریات و تصورات سے واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس دور کے جغرافیے کے عربی لٹریچر سے بھی متعارف تھا۔

المسعودی کا تنقیدی ذہن "نظریات پرستوں" کے تصورات کو چیلنج کیے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے اپنے دور کے عرب جغرافیہ دانوں کی پیدا کردہ الجھنوں کی جا بجا تصحیح کی۔ مثال کے طور پر وہ جنوبی نصف کرے میں کسی جگہ واقع "خطہ نامعلوم" (Terra Incognitia) کے بطلیموسی تصور کا پوری طرح قائل نہیں تھا جس کے مطابق بحر ہند کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ سوائے مشرق کے تمام اطراف سے خشکی میں گھرا ہوا ہے اور مشرق میں یہ ایک آبی گزرگاہ کے ذریعے بحر الکاہل سے ملا ہوا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اسے بحر ہند (البحر الحبشی) میں جہاز رانی کرنے والے ملاحوں نے بتایا کہ اس سمندر کی جنوبی طرف کوئی کنارا نہیں۔

اگرچہ المسعودی کو ایک فلسفی کی حیثیت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ لیکن اس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے یونانی فلسفے سے بہت دلچسپی تھی۔ تاہم وہ یونانیوں کے اس تصور مادیت کو مسترد کرتا ہے جو دنیا کو ابدی قرار دیتا ہے۔ المسعودی اپنی تحریروں میں سیدھا سادہ اسلوب اختیار کرتا ہے لیکن گاہے گاہے عرب شاعری کے استعمال نے اس کی تحریر میں ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے۔

الماہانی

(860ء----نا معلوم)

ابو عبداللہ محمد ابن عیسیٰ الماہانی ایران کے ایک صوبے کرمان کے علاقے ماہان پیدا ہوا' لیکن اس نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ بغداد میں گزارا۔ سال ولادت کا صحیح تعین مشکل ہے۔ اندازاً860ء کے قریب کا زمانہ متعین کیا جاسکتا ہے۔ ریاضی اور فلکیات اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

الماہانی کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات کا بڑا ذریعہ وہ اقتباسات ہیں' جو الماہانی ہی کی ایک غیر معروف تصنیف سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اقتباسات ابن یونس کی "جدول حاکی" میں الماہانی ہی کی کسی نا معلوم کتاب سے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ابن یونس ایسے مشاہدات بیان کرتا ہے جو الماہانی نے 853ء اور 866ء کے درمیانی عرصے میں کیے۔ یہ مشاہدات اجرام فلکی کا قران (دو اجرام فلکی کا ملنا) اور سورج اور چاند گرہن سے متعلق تھے۔ اس میں الماہانی چاند گرہن کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نے اس گرہن کے شروع ہونے کا وقت اصطرلاب جیسے آلے کی مدد سے معلوم کیا ہے اور اس کی صحت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے تین مسلسل چاند گرہنوں کے شروع ہونے کا وقت اپنے حساب سے نکالا اور پھر گرہن کے اوقات سے اس کا مقابلہ کیا تو صرف نصف گھنٹے کا فرق تھا۔ یعنی چاند گرہن اس کے اندازے کی نسبت آدھ گھنٹہ بعد میں شروع ہوا۔

الماہانی نے زیادہ تر حساب کے میدان میں تحقیق کا کام کیا۔ ابن الندیم کی "الفہرست میں اسے صرف ایک مہندس اور حساب دان بتایا گیا ہے۔ خیام کے بقول الماہانی وہ پہلا سائنسدان تھا جس نے ارشمیدس کے ایک اہم مسئلے کا حل الجبرے کے اصولوں کے مطابق نکالنے کی کوشش کی۔ یہ مسئلہ ایک کرے کو کسی مستوی کے ذریعے ایسے حصوں میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا جن کے حجم

آپس میں ایک دی گئی نسبت کے مطابق ہوں۔ یہ کروں اور بیلنوں سے متعلق اس کے ایک رسالے میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے حل میں مزید آگے نہیں بڑھ سکا۔ خیام کے مطابق یہ مسئلہ کافی عرصے تک ناقابل حل سمجھا جاتا رہا حتیٰ کہ الخازن مخروطی قطعات کو استعمال میں لاتے ہوئے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ الماہانی کے رسالے پر غالباً القوہی کی لکھی ہوئی شرح کے مخطوطے کی ایک نقل مغربی ہالینڈ کے ایک شہر لائیڈن میں دیکھی گئی ہے۔

الماہانی نے اقلیدس کی کتاب "اولیات" کی پہلی، پانچویں، دسویں اور تیرہویں فصلوں کی شرحیں بھی لکھی تھیں۔ ان میں سے پہلی فصل میں دیئے گئے چھبیس مسئلوں پر لکھی جانے والی شرح نہیں ملی۔ یہ مسئلے ایسے تھے جنہیں کسی مہمل میں تحویل کے بغیر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دسویں فصل جو غیر ناطق نسبتوں سے متعلق تھی، کی شرح کا ایک حصہ، تیرہویں فصل کی غیر معروف عبارتوں کی وضاحت اور تین مختلف رسالے (فصل پنجم) بھی اس وقت نایاب ہیں۔ چونکہ فصل پنجم جو تناسب کے نظریے سے متعلق ہے، ترکیبی انداز میں لکھی گئی ہے اور اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تناسب کا اصول کیونکر وجود میں آیا اس لئے عرب ریاضی دان اس کی تعریف نمبر 5 جو بنیادی نوعیت کی ہے سے بالکل غیر مطمئن تھے۔ تاہم انہوں نے اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا اور اسے ایک سائنسی اصول کے طور پر تسلیم کر لیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے "Equimultiple" کی اقلیدسی تعریف کو "Pre-Eudoxian Anthyphairetic" تعریف سے بدل دیا۔ یہ تعریف قدروں (Magnituds) کا مقابلہ ان کے کسر مسلسل میں پھیلاؤ کے لحاظ سے کرتی تھی۔ الماہانی کے رسالے میں اینتھی فریٹک تصورات صاف صاف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ثابت ابن قرہ کا حوالہ بھی دیتا ہے۔

الماہانی نے کچھ مہندسوں کی درخواست پر مینی لاوس (Menelaus) کی گم شدہ کتاب "Shaerica" کی جلد اول اور جلد دوم کے کچھ حصے نئے سرے سے ترتیب دے کر ایک اصلاح شدہ مسودہ تیار کیا۔ اس اصلاح میں اس نے توضیحی بیانات کے اضافے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کو بھی درست کیا۔ اس ضمن میں فنی اصطلاحات کو بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں سے بے معنی اور مبہم دلیلوں کو یا تو نکال دیا گیا یا ان کو صاف ستھرا اور واضح کر کے لکھا گیا۔ دسویں صدی میں احمد ابن ابی سعید الہروی نے اس اصلاح شدہ ایڈیشن پر نظر ثانی کی اور اسے مکمل کیا۔ الطوسی، جس نے اس کتاب کا سب سے زیادہ معروف عربی ایڈیشن لکھا ہے، الماہانی اور الہروی کی ان درستگیوں کو فضول قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے حوالے کے لیے ابو نصر منصور ابن عراق کا ایڈیشن استعمال کیا ہے۔

سنان ابن ثابت

(880ء-----943ء)

حران کے مشہور طبیب ریاضی دان اور مترجم ثابت ابن قرہ 830ء تا 901ء کا یہ لائق فرزند بغداد میں 880ء کے قریب تولد ہوا (ایک اور ذریعے کے مطابق اس کا سن پیدائش 850ء ہے) جس طرح اس کے والد نے طب اور ریاضی کے میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے' اسی طرح بلکہ اس سے بہت بڑھ کر اس کا بیٹا بھی علم و تحقیق کے آسمان پر سورج بن کر چمکا۔ یہی نہیں بلکہ آگے سنان ابن ثابت کے بیٹے اور ثابت ابن قرہ کے پوتے ابراہیم ابن سنان نے بھی اپنے دادا اور والد سے حاصل کی ہوئی علمی میراث سے تشنگان علم و تحقیق کو خوب سیراب کیا۔ سائنس کی تاریخ میں شاذونادر ہی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی خاص آدمی' اس کا بیٹا اور پھر اس کا پوتا تینوں اپنے اپنے زمانے میں نامور سائنسدان ہوئے ہوں۔ یہ اعزاز اسلامی تاریخ میں یا تو ان تینوں افراد کو حاصل ہوا ہے یا پھر مغربی دنیا میں اس کی مثال ہیکرل خاندان میں ملتی ہے۔ اے سی ہیکرل' اس کا بیٹا اے ای ہیکرل اور پھر اس کا پوتا اے ایچ ہیکرل تینوں اپنے اپنے دور کے مشہور سائنسدان ہو گزرے ہیں۔

سنان ابن ثابت حران میں جنم لینے والے صابی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس فرقے کے لوگ ستارہ پرست کہلاتے ہیں اور ان کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ اس کا والد ثابت ابن قرہ ممتاز سائنسدان محمد بن موسیٰ بن شاکر کے کہنے پر حران سے بغداد چلا آیا تھا اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی یوں سنان بن ثابت کو آغاز ہی سے بغداد کی علمی فضا میں اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع مل گیا۔

سنان نے ریاضی اور طب کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ مشہور تاریخ نگار المسعودی' سنان ابن ثابت کے حوالے سے عباسی خلیفہ المعتضد (دور خلافت 892 تا 902ء) جو اس کے والد کا مربی بھی تھا' کے دربار کے طریق زندگی کا نقشہ بیان کرتا ہے۔ بظاہر 908ء سے پہلے

سنان کا دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر المقتدر (دور خلافت 908ء تا 932ء) کے عہد میں اسے دربار کے حکیم اور طبیب کی حیثیت مل گئی اور اسی طرح وہ خلیفہ القاہر (دور خلافت 932ء تا 934ء) اور خلیفہ الراضی (دور خلافت 934ء تا 940ء) کے دور میں بھی دربار سے منسلک رہا۔ جبکہ ایک دوسرے مستند ذریعے کے مطابق 892ء میں معتضد کی وفات کے بعد مکتفی کے دور خلاف میں سنان بن ثابت کو تمام سرکاری شفاخانوں کا مہتمم اعلیٰ بنا دیا گیا۔ اس دور میں اس کے عمل کا دائرہ سفری شفاخانوں اور جیل میں طبی سہولتوں کے بہم پہنچانے تک محدود تھا اور پھر اس کے بعد مقتدر کے دور میں وہ نہ صرف اس عہدے پر فائز رہا بلکہ اب اس کی حیثیت ایک وزیر صحت کی سی ہو گئی۔ اس نے اپنی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے جلد ہی بغداد کے تمام اطباء میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔

• 931ء میں جب ایک عطائی کے غلط علاج کے باعث ایک مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو مقتدر کے حکم کے مطابق سنان نے مطب کرنے والے تمام اطباء کا ایک امتحان لیا اور بغداد کے تقریباً ایک ہزار میں سے صرف سات سو کے قریب اطباء کو مطب کھولنے کی اجازت دی گئی۔ اس امتحان سے صرف ان چند ایک اطباء کو مستثنیٰ رکھا گیا جو پہلے ہی اچھی شہرت رکھتے تھے۔ اس کے والد ثابت ابن قرہ نے پیرانہ سالی میں اسلام قبول کر لیا تو سنان بھی مسلمان ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال تھی، راضی کی وفات کے بعد اس نے واسط (کوفہ اور بصرہ کے درمیان ایک شہر کا نام) کے امیر ابو الحسین بحکم کی جسمانی صحت اور اخلاق و کردار کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ بغداد ہی میں 943ء میں اس کا انتقال ہوا۔ سنان کی تصانیف میں سے بدقسمتی سے اب کوئی بھی موجود نہیں۔ ابن القفطی کے بیان کے مطابق سنان کی تصنیفات کو تین سلسلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تاریخی سیاسی، دوسرا ریاضیاتی اور تیسرا فلکیاتی۔ ابن القفطی کی فہرست میں سنان کی کسی طبی تصنیف کا نام نہیں ملتا۔ پہلی قسم کی کتابوں میں ایک رسالہ وہ ہے جس میں سنان ابن ثابت خلیفہ المعتضد کے دربار کے طریق زندگی کے بارے میں معلومات پیش کرتا ہے۔ اس رسالے میں وہ دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ افلاطون کی کتاب "ری پبلک" کے مطابق ایک فلاحی مملکت کا ڈھانچہ متعین کر کے دیتا ہے۔ المسعودی اس کی اس پیشکش پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سنان کو چاہئے تھا کہ وہ خود کو اپنی قابلیت کے دائرے سے متعلق مضامین تک ہی محدود رکھتا۔ مثلاً اس کو اقلیدس کے علوم، المجسطی، فلکیات، موسیقیاتی مظاہر، منطق، مابعد الطبیعیات اور سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظام فلسفہ تک محدود رہنا چاہئے تھا۔

دوسرے سلسلے کی کتابوں میں چار ریاضیاتی رسالے ہیں۔ ان میں ایک عضد الدولہ کے نام منسوب کی گئی ہے۔ عضد الدولہ کی درخواست پر ابو سہل القوہی نے اس کی اس تصنیف کی ایک تفسیر کی اصلاح کی ہے۔ ریاضیاتی سلسلے کی دوسری کتاب ارشمیدس کی "On Triangles" سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب افلاطون کی کتاب "On Elements of Geometry" کی تصحیح واضافے کے بعد لکھی گئی ہے۔ یہاں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ افلاطون کی یہ کتاب کہیں وہی تو نہیں جو لیا صوفیہ میں مخطوط نمبر 5-4830 کے تحت افلاطون کی کتاب "المفردات" کے نام سے پڑی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اوپر بیان کیے گئے پہلے دو رسالے سنان کے نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں مخاطب کی گئی شخصیات دسویں صدی کے دوسرے نصف میں بام عروج کو پہنچیں جبکہ سنان دسویں صدی کے پہلے نصف ہی میں انتقال کر گیا تھا۔

تیسرے سلسلے کی کتابوں میں سے "کتاب الانواع" (منسوب بہ المعتضد) کے مندرجات کے بارے میں صرف البیرونی کے اقتباسات کے ذریعے کچھ معلوم ہوا ہے۔ موخر الذکر کتاب کا حوالہ ابن القفطی نے اور ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں دیا ہے۔ محققین ان کی وجوہات پر مختلف رائے رکھتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک یہ موسمیاتی خصوصیات ستاروں کے طلوع وغروب سے پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ دوسرے محققین اس کو گزرے ہوئے ایام کے موسم کے تقابل کے لحاظ سے لیتے ہیں۔ سنان اس دوسری رائے کی حمایت کرتے ہوئے جالینوس کو غلط ثابت کرتا ہے کیونکہ جالینوس ان دونوں آراء میں سے کسی ایک کی حقانیت کو جانچنے کے لیے صرف طویل تجزیاتی تجربات کو کافی قرار دیتا ہے اور ان ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ سنان بن ثابت ان دونوں نظریات کو تھوڑے سے وقت میں جانچنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے اتفاق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے اس امر کی تصدیق کی جائے کہ آیا عربی اور ایرانی لفظ "نوع" کی تعریف ایک ہی طرح سے کرتے ہیں۔ اگر وہ اتفاق کریں تو پھر دوسری رائے ہی درست ہو گی۔ البیرونی کے بقول سنان اس موضوع پر کہ موسموں کی ابتداء کا تعین کہاں سے کیا جائے مصری نظریے کا ہپارکس کے نظریے سے تعلق بھی پیدا کرتا ہے۔

فلکیات پر سنان کی دوسری تصنیفات میں سے ایک رسالہ ہفتے کے دنوں کے لحاظ سے سیاروں کی حرکت کے موضوع پر ہے اور یہ ابو اسحاق ابراہیم ابن ہلال صابی (924ء تا 993ء) کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ صابیوں کے مذہب میں سات سیارے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں

سے ہر ایک کا اپنا ایک معبد ہے۔ ابن القفطی صابیوں کے مذہب اور رسم ورواج پر بہت سی کتابوں کا حوالہ دیتا ہے۔

الحمدانی

(893ء------951ء)

ابو محمد الحسن ابن احمد ابن یعقوب الحمدانی کو ابن الحائک، ابن ذی الدمینہ یا ابن ابی الدمینہ کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ 893ء میں یمن کے شہر صنعاء میں پیدا ہوا اور اس نے 951ء کے بعد وفات پائی۔ الحمدانی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں یقینی نہیں ہیں۔ حمدانی ایک معروف جغرافیہ دان، ماہر آثار قدیمہ اور شاعر تھا۔ اسے عربی زبان پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ اسے ''لسان الیمن'' کہا جاتا تھا۔

حمدانی کا تعلق جنوبی یمن کے مشہور عرب قبیلے حمدان سے تھا اور اس کا خاندان چار پشتوں سے صنعاء میں آباد تھا۔ اس نے بہت سے ممالک کی سیاحت کی۔ برسوں عراق میں رہا اور ایک طویل عرصہ مکہ میں گزارا۔ اس نے اپنے دور کے معروف علماء و فضلاء کے ساتھ بذریعہ خط و کتابت تعلقات استوار کیے۔ ان عالموں میں کوفی زباندان ابن الانباری اور غلام ثعلب اور ان کا شاگرد ابن خالو یہ قابل ذکر ہیں۔ بعد ازاں وہ جنوبی عرب کے شہروں ریدہ اور سعدہ میں بھی مقیم رہا۔ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اسے دوبارہ جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔

شمالی اور جنوبی عرب قبائل کی جنگ میں اس نے اپنے قبیلے کی پر جوش حمایت کی۔ اس ضمن میں اس کی ایک نظم ''الدامغہ'' (تہس نہس کرنے والا) ملتی ہے، جس میں اس نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس کی دوسری نظموں میں بھی سیاست کی آمیزش موجود ہے۔ یہ اس کی وطن اور قوم سے محبت ہی تھی جس نے اسے ''الاکلیل'' اور ''صصفتہ جزیرۃ العرب'' لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان میں سے اول الذکر تصنیف، جس کے نام کا لغوی مفہوم ''تاج'' ہے 943ء میں لکھی گئی اور اس کا موضوع تاریخ ہے۔ دوسری کتاب جغرافیے سے متعلق ہے اور اس میں جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی کوائف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

"الاکلیل" دس ابواب پر مشتمل تھی' لیکن اب اس کے صرف چار ابواب دستیاب ہیں۔ کتاب کے باقی چھ ابواب ناپید ہو چکے ہیں۔ پہلا دوسرا اور دسواں باب جنوبی عرب کے قبائل کے سلسلہ نسب کے بارے میں ہے۔ آٹھواں باب یمن میں حماریوں کے تعمیر کردہ قلعوں سے متعلق ہے۔ گمشدہ ابواب میں سے تیسرے باب کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اس میں جنوبی عرب کے قبائل کی خصوصیات بیان کی گئی تھیں' اور چوتھے اور چھٹے باب میں جنوبی عرب کی اسلام سے پہلے کے دور کے تاریخی واقعات قلمبند کیے گئے تھے۔ ساتویں باب میں غالباً غلط رسومات پر تنقید کی گئی تھی اور نواں باب حماری کتبوں سے متعلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے کتاب میں جابجا فلکیات اور طبعیات کو بھی موضوع بحث بنایا اور کائنات اور اس کی تخلیق سے متعلق قدیم تصورات پر بھی اظہار خیال کیا۔

"صفتہ جزیرۃ العرب" بنیادی طور پر حمدانی کے اپنے سفری مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض جگہوں پر دوسرے جغرافیہ دانوں مثلاً الجرمی' ابوالحسن الخزاعی' احمد ابن الحسن العادی الفلجی اور محمد ابن عبداللہ ابن اسماعیل السکسکی سے اخذ کردہ معلومات بھی پیش کرتا ہے۔ تعارف میں وہ بطلیموس' ہرمس (Hermes Trismegistus) اور Divs Co-redes کے اقوال بھی نقل کرتا ہے۔ اس تصنیف میں فلکیات کی مشہور ہندوستانی کتاب "سند ہند" اس کے مترجم الفزاری اور صنعاء کے بعض فلکیات دانوں کے حوالہ جات بھی ملتے ہیں۔ اس تصنیف میں خالصتاً جغرافیائی معلومات کے علاوہ پھلوں' سبزیوں' قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے بارے میں مشاہدات بھی بیان کیے گئے ہیں اور لسانیات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یاقوت اور البکری کی جغرافیائی فرہنگوں میں جابجا اس تصنیف کے حوالے ملتے ہیں۔ البکری کی تصنیف میں تو الاکلیل سے بھی بہت سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔

حمدانی نے "سرائر الحکمۃ فی علم النجوم" کے نام سے ایک فلکیاتی تصنیف بھی قلمبند کی۔ یہ صفتہ جزیرۃ العرب سے قبل تحریر کی گئی اور اب اس کے صرف دس ابواب محفوظ ہیں۔ اس میں حمدانی نے ڈوروتھیس اور بطلیموس کے اقوال نقل کیے ہیں۔ حمدانی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس نے فلکیاتی جداول بھی ترتیب دیے' لیکن یہ جداول اب دستیاب نہیں۔ علم طب سے متعلق اس کی تصنیف "القوی" بھی اب ناپید ہے۔ غالباً یہ اس کی فلکیاتی تحریروں سے مربوط تھی کیونکہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ سیارے کس طرح ہوا کے درجہ حرارت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ حمدانی نے جائیداد کے معاملات سے متعلق بھی ایک کتاب تحریر کی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اس مجموعے کا اب صرف آخری حصہ یعنی "جوہر" باقی بچا ہے۔ اس حصے میں اس نے سونے اور چاندی پر مذہبی' ادبی اور

سانیاتی پہلوؤں کے بشمول تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ یہ دھات کاری پر سب سے پہلی اور جامع
ترین عربی تحریر ہے۔ اس میں دھاتوں کے استخراج، تخلیص، طلاکاری، ویلڈنگ، تسخیک اور ان کے
خالص پن کے تعین کے بارے میں نہایت مفید اور درست معلومات درج ہیں۔ یہ معلومات بنیادی
طور پر حمدانی کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اس ضمن میں اسے یمن کی ٹکسال سے بہت مدد ملی۔ اس
نے ٹکسال میں خود بھی مختلف عملیات کا مشاہدہ کیا اور وہاں کام کرنے والوں سے بھی معلومات حاصل
کیں۔ اس نے دھاتوں کے منابع اور ان کے دواؤں میں استعمال پر بحث کی اور مختلف مقامات پر ارسطو
'ڈورو تھیئس' ڈائیوس' کوریڈیز اور بقراط کے اقوال بھی نقل کیے۔ اوزان اور سکوں سے متعلق بعض
فنی اصطلاحات یونانی دبستان سے اخذ کردہ معلوم ہوتی ہیں۔

متذکرہ بالا تصنیف میں یونانی اثرات کے علاوہ ایرانی اثرات بھی نمایاں ہیں۔ جنوبی
عرب 628ء تک ایران کے ماتحت رہا اور بعد کی صدیوں میں بھی جنوبی عرب اور ایران کے لوگوں
کا باہمی تبادلہ جاری رہا۔ کیمیائی مادوں اور آلات سے متعلقہ اصطلاحات پر ایرانی اثر کا خاص طور پر
احساس ہوتا ہے۔ حمدانی کی تصنیف اپنے زمانے کی دنیا کی ایک مربوط تصویر پیش کرتی ہے جس میں
زندگی کے معاملات حتیٰ کہ عناصر' دھاتوں اور دوسری مادی اشیاء اور جغرافیائی حالات کو بھی ستاروں
اور سیاروں کے اثر کے حوالے سے پرکھا جاتا تھا۔

حمدانی نے بنیادی طور پر اپنے مشاہدات کو رہنما بنایا اور یہ دیکھا کہ حقیقت میں کیا چیز ممکن
ہے اور عملی طور پر کیا چیز مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کیمیاگروں کی کمتر دھاتوں کو سونے چاندی میں
تبدیل کرنے کے فارمولے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے مطابق سونا' سونے کی کچ دھات اور
چاندی' چاندی کی کچ دھات سے اخذ کیے جاتے ہیں اور یہ کہ انہیں کسی اور دھات سے اخذ نہیں کیا جا
سکتا۔ دھاتوں کو بڑے محتاط کیمیائی عمل سے گزار کر خالص بنایا جاتا تھا اور اس مقصد کے لیے جادوئی
طریقوں پر انحصار نہیں کیا جاتا تھا۔ حمدانی نے تفصیلات کو بھی صحت اور درستگی سے بیان کیا ہے اور
اس کے بیانات کی مدد سے بعض آلات کو نئے سرے سے بنایا جا سکتا ہے۔

اس نے اپنے پیشروؤں کے نظریات کو بلا تنقید قبول نہیں کیا بلکہ جہاں ضروری سمجھا
اس نے ارسطو اور بطلیموس جیسے قد آور سکالروں سے بھی اختلاف کیا ہے۔ وہ پہلے ایک مسئلہ پیش کرتا
ہے اور پھر متضاد آراء کی روشنی میں اس مسئلے کا تجزیہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر لسانیات کے
موضوع پر لکھتے وقت وہ زباندانوں کے ساتھ ساتھ ناخواندہ افراد کی آراء اور تصورات بھی پیش کرتا
ہے۔ سونے چاندی کے ماخذ پر بات کرتے ہوئے وہ یونانی فلسفیوں کے نظریات سے لے کر عام

کاریگروں اور کان کنوں کے تجربات اور مشاہدات تک سے اکتساب کرتا ہے۔ آباد دنیا کی حد بندی کے ضمن میں بھی وہ کسی ایک مکتب فکر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یونانی' ہندوستانی اور چینی' تینوں مکاتیب کے علماء کے نظریات کا جائزہ لیتا ہے۔ ہمدانی کو یونانی' ایرانی اور عربی ثقافت کے اتصال کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

الجوسی شیراز

(اندازاً 920ء----994ء)

ابو الحسن علی ابن عباس الجوسی شیراز کے قریب ایک مقام الاہواز (خوزستان) میں دسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں پیدا ہوا اور 994ء میں وہیں وفات پائی۔ اس نے طب علم الادویہ اور دیگر سائنسی علوم کے میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔

الجوسی کے آباؤاجداد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ معلوم نہیں' البتہ اس کے نام کے ایک حصے "الجوسی" سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ یا اس کا باپ پہلے زرتشت کا پیروکار تھا۔ اس نے اپنے آبائی علاقے سے باہر کا کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ الجوسی نے طب کی ابتدائی تربیت حکیم ابو ماہر موسیٰ ابن سیار سے حاصل کی' جس نے فصد کھلوانے پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ مجوسی' شاہ عضد الدولہ (متوفی 983ء) کے ہاں ملازم رہا اور اس کی سرپرستی کی وجہ سے اپنا واحد طبی رسالہ اسی بادشاہ کے نام معنون کیا۔ اس رسالے کا نام "کامل الصناعۃ الطبیہ" تھا۔ اس بادشاہ نے بعد میں شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔

مجوسی کی کتاب "کامل" بیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں دس علم طب کی تھیوری پر مشتمل ہیں اور بقیہ دس میں عملی طب کی تفصیلات ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس نے ادویات میں استعمال کے لیے دیسی پودوں' چھوٹے جانوروں اور معدنیات کا کیسے مطالعہ کیا۔

اگرچہ دسویں صدی عیسوی میں عراق اور ایران میں بہت سے حکیم اور سائنسدان گزرے ہیں لیکن مجوسی یا تو ان میں سے بہت کم کو جانتا تھا یا اسے ان کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ مثال کے طور پر مجوسی نے دسویں صدی عیسوی کے ایران کے مشہور حاذق حکیم' طب کی بہت سی کتابوں کے مصنف اور ممتاز کیمیادان الرازی کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے' لیکن مجوسی نے اپنے معاصر اور ہموطن' مشہور کتاب "غناومنا" کے مصنف حسین ابن نوح القمری کا کہیں ذکر نہیں کیا اور

اپنے دور کے ممتاز معلم طب اور کتاب بعنوان "قواء الادویۃ المفردۃ" کے مصنف احمد ابن ابی الاشعت کا ذکر بھی مجوسی کے ہاں نہیں ملتا۔

'کامل' کا ابتدائیہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسی نے اپنے پیشروؤں پر سخت تنقید کی ہے۔ اس تنقید سے وہ لوگ بھی محفوظ نہیں رہے جن کا اس نے اپنی کتاب میں تذکرہ کیا ہے اور جن کی تحریروں نے اسے متاثر کیا۔ مثال کے طور پر (چوتھی صدی عیسوی کے بقراط) حکیم جالینوس اور Oribasius' چھٹی صدی عیسوی کے پادری آہرن نویں صدی عیسوی کے یوحنا ابن سراابیون بھی مجوسی کے تنقید و تبصرے کا نشانہ بنے۔ ان کے برعکس اس نے حنین ابن اسحاق (سنہ وفات 873ء) کو مستند مترجم اور بہترین عالم تسلیم کیا اور اس کی بہت تعریف کی ہے۔

مجوسی نے سینے کی ایک بیماری ذات الصدر (Pleurisy) کے بارے میں بڑی دلچسپ حیران کن اور نہایت درست معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ معلومات اس بیماری پر ہونے والی جدید تحقیقات کے بہت قریب ہیں۔ اس بیماری میں پھیپھڑے کے پردے پر ورم آجاتا ہے جس میں مواد بھی بھر جاتا ہے۔ پھیپھڑے کے پردے پہ یہ مواد سینے یا سر کی جانب سے گرتا ہے۔ بخار' کھانسی' جسم کے اطراف میں سوئیاں سی چبھنا اور سانس کے آنے میں تکلیف ایسی علامات ہیں جن کا ذات الصدر سے گہرا تعلق ہے۔

تدریسی طب کے بارے میں اس نے بتایا کہ اس کی تین اقسام ہوتی ہیں:

1۔ فطری عناصر کا علم۔ مثلاً مزاج' مزاج' افعال' قابلیت اور اعضاء یا حصے۔

2۔ ایسی اشیاء کا علم جو انسان کی فطرت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ بات اس نے حنین ابن اسحاق کی کتاب "المسائل فی الطب" سے اخذ کی' جو اس علم کو چھ بنیادی اجزاء میں تقسیم کرتا ہے۔ اولاً ہوا (جس میں ہم سانس لیتے ہیں) اور ہوا کی آلودگی کو صاف کرنے کا علم۔ ثانیاً کام اور آرام کا علم ثالثاً خوراک کا علم۔ رابعاً نیند اور بیداری۔ خامساً قے آور اور قبض کشا ادویات کا استعمال اور سادساً نفسیاتی محرکات۔

3۔ ایسی اشیاء کا علم جو انسانی جسم کے فطری حالات کے دائرے سے باہر ہوں اور جن کا تعلق بیماری' اس کی وجوہات اور علامات سے ہے۔

وریدوں اور شریانوں کا ذکر کرتے ہوئے مجوسی بتاتا ہے کہ یہ پتلی پتلی باریک نالیاں ہیں جو تقسیم در تقسیم ہو کر سارے جسم میں بالوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ ان وریدوں اور شریانوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں' جو شریانوں اور وریدوں کے درمیان رابطے کا کام کرتے ہیں۔

مجوسی نے ریوی شریانوں (Pulmonary Arteries) اور اورطہ (Aorta) یعنی شریان کبیر میں سے ہر ایک میں تین تین صمام (Volves) اور وریدوی شریان (غالباً وہ اطاق بطینی (Atrioventricular) صمام کے بارے میں کہنا چاہتا ہے) میں دو صمام کے افعال تک بیان کیے ہیں۔

مجوسی نے جسمانی اور ذہنی حالت کو درست رکھنے کے لیے صحت کے اصول بھی بتائے ہیں۔ مثلاً وہ بہتر صحت کے لیے اچھی خوراک کام اور آرام میں توازن' نہانے کا معمول اور جسمانی ورزش جیسی چیزوں کو بہتر گردانتا ہے۔ ورزش کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے یہ تین نکات بیان کیے ہیں :

1۔ یہ جسم کی خلقی (Innate) حرارت کو بیدار کر کے تیز کرتی ہے۔ تاکہ جسم کے اعضاء خوراک کو کشش اور ہاضمے کے عمل سے گزر کر جسم کا حصہ بنانے میں آسانی محسوس کریں۔

2۔ اس سے جسم کو اپنے فاضل مادوں سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اور جسم کے مسام کھلتے اور صاف ہوتے ہیں۔

3۔ اس سے جسم کے اعضاء ٹھوس اور مضبوط ہوتے ہیں۔ جسم کے اعضاء کے درمیان رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ جسم کے افعال میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اس میں بیماریوں کے خلاف مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس نے سونے کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ اس سے دماغ اور حواس کو آرام اور تازگی ملتی ہے' عمل انہضام کو مدد ملتی ہے اور انسان کے اخلاط ربعہ توازن پر رہتے ہیں۔
مجوسی نے ابن سینا سے بہت پہلے نفسیاتی طریقہ علاج کی اہمیت اور نفسیات اور طب میں تعلق کو واضح طور پر سمجھا دیا تھا۔

جذباتی افعال (اعراضی نفسانیہ) کے بارے میں اس نے وضاحت سے بتایا ہے کہ یہ بیماری کا سبب بھی بن سکتا ہے اور اس سے صحت بھی بہتر ہو سکتی ہے' لیکن نتائج کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس قسم کے افعال کو کیسے کنٹرول کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق جذباتی محبت کو اگر اظہار کا موقع نہ مل سکے تو بندہ مستقل مریض بن کر رہ جاتا ہے۔

مجوسی نے اس کے علاوہ موسمیات' صحت عامہ' افراد کے عمومی رویے' جراحت اور بہت زیادہ فصد کھلوانے کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ علم الجنین کے باب میں اس نے اس دور میں وضاحت سے وہ بات بتادی' جو آج درست ثابت ہو چکی ہے کہ وضع حمل کے موقع پر بچہ باہر

دھکیلا جاتا ہے۔ زہروں' ان کے اثرات اور ان کے تریاق پر مجوسی کی تحقیقات قرون وسطیٰ کے علم سموم (Toxicology) کی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔ مجوسی نے افیون آمیز ادویات کے استعمال کے اثرات پر اس انداز میں اجتہاد کیا کہ اسے نشہ آور ادویات کی لت اور ان کے ناجائز استعمال کے سلسلے میں دلچسپ اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

علم دندان کے حوالے سے مجوسی نے بلند ترین اخلاقی معیارات پر زور دیا ہے اور اپنے ساتھیوں' ہم پیشہ دوستوں اور طلباء کو حکیم بقراط کی تحریروں کی روشنی میں ان اخلاقی معیارات کو اپنانے کا مشورہ دیا ہے۔ اس نے آج کے مسلمہ طبی اخلاقی اصولوں کے مطابق مانع حمل کے طریقوں کے رواج اور اسقاط حمل کی ادویات کے استعمال کی مخالفت کی' سوائے ایسی صورت کے کہ جس میں ماں کی جسمانی یا ذہنی صحت کو خطرہ درپیش ہو۔

اپنی کتاب "کامل" کے بارے میں مجوسی نے یہ کہا ہے کہ اس نے اس کتاب میں طب کے نصاب کے تین اہم نکات کو مدنظر رکھا ہے۔ اولاً فن اندمال (Artofhealing) کا تفصیلی تذکرہ' دوم طب کے ایک مختصر لیکن جامع خلاصے کی پیشکش اور سوم موضوع کا مکمل احاطہ۔ لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ تاہم اس کے گہرے مطالعے' ذاتی مشاہدے اور طب کے موضوع کے مکمل احاطے نے مجوسی کی کتاب کو شہرت دوام بخشی۔ اس کی کتاب کا کئی مرتبہ لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور آج بھی اس کے نادر و ناپید نمونے دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں جو مشرق و مغرب میں اس کی کتاب کی شہرت اور مقبولیت کا زندہ ثبوت ہے۔

ابوالقاسم الزہراوی

(936ء ----- 1013ء)

ابوالقاسم لن عباس الزہراوی پیدا تو دسویں صدی کے لوائل میں ہوا تھا لیکن اس کی فکر کی نہج اس کو بیسویں صدی میں ہماری نظروں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تو دنیا کی وہ حالت نہیں تھی جو فاصلے سمٹ جانے کی وجہ سے آج ہو گئی ہے۔ اس کی بہت سی دریافتیں اس وقت سب لوگوں تک نہیں پہنچ پائیں۔ نتیجے کے طور پر طب کی دنیا نے بہت سی ایسی دریافتوں کا سہرا اوروں کے سر باندھ دیا جو اس نے تقریباً پانچ صدیاں قبل کر لی تھیں۔

ہسپانوی خلیفہ عبدالرحمن الناصر کا دور سنہری دور تھا۔ اس کو فن تعمیر سے عشق تھا اور قرطبہ کی بلند و بالا اور خوبصورت عمارات اس کے اس شوق کی آئینہ دار تھیں لیکن ہمارے نزدیک اس شہر کی شان و شوکت اور عروج کی داستان صرف اس حقیقت میں مضمر نہیں ہے کہ یہاں کی آبادی دس لاکھ تھی' یہاں آٹھ ہزار دوکانیں' سات سو حمام' دو لاکھ مکانات' تین ہزار آٹھ سو مساجد اور ساٹھ ہزار عالی شان عمارتیں تھیں۔ ہمارے لئے تو سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس شہر میں صرف سرکاری ہسپتالوں کی تعداد پچاس تھی۔ یہاں کی شاہی لائبریری میں تقریباً دو لاکھ کتابیں تھیں اور یہاں کی یونیورسٹی مغرب کی عظیم ترین یونیورسٹی تھی' جہاں رات دن غیر معمولی صلاحیتوں کے امانت دار علماء اور اساتذہ تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ہمارے خیال میں کسی بھی باصلاحیت انسان کا ایسی فضا کے قرب و جوار میں پیدا ہونا منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے کے مترادف ہے۔

تعمیر تو الناصر کا مشغلہ تھا ہی' جس کے لئے وہ بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اس نے قرطبہ سے چھ کلو میٹر دور یعنی تقریباً چار میل کے فاصلے پر اپنی چہیتی ملکہ کے لئے ایک عظیم الشان محل بنوایا۔ ہوتے ہوتے یہ بستی قرطبہ سے جا ملی۔ ابوالقاسم اس بستی میں پیدا ہوا اور اسی کی نسبت سے

الزہراوی مشہور ہوا۔ قرطبہ اور الزہرا کو ملا کر جو شہر معرض وجود میں آیا' اس کی علمی اور فنی فضا' مثال یورپ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

الزہراوی کے آباؤاجداد نسلاً عرب تھے۔ وہ عرب فاتحین کے ساتھ اندلس آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں اور کچھ معلم نہیں ہے۔ اندلس کے بڑے بڑے شہروں میں ان ہی عرب خاندانوں کی حکومت تھی۔ قرطبہ میں بھی یہی لوگ صاحب اقتدار تھے۔

ابوالقاسم زہراوی کا دل شروع سے ہی طب میں لگتا تھا۔ اس نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قرطبہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کے علمی ماحول نے اس جوہر کو جو وہ لے پیدا ہوا تھا۔ صیقل تو کیا' لیکن اس کی تشنگی نہ ختم ہو سکی۔ اس کو خوب سے خوب تر کی تلاش تھی چنانچہ وہ مزید مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ اس کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ جو کچھ پڑھتا تھا' اس میں اس کو اپنے تمام سوالات کے جواب نہیں ملتے تھے۔ منزل ابھی بہت دور تھی اور اس کو ابھی بہت کچھ جاننا تھا۔ ابھی اور تجربہ حاصل کرنا تھا۔ خلیفہ الناصر جوہر قابل کا قدرداں تھا۔ اس نے الزہراوی کا تقرر شاہی ہسپتال میں کر دیا۔ الزاہراوی کے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔

ابوالقاسم نے اپنے وسیع مطالعہ کو فکر اور تجربے کی کسوٹی پر رکھ کر نتائج اخذ کئے اور اصول و قوانین وضع کئے۔ اس وقت تک ہر قسم کی بیماری کا علاج دواؤں سے کیا جاتا تھا۔ اس نے امراض کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ وہ امراض جن کا علاج دواؤں کے ذریعے ممکن ہے' اور وہ امراض جن کا علاج جراحی کے ذریعے ہونا چاہیے۔ جراحی یا آپریشن کے ذریعے علاج کا طریقہ اس وقت نیا تھا۔ الزہراوی کا خیال تھا کہ بعض اعضاء کے خراب ہونے کی صورت میں دواؤں سے علاج کی کوشش محض مریض کو تکلیف دینا ہے۔ اس لئے ان اعضاء کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے۔ اس نے سر سے پیر تک انسان کے پورے جسم کے امراض کا جائزہ لے کر ان امراض کی تفصیل بیان کی ہے جن کا صحیح علاج آپریشن ہے۔ ان بیماریوں میں موتیا' ہند' ٹونسلز (Tonsils)' فالتو گوشت کا بڑھ جانا اور سر' دماغ' گردے اور آنتوں کی بیماریاں شامل ہیں۔ اس نے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو کاٹ کر آپریشن سے جوڑنے اور ٹوٹی ہوئی چپنی کی ہڈی کو آپریشن کے ذریعے علیحدہ کرنے کے طریقے بھی بتائے۔ وہ آپریشن سے پہلے مریض کو مناسب مقدار میں مناسب دوا دے کر بے ہوش کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ تاکہ مریض کو کم سے کم تکلیف ہو اور آپریشن بھی زیادہ اطمینان سے کیا جا سکے۔ اس نے بقراط کی طرح اس سلسلے میں ڈاکٹر کے فرائض کی وضاحت کی اور آپریشن کے لئے قوانین مرتب کر کے

جراحی کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس نے زخموں کے ٹانکے سینے کے لئے کئی طرح کے دھاگوں اور تانتوں پر تجربات کر کے بتایا ہے کہ کون سی قسم کے دھاگے اور تانتیں بہتر ہیں۔ جراحی کے بارے میں اتنا سنجیدہ ہونے کے باوجود وہ کینسر کا آپریشن کرنے کے سخت خلاف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آپریشن سے کینسر کا زخم اور زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے' اس لئے اس مرض کا علاج دوا دارو سے ہی کرنا چاہیے۔

الزہراوی کے ان جدید طبی نظریات اور تجاویز نے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کو بالاتفاق رائے مغرب اور مشرق دونوں میں جراحی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف جراحی کی تجاویز پیش کیں بلکہ بڑی تفصیل سے جراحی اور مریضوں کی دیکھ بھال کے صحیح طریقے بھی بتائے ہیں۔ اس وقت ایک اور مشکل یہ تھی کہ جراحی کے لئے مناسب آلات دستیاب نہ تھے۔ لیکن الزہراوی ہمت نہ ہارا۔ وہ آلات جراحی کی تصویریں بنا کر قرطبہ کے بہترین کاریگروں سے اپنی نگرانی میں آلات بنواتا تھا۔ ان آلات کی تیاری میں بہترین قسم کا فولاد استعمال کیا جاتا تھا۔ نقشے بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ ان آلات پر طبیب کی گرفت مضبوط رہے اور ان کا زاویہ ایسا ہو کہ مطلوبہ عضو تک بہ آسانی پہنچ سکے۔ جسم کے نازک اور اندرونی حصوں کے آپریشن میں استعمال ہونے والے آلات بناتے وقت ان باتوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ الزہراوی نے تقریباً دو سو جراحی آلات کی تصاویر چھوڑی ہیں جن میں سے بیشتر کا موجد وہ خود ہے' اور جن میں سے کئی آلات ابھی تک کم و بیش اپنی اسی شکل میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ آپریشن کے لئے طرح طرح کی چمٹیاں' قینچیاں' آنکڑے' نشتر اور چاقو چھریاں استعمال کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے الزہراوی کو ایک انتہائی جدت پسند اور اختراعی ذہن کے علاوہ زبردست قوت مشاہدہ سے نوازا تھا۔ بقراط کی طرح وہ بھی کوئی تفصیل نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کے ہاں مریض کے ماحول اور خصوصی خوراک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے خیال میں صاف ستھرا ماحول نہ صرف مریض کی صحت یابی بلکہ صحت مند لوگوں کی صحت کی بقاء کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ وہ مریض کی مناسب دیکھ بھال' اور ڈاکٹر اور تیمار دار سے اس کے تعلقات کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کے طریقہ علاج میں انسانی نفسیات کا علم بہت ضروری ہے۔ اس نے کئی نفسیاتی عوارض کے لئے دوائیں ایجاد کیں۔ وہ اپنے مریضوں کو مسکن دوائیں (Tranquilizers) دیتا تھا جو ان کو ہیجان' تناؤ اور تفکرات سے نجات دلاتی تھیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کٹی ہوئی شریانوں کا خون بند کرنے کے لیے نسیں باندھنے کا طریقہ متعارف کروایا۔ اس نے ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد پلستر

چڑہانے اور پھنسی پھوڑوں کے علاج کے طریقے بتائے۔ آنکھ کے آپریشن اور کان کے پردے کے بارے میں بہت سی معلومات اسی کی مرہون منت ہیں۔ زچگی میں آج کل جو والچر پوزیشن (Walcher Position) کہلاتی ہے دراصل وہ الزہراوی کی دریافت ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے Hemophilia کے ایک مریض کا مشاہدہ کر کے تفصیلی وضاحت کی۔

طب سے اس غیر معمولی لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس کو نفسیات' اخلاقیات' ریاضیات' فلکیات' لسانیات' مذہبیات' کیمیا' طبیعیات' قواعد اور شاعری میں بھی دخل تھا۔ وہ انسان کی ذہنی قوتوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ قوت تخیل' قوت ادراک اور قوت حافظہ۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے زمانے کے انسان کی طرح طب کے کسی ایک شعبے کا انتخاب کر کے اپنی تمام تر توجہ اور کاوشیں اس ایک شعبے کے لئے وقف کر دینے کے حق میں ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں انسان صحیح معنوں میں ایک وقت میں ایک ہی فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ بیک وقت بہت سے شعبوں میں الجھنے کا نتیجہ انتشار کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے خیال میں مریض کی شفایابی کے لئے انسان صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اصل شفا بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے' اس سے دعا مانگنا اور اس پر توکل انتہائی ضروری ہے۔

اس کی واحد کتاب "التعریف لمن عجز عن التالیف" کا طب کی تاریخ میں جو مقام ہے وہ بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا۔ یہ تیس حصوں پر مشتمل ایک طرح کا طبی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب اس نے تقریباً پچاس سال کی عمر میں مکمل کر لی تھی۔ یہ کتاب اس وقت مشرق و مغرب کے حاصل کردہ تمام کلاسیکی طبی علم اور الزہراوی کے اپنے ذاتی علم' مشاہدے اور تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس تصنیف میں طب اور ادویہ سازی سے متعلق ہر ممکنہ اطلاع تو موجود ہے ہی' اس کے علاوہ سامان آرائش کی تیاری' کھانے پکانے کے فن اور علم الاغذیہ کے بارے میں معلومات بھی شامل ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی میں جرار القرمونی (Gerar of Cremona) اور دوسرے ترجمہ نگاروں نے اس کا ترجمہ کیا اور یہ کتاب عیسائی یورپ پر چھا گئی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا (ایڈیشن 1987ء) کے مطابق یہ کتاب پانچ صدیوں تک طب کی مستند ترین کتاب کی حیثیت سے مسلم رہی۔ یہاں تک کہ اس کو اس کی ایجاز و اختصار کی وجہ سے جالینوس کی تصانیف پر بھی فوقیت دی جاتی رہی۔

السنجری

(945ء----1020ء)

السنجری کا پورا نام ابو سعید احمد ابن محمد ابن عبدالجلیل تھا۔ وہ ایران کے شہر سجستان میں 945ء کے قریب پیدا ہوا۔ جیو میٹری' فلکیات اور علم نجوم اس کے خاص موضوعات تھے۔ بعض لوگ اسے السجزی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ ابن الندیم نے "الفہرست" (سنہ تالیف 987ء) میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ البیرونی (973ء-1050ء) "الاثار الباقیہ" میں اس کا حوالہ دیتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ البیرونی کا ہم عصر تھا۔ البیرونی نے قبلہ کی صحیح سمت متعین کرنے میں السنجری سے رابطہ قائم کیا تھا اور قاطع اشکال کے نظریے پر اپنے استاد منصور ابن عراق کا فراہم کردہ ثبوت بھی تحریری صورت میں اسے بھیجا تھا۔ السنجری بھی اپنی تصنیف میں البیرونی کی تین ایسی اشکال (متعلقہ جیومیٹری) کو بیان کرتا ہے' جو کسی زاویے کی تثلیث (تین حصوں میں تقسیم کرنا) سے متعلق ہوں۔ اس کے اختتام پر وہ البیرونی کو در پیش پانچ مسائل بھی دیتا ہے۔

969ء کے قریب السنجری نے شیراز میں ریاضی پر کچھ کتابیں لکھیں اور ان کی نقول تیار کیں۔ ان نقول کا جو قلمی نسخہ بعد میں تیار ہوا' وہ پیرس کے قومی کتاب خانے مین محفوظ ہے۔ غالباً انہی دنوں یعنی 967ء کے قریب اس نے ایک کتاب بعنوان "کتاب القرانات" تالیف کی۔ اس کتاب میں اس کی خود نوشتہ کتاب "منتخب کتاب الالوف" کے حوالے بھی درج تھے۔ 969-970ء میں السنجری نے شیراز میں عبدالرحمن الصوفی کے مشاہدات میں اس کی مدد کی۔ یہ مشاہدات Me-ridian Transits سے متعلق تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ السنجری نے خراسان میں بھی کچھ وقت گزارا' کیونکہ اس نے اس علاقے کے ریاضی دانوں کے سوالات کے جوابات رقم کیے ہیں۔ اس نے اپنی تصنیفات بلخ کے شہزادے امیر ابو جعفر احمد ابن محمد (متوفی 1019ء) اور بویہ خلیفہ عضد الدولہ کے نام معنون کی

ہیں۔

السجزی سائنسی تحقیقات میں علم نجوم پر زیادہ وقت صرف کرتا تھا اور اسے اس سلسلے کی قدیم معلومات پر بھی مکمل عبور تھا۔ وہ عام طور پر اپنی ہی تنقیدی شرحوں اور تبصروں کو جمع کر کے ان کی تالیف و تدوین کرتا اور ان کو جدول کی شکل میں پیش کرتا تھا۔ السجزی نے ابو معشر کی تین تالیفات کا خلاصہ بھی لکھا تھا اور اپنی تالیف "کتاب زرادشت صور درجات الفلک" میں زرتشت سے منسوب پانچ کتابوں میں سے دوسری کتاب کی بابت بھی لکھا تھا۔ اپنی تصنیف "کتاب القرانات" میں، جو عمومی علم نجوم اور اس کی تاریخ سے متعلق ہے وہ ساسانی مواد اور ہارون الرشید کے زمانے اور آخری اموی دور کے ماخذ سے استفادہ کرتا ہے۔ زائچوں کے بارے میں اپنی ایک کتاب "زائرجات" میں وہ ایسی جداول دیتا ہے جو ہرمیس، بطلیموس، اور ڈرو تھئیس کی تحریروں کو بنیاد بنا کر بنائی گئی ہیں۔

السجزی اور بطلیموس کی جدول کا حوالہ احتیاز الدین محمد نے اپنی تصنیف Judicial Astrology میں دیا ہے۔ البیرونی اپنی "کتاب فی استیعاب" میں السجزی کے بنائے ہوئے تین گھٹیا قسم کے اصطرلاب کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک مچھلی کی شکل کا ہے، دوسرا پھول کی شکل کا اور تیسرا کشتی کی شکل کا۔

السجزی کی ریاضیاتی تصانیف اگرچہ فلکیاتی تصانیف سے تعداد میں کم ہیں، لیکن ان کی اہمیت ان سے زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ زیادہ تر ایک مہندس کے طور پر پہنچانا جاتا ہے۔ اس نے کروں اور مخروطی قطعوں پر پہلی کتاب لکھی۔ مخروطی پرکاروں کی ساخت اور مساوی الاضلاع بدلولی شکل کے کسی دائرے کی تقطیع کے ذریعے، ایک زاویے کی تثلیث پر تصنیفات بھی اس کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ تھیں۔ لائیڈن کے ایک مخطوطے میں ابوالجود کا بیان ہے کہ زاویہ کی تثلیث کا یہ طریقہ نہایت معروف ہوا۔ السجزی اس مسئلے کے حل کے بہت سے دوسرے طریقوں کی بھی وضاحت کرتا ہے، جن میں ایک طریقہ "غیر مستقل جیومیٹری کے ذریعہ" کا ہے۔ وہ اس طریقے کو متقدمین سے منسوب کرتا ہے، لیکن پاپس (Papus) کے نام کا حوالہ ہرگز نہیں دیتا۔ قاطع اشکال میں ابعاد پر اس کی تصنیف علم فلکیات میں بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا خطوط کی وضع پر زور دینا ایک نئی اور اہم بات ہے۔ السجزی Regular Heptagon اسی اصول پر بناتا ہے جس پر القوہی نے بنائی تھی۔ السجزی نے قطعات کی تقسیم در تقسیم پر بھی مضامین لکھے اور اقلیدس اور ارشمیدس کی تصانیف سے متعلق بہت سے سوالات کے جوابی خطوط بھی لکھے تھے۔

السجزی کی وفات کا سال صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا لیکن یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ 1020ء کے قریب فوت ہوا۔

المقدسی

(946ء-----995ء)

پورا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البنا الشامی المقدسی البشاری ہے۔ اس کی ولادت اور وفات کے سنین متعین نہیں، لیکن اندازاً یہی کہا جاتا ہے کہ وہ یروشلم میں 946ء کے قریب پیدا ہوا اور دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں فوت ہو گیا۔ المقدسی کی وجہ شہرت جغرافیہ اور نقشہ کشی کے موضوعات ہیں۔

المقدسی نے اپنی جوانی کا زیادہ تر حصہ یروشلم میں گزارا اور اس کے بعد اندلس (جنوبی سپین) سندھ اور سجستان (جنوبی افغانستان) کے علاوہ مملکت اسلامیہ کے تمام علاقوں کا سفر کیا۔ وہ سسلی بھی گیا۔ اپنے ان سفروں کے مشاہدات و تجربات کو اس نے کتابی شکل میں قلمبند کیا اور اسی کتاب کی وجہ سے مسلمان جغرافیہ دانوں میں اس کا نمایاں مقام ہے۔ یہ کتاب "احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم" کے نام سے موسوم ہے اور یہ 985ء میں شیراز کے مقام پر مکمل ہوئی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہے لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ المقدسی نے جغرافیہ کے علاوہ اسلامی فقہ کا بھی وسیع مطالعہ کر رکھا تھا۔ وہ حنفی مسلک فقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے بیشتر جغرافیہ دانوں نے 'خواہ ان کا تعلق مغرب سے ہو یا عرب سے' زیادہ تر جغرافیائی جزئیات کے بیان کرنے میں اپنا زور قلم صرف کیا ہے۔ اس جزئیات نگاری کے باعث ان کی کتابیں یا تو ریاضیاتی' طبعی یا بیانی جغرافیہ سے متعلق تفصیلات پر مشتمل ہیں یا ان میں تجارتی راستوں اور سلطنتوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اور یا مختلف مقامات کے ناموں پر بحث کرتی ہیں۔ المقدسی نے ان طے شدہ راستوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ وہ اپنے پیشرو جغرافیہ دانوں کی ایسی تحریروں اور ان کے معیار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے الجیہانی' ابو زید احمد ابن سہل البلخی' ابن الفقیہہ الہمذانی اور ابن خردادبہ جیسے جانے پہچانے جغرافیہ دانوں کو تنقید

کا نشانہ بنایا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ان کی تحریریں یا تو حکمرانوں کے خاص مقاصد اور حکومتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئیں یا پھر ان میں اتنا اختصار پایا جاتا ہے کہ ان سے کوئی علمی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اپنے ان ہی خیالات کی روشنی میں اس نے خود ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو معاشرے کے مختلف طبقوں مثلاً تاجر' سیاح اہل ثقافت وغیرہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر سکے اور وہ انہیں مفید عملی معلومات فراہم کر سکے۔

المقدسی کو جغرافیہ کی ہر دلعزیزی کا پورا علم تھا چنانچہ وہ اسی حوالے سے لکھتا ہے کہ "یہ ایک ایسا علم ہے جس میں بادشاہ اور امرا گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ فقیہ اور قاضی اسے حاصل کرتے ہیں اور عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ارباب اختیار بھی اس سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں"

المقدسی کا خیال ہے کہ جغرافیہ ایک ایسا موضوع ہے' جس میں اور بھی بہت کچھ شامل ہے۔ اس میں صرف اماکن کی تفصیل ہی نہیں ہوتی بلکہ مختلف گروہ اور فرقے' کاروبار اور تجارت' اوزان و پیمائش' رسم و رواج' سکے اور مالیاتی نظام' زبانیں اور بولیاں بھی شامل ہیں۔ ان تمام موضوعات کو المقدسی نے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے اور ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی بیانیہ اور محققانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ المقدسی نے جغرافیہ کے موضوع کو ایک نیا رخ دیا اور اس میں معاشرتی کوائف کو شامل کر کے اسے مزید وسعتوں سے روشناس کرایا۔

بلخی جغرافیہ دانوں نے اپنی تحریروں کو اسلامی ممالک تک محدود رکھا اور اپنے جغرافیائی نظریات کو قرآن اور حدیث سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک مثال سمندروں کے بارے میں المقدسی کے اس بیان میں ملتی ہے جس میں اس نے دعوٰی کیا ہے کہ قرآن میں دو سمندروں کے سنگم پر واقع جس مقام برزخ کا ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل خاکنائے سویز پر بحیرہ روم اور بحر ہند (جسے بیشتر عرب جغرافیہ دان ایک جھیل سمجھتے تھے) کے ملاپ کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ قرآن میں الفرما اور القلزم کے درمیانی خطے کو البرزخ کہا گیا ہے۔

بلخی جغرافیہ دانوں کی طرح المقدسی نے بھی اپنی تحریریں مملکت اسلامیہ کی حدود میں رکھیں اور اسے "جزیرہ عرب" کے بیان سے شروع کیا۔ اس نے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ نہ تو کبھی غیر مسلموں کے ممالک میں گیا اور نہ اسے ان علاقوں کو بیان کرنے کی کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوئی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود المقدسی جداگانہ خیالات کا مالک تھا اور بہت سی باتوں میں اسے

بلخی جغرافیہ دانوں سے اختلاف تھا۔ اس نے جغرافیہ سے متعلق ہر مسئلے کو ایک منفرد اور عالمانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اپنی تحریروں کے مستند ہونے کے بارے میں وہ خود اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"میں جانتا ہوں کہ جغرافیہ کے بہت سے علماء و فضلاء اس موضوع پر لکھ چکے ہیں لیکن (ان کی تحریروں میں سے) اکثر بلکہ تمام ہی کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر ہے۔ ان کے برعکس میں نے ہر علاقے کو خود دیکھا ہے اور علم کو تجربے کے ذریعے حاصل کیا۔ مزید یہ کہ میں نے تحقیق، تفتیش اور نامعلوم (الغیب) کے ادراک (کے حصول کی کوششوں) کو ترک نہیں کیا۔ لہٰذا یہ کتاب تین حصوں میں مرتب کی گئی ہے: اول میرے ذاتی مشاہدات، دوم جو کچھ باوثوق ذرائع سے سنا اور سوم جو کچھ مجھے اس موضوع اور دوسرے موضوعات پر کتابوں سے حاصل ہوا"۔

المقدسی نے "احسن التقاسیم" کا آغاز مختلف موضوعات پر عمومی تاثرات سے کیا ہے جن میں سمندر اور دریا، جگہوں کے نام اور ان کے متبادلات (ایسے نام بھی جن سے ایک سے زیادہ مقامات موسوم ہیں) مختلف علاقوں کی امتیازی خصوصیات اسلام کے مختلف فرقے اور اسلامی دنیا کے غیر مسلم باشندے، ذاتی سفری روایات کے علاوہ "ایسے مقامات جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے" "قانون دانوں کے لیے ایک تلخیص" اور "دنیا کی اقالیم (خطے یا انتظامی اضلاع) اور "قبلہ کا محل وقوع" کے عنوانات کے تحت ابواب شامل ہیں۔ اس تعارفی حصے میں کچھ ایسی معلومات کو بھی جگہ دی گئی ہے، جو ہمیں پہلی بار المقدسی کے ہاں ملتی ہیں۔ مثلاً وہ پہلا عرب جغرافیہ دان تھا جس نے عربی کی جغرافیائی اصطلاحوں کے معانی اور ضمنی مطالب کو معلوم کیا اور ان کی معیار بندی کی۔ اس کے علاوہ سب سے پہلے اسی نے فوری حوالے کے لیے شہروں اور دوسری خصوصیات کی ایک فہرست بھی مرتب کی۔

المقدسی کے مطابق دنیائے اسلام کے نقشے کی کوئی باقاعدہ شکل نہیں بلکہ یہ ایک بے قاعدہ ترتیب میں ہے۔ اس نے اسلامی دنیا کو چودہ خطوں (اقالیم) میں تقسیم کیا۔ اس میں سے چھ کو اس نے "عرب" کے نام سے موسوم کیا، جن میں جزیرہ عرب، عراق (جنوبی بین النہرین) اقور (الجزیرہ یا شمالی بین النہرین)، شام، مصر اور المغرب کے علاقے شامل تھے۔ باقی آٹھ خطے، جن کو اس نے "عجم" کا نام دیا، المشرق (سامانیوں کی مملکت)، الدلم (گیلان اور عیرہ خزر کے مشرق میں واقع پہاڑی علاقے)، الرحاب (آذربائیجان، اران اور آرمینیا)، الجبال (قدیم میڈیا)، خوزستان (میڈیا کے جنوب اور بین النہرین کے مشرق کا علاقہ) فارس (قدیم ایران)، کرمان (فارس کے جنوب کا علاقہ)

اور سندھ کے علاقوں پر مشتمل تھے۔ یہ تمام علاقے اپنی اپنی مخصوص سرحدیں بھی رکھتے ہیں جو یقیناً المقدسی کے زیر غور تھیں۔ ان علاقوں کو بیان کرتے ہوئے اس نے ہر مقام سے متعلق اپنے مشاہدات کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے ایک شعبہ اس جگہ کی طبعی خصوصیات' ناموں کے مطالعے اور سیاسی ذیلی اکائیوں کے لیے مخصوص تھا جبکہ دوسرا اس مقام کے عمومی خواص کے بیان پر مشتمل تھا۔

المقدسی نے ہر اقلیم کا ایک نقشہ مرتب کیا' جس میں علاقائی سرحدوں اور تجارتی راستوں کو سرخ' ریگستانی علاقوں کو پیلے' نمکین سمندروں کو سبز' دریاؤں کو نیلے اور پہاڑوں کو ہلکے بادامی رنگ میں دکھایا گیا۔ اگرچہ ان میں سے اکثر نقشے اب ناپید ہیں تاہم دوسرے بلخی جغرافیہ دانوں کے تیار کردہ نقشوں کی مدد سے انہیں کسی حد تک دوبارہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ المقدسی نے ان کی تیاری میں بلخی روایات ہی کو اپنایا تھا۔

المقدسی کی کتاب اپنے ادبی اسلوب بیان کے باعث بھی مشہور ہے۔ اس کا طرز تحریر مسجع اور مقفی تھا۔ اس نے ہر علاقے کو بیان کرتے وقت وہاں کا مقامی لب و لہجہ اختیار کیا لیکن بعض علاقوں کے لیے وہ ایسا نہیں کر سکا اور ان کے لیے اس نے اپنی آبائی بولی۔ یعنی شامی زبان استعمال کی ہے۔ اس اصول کے تحت المشرق کے علاقے پر تحریر کردہ باب کی زبان خطیبانہ ہے کیونکہ اس خطے کے لوگ عربی زبان پر عبور رکھتے تھے' لیکن چونکہ مصر اور المغرب کے علاقوں کے باشندوں کی زبان غیر معیاری اور غیر مسجع تھی' اور البطائح (عراق کے دلدل علاقوں) کے لوگوں کی زبان بھی بہت معیوب تھی' لہٰذا ان کے بارے میں المقدسی نے اسی قسم کا لب و لہجہ اختیار کیا۔

ابن الہیثم

(965ء---- 1039ء)

ابو علی الحسن ابن الحسن البصری المصری' عراق کے شہر بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں اور بعد کے حالات کے بارے میں بھی مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس کے روزناچوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی غور و فکر کا عادی تھا۔ بڑا ہوا تو ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ لیکن اس کا جی دفتر کے کاموں سے زیادہ پڑھنے میں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریاضی' طبیعیات' اور طب کے مطالعے میں غرق رہتا تھا۔

اس کے زمانے میں مسلمان دنیا میں مذہبی فرقوں اور مکاتب فکر کی بھر مار تھی۔ ابن الہیثم کو اس بات سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تمام الجھاؤ شکوک و شبہات کی وجہ سے ہے جس کی بنیاد کم علمی ہے۔ اس کے خیال میں سچائی میں انتشار ممکن نہیں کیونکہ سچ صرف ایک ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ انسان کے لئے حصول علم کے بغیر اللہ تعالٰی کی رضا و خوشنودی اور تقوی کی منزل کا حصول ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے علوم عقلیہ میں کمال حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہو سکتا ہے اس کے خیالات یونانی فکر کے تابع ہوں۔ یونانی فلسفیوں کے ہاں ایک طرف گناہ اور جہالت اور دوسری طرف نیکی اور حکمت ہم معنی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ حسن کو نیکی اور حکمت سے اور بد صورتی کو گناہ اور جہالت سے نسبت دیتے ہیں۔ ابن الہیثم نے سوچ لیا کہ وہ ریاضی' طبیعیات اور طب کے ساتھ ساتھ الہیات کی تعلیم بھی حاصل کرے گا۔

دنیائے علم نے اس کو اپنی زندگی علم کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا صلہ یہ دیا کہ آج انسائکلو پیڈیا برٹینکا (1987ء) کے مطابق وہ بطلیموس (دوسری صدی) کے بعد پہلا اہم ماہر بصریات ہے' جس نے انعطاف' انعکاس' دو چشمی نظارے' عدسوں کی تمسیک یا فوکس (Focus)

کرنے کے عمل، قوس قزح، شاجمی اور کروی آئینوں، ہوائی کرے کے انعطاف اور زمینی افق کے قریب سیاروں کے حجم بڑے نظر آنے کے بارے میں نظریات پیش کیے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے بصارت یا دید (Vision) کے عمل کی تفصیلی اور درست وضاحت کی، اور بتایا کہ روشنی نظر آنے والے اجسام کی جانب سے دیکھنے والی آنکھ کی جانب سفر کرتی ہے۔ آنکھ سے اجسام کی جانب نہیں۔

ابن الہیثم کی تصانیف کی صحیح تعداد کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے۔ مختلف مورخوں نے ان کی تعداد مختلف بتائی ہے یعنی 92، 69، 70 یا 55۔ اس نے جن علوم پر کام کیا ان میں متذکرہ بالا علوم کے علاوہ منطق، اخلاقیات، سیاسات، شاعری، موسیقی اور علم کلام شامل ہیں۔ اس کی بیشتر تصانیف ناپید ہیں۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "المناظر" ہے، جس کا موضوع روشنی ہے۔

روشنی کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں ابن الہیثم کے نظریات قابل قدر ہیں۔ اس نے مطالعے کے بعد اپنے متقدمین کے نظریات کو جوں کا توں تسلیم کرنے کے بجائے دوبارہ تحقیق کر کے ان کی بنیاد پر اپنے نظریات قائم کیے ہیں۔ اس نے نظریات قائم کرنے کے لئے تجربے کو بہت اہمیت دی۔ اس کے لئے وہ مختلف قسم کی نلکیاں، ڈوریاں اور تاریک ڈبے استعمال کرتا تھا۔ اس کے نزدیک حرارتی توانائی کی طرح روشنی بھی ایک طرح کی توانائی ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ روشنی اور حرارت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، مثلاً سورج کی کرنیں، آگ اور چراغ کی لو وغیرہ۔ روشنی اور حرارت ایک دوسرے کے بغیر بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس لئے دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روشنی کرنیں یا شعاعیں ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ روشنی نور ہے اور ہمیشہ بغیر کسی سہارے کے خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ نیز روشنی کی ایک حرکت ہے جس کی رفتار میں کمی بیشی ممکن ہے۔ جب یہ کسی کثیف جسم میں سے گزرتی ہے تو اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

ابن الہیثم اجسام کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے: نور افشاں اجسام اور بے نور اجسام۔ نور افشاں جسم کی صفت روشنی خارج کرنا ہے، مثلاً سورج یا چراغ۔ بے نور جسم کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہوتی لیکن اگر نور افشاں جسم اس پر روشنی ڈالے تو یہ عارضی طور پر روشن ہو جاتا ہے مثلاً چاند۔ یہ عارضی نور کہلاتا ہے۔ بے نور اجسام تین طرح کے ہوتے ہیں۔ (1) شفاف جسم: جن میں سے روشنی گزرتی تو ہے لیکن مکمل۔ مثلاً ہوا، پانی، شیشہ وغیرہ۔ (2) نیم شفاف جسم: جن میں سے روشنی گزرتی تو ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ مثلاً باریک کپڑا، رگڑا ہوا شیشہ وغیرہ۔ (3) غیر شفاف جسم: جن میں سے روشنی بالکل نہیں گزر سکتی مثلاً لکڑی، پتھر وغیرہ۔

ابن الہیشم کہتا ہے کہ کوئی چیز مکمل طور پر شفاف نہیں ہوتی۔ ہر شفاف جسم میں ایک درجہ ناشفافی کا ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ روشنی جب بھی کسی جسم میں سے گزرتی ہے تو تقسیم ہوتی ہے۔ اس ی لئے وہ جسم لطیف تر ہو جاتا ہے۔ تقسیم کے اس عمل میں ایک ایسی حد آتی ہے جب مزید تقسیم نا ممکن ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر روشنی ختم ہو جاتی ہے۔

ابن الہیشم کے نزدیک رنگوں اور نور میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ رنگ بھی روشنی کی طرح اپنی شعاعیں اپنے ارد گرد ڈالتے ہیں اور روشنی ہی کی طرح رنگوں کی شعاعیں نظر آنے والے جسم کے ہر ذرے سے خارج ہو کر تمام سمتوں میں پھیلتی ہیں۔ رنگ اور نور ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

ابن الہیشم کا ایک تجربہ زمانہ جدید کی کئی اہم ایجادات اور دریافتوں کا پیش خیمہ بنا۔ اس نے ایک اندھیرے کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے اس سے روشنی اندر پہنچائی۔ سوراخ کے عین سامنے ایک ایسا پردہ لٹکا دیا' جس پر سوراخ سے آنے والی روشنی اور اس روشنی میں نظر آنے والی چیزوں کا عکس پڑ سکے۔ اس نے دیکھا کہ روشنی میں نظر آنے والی تمام چیزوں مثلاً انسان' درخت' پتوں وغیرہ کا پردے پر الٹا عکس پڑتا ہے حالانکہ وہ چیزیں سیدھی ہیں۔ اس تجربے نے نہ صرف آنکھ کا فعل سمجھنے میں مدد دی بلکہ کیمرے کی ایجاد کا باعث بھی بنا۔ اگرچہ ابن الہیشم کے خیال میں آنکھ کے اندر بننے والی صورت کا ادراک حواس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ابن الہیشم کا سب سے بڑا کارنامہ بصارت یا دید کے عمل کی وضاحت ہے۔ اس کے مطابق نور کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ بصارت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی لئے تیز روشنی کی طرف دیکھنے سے آنکھوں میں تکلیف ہوتی ہے اور روشنی پر سے نظر ہٹا لینے کے بعد تک آنکھ پر روشنی کا اثر رہتا ہے۔ قدماء کا خیال تھا کہ انسانی آنکھ سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں اور جس جس چیز پر یہ کرنیں پڑتی ہیں وہ دیکھنے والی آنکھ کو نظر آجاتی ہے۔ لیکن ابن الہیشم نے اس نظریے کو رد کر دیا اور ثابت کیا کہ جب بھی کسی جسم پر روشنی پڑتی ہے تو وہ جسم اس روشنی کو متعین سمتوں میں واپس بھیج دیتا ہے۔ روشنی کی یہ خاصیت ہے کہ جب یہ کسی جسم سے ٹکراتی ہے تو اسی زاویے میں واپس مڑ جاتی ہے جس زاویے سے یہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جسم سے نکلی ہوئی شعاعوں میں سے کچھ ان آنکھوں میں داخل ہو جاتی ہیں جو خط مستقیم میں سفر کرنے والی شعاعوں کے راستے میں آجاتی ہیں۔ اس طرح یہ اجسام ان آنکھوں کو نظر آجاتے ہیں۔ ابن الہیشم پہلا شخص تھا جس نے دید کے فعل کی وہ وضاحت کی جو جدید بصریات کی بنیاد ہے اور ابھی تک مستند سمجھی جاتی ہے۔ بصریات سے متعلق اصطلاحات بھی ابن الہیشم

کی مرہون منت ہیں۔

اس نے خلا کے وجود اور نظریہ کشش ثقل پر بھی بحث کی۔ اس کا کہنا ہے کہ زمین سے دس میل بلندی تک ہوا کہ تہہ موجود ہے۔ اس کے خیال میں اشیاء کے وزن میں فضا کی لطافت اور کثافت کی مناسبت سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے نزدیک شفق کی ابتدا اور انتہا اس وقت ہوتی ہے جب سورج افق سے ۱۹ درجے نیچے ہو۔

اس عالی مرتبہ سائنس دان نے اپنی تمام زندگی کھوج میں گزار دی۔ وہ انتہائی قناعت پسند واقع ہوا تھا۔ روپے پیسے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عمر کا ایک حصہ اس نے جامع الازہر کے ایک کمرے میں تحقیق و مطالعے میں گزار دیا۔

مسلمانوں نے اس قابلیت کو بہت بعد میں تسلیم کیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ 1150ء میں خلیفہ المتسنجد نے فلسفہ کی تمام کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نذر آتش کرنے کے لیے قاضی مکرر کیا۔ 1192ء میں طبیب عبدالسلام کفر والحاد سے مطعون کیا گیا۔ اس کی کتابیں ضائع کرنے پر جو مولوی مقرر ہوا وہ کرسی پر چڑھا اور فلسفہ کے خلاف تقریر کی۔ پھر باری باری جلدیں ہاتھ سے لے کر شرمناک تعلیم کا ذکر کیا اور کتابیں آگ میں جھونکتا گیا۔ میمون کا عزیز ربی یہود اس واقعہ کا عینی شاہد تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس نے ابن الہیثم کی ایک ہیئت کی کتاب مولوی کے ہاتھ میں دیکھی۔ جن دائروں کے ذریعہ ابن الہیثم نے افلاک کی کروں کو واضح کیا تھا' انہیں دکھا کر مولوی نے کہا' یہ "دیکھ لو کس قدر رنج کی بات ہے' کس قدر آفت ہے اور کتنی بڑی مصیبت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کتاب کو پھاڑ ڈالا اور آگ میں جلا دیا۔

البیرونی

(973ء----- 1050ء)

البیرونی کی ولادت 6 ستمبر 973ء کو خوارزم میں ہوئی۔ پورا نام ابوالریحان محمد بن احمد ہے۔ اس کے سال وفات اور مقام وفات کے بارے میں اختلافات ہیں لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غالباً 1050ء میں غزنی میں فوت ہوا۔ اس کا نام ریاضیات' جغرافیہ اور تاریخ کے موضوعات کے حوالے سے مستند سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحقیقات اور مطالعات سے دور حاضر میں بھی استفادہ کیا جارہا ہے۔

البیرونی جس علاقے میں پیدا ہوا' وہ شہر کاث سے ذراہٹ کر تھا۔ اسی لیے وہ البیرونی کہلایا۔ خوارزم کے دوسرے بڑے شہر خیوا میں اس کی ابتدائی زندگی کے کئی سال گزرے۔ اس کے آباؤاجداد اور بچپن کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ تاہم' چھوٹی عمر میں ہی سائنسی علوم سیکھنے میں لگ گیا۔ خوارزم کے معروف ہیئت دان' ریاضی دان ابو نصر منصور کا شاگرد ٹھہرا۔ سترہ برس کی عمر میں اس نے ایک ایسا حلقہ ایجاد کیا' جس پر نصف درجہ تک کے نشانات لگے ہوئے تھے۔ یہ نصف النہار کے وقت کاث میں ارتفاع شمس کے مشاہدہ کے لیے استعمال کیا گیا اور اسی کی مدد سے البیرونی نے زمینی عرض بلد نکالا۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا اور صرف چار سال بعد اس نے 15 ذراع قطر کا ایک حلقہ اور دیگر سامان پیمائش تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اپنی تحقیقات کے دوران ہی ملک میں خانہ جنگی اور بدامنی کی وجہ سے البیرونی کو آبائی وطن سے ہجرت بھی کرنا پڑی۔

البیرونی کی ایک کتاب "تحدید الاماکن" سے پتہ چلتا ہے کہ اسے بعض دنیاوی امور میں مجبوراً حصہ لینا پڑا۔ دنیاوی مصروفیات اس کے علمی اور سائنسی کام پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ اس کے کئی حاسد پیدا ہو گئے جن سے اس کی چپقلش چلتی رہی۔ اس کتاب میں البیرونی نے لکھا ہے کہ اس نے خلیفہ مامون کے کہنے پر زمینی خط نصف النہار کے ساتھ درجہ کی پیمائش کے لیے جرجان اور

اغوز ترکوں کے علاقے کے مابین موزوں قطعہ زمین کا انتخاب کیا لیکن اس کے سرپرست (غالباً سلطان قابوس) کو اس تجربہ میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ 995ء میں البیرونی نے کس جگہ کو چھوڑا اور کس کو اختیار کیا لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ "رے" میں چلا گیا ہو۔ اس کی تصنیف "الباقیہ" میں اس کی مفلسی کی مصیبتوں کا ذکر طنزیہ نظم کی شکل میں ملتا ہے۔ اسی میں وہ ایک مقامی منجم کا ذکر کرتا ہے جو پہلے اس کی مفلسی کی وجہ سے اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور جب اس کے حالات ٹھیک ہوئے تو دوست بن گیا۔ زندگی کے ماہ و سال گزرتے رہے اور 997ء میں البیرونی نے واپس کاث پہنچ کر اسی سال 24 مئی کو وہاں چاند گرہن کا مشاہدہ کیا۔ اس واقعہ کا "تحدید الاماکن" میں صرف سنہ دیا گیا ہے جبکہ تاریخ یہی درست ہے کیونکہ اگلا چاند گرہن کاث اور بغداد دونوں شہروں سے بیک وقت نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ چاند گرہن 17 نومبر 997ء کو لگا تھا۔ پیمائش کے دوران وقت میں جو فرق سامنے آیا اس سے البیرونی اور ابوالوفا نے دونوں شہروں کے طول بلد کا فرق معلوم کیا۔

1000ء میں البیرونی نے اپنی تصنیف "لآثار الباقیہ" کو قابوس کے نام معنون کیا لیکن یہ اس کی پہلی تصنیف نہیں تھی، کیونکہ اس میں وہ اپنی سات کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تمام کتابیں اس وقت نایاب ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں ایک اعشاری حساب، دوسری اصطرلاب، تیسری فلکیاتی مشاہدات، تین کتابیں نجوم پر اور ایک تاریخ کے موضوع پر ہے۔

البیرونی کے بیشتر واقعات اس کی خودنوشت سے لئے گئے ہیں۔ گو یہ اب ناپید ہو چکی ہے لیکن اس کے بعض حصے تاریخی کتب میں منقول ہیں۔ محمود غزنوی واپس جاتے ہوئے البیرونی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کو ساتھ لے جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ محمود غزنوی اس کی موجودگی سے اپنے دربار کی علمی شوکت میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مقامی حکمرانوں کے ایک فعال ساتھی کو منظر سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہمیں البیرونی کا ذکر کابل کے گردونواح کے ایک گاؤں میں ملتا ہے۔ اس وقت وہ نہایت مایوس اور تفکرات میں گھرا ہونے کے باوجود اپنی کتاب تحدید الاماکن مین بے حد مصروف رہا۔ 14۔ اکتوبر 1018ء کو وہ شمسی ارتقاء کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن آلات نہ ہونے کی وجہ سے اس نے تختہ حساب کی پشت پر ہی ایک درجہ وار قوس لگائی اور ایک شاقول کے استعمال سے اس نے اسے ایک آلہ ربع کے طور پر استعمال کیا۔ جو نتائج حاصل ہوئے ان کو اس نے گاؤں کا عرض بلد دریافت کرنے میں استعمال کیا۔

البیرونی کو سنسکرت اور ہندوستانی تہذیب میں کافی دلچسپی تھی۔ اسے ہندوستان کے سفر

اور قیام سے بہت فائدہ ہوا۔ اس نے ہندوستان کے بہت سے مقامات کی سیاحت تو کی لیکن اس کی مصدقہ تاریخوں کا علم نہیں۔ جن شہروں میں وہ گیا ان کا تعلق پنجاب اور کشمیر کے سرحدی علاقوں سے ہے۔ زخاؤ (E-SACHAU) نے "کتاب الہند" کے تعارف میں گیارہ ایسے شہروں کے نام درج کئے ہیں۔ جن کے عرض بلد البیرونی نے دریافت کئے تھے۔ البیرونی لکھتا ہے کہ جب وہ نندنہ میں تھا تو اس نے ایک قریبی پہاڑی کو کرۂ زمین کا قطر معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ نندنہ موجودہ کھیوڑہ (ضلع جہلم) کے قریب واقع ہے اور اسے محمود غزنوی نے 1014ء میں فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے سکندر اعظم اور بعد میں مغلوں نے بھی اس شہر کو فتح کیا۔ البیرونی نے برسوں غزنہ میں قیام کیا اور 1027ء کے دوران چینی اور اغوز ترکوں کے وفود کی غزنہ آمد پر ان سے مشرق بعید کے متعلق معلومات حاصل کیں اور انہیں اپنی کتاب "القانون المسعودی" میں رقم کیا۔

1030ء میں سلطان محمود غزنوی کے انتقال کے ساتھ ہی اس کے دو بیٹوں میں جانشینی کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ البیرونی اس تالیف کو کسی کے نام معنون نہ کر سکا۔ اسی سال محمود غزنوی کا بڑا بیٹا مسعود غزنوی مسند نشین ہوا تو البیرونی کے حالات بھی بہتر ہو گئے۔ چنانچہ اس نے "القانون المسعودی" کو اسی نئے حکمران کے نام منسوب کیا۔ جب البیرونی کو ذرا سکھ کا سانس نصیب ہوا تو وہ اپنے آبائی وطن گیا اور اکسٹھ سال کی عمر میں اس کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی۔

محمود غزنوی کے بڑے بیٹے مسعود کو 1040ء میں جب اس کے بعض افسروں نے قتل کر دیا تو اس کا چھوٹا بھائی مودود تخت نشین ہوا۔ اس کے آٹھ سالہ دور حکومت میں البیرونی نے "دستور" اور "جواہر" جیسی کتابیں مکمل کیں۔ اس کے بعد آٹھ قمری سال گذر جانے کے بعد اس کی سماعت اور بینائی میں کمی آ گئی۔

البیرونی نے ارشمیدس کے اصول کو استعمال کرتے ہوئے ترازو کی بعض مخصوص شکلوں کے ذریعے ایک بعد قاعدہ شکل کے ٹھوس جسم کی کثافت نکالی ہے۔

البیرونی کی "کتاب القمر" میں مختلف اقسام کے ان فلکیاتی مظاہر کا ذکر کیا گیا ہے، جن کے لئے قمر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ جب ایک سیارے کا دوسرے سیارے کے فلکیاتی طول بلد یا عرض بلد میں یا زمین سے اس کے بقدر فاصلے میں گزر ہوتا ہے، تو یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

البیرونی کی ایک اور تالیف "کتاب الجواہر" ترتیب کے لحاظ سے دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا جز قیمتی اور کم قیمتی پتھروں اور دوسرا دھاتوں سے متعلق ہے۔ البیرونی کو یونانی، روسی،

سریانی' ہندوستانی اور اسلامی ذرائع سے جو بھی معلومات حاصل ہوئیں وہ بھی اس نے اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ اس کے مشاہدات کے نتائج بھی اسی میں درج ہیں۔ اس کتاب میں مختلف چیزوں کی کانوں کے ذرائع کے حصول کے ذکر کے علاوہ مختلف اشیاء کے طبعی خواص' مختلف زبانوں اور لہجوں میں فنی اصطلاحات کے اشتقاق کا بھی ذکر ہے۔ نیز سونے کو معیار مان کر باقی دھاتوں کی کثافت بیان کی گئی ہے اور حجم کی مطابقت سے ہیروں اور زمرد کی قیمتوں کی جدولیں دی گئی ہیں۔

علم کے حصول کی خواہش کی وجہ سے البیرونی نے بچپن ہی میں کئی زبانیں سیکھیں لیکن اس کی مادری زبان خوارزمی تھی۔ البیرونی کے مطابق خوارزمی زبان میں کسی سائنسی تصور کو بیان کرنا اتنا ہی عجیب لگتا ہے جتنا کسی پرنالے پر اونٹ کو کھڑا دیکھنا یا اصیل گھوڑوں میں زرافہ دیکھنا۔ عربی اس کے لیے سائنسی تصورات کے بیان کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یونانی' سریانی اور عبرانی زبانوں پر اسے دستگاہ حاصل تھی۔ سنسکرت میں تو وہ اس قدر ماہر تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے علمی کتابوں کے تراجم عربی میں اور عربی کتابوں کو سنسکرت میں منتقل کر سکتا تھا۔

البیرونی کھلے ذہن کا انسان تھا لیکن اس کی رواداری غیر سنجیدہ لوگوں' بے عقل افراد اور متعصب اشخاص کے لیے نہیں تھی۔ ایک بار اس نے کسی فقیہ کو نمازوں کے اوقات مقرر کرنے کا ایک آلہ دکھایا تو اس نے یہ اعتراض کیا کہ اس پر مہینوں کے بازنطینی نام کندہ کر دیئے گئے ہیں لہٰذا یہ کفار کے ساتھ تشبیہہ کے حکم میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں البیرونی کا جواب کچھ اس طرح تھا: "بازنطینی کھانا کھاتے ہیں' تب آپ اس معاملے میں ان کا تشبہ اختیار نہ کیا کریں۔" یہ کہتے ہی اس نے فقیہہ کو نکال باہر کیا۔

البیرونی کے معاصرین اسے اس کی زندگی بھر کارکردگی اور کردار کی وجہ سے "الاستاذ" کے نام سے جانتے تھے۔ اس کو فوت ہوئے کئی صدیاں گذر چکی ہیں' لیکن اس کے باوجود البیرونی کا نام دنیا بھر کے علمی اور سائنسی حلقوں میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ اس کی بین الاقوامی شہرت ہی کا نتیجہ ہے کہ 1973ء میں' جب اس کی ولادت کو پورے ایک ہزار سال ہوئے' دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک میں کانفرنسیں اور سیمینار منعقد ہوئے' جن میں اس کی گرانقدر سائنسی اور علمی خدمات کو سراہا گیا۔

ابن رضوان

(998ء----1061ء)

ابن رضوان کا پورا نام ابو الحسن علی بن علی بن جعفر ابن رضوان ہے۔ یہ مصر کے دار السلطنت قاہرہ کے قریب ایک قصبے الجیزہ میں 998ء میں پیدا ہوا۔ وہ مصر کی فاطمی خلافت کے دور کا ایک طبی محقق تھا۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ تر معلومات ابن القفطی اور ابن ابی اصیبعہ کی تصانیف میں ملتی ہیں۔ تاہم اس کی خود نوشت سوانح حیات بھی اس کی زندگی کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ قاہرہ ہی میں گزارا اور وہیں 1061ء (بعض روایات کے مطابق 1069ء) میں وفات پائی۔

اس کا باپ ایک بیکری میں معمولی ملازم تھا۔ وہ خود اپنی کتاب میں اس دور کی مفلسی کا تذکرہ کرتا ہے۔ ابن رضوان شروع ہی سے حصول علم کی جانب رغبت رکھتا تھا اور اسی کی خاطر وہ دس سال کی عمر میں قاہرہ پہنچ گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے خود ہی طب کی اعلیٰ کتابیں پڑھنا شروع کر دیں اور فالتو وقت میں زندگی گزارنے کے لیے ذریعہ معاش کے طور پر راہگیروں کو قسمت کا حال بتا کر پیسے کمانا شروع کر دیے۔ تیس سال کی عمر میں اس نے شادی کی اور ایک یتیم بچی کو متبنیٰ بنایا جو غالباً 1044ء میں اس کی تمام قیمتی اشیاء اور ساری پونجی لے کر فرار ہو گئی۔ اس سانحے کا ابن رضوان کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ بہر حال وہ اپنے طب کے پیشے سے خوش تھا۔ اس کی تحقیق کا میدان حفظ صحت یعنی ہائی جین (Hygiene) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکران کا بادشاہ ابو المعسکر بھی اس سے مشوروں کا طالب رہتا تھا یہ بادشاہ آدھے دھڑ کے فالج میں مبتلا تھا۔ وہ کامیابی کے عروج پر پہنچ گیا جب قاہرہ کے ایک فاطمی خلیفہ نے اسے مصر میں "سردار اطبا" کا خطاب دیا۔ ایک مستشرق شاخت (J.Schacht) نے اس حکمران کا نام المستنصر (عہد حکومت 1036ء تا 1049ء) لکھا ہے۔ اس کے برعکس ابن ابی اصیبعہ اس کا نام الحاکم بتاتا ہے۔ الحاکم نے 1021ء میں وفات پائی تھی۔

اس وقت ابن رضوان کی عمر 23 سال تھی اس لیے ابن ابی اصیبعہ کا بیان درست نہیں ہے۔

ابن رضوان کی مختصر سی خود نوشت سوانح عمری ابن ابی اصیبعہ کی تصنیف میں محفوظ ہے۔ اس میں وہ حتمی طور پر کہتا ہے کہ ہر آدمی کو وہی پیشہ منتخب کرنا چاہئے جو اس کے حسب حال ہو۔ خود اپنے معاملے میں وہ بتاتا ہے کہ اس کی پیدائش کے روز ہی قدرت الٰہی نے اس کے لیے طب کا میدان مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بقول طب ایک ایسا علم ہے جو نہ صرف فلسفے کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اس کا تقویٰ ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ یہ اصول مقرر کرتا ہے کہ طبیب کو مشورے کا معاوضہ نقدی کی صورت میں ملنا چاہئے اور انہیں سوائے حقیقی ضرورت کے کبھی کسی کو قرض کے طور پر رقم نہیں دینی چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ادھار لی گئی رقم لوٹائی نہ گئی ہو تو ایسے ادھار کو فی سبیل اللہ صدقہ خیرات سمجھ کر معاف کر دینا چاہئے' کیونکہ خدا بھی تو سخت مشکلات میں اس کی دست گیری کرتا ہے۔

ابن رضوان طبی اخلاقیات کے ایسے مجموعہ قوانین کی تائید کرتا ہے جو بقراط کے خیالات کی حد تک احتیاط پسند ہو۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہننے اور لباس کو معطر کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ دل کی پاکیزگی اور آنکھوں کی حیاء پیدا کرنے پر بھی زور دیا۔ وہ پیشہ ورانہ رازوں کی پابندی کرتا تھا اور مریضوں کو بلاوجہ تنگ کرنے کے خلاف تھا۔ اس کے بقول طبیب کو مریض سے نرمی سے پیش آنا چاہئے اور اس کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ خطرناک ادویات استعمال نہیں کرے گا۔ الغزالی کی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ ادویات جس قدر جسم کے لیے مفید ہیں اتنی ہی روح کی بقا کے لیے بھی فائدہ مند ہیں۔ اس نے اس موضوع پر کہ ادویات کے ذریعے کیسے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ وہ روح کی شفا میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے Posidonius اور Philagrius کی تصانیف پر حاشیہ آرائی بھی کی۔ یہ تصانیف اعصابیاتی (Neurological) نوعیت کی تھیں اور کسی قدر دماغی امراض کے علاج سے متعلق تھیں۔ ابن رضوان نے طب اور اخلاقیات میں ایک تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح زندہ رہتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے متفق تھا۔

طب اور طبابت کے بارے میں ابن رضوان کے خیالات ہی بلند پایہ نہیں تھے بلکہ وہ عملی طور پر بھی ایک بااصول اور ایماندار طبیب تھا۔ اس نے اپنے قابل ذکر نظریاتی علم کے ساتھ اپنے محتاط طبی مشاہدات بھی لکھے ہیں۔ اس نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ طبیب کو چاہئے کہ سب

سے پہلے وہ مریض کے بیرونی جسمانی اعضا کے ظاہری پہلوؤں پر غور کرے اور جلد کی رنگت' اس کا درجہ حرارت اور اس کی ساخت نوٹ کر لے۔ اس کے بعد اندرونی اور بیرونی اعضاء کے افعال کا معائنہ کرے۔ مثال کے طور پر سماعت اور بصارت کی شدت کا اندازہ لگائے اور زبان سے کی گئی گفتگو کے لہجے پر غور کرے۔ ابن رضوان مریض کے عضلات کی قوت معلوم کرنے کے لیے اسے وزن اٹھوانے اور ان کی قوت گرفت کا اندازہ لگانے کے لیے اسے مختلف چیزیں تھمانے کے طریقے کی بھی وکالت کرتا ہے۔ وہ مریض کے آگے اور پیچھے کی جانب چلنے کا مشاہدہ کرنے' پیٹ کو چھو کر آنتوں کی حالت معلوم کرنے' نبض کو چھو کر مریض کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانے اور پیشاب اور خلطوں کا معائنہ کر کے جگر کے حالات معلوم کرنے کو ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ مریضوں سے ان کی ذہنی کیفیات معلوم کرنے کے لیے سوالات پوچھتا اور ان کے رد عمل کو بڑی احتیاط سے نوٹ کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مرض کی تشخیص کے لیے وہ مریض کے عمومی رویے اور مریض کی ذاتی ترجیحات کو بھی مد نظر رکھتا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا کہ مریض کی بیماری ابتدائی نوعیت کی ہے یا دائمی۔ اس طرح ان امور کو سامنے رکھ کر وہ مریض کا علاج شروع کرتا تھا۔

اپنی خود نوشت سوانح حیات کے آخر میں ابن رضوان ان کتابوں میں سے کچھ کی فہرست دیتا ہے جو اس نے وقتاً فوقتاً پڑھی ہیں۔ ان میں ادب' فقہ' مفردات پر دیوسقریڈیس (-Diosco rides) کا رسالہ' الرازی کی کتاب "الحاوی" زراعت اور قرابادین پر کتب' بطلیموس کی کتاب "المجسط" اور Quadripartitum شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بقراط' جالینوس' روفوس (Rufus)' اری بے سی اس (Oribasius)' پال افلاطون' ارسطو' اسکندر' تھیمسٹیس (Themistius) اور الفارابی کے نظریات و تصنیفات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ اس فہرست سے اس کی علمیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے اور اس کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا بھی علم ہوتا ہے لیکن اس کے مخالفین اکثر اس کو "خود آموز" اور صرف کتابی عالم گردانتے ہیں یعنی اس نے اتنا علم کسی استاد سے حاصل نہیں کیا بلکہ صرف کتابیں پڑھ پڑھ کر عالم بن گیا۔ اس نے اپنی تربیت کی فضیلت کا دفاع کیا ہے اور وہ اپنے معترضین پر کھلم کھلا یہ الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے قدیم تحریروں سے سراسر انحراف کیا ہے۔ یوں وہ ابن بطلان کے ساتھ بحث و نزاع میں الجھ گیا۔

ابن رضوان کی طبی تصنیفات بہت سے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس نے بقراط اور جالینوس کی کتابوں کی چودہ کے قریب شرحیں اور خلاصے لکھے تھے۔ جالینوس کی کتاب "Arparva" پر لکھی گئی اس کی شرح کا ترجمہ عبرانی زبان میں کیا گیا۔ اسی طرح اس کے

مجموعہ اصول طب کا بھی عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس نے فیل پا (ایسا مرض جس میں جلد ہاتھی کی جلد کے مشابہہ ہو جاتی ہے اور پیر پھول جاتا ہے) کے علاج' دست آور اشیاء' شربت اور معجون' بخاروں کی قسم بندی' گلٹیوں' میعادی بخار اور دمہ پر بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ اس نے طب کی تعلیم کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔ مصر میں پھیلنے والی بیماریوں پر ایک مبسوط کتاب اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس میں ابن رضوان حفاظتی اقدامات' حفظان صحت کے اصول اور طاعون کی وجوہات کے بارے میں بتاتا ہے۔ موخر الذکر بیماری سے اس کا واسطہ سب سے پہلے قاہرہ میں 1044ء میں پھوٹنے والی وباء کے دوران پڑا۔ اس نے علم الادویہ کے موضوع پر مضامین ایک کتاب میں جمع کیے اور الفبائی لحاظ سے مفردات کی ایک لغت بھی ترتیب دی۔

ابن رضوان کی غیر طبی تصنیفات میں ارسطوئی طبیعیات (یہ مضمون ارسطو کے علم کی برق' حرارت اور نکات اور خطوط کے طبعی وجود کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے)' مابعد الطبیعیات رسائل (یہ رسائل دنیا کے مادہ اولی اور ابدی وجود کے بارے میں ہیں)' اقلیمیات (علم آب و ہوا)' مصر اور فرفوریوس کی کتاب "Isagoge" کی افادیت پر رسالے اور کتابیں شامل ہیں۔ بطلیموس کی کتاب "Quadripartitum" پر اس کی شرح کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا جو وینس میں شائع ہونے والے ایک ایڈیشن کی شکل میں موجود ہے۔ ابن رضوان اگرچہ لکھنے لکھانے میں بڑا ماہر تھا لیکن اس کی سرگرمیاں یہیں تک محدود نہ تھیں۔ وہ درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس کے تلامذہ میں فاطمی شہزادہ المبشر ابن الفاتک جو خود ایک مصنف اور فلسفہ دان تھا اور یہودی حکیم افرائیم ابن الزفر شامل ہیں۔

عمر خیام

(1048ء ----- 1131ء)

پورا نام غیاث الدین ابو الفتح ابن ابراہیم الخیامی تھا۔ 15 مئی 1048ء میں ایرانی شہر نیشاپور میں پیدا ہوا اور ۴ دسمبر 1131ء کو یہیں اس کا انتقال ہوا۔ کے نام سے مشہور ہوا اور ایک بلند پایہ شاعر، ریاضی دان، فلکیات دان اور باکمال فلسفی تھا۔

خیام کے والد کا جدی پیشہ خیمہ سازی تھا۔ عمر اس کا ذاتی نام تھا اور اس کا نام "خیام" خیمہ سازی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ نامور مورخ البیہقی خیام کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ خیام کے انتقال کے چار برس بعد اس کے مقبرے کی زیارت کا ذکر ملتا ہے۔

خیام نے ابتدائی تعلیم نیشاپور میں حاصل کی۔ لڑکپن اور جوانی کا دور بلخ میں گزارا۔ سترہ سال کی عمر تک اس نے فلسفے پر کامل عبور حاصل کر لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد غالباً معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ تدریسی مصروفیات کی وجہ سے اسے اتنی فرصت نہیں ملتی ہو گی کہ سائنسی تحقیقات پر توجہ مرکوز کر سکے۔ اسے یکسوئی کی خاطر شاہی دربار سے وابستگی اختیار کرنا پڑی۔ اس نے اپنے "رسالہ فی البراہین، علی مسائل الجبر، والمقابلہ" میں زندگی کے مختلف مصائب پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس نے اپنی کسی مجبوری کو کبھی آڑے نہ آنے دیا۔ نامساعد حالات کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور "مشکلات الحساب" جیسی مفید اور اہم کتاب لکھی۔ لیکن اس کی یہ ریاضیاتی تصنیف ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی۔ اس نے موسیقی پر ایک رسالہ "القول علی اجناس التی بالاربع" بھی رقم کیا۔

1070ء کے لگ بھگ خیام نے سمرقند میں قاضی القضاۃ ابو طاہر کی مصاحبت اور سرپرستی میں مکعب مساواتوں کے بارے میں الجبرے کی ایک شاہکار تصنیف قلمبند کی۔ بعد میں اس نے اس تصنیف میں اضافہ بھی کیا۔ اصفہان میں سلجوقی سلطان جلال الدین ملک شاہ اور اس کے وزیر نے اسے اپنے پاس بلایا اور فلکیاتی رصدگاہ کی نگرانی پر لگا دیا۔

اصفہان میں خیام کا تقریباً اٹھارہ سالہ دور اس کی زندگی کا غالباً خوشگوار ترین اور پر سکون زمانہ تھا۔ رصدگاہ میں اس کی رہنمائی میں اس کے رفقائے کار نے جو فلکیاتی جداول مرتب کیے' وہ ''زیج ملک شاہی'' کے نام سے مشہور ہوئے لیکن ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکے ہیں۔ ایران میں مروج شمسی کیلنڈر کی اصلاح کا کام بھی اس رصدگاہ میں تکمیل کو پہنچا۔ کیلنڈر کی اصلاح کا منصوبہ خیام نے 1079ء کے لگ بھگ پیش کیا تھا اور بعد میں اس نے ''نوروز نامہ'' کے نام سے گزشتہ اصلاحات کی تاریخ مرتب کی۔ اس کی اصلاحات کا ذکر طوسی اور الغ بیگ فلکیاتی جداول میں شامل مختصر بیانات سے ہوتا ہے۔ نئے کیلنڈر کے لئے تینتیس برس کے دور کو بنیاد بنایا گیا اور اسے سلطان جلال الدین ملک شاہ کی نسبت سے ''سن ملکی'' یا ''سن جلالی'' کا نام دیا گیا۔ ہر دور کے چوتھے' آٹھویں' بارھویں' سولھویں' بیسویں' چوبیسویں' اٹھائیسویں اور تینتیسویں سال کو تین سو چھیاسٹھ دنوں پر مشتمل سال کبیہ (Leap Year) قرار دیا گیا۔ سال کی اوسط لمبائی 2424 -365 دن قرار پائی۔ اس طرح یہ اصل کیلنڈر سے 0.0002 دن کا انحراف کرتا ہے اور اس کیلنڈر میں پانچ ہزار سال بعد ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔

خیام نے درباری نجومی کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن وہ عدالتی نجومیات پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ 1077ء میں اس نے اقلیدس کے متوازی خطوط اور نسبتوں کے نظریے پر تبصرے تحریر کئے۔ فلسفے پر 1080ء میں اس نے رسالہ لکھا۔ 1092ء میں ملک شاہ کی وفات اور وزیر نظام الملک کے قتل کے بعد ملک شاہ کی دوسری بیوی ترکان خاتون تخت پر بیٹھی تو خیام کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں کیونکہ ترکان خاتون کے نظام الملک کے ساتھ جانشینی کے سلسلے میں اختلافات تھے۔ چونکہ خیام نظام الملک کی سرپرستی میں تھا اس لیے وہ ترکان خاتون کے عتاب کا شکار ہوا۔ اس پر سب سے بڑا جو اعتراض کیا گیا وہ یہی تھا کہ اس کی لکھی ہوئی رباعیاں شراب و شباب کے موضوعات سے بھری پڑی ہیں۔

خیام نے 1118ء میں' جب ملک شاہ کا تیسرا بیٹا تخت پر بیٹھا' اصفہان کو چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ مرو میں گزارا۔ اس نے اپنی تصانیف ''میزان الحکم'' اور ''فی القسطاس المستقیم'' غالباً مرو ہی میں تحریر کیں۔ ''میزان الحکم'' میں اس نے دوسری چیزوں کے علاوہ کسی بھرت میں شامل مختلف دھاتوں کے مخصوص اوزان اور ان کے ابتدائی تعین کی مدد سے بھرت میں موجود سونے اور چاندی کی مقداروں کے تعین کے مسئلے کا خالص جبری حل بھی پیش کیا۔ اس نے اپنی تصنیف ''القول علی اجناس التی بالاربع'' میں ایک ربع کو تین سروں یعنی ہشت سرے سرگم' نیم سرتی اور رور موسیقی کے

تطابق میں تین وقفوں میں تقسیم کرنے پر بحث کی ہے۔ یونانیوں کے برعکس، خیام نے نسبتوں کی مساوات کے متعلق لکھ کر ریاضیاتی زبان کو نسبتوں تک وسیع کیا۔ اس سے پہلے اس نے نسبتوں کی ضرب پر اس قسم کی بحث کی تھی۔

الجبرے میں، ریاضی کے سلسلے میں مسلمان الجبرا دانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے نہ صرف یونان اور قدیم مشرق کے الجبرے کو یکجا کیا بلکہ اس میں ہندوستان اور چین سے لئے گئے تصورات اور منہاجات کو بھی شامل کیا۔ خیام نے مکعب مساواتوں کے لئے جو ہندسی نظریہ تشکیل دیا، اسے کسی مسلمان ریاضی دان کی انتہائی کامیاب کوشش کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ الجبرے ہی سے متعلق اس نے مساواتوں کو عام صورتوں یعنی صرف مثبت سروں والی مساوات سے بھی بحث کی اور پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کی 25 مساواتیں درج کیں، جن میں غالباً مثبت رقمی بھی ہو سکتی ہیں۔ خیام نے "رسالہ" میں الجبرے کی وہ تعریف دی ہے جس کا شمار الجبرے کی اولین تعریفات میں ہوتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق "الجبر اور المقابلہ کا علم ایک سائنسی علم ہے جس کا موضوع خالص عدد اور قابل پیائش مقداریں ہیں۔"

"رسالہ الجبر" میں خیام نے اپنے اس مفروضے کا اعادہ کیا ہے کہ مکعب مساواتوں کو، جنہیں دو درجی مساواتوں میں تحویل نہیں کیا جا سکتا، مخروطی تراشوں کے اطلاق سے حل کیا جانا چاہیے۔ اس کا حسابی حل تاحال معلوم نہیں کیا جا سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ سولہویں صدی عیسوی تک جذریوں کی صورت میں حل دریافت نہیں ہوئے تھے۔ تاہم، خیام کسی ایسے حل سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے لکھا ہے "شاید ہمارے بعد آنے والا کوئی شخص اسے معلوم کر سکے جبکہ معلوم قوتوں کی پہلی تین اصناف یعنی عدد، شے اور مربع نہ ہوں۔" اس نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مساواتوں کی کچھ طرزیں کثیر التعداد صورتوں سے متصف کی جاتی ہیں تاکہ ان کی کوئی قیمت نہ ہو یا ایک ایک قیمت ہو اور یا پھر دو دو قیمتیں ہوں۔ اس نے قیمتوں کی حدود پر بھی تحقیق کی ہے۔

ریاضی پر اب تک کی تحقیق سے یہ پتا چلتا ہے کہ خیام پہلا ریاضی دان تھا جس نے یہ ثابت کیا کہ مکعب مساواتوں کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ ایک خط مستقیم پر واقع دو عمود ایک دوسرے کو قطع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہیں خط مستقیم کی دونوں جانب دو نقاط پر تناسباً قطع کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ مل نہیں سکتے۔ اس اصول کے دوسرے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خط مستقیم پر گرائے گئے دو عمود منتشر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایک ہی خط مستقیم پر گرائے گئے دو عمود نہ تو باہم ملتے ہیں اور نہ ہی منتشر ہوتے ہیں کیونکہ وہ دراصل ایک دوسرے سے یکساں فاصلے ہوتے

ہیں۔

دنیا کے بارے میں خیام کے تصورات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری اور تحریریں فلسفیانہ خیالات کی حامل ہیں۔ جب اس کی مذہبی اور فلسفیانہ تحریروں اور رباعیوں میں اختلاف سامنے آتا ہے تو پیچیدگی کی وجہ سے یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش آتی ہے کہ اس کی کتنی رباعیاں اصلی ہیں اور کتنی اس کے نام سے منسوب ہیں۔ چونکہ خیام نے اپنی تحریریں سرکاری سرپرستی میں لکھیں' اس لئے اس بارے میں بھی یقین نہیں ہے کہ اس نے اپنی تحریروں میں اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں یا نہیں۔ اس کی مذہبی اور فلسفیانہ تحریروں کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دامن سے آزاد خیالی اور دین دشمنی کے داغ مٹانا چاہتا تھا۔ بے شک اس کا دور مختلف مذہبی مسالک کے درمیان نزاع کا دور تھا۔ تاہم' تمام فرقے اس کے مخالف تھے اور ہو سکتا ہے کہ اس کی رباعیوں پر کٹر قسم کے مذہبی علماء نے اعتراض کیا ہو۔ اب خیام کے نام منسوب کی جانے والی رباعیوں کے مضامین کا احاطہ بہت وسیع ہے جن میں تصوف اور معرفت سے لے کر مادیت پرستی حتیٰ کہ الحاد تک کی جھلک نظر آتی ہے۔ القفطی' خیام کی شاعری کو "شریعت کے لیے زہریلا ناگ" کہتا ہے۔ اس کے نام سے ایک ہزار سے زائد فارسی رباعیات منسوب ہیں۔

مختلف حلقوں کی جانب سے خیام کو شدید اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا اور اسے آزاد خیال' مفسد' ملحد' دہریہ' وحدت الوجودی' تصوف کا مذاق اڑانے والا' عقیدہ پرست مسلمان' سچا فلسفی' ذہین شاہد اور اس کے علاوہ عیاش' بدکردار' منافق کہا گیا۔ اس الزام تراشی کے باوجود اس کی شخصیت قابل احترام سمجھی جاتی ہے۔ اس کے شاعرانہ کارناموں کو مشرق میں ہمیشہ پزیرائی حاصل ہوئی۔ وہ آج بھی اپنی رباعیوں اور دیگر نگارشات کی وجہ سے زندہ جاوید ہے۔ اس کے یورپی پرستاروں نے 1892ء میں لندن میں کلب کی بنیاد رکھی' جس کی پیروی میں امریکہ میں بھی اس طرز کے کئی کلب قائم کیے گیے۔

ابن زہر

(1091ء-----1162ء)

ابن زہر دراصل ان مسلمان علماء اور حکماء کے خاندان کا نام ہے' جو اسلامی دور کے اندلس میں نویں صدی عیسوی کے شروع سے تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے تک گزرے ہیں۔ یہ لوگ عربستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اپنے آپ کو عدنان کی نسل سے بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد جنوب مشرقی اندلس میں جنن شاطبہ (xativa) سے جہاں یہ سب سے پہلے آباد ہوئے تھے' تمام جزیرہ نمائے آئبیریا (Iberia) میں پھیل گئی۔

اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام زہر تھا۔ وہ اپنا سلسلہ نسب ایاد بن معد بن عدنان تک لے جاتا تھا۔ اس خاندان میں بہت سے حکماء علماء' سائنسدان' شاعر اور اطباء ہو گزرے ہیں۔ ابو مروان عبد المالک ابن ابی العلماء المعروف بہ ابن زہر ان میں سب سے زیادہ قابل اور باصلاحیت شخص تھا۔ اس کو عام طور پر ابو مروان ابن زہر بھی کہا جاتا ہے۔

ابن زہر اشبیلیہ میں پیدا ہوا۔ اس کے سنہ پیدائش میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک ماخذ کے مطابق اس کی تاریخ پیدائش 1091ء اور 1094ء کے درمیان متعین کی جا سکتی ہے' سب سے پہلے اس نے ادب فقہ اور دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے والد ابو العلاء زہر کے زیر نگرانی طب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کا باپ اپنے دور کا ماہر نباض اور حاذق طبیب تھا اور مرابطی سلاطین اور حکومت (1090ء-1147ء) کے درباری حکیم کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا۔ ابن زہر بھی اپنے والد کی طرح سپین میں المرابطوں کی ملازمت میں رہا اور ان کے دربار میں اس کی کافی عزت افزائی ہوتی رہی۔ بعد میں اس کو اس کے مربی علی یوسف ابن تاشفین (دور حکومت 1106ء تا 1143ء) نے اپنے مراکش کے محل میں بلا لیا۔ وہاں رہتے ہوئے نامعلوم وجوہ کی بناء پر ابن زہر اور اس کے سرپرست علی ابن تاشفین کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں اس کو

نہایت ذلیل کر کے 1141ء میں نہ صرف دربار سے نکال دیا بلکہ اسی جرم میں ابن کو جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ جیل میں اسے جن تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کے اثرات اس کے جسم اور ذہن پر رہائی کے بعد تک بھی قائم رہے۔ ابن زھر نے اپنی تصانیف میں اس واقعے کی طرف بعض تلخ اشارات بھی کیے ہیں۔ وہ اپنی بعد کی تصانیف میں کہتا ہے کہ المرابطوں کے زوال کے بعد ان کے دشمنوں یعنی الموحدوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

ابن زھر، علی بن یوسف بن تاشفین کی وفات اور الموحدوں کے ہاتھوں المرابطوں کے مغلوب ہو جانے کے بعد ابو محمد عبدالمومن کے پاس چلا گیا۔ اپنی وفاداری بدلنے کے اس فعل پر اسے ذرا بھی ندامت محسوس نہ ہوئی، کیونکہ وہاں اسے نہ صرف نہایت قیمتی انعامات سے نوازا گیا، بلکہ اس کے والد کی طرح اسے بھی وزیر کا عہدہ عنایت کیا گیا اور تحفتہ درباری طبیب کی اضافی ملازمت بھی ملی۔ ابن زھر نے ان نوازشات کا بدلہ یوں دیا کہ اس نے اپنی دو تصانیف اپنے محسن یعنی ابو محمد کے نام معنون کیں۔ ان میں ایک رسالہ "زہر مار ادویات یعنی تریاقات کے متعلق ہے اور دوسرا مختلف غذاؤں کے بارے میں۔

اس دور میں ابن زھر کی عزت و وقار میں کافی اضافہ ہوا اور اس نے بہت دولت کمائی۔ اسی دوران مشہور حکیم اور فلسفی ابن رشد سے اس کی گہری دوستی ہو گئی۔ ابن رشد کے مطابق وہ جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب تھا۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ابن زھر ابن رشد کا شاگرد تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر" کا انتساب ابن رشد کے نام کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب بھی اس نے ابن رشد ہی کے کہنے پر لکھی تھی۔ ابن رشد نے اس سے ایک ایسی کتاب لکھنے کا تقاضا کیا تھا جس میں جسم کے اعضاء کی مخصوص بیماریوں کے علاج کے ساتھ ساتھ ان کے تدارک اور سدباب کا طریقہ بھی بتایا گیا ہو۔ ابن رشد نے بذات خود اس کی "کتاب التیسیر" کے اختتامیہ کے طور پر ایک باب "الکلیات" لکھا۔ کتاب کے تعارف میں ابن رشد یہ واضح کرتا ہے کہ یہ ادویات کی عمومی خصوصیات سے متعلق ہے۔

ابن زھر کی لائق اور ذہین و فطین اولاد میں ایک بیٹی اور بیٹا تھا۔ ابن زھر کی بیٹی کا اسلامی دور کی اچھی قابل دائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور اس کا بیٹا ابوبکر محمد بن عبدالملک بن زھر بیک وقت حاذق طبیب بھی تھا اور اچھا شاعر بھی۔ اسے علم و ادب سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ ایک دفعہ جب اس کا والد اپنے مطب پر نہیں تھا تو اس نے مریضوں کی خود تشخیص کی۔ بیٹے کی قابلیت اور ہنر مندی کے اعتراف کے طور پر اور اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر ابن زھر نے اپنی کتاب "التذکرہ" اس کے نام

معنون کر دی۔ اس کتاب میں مختلف قسموں کے بخار' معالجات اور قبض کشا ادویات کے استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ ایسی مسہل ادویات کا جب بیجا یا غلط استعمال کیا جائے تو اس کے نزدیک یہ زہر سے زیادہ زہریلی ثابت ہو سکتی ہیں۔

ابن زہر نے طب کی درس و تدریس' عملی طبابت اور طب کی تصنیف و تالیف میں اپنی زندگی گزاری اور آخر کار اپنے والد کی طرح ایک مہلک رسولی کے عارضے میں مبتلا ہو کر اشبیلیہ ہی میں 1162ء میں وفات پائی۔ اسے اشبیلیہ میں باب الفتح کے باہر دفن کیا گیا۔ ابن زہر کی تصانیف اور تحقیقات نے مغربی طب اور عربی طبابت پر گہرا اثر چھوڑا۔ یہ اثر اس کی تصانیف کے عبرانی اور لاطینی ترجموں اور ان کی اشاعت کی بدولت سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک قائم رہا۔ اگرچہ نظری اعتبار سے وہ بقراط اور جالینوس کا پکا اور سچا مقلد اور نظریہ اخلاط کا حامی تھا' لیکن عمل کے میدان میں تجربے کو سب سے زیادہ قابل اعتماد رہنما تصور کرتا تھا۔ بعض مسلمہ حقائق کے متعلق اس کے جدید نظریات نہ صرف اچھوتے ہیں' بلکہ اس نے علم طب کے میدان میں تجربات اور مشاہدات کے ذریعے نئے اضافے بھی کیے۔ ابن زہر نے بتایا کہ اچھی اور متوازن غذا بذات خود ایک معالجاتی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے مختلف زہروں کے تریاقات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے بقول کسی بیمار آدمی کا علاج کرتے ہوئے مسہل اشیاء کا استعمال نہایت سوچ سمجھ کر اور محتاط رہ کر کرنا چاہیے۔ بعض اوقات ایسی اشیاء مریض کے حق میں زہر ثابت ہو سکتی ہیں' حالانکہ اسے زہر نہیں بلکہ شفاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے طبیبوں کو ترغیب دی کہ وہ شروع میں مریض کو ہلکی دوا استعمال کرائیں اور اس کے نتیجے میں مریض کا رد عمل نوٹ کریں۔ پہلے تین دن تک تو خاص طور پر ایسا کیا جانا چاہیے۔ اگر اس عمل میں دی گئی دوا مفید نتائج ظاہر کرے' تو پھر مریض کو تیز دوا دی جا سکتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر دوا شہد یا چینی میں ملا کر کھائی جائے تو جگر تک جا پہنچتی ہے' جہاں پر جگر ان اشیاء کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

ابن زہر نے پھیپھڑوں کے درمیان والی خالی جگہ میں رسولی کا پیدا ہونا اور پیری کارڈیم (دل کا بیرونی غلاف) پر پھوڑوں کا نمودار ہونا' حلق کا فالج' خارش' کان کے درمیانی حصے کا متورم ہونا اور انتڑیوں کا گھلنا جیسے امراض پر اپنے اسلاف کی نسبت زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ ابن زہر سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ابو القاسم الزہراوی نے سب سے پہلے سانس کی نالی میں شگاف ڈالنے کا ذکر کیا اور اس کی وضاحت بھی کی تھی۔ ابن زہر نے اس عمل کو مفید خیال کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ مریض کے جسم میں نرخرے یا مقعد کے ذریعے مصنوعی طور پر خوراک کی ترسیل کے

عمل سے بھی وہ ناواقف نہیں تھا بلکہ وہ اس کے طریق کار کی بڑی مہارت سے تشریح کرتا ہے۔ بخار کو کم کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کے استعمال جیسے عمل کی بھی ابن زہر نے سفارش کی۔ ابن زہر نے یہ بھی محسوس کیا کہ دلدلی علاقوں سے آنے والی ہوا نہایت ضرر رساں ہوتی ہے۔ جالینوس کے ایک لائق شاگرد کی حیثیت سے ابن زہر نے بھی حنین ابن اسحاق کی طرح صحت کے لیے صاف ستھری اور اچھی ہوا کی اہمیت پر زور دیا۔ بہت سے مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ ابن زہر یہودی تھا' لیکن یہ الزام غلط ثابت ہوا ہے۔ اس نے اپنی زندگی نہایت مستحسن طریق پر تصنیف و تالیف اور اعمال صالحہ میں گزاری۔ اندلس کے اسلامی دور کے مسلم حکیموں اور اطباء میں اس کا شمار اول درجے کے طبیبوں میں ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس دور کے مستند ترین حاذق حکماء میں اس کا نام سر فہرست ہے۔

الادریسی

(1100ء----نامعلوم)

ابو عبداللہ محمد ابن محمد ابن عبداللہ ابن ادریس' جسے الادریسی کے مختصر نام سے پہچانا جاتا ہے' بارہویں صدی عیسوی کا عظیم جغرافیہ دان اور ماہر نقشہ نگار تھا۔ یہ 1100ء میں مراکش کے علاقے سبتہ (Ceuta) میں پیدا ہوا۔ وہ علویوں کے ادریسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان خلافت عباسیہ کو نہیں مانتا تھا اور خود خلافت کا مدعی تھا۔ اس خاندان کے بانی ادریس اول بن عبداللہ نے عباسی خلیفہ موسیٰ الہادی کے خلاف علویوں کے خروج میں حصہ لیا تھا اور پھر بعد میں ملک کے ایک حصے پر حکمران بھی رہا تھا۔ اس لحاظ سے اس خاندان کے لوگ 789ء سے 985ء تک سبتہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر حکمران رہے۔ وہ زیادہ دیر تک اپنی سلطنت قائم نہ رکھ سکے اور گیارہویں صدی عیسوی میں اس خاندان کی حکمرانی سبتہ کی چاردیواری تک محدود ہوگئی۔

ابو عبداللہ الدریسی نسلاً سادات میں سے تھے اور اس وجہ سے اس نے الحسنی کا لقب اختیار کیا۔ بعد میں وہ الشریف الادریسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم قرطبہ ہی میں حاصل کی۔ یوں القرطبی بھی اس کے نام کا حصہ بن گیا۔ ایک اہم یورپی علمی مرکز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

اس نے اپنی سیاحت کا آغاز ایشیائے کوچک کے سفر سے کیا۔ اس وقت اس کی عمر مشکل سولہ سال تھی۔ پھر اس نے فرانس کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر شروع کیا اور اس طرح انگلستان سے ہوتا ہوا سپین اور مراکش واپس پہنچ گیا۔ سپین اور مراکش میں وہ خوب گھوما پھرا۔ الصفدی کے حوالے سے الادریسی کو 1138ء میں سسلی کے نارمن بادشاہ روجر (Rojer) ثانی نے سیرو سیاحت کے لیے پلرمو

(Palermo) آنے کی دعوت دی۔ جب وہ یہاں پہنچا تو بادشاہ نے اس سے درخواست کی کہ وہ یہیں

رہے کیونکہ وہ خلفاء کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اگر وہ مسلمانوں ہی میں رہا تو عباسی خلفاءاس کو مروانے کی سازش کریں گے' لیکن اگر اس کے ساتھ رہے' تو اس کی زندگی محفوظ رہے گی۔ بادشاہ کی اس درخواست پر وہ طویل مدت تک پلرمو میں بادشاہ کے دربار میں مقیم رہا۔ اسی حوالے سے بعض اوقات اسے الصقلی بھی کہا جاتا ہے۔ 1154ء میں روجر ثانی نے وفات پائی اور ادریسی اپنے وطن سبتہ واپس لوٹ آیا۔ وہ برسوں روجر کے دربار سے منسلک رہا اور اس کی وفات تک تمام واقعات کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ادریسی نے راجر ثانی کے زیر سرپرستی مسیحی علماء کے ساتھ مل کر کام کیا اور جغرافیہ اور نقشہ کشی کے فن میں نہایت اہم اور گرانقدر اضافے کیے۔ روجر خود بھی ان موضوعات میں دلچسپی لیتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ پوری دنیا کا ایک نقشہ بنایا جائے۔ وہ ایک ایسا عالمی جغرافیہ تیار کروانا چاہتا تھا جس میں دنیا کے بیشتر علاقوں کے متعلق مفصل معلومات موجود ہوں۔ ممکن ہے اس کی یہ خواہش محض سیاسی نوعیت کی ہو اور وہ اپنی حدود سلطنت میں توسیع کے لیے ایسا چاہتا ہو۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ وہ اس دور میں ہونے والی یونانی اور عربی تحقیق کی رفتار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے دنیا کے بہت سے علاقوں کی جانب اپنے ایلچی روانہ کیے' تاکہ وہ وہاں سے ان علاقوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات لے کر آئیں۔ اس نے چاندی کے ایک بڑے قرص پر پوری دنیا کا ایک بڑا سا نقشہ بنانے کا حکم دیا۔ یہ کام ادریسی نے انجام دیا۔ اس نے بڑے بڑے علماء اور ماہرین کی مدد سے ایک ایسا ابھرواں نقشہ بنایا' جس پر ساتوں اقالیم' دریا' سمندر' پہاڑ' بندرگاہیں' خلیجیں' جزیرے' قصبات اور بہت سی طبعی کیفیات کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس کام میں یونانی اور عربی ماخذ کے علاوہ راجر کے بھیجے ہوئے قاصدوں اور سیاحوں کی معلومات سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔

ادریسی کی جو کتاب دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہے وہ جغرافیے سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان "کتاب نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" ہے۔ اس کتاب میں متن کے علاوہ مختلف علاقوں کے اکہتر نقشے ہیں' جو اس چاندی کے نقشے سے اتارے گئے ہیں جو ادریسی نے راجر کے کہنے پر بنایا تھا۔ ان نقشوں کی بنیادی ساخت بطلیموسی ہے۔ ان نقشوں میں آباد دنیا (Olkoumena) کو جو کہ زیادہ تر نصف کرہ شمالی پر مشتمل ہے' سات ایسے عرضی اقالیم میں تقسیم کیا گیا ہے جو خط استوا کے متوازی ہیں۔ اس کے بعد ہر اقلیم کو لمبائی کے رخ مزید دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ہر دو ستر حصص کا علیحدہ علیحدہ نقشہ دیا گیا ہے۔ ان تمام حصوں کو ملا کر دنیا کے نقشے کی جو مجموعی تصویر بنتی ہے وہ اس دنیا کی ہو گی جس کو عرب اور نارمن جانتے تھے۔ لیکن اس دور کی اور اس سے قبل کی اس قدر زیادہ معلومات کو جب بطلیموس کے پیش کیے گئے ایک ہزار سال قبل کے نقشے پر منضبط کیا گیا' تو اس سے کچھ

علاقوں کے جغرافیائی مقامات کی جو تقابلی صورت سامنے آئی' وہ نہایت مضحکہ خیز تھی۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر ادریسی کے ان نقشہ جات اور ان کے وضاحتی بیان کے فروعات میں موافقت نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں چیزوں کی تالیف و تدوین مختلف اوقات میں ہوئی۔ اس کتاب اور ان نقشوں سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ مصنف کا علم یورپ' مشرق وسطیٰ اور جیرہ روم کے علاقے کے بارے میں دنیا کے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ صحیح اور معتبر ہے۔ مزید یہ کہ یہ نقشے ریاضیاتی اصولوں کے مطابق نہیں۔ نیز مختلف مقامات کے جغرافیائی محل وقوع کے تعین کے لیے ان طول بلدوں اور عرض بلدوں سے استفادہ نہیں کیا' جن سے یونانی اور عرب جغرافیہ دان اور ہئیت دان بخوبی آگاہ تھے۔

اس کتاب میں یورپ ایشیا اور شمالی افریقہ کے بہت سے ممالک کے بارے میں سیر حاصل معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس میں نہ صرف جغرافیائی خصوصیات کی تفاصیل' مردم نگاری سے متعلق معلومات اور جغرافیہ طبعی و بیانی کی رپورٹیں شامل ہیں' بلکہ اس دور کے اجتماعی' معاشیاتی اور سیاسی حالات بھی اس کتاب میں بالتفصیل درج ہیں۔ یوں ایک طرح سے یہ کتاب قرون وسطیٰ کا ایک گراں بہا انسائیکلو پیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ اس میں درج کردہ معلومات کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس طرح اماکن کو تلاش کرنے میں وقت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ جہاں کسی جگہ کا ذکر کیا گیا ہے اسی کے ذیل میں وہاں کا نقشہ بھی دے دیا ہے۔

ادریسی کی "نزہتہ المشتاق" اس امر کی واضح مثال ہے کہ قرون وسطیٰ میں جغرافیہ اور نقشہ کشی کے میدان میں عربی اور نارمن سائنسدانوں نے مل کر کام کیا۔ یہ تصنیف صدیوں تک یورپ میں نصابی کتاب کے طور پر رائج رہی۔ اس کتاب کے بہت سے خلاصے بھی لکھے گئے جن میں 1592ء میں روم سے شائع ہونے والا خلاصہ مسمی بہ "نزہتہ المشتاق فی ذکر الامصار والاقطار والبلدان والجزر والمدائن والافاق" اولین حیثیت کا حامل ہے۔ اس کا ایک لاطینی ترجمہ دو مارونی (Maronite) راہبوں نے 1619ء میں کیا۔

P. Amedee Jaubert نے انیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں اس کے پورے متن کا ایک فرانسیسی ترجمہ دو جلدوں میں بعنوان Geographia Dedrisi شائع ہوا۔ یہ ترجمہ اغلاط سے پر ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے بہت سے محققین نے اس کتاب کے مختلف منتشر اجزاء کو جمع کیا اور ان کا ترجمہ کیا۔

ابن البیطار

(1190ء-----1248ء)

ابن البیطار المالقی کا پورا نام ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ہے اور وہ 1190ء میں سپین کے ایک شہر مالقہ میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق غالباً اس شہر کے بیطار خاندان سے تھا۔ اس دور کی سوانحی کتب میں اس خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سپانوی رومی نسل سے تعلق رکھتا تھا لیکن فی الحال اس تعلق کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ ابن البیطار نے 1248ء میں دمشق میں وفات پائی۔ وہ جڑی بوٹیوں اور نباتات کے علوم پر گہری نظر رکھتا تھا اور یہی اس کی شہرت کا باعث ہے۔

ابن البیطار نے ابتدائی تعلیم سپین کے شہر اشبیلیہ میں حاصل کی۔ یہاں وہ اپنے اساتذہ ابو العباس النباتی' عبداللہ ابن صالح اور ابو الحجاج کے ہمراہ اس شہر کے گردونواح سے پودے جمع کیا کرتا تھا۔ وہ الغافقی' الزہراوی' الادریسی' دسقوریدس اور جالینوس کی تحریروں کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا کرتا تھا۔

1220ء کے لگ بھگ ابن البیطار نے بلاد شرقیہ کی طرف ہجرت کی اور شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے 1224ء میں ایشیائے کوچک اور شام کا بحری سفر کیا۔ آخر کار وہ قاہرہ میں سکونت پذیر ہوا۔ مصر میں اس وقت ایوبی خاندان کے بادشاہ الکامل کی حکومت تھی۔ ابن البیطار نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ اس ایوبی سلطان کے دربار میں ماہرین نباتیات کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا اور الکامل کے بیٹے اور جانشین الصالح کے عہد میں بھی اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ ابن البیطار اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے ہمراہ کبھی کبھی عرب' فلسطین' شام اور عراق کا سفر کیا کرتا تھا۔ اس کے جانے پہچانے شاگردوں میں ایک نام ابن ابی اصیبعہ کا ہے' جس نے اپنی کتاب "عیون الانباء" میں اپنے استاد کے متعلق تعریفی کلمات لکھے ہیں' لیکن ابن البیطار کے تفصیلی حالات زندگی جاننے کے لیے یہ کتاب کچھ

زیادہ مدد نہیں کرتی۔

ابن لبیطار نے دو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ کتابیں اس کی تمام عمر کی تحقیقات اور مشاہدات کا نچوڑ اور اس کی عالمگیر شہرت کا باعث ہیں۔ ان دو کتابوں کے عنوانات "المغنی فی الادویۃ المفردۃ" اور "الجامع المفردات الادویۃ والاغذیۃ" ہیں۔ پہلی کتاب یعنی "المغنی" سلطان الصالح کے نام منسوب ہے اور اس میں مختلف امراض کے لیے موزوں سادہ دواؤں اور ان کے خواص سے بحث کی گئی ہے۔ اسے اعضائے ماؤفہ کے اعتبار سے ایک سہل شکل میں طبیبوں کے استعمال کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب یعنی "الجامع" میں حیوانات' نباتات اور معدنیات کے ذریعے معالجے کے تقریباً 1400 سہل نسخوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ابن البیطار نے اپنے تجربات کے علاوہ اندازاً 150 یونانی اور عرب ماہرین موضوع سے بھی استفادہ کیا۔ ان ماہروں میں الرازی اور ابن سینا کے نام بھی شامل ہیں۔

ابن البیطار کا سب سے اہم کارنامہ ان دریافتوں کو ایک باقاعدہ شکل میں ترتیب دینا تھا جو قرون وسطیٰ میں عربوں نے کی تھیں۔ اس طرح متقدمین کی ہزاروں دوائیوں کی فہرست میں مزید 300 سے 400 ناموں کا اضافہ ہوا۔ اس نے عربی' فارسی' بربری' یونانی' لاطینی' رومانی اور عرب کی علاقائی زبانوں کے درمیان فنی مترادفات قائم کرنے کی طرف بھی خاصی توجہ دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ابن میمون کی "شرح اسماء العقار" سے بہت مدد لی کیونکہ وہ خود اس کا ترجمہ بھی کر چکا تھا۔ میئرہوف (Meyerhof) اور سوبھی (Sobhy) "الجامع" کے بارے میں اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کی معلومات میں کوئی نیا پن نہیں ہے' بلکہ یہ الغافقی کی "کتاب الادویہ" کا چربہ ہے۔ الغافقی کی اس کتاب کا ابن البیطار نے 200 سے زیادہ جگہوں پر حوالہ دیا ہے۔ متذکرہ مستشرقین نے اپنے جس شبے کا اظہار کیا ہے' اس پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کا علمی دیانتداری کا تصور موجودہ دور کے مقابلے میں مختلف تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ الغافقی کی تحریر صرف ابن العبری (Barhebraeus) شدہ صورت میں محفوظ ہے۔

مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے اندر اور باہر ادویہ کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئیں' ان پر "الجامع" کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں اس کا اثر بہت کم ہوا کیونکہ عربی سے لاطینی میں تراجم کا دور تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ختم ہو گیا تھا۔ تاہم An-drea Alpago نے ابن سینا پر اپنی تحریروں میں "الجامع" سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ عہد متاخرین میں یہ کتاب ولیم پورٹل (William Portel) اور گالاں (Antoine Galland)

جیسے عرب دانوں کی توجہ کا مرکز رہی اور انہوں نے اس کا خلاصہ اور فرانس میں محفوظ اس کا قلمی نسخہ
شائع کیا۔

ان دو مشہور کتابوں کے علاوہ ابن البیطار نے کچھ اور کتابیں بھی لکھی تھیں، لیکن وہ زیادہ
مقبول نہیں ہو سکیں۔ ایسی کم معروف کتابوں میں "میزان الطبیب" "رسالۃ فی الاغذیۃ والادویۃ"
مقالہ فی الیمون "(اسے ابن الجمع کے نام سے منسوب کیا گیا اور Alpago کے لاطینی ترجمہ کی
صورت میں موجود ہے) اور دستوردس (Dioscorides) کی کتاب کی ایک شرح جس کا ایک
خطی نسخہ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ اس کتاب میں ابن البیطار نے نہ صرف 550 دوائیوں کی
فہرست درج کی ہے، جو دستوردس کی پہلی چار کتابوں میں ملتی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کے مترادفات
بھی دیئے ہیں۔

الجزری

(1206ء ــــــ نامعلوم)

پورا نام بدیع الزمان ابو العز اسماعیل ابن الرزاز ہے اور وہ 1206ء میں دیار بکر میں زندہ تھا۔ مشین سازی اور فن تعمیر میں اسے پوری مہارت حاصل تھی۔ اس کے حالات زندگی اس کی تصنیف "کتاب فی معرفت الحیل الهندسیة" کے دیباچے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت وہ دیار بکر کے حکمران ناصر الدین کے ہاں ملازم تھا۔ الجزری یہ بھی لکھتا ہے کہ وہ حکمران خاندان کے ساتھ زندگی کے پچیس برس صرف کر چکا ہے اور اس دوران میں وہ ناصر الدین کے باپ اور بھائی کی ملازمت میں بھی رہ چکا ہے۔ دیار بکر کا یہ برسر اقتدار خاندان ترکمان نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ 1181ء میں اس خاندان نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی اطاعت قبول کر لی۔

الجزری کی مذکورہ بالا کتاب ناصر الدین کی خواہش پر تحریر کی گئی۔ یہ پچاس ابواب پر مشتمل اور چھ فصلوں میں منقسم ہے۔ فصل اول: آبی گھڑیاں اور شمعی گھڑیاں (دس باب) فصل دوم: مے نواری کے لئے موزوں حالتیں اور برتن (دس ابواب) فصل سوم: رگزنی اور رسوماتی دھلائی کے لئے صراحیاں اور آبگیرے (دس ابواب) فصل چہارم: شکل بدلنے والے فوارے اور دوامی خیار کے لئے مشینیں (پانچ ابواب) فصل پنجم: پانی اوپر لے جانے والی مشینیں اور فصل ششم: متفرقات (پانچ ابواب)۔ مثلاً پیتل اور تانبے کا ایک بڑا آرائشی دروازہ 'ایک پروٹریکٹر اتصالی تالے' چٹخنی والا تالہ اور ایک چھوٹا آبی گھڑیال۔

یہ کتاب عربی میں لکھی گئی اور اس کا انداز تحریر سادہ اور عام فہم ہے۔ اس میں آلات اور ان کی ملاوٹ کی وضاحت کے لئے ایک سو تہتر شکلیں اور خاکے دیئے گئے ہیں۔ ان اشکال میں مختلف حصوں پر عربی حروف تہجی سے نشان لگائے گئے ہیں اور عبارت میں جابجا ان حروف کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ تصویریں عموماً جزوی تناظر میں بنائی گئی ہیں اور قابل قدر فنی محاسن کے باوجود جدید ناقد کے

معیار پر پورا نہیں اتر تیں۔ اس کے باوجود یہ عبارت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔

دیباچے اور کتاب کے دوسرے حصوں کے بیانات سے الجزری انجینئروں کی بین الاقوامی برادری سے اپنے تعلق اور اپنے پیشروؤں کے نام کو ترقی دینے پر فخر کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنے یادگاری آبی گھڑیال کے لئے "جعلی ارشمیدس" کے ماڈل سے استفادہ کیا ہے۔ الجزری ان کے فواروں سے متعلق کام کے حوالے سے بنو موسیٰ کا ذکر بھی کرتا ہے اور ایک خود کار آلہ موسیقی کا ذکر کرتے ہوئے بازنطین کے Appoleonius کی تحریر کا حوالہ بھی دیتا ہے۔ اس تصنیف میں بعض ایسے ماہرین کے ناموں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں یا پھر سرے سے کچھ نہیں جانتے۔ بعض جگہوں پر وہ اپنے سے پہلے کے بعض ایسے ماہرین کے ایجاد کردہ آلات کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے ناموں سے وہ واقف نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الجزری نے بہت سی مشینیں پہلے سے ایجاد شدہ آلات میں ترمیم کر کے بنائیں۔ زیادہ تر اس نے مسلمان پیشروؤں کے ماڈلوں سے اکتساب کیا۔ ان میں سے بعض ماڈلوں کا ذکر قدیم دور مصنفوں مثلاً اسکندریہ کے Hero اور بازنطین کے Philo کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ممکن ہے اس نے ہندوستان اور مشرق بعید کی ٹیکنالوجی سے بھی استفادہ کیا ہو۔ لہٰذا الجزری کو موجد کی بجائے انجینئر کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس نے پہلے سے اختراع شدہ آلات کو ترمیم واضافہ سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کے اکثر آلات افادیت کی بجائے تفریح سے متعلق ہیں اس کے باوجود اس نے اپنے کام کو بڑی سنجیدگی سے سرانجام دیا ہے۔

الجزری کی مکمل مشینوں میں سے صرف پیڈل وہیل سے چلنے والا ڈبل سلنڈر پمپ ایک ایسی مشین ہے جو مشینی تاریخ میں کسی قدر اہمیت رکھتی ہے۔ آبی اور شمعی گھڑیال اور جادوئی برتنوں کو جن کا بیان اس کی کتاب کے تین چوتھائی حصے پر محیط ہے بعد میں ہونے والی میکینکل ٹیکنالوجی کی ترقی کے حوالے سے بہت کم اہمیت حاصل ہے تاہم وہ پرزے اور تکنیکیں جنہیں الجزری نے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے نسبتاً زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ آج صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آپ کو مغرب کے فنی ادب کے ذخیرہ الفاظ میں الجزری کے تیار کردہ پرزوں اور تکنیکوں کا عکس نظر آئے گا۔ ان پرزوں اور تکنیکوں سے مخروطی والو' بند سانچوں میں سبز ریت سے پیتل اور تانبے کی ڈھلائی بڑے چرخی دار پہیوں کا سکونی توازن' چوبی واسوں (نمونے کے تختے جنہیں سامنے رکھ کر پتھر وغیرہ تراشتے ہیں) کا استعمال' نمونہ سازی میں کاغذی ماڈلوں کا استعمال' سوراخوں کی پیمانہ بندی شہتیروں کی کان کو کم کرنے کے لئے پرت بندی' غرقابی آب کشی کی بجائے آب کشی پمپوں کا استعمال' جھکنے والی بالٹیاں جو اپنے مواد

کو ایک مقررہ وقت کے بعد از خود انڈیلتی ہیں اور قطعی گراریاں خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔

یادگاری آبی گھڑیال کو چلانے کے طریقے میں الجزری کی تکنیکوں کا مثالی عکس نظر آتا ہے اور اس سے کتاب کی مجموعی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تکنیک الجزری کی ذاتی اختراع نہیں۔ الجزری نے خود اسے "ارشمیدس" کی آبی مشینری سے اخذ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ دمشق کے ایک دروازے جیرون پر لگایا جانے والا محمد الخراسانی السعاتی کا تیار کردہ آبی گھڑیال (جسے اس کے بیٹے رضوان نے بیان کیا ہے) بھی اسی طرز پر بنایا گیا تھا۔ لیکن یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ اس نے دوسرے ڈیزائنوں میں بڑی اہم اصلاحات کیں۔ مثال کے طور پر "ارشمیدس" کا بیان کردہ مخروطی والو قدرے ادھورا آلہ ہے اور نہ السعاتی نے کوئی درست فلو ریگولیٹر (Flow Regulator) بنایا اور نہ ہی الجزری نے ایسا کرنے کی کوشش کی۔

یہ گھڑیال شمسی گھنٹوں کا سفر ریکارڈ کرتا تھا۔ روشن گھنٹے اور تاریک گھنٹے بارہ حصوں میں تقسیم تھے۔ ان گھنٹوں کی لمبائیوں میں مختلف حصوں کے حوالے سے اور دن رات کی لمبائی کے فرق کے حوالے سے تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ فلو ریگولیٹر کا مقصد سوراخ کے اوپر سکونی اچان میں کمی بیشی پیدا کر کے یہ تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔

ٹینکی اور دونوں فلوٹ مکمل طور پر تانبے کی چادر سے بنے تھے جن کی تیاری میں ویلڈنگ سے مدد لی گئی تھی۔ مختلف حصوں کی موٹائی کو یکساں رکھنے میں بڑی احتیاط برتی گئی تھی۔ ٹونٹی والو سیٹ اور والو پلگ ڈھلی کانسی سے تیار کیے گئے تھے۔ پلگ اور سیٹ کو خراد پر اس حد تک رگڑا گیا تھا کہ والو بند کرنے پر واٹر ٹائٹ ہو جاتا تھا اور پانی نیچے جانے پر پلگ آرام سے والو سے نکل جاتا تھا۔ اوپر بیان کیے گئے آلے کو الجزری کے محاسن یعنی پرزوں کو تیار کرنے اور انہیں یکجا کرنے میں انتہائی احتیاط اور اپنے پیشروؤں کے کام میں صحیح معنوں میں اصلاح کی قابلیت کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بڑی خامی بے میل پیمائشیں اور سامان کی پوزیشننگ میں ابہام ہے۔ تاہم اگر اس کی تحریر اور اشکال کو اکٹھا رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنا یہ ارادہ پورا کرنے میں کامیاب رہا کہ طریق کار کو اس طرح بیان کیا جائے کہ آنے والے دور کے لوگ متعلقہ عبارت کو پڑھ کر آلے کو بعینہ دوبارہ تیار کر سکیں۔ الجزری کے اوپر بیان کیے گئے گھڑیال کو 1976ء میں اسلامی دنیا کے متعلق فیسٹول میں رکھنے کے لیے سائنس میوزیم لندن نے ہوبہو اس نمونے پر تیار کیا۔ یہ گھڑیال الجزری کے تخیل کے عین مطابق کام کرتا ہے۔

الجزری اور دوسرے مسلمان انجینئروں کی بہت سی تکنیکوں اور آلات کو صدیوں بعد یورپ

میں دوبارہ ایجاد کیا گیا۔ بند سانچوں میں سبز ریت کے ساتھ دھات کی ڈھلائی کا کام یورپ میں 1000ء میں شروع ہوا۔ مخروطی والووں کا ذکر پہلی مرتبہ لیونارڈو داونچی نے کیا اور اوپر بیان کیے گئے آبی گھڑیال سے مشابہ نظام کے حامل بھاپ بوائلروں کے لیے استعمال کیا جانے والا فلوٹ کنٹرولڈ ریگولیٹر انگلینڈ میں 1784ء میں پیٹنٹ کرایا گیا۔ (فیڈبیک کے لیے خودکار طریقے سے چلنے والے مخروطی والو اور سادہ لفٹ اینڈ ریلیز "باتھ پلگ" طرز میں امتیاز کرنا اہم ہے جو کہ اسکندریہ کے Hero کے زمانے میں بھی موجود تھا اور الجزری سمیت بہت سے مسلم انجینئروں نے بھی اسے بہت زیادہ استعمال کیا۔)

الجزری اور دوسرے مسلمان انجینئروں کی تصانیف کے ترجمے بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ یورپ میں ترجمے کا رجحان کم ہو چلا تھا' مسلم سائنسدانوں اور انجینئروں کے تصورات تحریری دستاویزات کی بجائے سفرناموں اور انجینئروں کے ذاتی تعلقات کے ذریعے منتقل ہوتے رہے ہوں۔

ابن النفیس

(1210ء-----1288ء)

خیال اور عمل کی قیمت حال نہیں مستقبل لگاتا ہے۔ ایک انسان اپنی تمام زندگی سرگرداں گزار دیتا ہے۔ بظاہر اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا لیکن آنے والی نسلیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ اس شخص کو وہ حاصل ہوا جو اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی طرح کوئی زندگی میں سرفراز و کامراں رہتا ہے۔ سب اس پر رشک کرتے ہیں۔ مگر آنے والا زمانہ اس کی کامرانیاں کسی اور کے نام لکھ دیتا ہے۔ زندگی میں اس کی عزت کسی اور وجہ سے ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد وجہ تکریم وافتخار کچھ اور ٹھہرتی ہے۔ یہی نہیں، شہرت اور رائے عامہ کا جوار بھاٹا مرنے کے بعد بھی فعال رہتا ہے۔ کبھی کسی کا پلڑا اونچا اور کبھی کسی کا۔ ایسے ہی اشخاص میں سے ایک ابن النفیس بھی تھا۔

ابن النفیس کا پورا نام علاؤ الدین ابو الحسن علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی تھا۔ وہ 1210ء میں دریائے جیحون کے پاس دمشق میں پیدا ہوا۔ بعض مورخین کو اس تاریخ پیدائش سے اختلاف ہے۔ ان کے خیال میں وہ 1201ء میں پیدا ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دمشقی کہلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دمشق میں ہی پیدا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ پیدا کہیں اور ہوا ہو لیکن اس کی سرپرستی اور تعلیم و تربیت دمشق میں ہوئی ہو۔ بہر حال اہم ترین بات سال اور شہر کا تعین نہیں ہے۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ ایسے زمانے میں مسلمان دنیا میں پیدا ہوا جب علم و فن مسلمان حکماء کی قلمرو تھے، اس قلمرو کی سرحدیں ابھی سمٹنا شروع نہیں ہوئی تھیں اور انحطاط اور انتشار کا دور ابھی کچھ دور تھا۔

ابن النفیس نے ابتدائی تعلیم دمشق میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مہذب الدین عبد الرحیم ابن علی الدخوار کے حلقہ درس میں شامل ہو گیا۔ ابن الدخوار علم الحدیث اور فن طب دونوں کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ ابن النفیس نے ابو الفرج ابن یعقوب ابن اسحاق المسیحی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کی اصل دلچسپی تو طب میں تھی لیکن ابن النفیس نے صرف و نحو منطق اور اصول فقہ کا مطالعہ بھی کیا۔ اس کا

شمار فقہ شافعیہ کے مستند علماء میں کیا گیا ہے۔ ایک زمانے میں وہ فقہ کا استاد بھی رہا۔ وہ عربی لغت کا ماہر تھا۔ اپنی زندگی میں اس کو ادیب کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ صاحب تصنیف تھا۔ اس نے ابن طفیل کے تحریر کردہ قصے "ابن یقظان" کے جواب میں "فاضل ابن ناطق" لکھی۔ اس زمانے کے بیشتر لکھنے والوں کے برعکس اس کی تمام تر تحریریں دوسرے مصنفوں کی تصانیف پر ہی مبنی نہیں بلکہ طبع زاد تصانیف بھی ہیں۔

شرح نگاری میں اس کا اپنا ایک مقام ہے اور بطور شارح اس کی آزاد خیالی اور وسیع النظری کی مثال دی جاتی ہے۔ اس نے بقراط کی "طبعیۃ الانسان" اور "وبائی امراض" حسنین بن اسحاق کی "مسائل فی الطب" اور ابن سینا کی "اشارات" اور "ہدایۃ فی الحکمت" پر شرحیں لکھیں۔ اس نے ابن سینا کی "للقانون" کی تلخیص کر کے اس کا نام "کتاب الموجز" رکھا۔ "القانون" کے چار ابواب کی مناسبت سے یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے علم الحدیث پر "مختصر علم اصول الحدیث" اور سیرۃ النبیؐ پر "الرسالتہ الکاملیتہ فی السیرۃ النبویہ" بھی تحریر کیں۔

1952ء میں اس کی ایک غیر مطبوعہ کتاب "کتاب الشامل فی الصناع الطبیہ" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی دریافت نے بہت سے حقائق پر سے پردہ ہٹا دیا۔ اس کتاب میں ابن النفیس نے بہت سے معاملات میں بقراط اور الزہراوی کی تقلید کی ہے۔ مثلاً اس نے آپریشن کے وقت مریض کو صحیح طرح لٹانے یا بیٹھانے کے طریقوں کے بارے میں بتایا ہے اور آلات جراحی کے صحیح استعمال کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ یہ بھی اسی کتاب سے ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک ماہر جراح تھا۔ اس نے مریض کے جراح اور تیمار دار سے تعلقات کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ وہ جراحی کو تین مرحلوں میں تقسیم کرتا ہے: العطاء، العمل اور الحفظ۔ تینوں مرحلے اپنی اپنی جگہ انتہائی اہم ہیں۔ العطاء یعنی تشخیص اس لئے اہم ہے کیونکہ مریض کی زندگی کا دارومدار جراح کی صحیح تشخیص پر ہے۔ دوسرا مرحلہ العمل یا آپریشن اس لئے اہم ہے کیونکہ اس میں ایک انسانی عضو کی چیر پھاڑ اور کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے۔ آخری مرحلہ الحفظ یعنی شفایابی کا مرحلہ اہمیت میں کسی طرح کم نہیں ہے کیونکہ یہ وہ وقت ہے جب زخم بھر رہا ہوتا ہے اور ذراسی لاپروائی یا بے احتیاطی سے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ اس نے ان تینوں مراحل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔

لیونارڈو داونچی کی طرح ابن النفیس بھی بہت نرم دل واقع ہوا تھا۔ علم طب سے گہرا شوق رکھنے کے باوجود اس کو بغیر مجبوری کے انسان تو انسان جانور تک کی چیر پھاڑ کرنا گوارا نہیں تھا۔ ان حالات میں کسی کو اس کے حاصل کردہ نتائج سے صحت اور درستی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن حیرت

انگیز بات یہ ہے کہ چیر پھاڑ سے اجتناب کے باوجود اس کو طب کی دنیا میں علم تشریح الاجسام اور امراض چشم کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ خون کے بارے میں تحقیق اور دوران خون کے بارے میں اس کے نظریات ہیں۔

انسان کی زندگی اور صحت کا راز اس کے دوران خون کے نظام میں مضمر ہے۔ انسانی جسم میں خون کی اہمیت سے اطباء بہت پہلے سے واقف تھے لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ دل سے نکلنے کے بعد خون کس طرح سفر کرتا ہے۔ ابن سینا کا خیال تھا کہ خون دائیں خانے سے نکل کر براہ راست بائیں خانے میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ بیان پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکا کیونکہ وہ دل کے ان دونوں خانوں کے درمیان کسی راستے کی نشاندہی نہ کر سکا۔ ابن النفیس نے دیکھا کہ خون جب دل کے دائیں خانے میں پہنچتا ہے تو اس وقت تک پتلا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خون دل کے بائیں خانے میں چلا جاتا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کیسے جاتا ہے۔ کیونکہ دل کے دونوں خانوں کی درمیانی دیوار میں کوئی نالی یا سوراخ نہیں ہے۔ دل کے عضلات اتنے موٹے اور سخت' اور مسام اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ خون ان میں سے بھی نہیں گزر سکتا۔ ابن النفیس نے اندازہ لگایا کہ یہ خون دل کے دائیں خانے سے پھیپھڑوں کی ورید کے ذریعے پھیپھڑوں میں جاکر پھیل جاتا ہے اور اس میں ہوا شامل ہو جاتی ہے' تو یہ خون پھیپھڑوں سے شریان کے راستے واپس دل کے بائیں خانے میں چلا جاتا ہے۔ ابن النفیس نے یہ انکشاف 1242ء میں کیا۔ لیکن آج دوران خون کا ذکر آتے ہی اکثریت کی زبان پر ولیم ہاروے 1687ء یا سولھویں صدی کے سر فیتس (-Ser vetus) کا نام آجاتا ہے۔ حالانکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے اس حقیقت کی نشاندہی کرنے والا ابن النفیس ہی تھا۔ اگر اس وقت ذرائع ابلاغ بہتر ہوتے تو شاید ابن النفیس کی یہ دریافت دنیا میں تہلکہ مچا دیتی اور آج طب کی تاریخ کم از کم چار سو سال آگے ہوتی۔ لیکن کسی وجہ سے اس کا صرف ایک لاطینی ترجمہ شائع ہوا جو دنیا کی اکثریت کی نظروں سے اوجھل رہا۔

10 جون 1957ء کو لندن کی مشہور خبر رساں ایجنسی رائٹر (Reuter) کی طرف سے ایک خبر شائع ہوئی جس میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا کہ نظریہ دوران خون کا دریافت کرنے والا سر فیتس یا ہاروے نہیں بلکہ ازمنہ وسطی کا ایک مسلمان سائنسدان ابن النفیس القرشی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بعد چھپنے والی انسائیکلوپیڈیا میں دوران خون میں پھیپھڑوں کے کردار کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے ابن النفیس کے نام کا اضافہ کر دیا گیا۔

الدمیری

(1341ء-1405ء)

الدمیری کا پورا نام محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین ہے۔ وہ 1341ء میں قاہرہ میں پیدا ہوا اور اسی شہر میں 1405ء میں وفات پائی۔ کسب معاش کے لیے اس نے درزی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ وہ کپڑوں کی سلائی سے اپنی گزر بسر کرتا رہا' لیکن اس کام کے ساتھ ساتھ علم حاصل کرنے کی تگ ودو بھی جاری رہی۔ بالآخر اس نے یہ پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا اور ہمہ وقت تحصیل علم میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے عہد کے نامور اور جید علماء کی علمی مجالس میں حاضر ہونے لگا اور ان کے حلقہ تلامذہ میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گیا۔ اس کے اساتذہ میں مشہور شافعی عالم بہاؤ الدین السبکی' جمال الدین الاسنوی' ابن عقیل اور برہان الدین القیراطی شامل ہیں۔

ان اساتذہ کی علم پرور صحبتوں کا اثر تھا کہ الدمیری نے تھوڑی ہی مدت میں فقہ علوم حدیث' تفسیر' عربی زبان اور معانی وبیان میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ الازہر' جامعہ الظاہر' مدرسہ ابن البقری اور قبہ جیسے عظیم علمی مراکز میں درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مصروف ہو گیا۔

اپنے مذہبی اعتقادات کے باعث الدمیری تصوف کے اس مسلک سے وابستہ ہوا جس کی تاسیس خانقاہ صالحیہ میں ہوئی تھی۔ الدمیری ایک زاہد' عابد اور صاحب کرامت بزرگ کے طور پر مشہور تھا۔ نوجوانی میں وہ اگرچہ کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا' لیکن بعد میں وہ اکثر روزے کی حالت میں رہتا' اپنا زیادہ وقت نمازوں میں گزارتا اور شب بیداری کرتا۔ 1361ء سے 1397ء کے درمیان اس نے چھ مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ اس دوران اس نے ایک طرف تو مکے اور مدینے کے مقامی علما و فضلا سے اپنے علم کی پیاس بجھائی اور دوسری طرف اپنے درس و وعظ اور فتاویٰ سے لوگوں کو فیضیاب کیا۔

یوں تو الدمیری نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں لیکن اس کی وجہ شہرت اس کی کتاب بعنوان "حیات الحیوان" ہے۔ اس کتاب میں اس نے جانوروں سے متعلق عوام الناس میں پائے جانے والے غلط خیالات و تصورات کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا مسودہ الدمیری نے 1371ء میں تیار کیا تھا اور اس میں ان تمام حیوانات کے بارے میں ممکنہ حد تک مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کا ذکر قرآن اور اس کے علاوہ عربی ادب میں جابجا ملتا ہے۔

"حیات الحیوان" میں اندراجات کو الفبائی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور ہر اندراج کے تحت عموماً مندرجہ ذیل مطالب کو زیر بحث لایا گیا ہے:

1۔ زبان کے قواعد اور لغوی لحاظ سے ہر جانور کے نام کی خصوصیات دی گئی ہیں۔ اس ضمن میں الجاحظ' ابن سیدہ اور دوسرے ماہرین کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

2۔ ارسطو اور الجاحظ کی متعلقہ تصانیف کے حوالے سے ہر حیوان اور اس کی عادات کو بیان کیا گیا ہے۔

3۔ ان اسلامی روایات کو بھی شامل کیا گیا ہے' جن میں مختلف حیوانات کا ذکر ملتا ہے۔

4۔ ہر جانور کی شرعی اور مذہبی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔ خصوصاً غذا کے طور پر اس کے حلال یا حرام ہونے کی وضاحت موجود ہے۔

5۔ حیوانوں سے متعلق ضرب الامثال بھی درج کی گئی ہیں۔ اس مقصد کے لیے خصوصاً المیدانی کی "مجمع الامثال" سے کافی مدد لی گئی۔

6۔ حیوانات سے حاصل کردہ مختلف ازویہ اور مصنوعات کے طبی اور دیگر خواص تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ارسطو' الجاحظ ابن سینا اور القزوینی کے تجربات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

7۔ خواب میں مختلف حیوانات کے ظاہر ہونے کی تعبیر سے متعلق اصول بیان کیے گئے ہیں۔

الدمیری نے اگرچہ اپنی معلومات کے لیے مکمل طور پر عربی ماخذ پر انحصار کیا ہے' تاہم ان میں دوسری زبانوں (خصوصاً لاطینی) سے عربی میں کیے گئے تراجم بھی شامل ہیں۔ اس نے مختلف حیوانات کے کوائف درج کرتے ہوئے 805 مصنفین کا حوالہ دیا ہے اور یہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر قوموں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

"حیات الحیوان" کا اسلوب واضح اور سلجھا ہوا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ کتاب اس لیے اہمیت

کی حامل ہے کہ اس میں حیوانات سے متعلق مشاہدات کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مروجہ روایات اور عقائد کے بارے میں اکثر مقامات پر خاصی معلومات درج ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں مصنف اکثر اوقات اپنے اصل موضوع سے گریز کرتے ہوئے دوسرے مضامین پر توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر "اوز" (بطخ) کے عنوان کے تحت خلفاء کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے جو پوری کتاب کا تقریباً تیرھواں حصہ بنتا ہے۔

الدمیری کی یہ تصنیف اپنی علمی افادیت کے اعتبار سے اتنی اہم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الدمیری نے صرف دوسری کتابوں سے حاصل کردہ معلومات کو جمع کیا ہے اور اس میں اپنے مشاہدات کو شامل نہیں کیا۔ یہ کتاب 1096 مقالات پر مشتمل ہے لیکن جانوروں کی تعداد اس سے خاصی کم ہے کیونکہ کئی جانوروں کو مختلف یا مترادف ناموں کے تحت ایک سے زیادہ مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ الدمیری کی اس کتاب میں "براق" کے علاوہ ان حیوانات سے متعلق بھی کافی معلومات ملتی ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ مزید برآں اس میں ان مقبول عام روایات کی جھلک بھی نظر آتی ہے جن کا ذکر اس دور کے قصے کہانیوں میں موجود ہے۔ جیسے چھپکلی اور شیر پر اندراجات میں مشہور عربی داستان "الف لیلہ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض جگہ جانوروں کے بیان کے دوران وہمی اور خیالی باتوں کو بھی جگہ دی گئی۔

"حیات الحیوان" متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے تین منتشر نسخے ہیں: الکبری، الوسطی اور الصغری۔ اس کے متعدد خلاصے اور اقتباسات بھی تیار کیے گئے ہیں۔ ترھویں صدی میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا جبکہ ترکی زبان میں اس کا ایک ترجمہ بعد میں ہوا۔ اس کے علاوہ Jayakar کا انگریزی زبان میں ایک نامکمل (کتاب کا تقریباً تین چوتھائی) ترجمہ بھی ملتا ہے، لیکن یہ زبان و بیان کے اعتبار سے کمزور ہے۔

ایک حوالے میں "حیات الحیوان" کے علاوہ الدمیری کی دیگر تصانیف میں سے صرف تین کے موجود ہونے کا تذکرہ ملتا ہے (براکلمان) ان کے نام درج نہیں ہیں۔ اس کی آخری تصنیف "سنن ابن ماجہ" کی تفسیر ہے، جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا عنوان "الدیباچہ" ہے۔

الغرناطی

(1485ء-----1554ء)

الحسن ابن محمد الوزان الزیاتی الغرناطی ' جسے افریقی لیو کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے' 1485ء کے قریب سپین کے شہر غرناطہ میں پیدا ہوا اور 1554ء کے بعد تیونس میں انتقال کر گیا۔ جغرافیہ اور سیاحت اس کی وجہ شہرت ہے۔ اس کی پیدائش کے تقریباً سات سال بعد غرناطہ کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا خاندان یہاں سے کوچ کر کے فیض میں آباد ہو گیا۔ الحسن نے اپنی ابتدائی تعلیم فیض میں ہی مکمل کی۔

الحسن کے جغرافیائی علم کی بنیاد قرون وسطی کے مسلمانوں کی جغرافیائی تحریروں اور اس کی اپنی سیاحتوں سے براہ راست حاصل کردہ مشاہدات پر رکھی گئی۔ Mauny کے مطابق اس نے پہلا سفر 1507ء-1508ء میں ٹمبکٹو کا کیا۔ 1512ء-1514ء میں اس نے ایک بار پھر ٹمبکٹو کا عزم کیا اور وہاں سے جھیل چاڈ کے راستے مصر پہنچا۔ 1515ء-1518ء میں اسے مراکش کے سفیر کی حیثیت سے دربار عثمانیہ میں بھیجا گیا۔ اس سفر کے دوران میں اس نے قسطنطنیہ اور پھر مصر' عرب ممالک اور طرابلس کی سیاحت کی۔ طرابلس میں اسے اطالوی قزاقوں نے پکڑ لیا اور اپنے ساتھ اٹلی لے گئے اور وہاں غلام کے طور پر پوپ لیو دہم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہاں اسے عیسائیت قبول کرنا پڑی اور اس نے اپنا نام بدل کر پوپ کے نام پر لیو رکھ لیا اور اسے اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ 1529ء میں جب وہ تیونس واپس آیا' تو دوبارہ مسلمان ہو گیا۔

اٹلی میں قیام کے دوران الحسن نے اطالوی زبان میں ایک جغرافیائی تصنیف Della Dercittione Dell Africa تحریر کی۔ اس تصنیف کو نو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' جن میں سے پہلی فصل افریقہ اور افریقیوں کے بارے میں عام معلومات پر مشتمل ہے۔ اس سے اگلی پانچ فصول میں شمالی افریقہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتویں فصل میں بالائی نائجیریا اور صحارہ کی جنوبی

سرحدوں پر واقع دوسرے علاقوں کے بارے میں معلومات درج ہیں اور آٹھویں فصل میں مصر کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ نویں فصل میں افریقہ کے دریاؤں' جانوروں' معدنیات اور نباتات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ تازہ معلومات کے اعتبار سے سائنسی مورخین کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا حامل ہے۔ یہاں اس نے ایک جغرافیہ نگار پلائنی کی افریقہ کے بارے میں ناکافی معلومات پر بھی بحث کی ہے اور اس خطے کے بارے میں درست ترین معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

الحسن کی متذکرہ تصنیف افریقی جغرافیے کے ناکافی علم میں ایک قابل قدر اضافہ تھا۔ عملی جغرافیے کی اس تحریر میں مختلف مقامات کے درمیان فاصلہ میلوں میں دیا گیا ہے۔ یہ تصنیف "مسالک وممالک" کی طرز پر روایتی اسلامی جغرافیے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کی اشاعت کے دو سو سال بعد تک نقشے اور جہاز رانی سے متعلقہ تحریریں لکھنے والے (جیسا کہ افریقہ سے متعلقہ Ramusio (1554' Luchini (1559ء) اور Ortelius (1570ء) کے نقشوں اور W.Barentszoon کی جہاز رانی سے متعلقہ تحریر (1596ء) سے ظاہر ہے) اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ قرون وسطیٰ کے بعد کے مسلمانوں کی ان چند تصنیفات میں شامل ہے' جن سے اہل مغرب نے اکتساب کیا۔

آٹھواں حصہ

سپہ سالار، فاتح، ریاست کار

عمرو بن عاص ؓ

(577ء ------ 667ء)

آپ قریش کے ایک مشہور قبیلہ سہم سے تھے۔ یہ قبیلہ کعب پر آکر پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کے نسب سے جاملتا ہے۔ شعر و ادب اور سخاوت و مہمان نوازی اس قبیلے کا امتیازی وصف ہے۔

عمرو بن عاص ؓ کی ولادت واقعہ فیل سے چھ سال بعد مکہ میں ہوئی۔ آپ کے والد عاص کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سلمہ دوسری ہر ملہ مگر اسلام کی سعادت صرف سلمہ ہی کے اس بیٹے عمرو بن عاص ؓ کو نصیب ہوئی۔

فتوحات اسلامی میں جن کا نام خاص طور پر نمایاں ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ تاہم عمرو بن عاص ؓ نے باقاعدہ طور پر لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور اس میں کافی حد تک مہارت بھی پیدا کرلی تھی نیز معاملہ فہمی' دور اندیشی' عزم استقلال' ہمت اور اولوالعزمی تو انہیں ورثے میں ملی تھی۔

اسلام سے عداوت اور دشمنی قریش کے دوسرے قبیلوں کی طرح بنی سہم کو بھی خاص طور سے تھی۔ عاص بن وائل اور خود عمرو بن عاص کا نام جہالت کے ایام میں اسلام کے دشمنوں کی فہرست میں تھا حتیٰ کہ عمرو بن عاص ؓ نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اب ان کی عداوت اور دشمنی کا رخ کفر کے مٹانے کی طرف پھر گیا۔ انہوں نے اس بات کا عہد کیا کہ اب اس کے بعد میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اسلام ہی کی خدمت اور مسلمانوں ہی کی ترقی اور حفاظت میں صرف ہوگی۔ یہ بات عمرو بن عاص ؓ کے اسلامی جذبات ہی کا نتیجہ تھی کہ انہیں حضور ؐ نے بعض اہم غزوات و سرایا کی امارت سپرد فرمائی۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ بات خود عمرو بن عاص ؓ ہی نے بیان کی کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام ؐ نے مجھے کہلا بھیجا کہ میں فوج کی وردی اور ہتھیار پہن کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ رسول اکرم ؐ نے سریہ ذات السلاسل کی امارت کے لئے عمرو

بن عاصؓ کو منتخب فرمایا اور انہیں اپنے دست مبارک سے ایک سفید علم بھی عنایت کیا۔ جب اسلام کا لشکر سر زمین جذام کے چشمے "سلاسل" پہنچا تو معلوم ہوا کہ معرکہ سخت اور دشمنوں کی فوج اسلام کے لشکر کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس کی اطلاع حضورؐ کی خدمت میں بھجوائی اور حضورؐ نے اسی وقت دو سو صحابہ کو جن میں سیدنا ابو بکر صدیقؓ سیدنا عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح ایسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے 'بطور کمک بھیج دیا اور نصیحت فرمائی کہ سب مل جل کر رہنا' کسی سے کوئی اختلاف نہ کرنا۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ قضاعہ کے علاقے میں پہنچ کر حضرت عمرو بنؓ عاص نے ایسی شجاعت اور بے جگری سے حملہ کیا کہ دشمن بری طرح پسپا ہوا۔ ہزاروں آدمی مارے گئے اور بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد عمرو بن عاصؓ ایک اور مہم پر بھیجے گئے یہ سریہ سواع تھا' جو بنی ہذیل کے مشہور بت خانے سے متعلق تھا۔ یہ بت' جو ایک عورت کی شکل پر تھا مکہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ قبیلہ ہذیل کے لوگ اسے خدا سمجھتے تھے حضورؐ نے اس بت کو ڈھانے کے لئے عمرو بن عاصؓ کو مقرر فرمایا۔

اس مہم کے بعد پھر عمرو بن عاصؓ کو کئی ایک قبیلوں سے خراج وصول کرنے کی مہم پر مقرر فرمایا گیا' جن میں نجرین' سعد ہذیم' عذرہ' جذام' جدس اور خزارہ ایسے قبیلے شامل تھے جنہوں نے جذیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ ان قبائل کے پاس گئے اور ان سے رقمیں وصول کیں اور پائی پائی لاکر حضورؐ کی خدمت اقدس میں پیش کر دی۔

حضرت عمرو بن عاصؓ تنہا شجاعت اور تلوار ہی کے دھنی نہ تھے' فہم و فراست' تدبیر و سیاست میں بھی قدرت کا وافر حصہ پایا۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کی جنگی مہارت اور سیاسی بصیرت کو دیکھتے ہوئے اہلیت اور صلاحیت پر انہیں اسلامی سفارت کا عہدہ بھی تفویض فرمایا۔

حضورؐ کی رحلت کے بعد ابو بکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو یہ بے حد نازک وقت تھا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور انہیں ذات رسالت مابؐ کی بابرکت صحبت میسر نہ آسکی وہ اسلام کی تعلیمات کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے باعث دین سے پھر گئے اور ان سب نے بیک زبان زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ہر چند ان حالات نے ابو بکر صدیقؓ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا تاہم انہوں نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی پورے طور پر ٹھان لی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو بارگاہ خلافت میں طلب کیا اور وہ حکم کی تعمیل میں عمان سے مدینے کو چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں بنو عامر کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

زکوۃ کے منکروں کی سرکوبی کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ مدینے سے ہو کر پھر عمان چلے گئے۔ لیکن ابو بکر صدیقؓ کو جلد ہی پھر ان کی ضرورت پڑ گئی اور انہیں بلا بھیجا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاصؓ پھر مدینے پہنچ گئے۔ یہ موقع شام کی مہم کا تھا۔ ابو بکر صدیقؓ نے شام کی مہم پر جانے والے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ جب عمرو بن عاص اپنے لشکر کے نو ہزار سرفروش مجاہدوں کو لے کر مدینے سے چلنے لگے تو سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے انہیں چند باتیں نصیحتوں کے طور پر ارشاد فرمائیں اور آخر میں فرمایا' اے عمرو بن عاصؓ جاؤ' اللہ کی برکت اور اس کی رحمت تمہارے ساتھ ہے۔

جب دونوں طرف سے فوجوں کی صف بندی ہو چکی اور ابتدائی انتظامات مکمل ہوئے' تب جنگ کا آغاز ہوا۔ جونہی رومیوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا وہ ان کے حملے کا بڑھ بڑھ کر جواب دینے لگے۔ حتیٰ کہ لڑائی تمام دن جاری رہی۔ آخر مسلمانوں نے رومیوں کو مار بھگایا۔ لیکن ابھی رومیوں کے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا پیچھا ہی کیا جا رہا تھا کہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں نے پلٹ کے پیچھا کرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں حضرت عمرو بن عاصؓ کے سوتیلے بھائی سعید بن خالد شہید ہو گئے جن کے صدمے سے آپ بے حد ملول ہوئے اور مسلمانوں کو للکارا کہ "اے بھائیو! سعید بن خالد بھی عالم بقا میں چل دیے ہیں اور اب میں بھی جانا چاہتا ہوں۔ تم میں سے کون ایسا ہے جو میرا ساتھ دے گا۔" اس پر صحابہ کی ایک جماعت مستعد ہو گئی اور ایسی بے جگری سے لڑی کہ ایک ہی حملے میں پندرہ ہزار سپاہیوں کو کاٹ کے رکھ دیا اور سرزمین فلسطین فتح کر لی۔ اس لڑائی میں جو مسلمان شہید ہوئے۔ مورخین ان کی تعداد صرف ایک سو تین بیان کرتے ہیں۔

عمرو بن العاصؓ نے شام اور فلسطین کو بھی فتح کیا' لیکن آپ کا اصل کارنامہ مصر کی فتح ہے۔ یہی آپ کی وجہ شہرت بھی بنی۔ مسلمانوں کو ڈر تھا کہ روم کا قیصر اب مصر کی طرف سے شام تک ملک پر حملہ کرے گا۔ عمرو بن عاصؓ نے اس خطرہ کو ٹالنے کے لیے ضروری سمجھا کہ مصر فتح کر لیا جائے۔ اس زمانے میں چونکہ طاعون کی وبا سے نجات ملے مسلمانوں کو تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور اس کے اثرات ابھی پورے طور پر زائل نہ ہوئے تھے اس لئے عمر فاروقؓ ان حالات میں اسلام کی فوج کو باہر بھیجنا پسند نہ کرتے تھے مگر حضرت عمرو بن عاصؓ کا اصرار بڑھا ہوا تھا اس لئے دشمن کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے رضامند ہو گئے اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک ہزار فوج دے کر مصر کی طرف بھیج دیا۔

عمرو بن عاص وادی العریش کے رستے مصر کی سرحد میں داخل ہوئے۔ پہلے آپ نے عریش ورمح وغیرہ فتح کئے۔ پھر ایک قدیم اور تاریخی شہر فرما کو فتح کیا۔ یہ شہر کسی زمانے میں اپنی سنگین فصیلوں' گرجوں' کلیساؤں اور بلند عمارتوں کے لحاظ سے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ فرما کے بعد شہر بلبیں

کو فتح کیا جو مصر سے تیس میل کے فاصلے پر فرما کے جنوب میں واقع ہے عمرو بن عاصؓ دریائے نیل کے مغربی علاقوں کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ چنانچہ "منف" پر حملہ کیا جس میں مصریوں نے سخت شکست کھائی۔ اس کے بعد انہوں نے شہر ہنسا پر حملہ کیا جس میں رومی فوج کے سراغ رسانوں کی بہت بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی اور مسلمانوں نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا جو کافی عرصے تک جاری رہا ۔ مسلمانوں کے ڈر سے رومی قلعے ہی میں پڑے رہے۔

عین الشمس کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ نے رومیوں کے مشہور قلعہ بابلیون کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ انتہائی مضبوط اور وسیع تھا اور مصر کا بادشاہ مقوقس یہیں رہتا تھا۔ اب دشواری یہ تھی کہ عمرو بن عاصؓ کے پاس نہ تو قلعہ شکن توپیں تھیں نہ زیادہ سامان حرب۔ اور مصری کھل کر سامنے آتے نہیں تھے اور اگر کبھی آتے بھی تھے تو ایک آدھی معمولی جھڑپ کر کے پھر قلعے میں گھس جاتے تھے۔ غرض اسی حال میں سات مہینے گزر گئے۔ آخر کار مقوقس گھبرا گیا اور درباریوں کی رضامندی سے اس نے اسلامی سفیر کو طلب کیا۔ عمرو بن عاصؓ نے حضرت عبادہ بن صامت کو دس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا۔ حضرت عبادہ بن صامت کے واپس چلے آنے کے بعد مقوقس نے اپنے درباریوں سے پھر کہا کہ میرا دل کہتا ہے۔ مسلمان ہمارا قلعہ ضرور فتح کر لیں گے اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان سے صلح کر لی جائے۔ لیکن رومی اس کی بات سن کر پھر غصے سے نکھر گئے اور اسی وقت آگ بگولہ ہو کر قلعے سے باہر نکل آئے اور آتے ہی مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ رومی قلعہ سے باہر نکلیں اور کھل کر مقابلہ کریں۔ اب ان کے آنے سے بے حد خوش ہوئے اور بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دینے لگے۔ حتی کہ رومیوں کے قدم اکھڑ گئے اور بھاگ نکلے۔ اب انہیں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ مقوقس کی رائے ٹھیک ہی تھی۔ مسلمانوں سے صلح کر لینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ مقوقس اپنے درباریوں کے ہمراہ صلح کی درخواست لے کر عمرو بن عاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عمرو بن عاصؓ نے اس کا نہایت فراخدلی سے استقبال کیا اور قدرے نرم لہجے میں فرمایا: "آپ بذات خود تشریف لائے ہم آپ کے ممنون ہیں۔" اس کے جواب میں مقوقس نے بھی سر جھکاتے ہوئے کہا "بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ سرزمین عطا فرما دی ہے۔ اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ رومیوں کے خلاف بالکل کوئی جنگ نہ کریں۔"

صلح کرنے کے بعد مقوقس نے اس واقعے کی اطلاع قیصر روم کو بھجوا دی۔ مگر قیصر روم خط دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور اس نے فوراً ایک فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لئے مصر کی جانب روانہ کر دی۔ مقوقس یہ صورت حال دیکھ کر قلعے سے باہر چلا گیا اور عمرو بن عاصؓ کو کسی سے کہلوا بھیجا کہ میں

اپنے عہد پر بدستور قائم ہوں۔

پھر اسی دوران میں اطلاع پہنچی کہ قیصر روم ہرقل مر گیا تو لوگوں نے کہا یہ سزا ہے کہ مقوقس کی بات نہ ماننے کی جو خدا نے ہرقل کو اجل کے سپرد کر دیا۔ اب اس کے بعد مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ رومیوں پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو صاحب سب سے آگے بڑھے وہ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی زبیر ابن العوامؓ (حضرت عبداللہ بن زبیر کے والد) تھے۔ انہوں نے رومیوں پر حملہ کرنے سے پہلے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے مسلمانو! میں اپنی جان اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں مسلمانوں کو ضرور فتح عطا فرمائے گا۔" اور یہ کہتے ہی پھر قلعہ کی فصیل پر سیڑھی لگائی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ جب میں نعرۂ تکبیر بلند کروں تم پوری قوت کے ساتھ جواب دینا۔ آپ تلوار ہاتھ میں لے کر نہایت پھرتی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گئے اور نہایت بلند آواز سے تکبیر کہی جس کا باہر سے مسلمانوں نے پورے جوش و خروش سے جواب دیا۔ رومیوں نے اب جو تکبیر کے نعروں کا شور و غل سنا تو سمجھے کہ مسلمانوں نے قلعے کو فتح کر لیا' چنانچہ وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ حضرتِ زبیر ابن العوامؓ نے آگے بڑھ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

مہم سے فارغ ہو کر حضرت عمرو بن عاصؓ سکندریہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اس مرتبہ آپ کی فوج میں قبطی بھی شامل تھے۔ اب عمرو بن عاصؓ ایک ماہ میں اسکندریہ ایسے مشہور تاریخی مقام کی فتح کے لئے جا پہنچے جسے مشہور عالم فاتح سکندر نے بحر ابیض پر تعمیر کیا تھا۔ اس موقع پر اسلامی فوج کی تعداد آٹھ ہزار یا زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار تھی۔ لیکن رومی فوج پوری پچاس ہزار تھی۔ اسلامی فوج کے پاس نہ قلعہ شکن آلات حرب تھے نہ بحری جنگ کے لئے جہاز۔ رومی پورے طور کیل کانٹے سے لیس اور سر سے لے کر پیر تک لوہے میں غرق تھے۔ جنگ شروع ہو گئی اور متواتر دو مہینے تک جاری رہی۔

ایک روز قبیلہ مہرہ کے ایک مجاہد اسلام دشمن رومیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور ان کا سر رومی کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مہریوں نے عمرو بن عاصؓ سے آ کر شکایت کی اور کہا کہ جب تک ہمارے بھائی کا سر واپس نہیں ملے گا ہم لاش کو دفن نہیں کریں گے۔ عمر بن عاصؓ نے کہا "بھلا رومیوں کو تمہارے غم و غصے کی کیا پروا۔ اب تو ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم بھی کسی رومی کا سر کاٹ کر لے آؤ۔ جب وہ اس کی واپسی کا تقاضا کریں تم بھی واپسی کا تقاضا کر دینا۔ وہ اگر سر تمہیں واپس کر دیں تم بھی انہیں واپس کر دینا۔" چنانچہ دوسرے ہی دن مہریوں نے رومیوں کے ایک سردار کو موقع پا

کر مار گرایا اور اس کا سر کاٹ کر ساتھ لے آئے۔

اب رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل جنگیں برپا ہوتے ایک سال دو مہینے پورے ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ فتح کا مژدہ سننے کے لئے بے چین رہنے لگے۔ حتی کہ جب انتظار کی مدت حد سے گزر گئی تو آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو لکھا: "معلوم ہوتا ہے تم بھی آرام طلب رومیوں کی طرح اب آرام پسند ہو گئے۔ ورنہ فتح میں اتنی دیر کیوں ہے۔" حضرت عمرو بن عاصؓ نے اسلامی فوج کو خط کے مضمون سے مطلع کیا۔ پھر حضرت عبادہ بن صامت سے ان کا نیزہ لے کر اپنا عمامہ اتار اور اس نیزے سے باندھ دیا' پھر اسے علم بنا کر حضرت عبادہ بن صامت کو واپس کر دیا اور کہا "آج سے آپ علم بردار ہیں۔" اس کے بعد حضرت زبیر ابن العوامؓ کو حضرت مسلمہ کی فوج کا ہراول مقرر کیا اور ساری فوج کے آگے آگے ننگی تلوار لئے خود رومیوں کی طرف بڑھے اور ایسا میدان کارزار گرم کیا کہ جب تک دشمن رومیوں کی بری اور بحری فوجوں کو شکست فاش نہ دے دی جنگ برابر جاری رکھی۔

فتح مصر کے علاوہ حضرت عمرو بن عاص کا ایک قابل ذکر کارنامہ نہر سویز کی تعمیر ہے جسے انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم پر بنانا شروع کیا تھا اور بہت جلد پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس نہر نے دریائے نیل کے پانی کو بحر احمر کے پانی سے ملا دیا اور اس کے ذریعے سے مصر کے غلے کو عرب کی بندرگاہ پر بھیجنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اسی برس تک یہ نہر کار آمد رہی لیکن بعد میں ریت سے بھر جانے کے باعث بیکار ہو گئی۔

کتاب المعارف ابن قتیبہ اور اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ عمرو بن عاصؓ کی رحلت کا وقت جب قریب آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوئے اور کہا کہ: "اے اللہ! تو نے حکم دیا میں نے سرتابی کی 'تو نے ممانعت کی' میں نے نافرمانی کی۔ اگر تو مجھے معاف کر دے تو مجھ پر یہ تیرا کرم ہے اور اگر سزا دے تو میں اپنے اعمال کی بدولت اس کا مستحق ہوں۔ تاریخ وفات 667ء ہے۔ نوے سال کی عمر پائی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ

(583ء----- 645ء)

حضرت خالد بن ولیدؓ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا اور آپ کا شجرہ نسب ساتویں پشت میں رسول اللہؐ اور خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کا خاندان بنی مخزوم اہل قریش میں بہت مشہور اور سر کردہ تھا۔

خالد بن ولیدؓ کے سن ولادت سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ قیاس ہے کہ وہ سیدنا عمر فاروقؓ کے بچپن میں ان کے ساتھ کھیلتے کودتے تھے اور ایک مرتبہ ہنسی مذاق میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی پنڈلی توڑ دی تھی اس لئے ضرور ہے کہ وہ ان کے ہم عمر ہوں گے۔

اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ دونوں ہم عمر تھے تو اس حساب سے حضرت خالد بن ولیدؓ کا سن ولادت 583ء یعنی پیغمبر اسلام کے سن ولادت سے بارہ سال بعد کا عرصہ قرار پاتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ایک امیر کبیر باپ کے بیٹے تھے جس کے مکے سے طائف تک بے شمار باغات تھے اور روپے پیسے کی کسی طرح کی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں خالد نے شاہانہ انداز میں پرورش پائی۔ وہ عام طور پر امراء کے لاڈلے بیٹوں کی طرح گھوڑ سواری اور گھوڑ دوڑ وغیرہ دلچسپ مشغلوں میں لگے رہتے تھے اور چونکہ وہ قریش کے بنی مخزوم ایسے ایک مشہور خاندان سے تھے' جسے قریش کی طرف سے فوجی کیمپ کا انتظام اور فوجوں کی سپہ سالاری کی خدمت سونپی گئی تھی۔ لہذا جب خالد بن ولید جوان ہوئے تو ان کے قبیلے بنی مخزوم نے یہ خدمت انہی کو تفویض کی۔ واضح رہے کہ حضرت خالدؓ کے باپ ولیدؓ نے ہجرت نبویؐ کے تین مہینے بعد پچانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔ خالدؓ فنون حرب میں لاجواب تھے۔ سارے عرب میں کوئی ان کے پائے کا سپہ سالار اور تلوار کا دھنی نہیں تھا۔ انہوں نے اگر کہیں تربیت پائی تو وہ صرف میدان جنگ میں' جہاں وہ اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر داد شجاعت دیا کرتے تھے۔ یہ اسی تربیت کا اثر تھا کہ خالد بن ولیدؓ نہایت دلیر' بہادر اور

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑنے والے نڈر سپاہی بن گئے۔

جنگ احد جس میں پہلے پہل میدان جنگ مسلمانوں نے سر کر لیا تھا' خالد بن ولیدؓ ہی کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے سے ان کی فتح سے شکست میں بدلی۔ جنگ احد سے ایک مدت بعد جنگ خندق کا واقعہ پیش آیا تو اس موقع پر بھی خالد بن ولید اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے میں پیش پیش تھے۔ وہ خندق کے کنارے کنارے تمام دن گشت کرتے رہے' جس سے انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ آیا خندق کا کوئی حصہ کہیں سے ایسا کمزور بھی ہے کہ جہاں سے مسلمانوں پر آسانی سے حملہ کیا جا سکے۔

اگرچہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے اسلام لانے سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ تاہم ان سب سنین میں صحیح 8 ہجری ہے' جس میں آپ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اسلام کیسے قبول کیا اس کا سبب خود انہی کی زبانی سنئے' فرماتے ہیں: "جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل و کرم کرنا چاہا تو اس نے میرے دل میں اسلام کی طرف لگاؤ پیدا کر دیا اور مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔"

جب حضرت ابو بکرؓ نے عنان خلافت سنبھالا تو ایک طرف باغی اور مرتد لوگوں نے آفت برپا کی ہوئی تھی اور دوسری طرف ایسے لوگوں کا زور بڑھ رہا تھا جو نبوت کے جھوٹے مدعی بنے بیٹھے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے اس کٹھن ساعت میں کمال ہمت اور استقامت سے کام لیا اور آپ کی نگہ انتخاب نے منکرین زکوٰۃ اور مرتدین کی سرکوبی کے لئے اولوالعزم صحابہ رسول کو مقرر کیا۔ ان میں حضرت خالد بن ولید' سیف اللہ کا نام بھی سر فہرست تھا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ سب سے پہلے طلیحہ کی سرکوبی کے لئے بھیجے گئے جس نے حجتہ الوداع کے بعد حضورؐ پیغمبر اسلام کو بستر علالت پر دیکھ کر اپنی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ طلیحہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد خالد بن ولید نے بنی تمیم کا رخ کیا جس میں بنی یربوع کے خاندان کی ایک عورت سجاع نبوت کا دعویٰ رکھتی تھی اور اس کا سردار مالک بن نویرہ تھا۔

اب خالد بن ولیدؓ کو حکم ملا کہ وہ مسیلمہ بن کذاب کی سرکوبی کریں' جس نے حضورؐ پیغمبر اسلام کی حیات مبارکہ ہی میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا اور حضورؐ کی خدمت میں لکھا تھا کہ آپ مجھے اپنی رسالت اور نبوت میں شریک کر لیں اور نصف حکومت میرے حوالے کر دیں۔

مرتدین اسلام اور منکرین زکوٰۃ سے فراغت پانے کے بعد اب حضرت خالد بن ولیدؓ کی ان فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اسلام کی حفاظت اور مدافعت کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ انہیں عراق کی مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اسی دوران میں جب ہرمز کو حضرت خالد بن ولیدؓ کے آنے کا پتہ چلا تو اس نے فوراً شہنشاہ

ایران اردشیر کو مدد کے لئے لکھ بھیجا اور خود ایک لشکر جرار لے کر حفیر کی طرف روانہ ہوا۔ حفیر مقام بصرہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ہرمز نے حفیر کے مقام پر اپنے لشکر کو ترتیب دیا جس میں سے لشکر کے ایک حصے نے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑ لیا تاکہ وہ میدان جنگ میں جم کر لڑ سکیں۔ اس اثناء میں حضرت خالد بن ولیدؓ بھی حفیر پہنچ گئے اور ان کے آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہرمز نے اپنے لشکر سے باہر نکل کر حضرت خالد بن ولیدؓ کو مبارزت کی دعوت دی جسے حضرت خالد بن ولیدؓ نے فورا قبول کر لیا۔ چنانچہ دونوں میں دست بدست لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ ہرمز کی نیت یہ تھی کہ حضرت خالد بن ولیدؓ گھیرے میں لے کر شہید کر دیے جائیں' چنانچہ ہرمز کے آدمیوں کو اس مقصد کی تلقین بھی کر دی تھی لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس سے پہلے کہ ایرانی سورما انہیں گھیرے میں لینے کے لیے آئیں' تلوار کے ایک ہی وار میں ہرمز کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے سورماؤں کو موقع دیے بغیر کہ وہ حملہ کریں کمال چستی اور دانائی سے لشکر میں واپس آ گئے۔

ہرمز کے مارے جانے کے بعد ایرانی فوج کے حوصلے پست ہو گئے یہاں تک کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ حفیر کے بعد پھر مسلمانوں اور ایرانیوں کی جنگ دلجہ کے مقام پر ہوئی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس علاقہ کے کاشتکاروں سے کوئی تعرض نہ کیا۔ ان سے محض جزیے کا مطالبہ کیا جس کی ادائیگی کا انہوں نے وعدہ کر لیا۔

اس جنگ میں چونکہ قبیلہ بکر بن وائل کے بھی کئی عربی نسل کے عیسائی مارے گئے تھے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایران کے دربار میں فریاد کی اور شہنشاہ ایران اردشیر نے بہمن جادویہ ایک نامی گرامی ایرانی سورما کو ان کی مدد کے لئے لشکر دے کر روانہ کیا۔ جادویہ نے الیس کے مقام پر پہنچ کر وہاں کے حاکم حبان کو ایرانی فوج سونپ دی اور خود شہنشاہ ایران سے مشورہ کرنے مدائن چلا گیا۔

ادھر جب خالد بن ولیدؓ کو ایرانیوں کے نئے حملے کی تیاریوں کا پتہ چلا تو وہ بھی لشکر لے کر مقابلے کو چل دیے اور الیس کے مقام پر پہنچتے ہی لڑائی شروع کر دی اور اس سے پہلے کہ بہمن جادویہ واپس آئے مسلمانوں نے موقع غنیمت جان کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا۔

الیس کی مہم سر کرنے کے بعد اب خالد بن ولیدؓ امینشیا کی طرف بڑھے لیکن یہاں کے باشندے حضرت خالدؓ کے صرف آنے ہی کی اطلاع پا کر بھاگ نکلے حتی کہ شہر بالکل خالی ہو گیا۔ مسلمانوں کو یہاں سے اس قدر مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اتنا جنگ ذات السلاسل کے بعد بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ غنیمت میں ہر سوار کو پندرہ سو درہم ملے۔ دیگر مجاہدین کو جو رقمیں ملیں وہ اس کے علاوہ تھیں۔

جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ فتح کی خوشخبری کے ساتھ سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں بھجوایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ امینشیا کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ نے حیرہ کا رخ کیا۔ وہاں کے حاکم ارازبہ نے جب دیکھا کہ خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں جنگ کے ذریعے رستگاری نہیں مل سکتی۔ اس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ دریائے فرات پر بند باندھ کر اس کا سارا پانی روک لے اور دریا سے نکلنے والی نہروں میں چھوڑ دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تمام کشتیاں دلدل اور کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ اب یہ صورت حال دیکھ کر ارذبہ کی طرف لپکے اور ناگہانی طور پر مسلمان اس کی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان اپنی کشتیوں کو دلدل میں چھوڑ کر بجلی کی طرح اس فوج تک پہنچ جائیں گے۔ مسلمانوں نے اس پامردی سے ان کا مقابلہ کیا کہ ان کا ایک فرد بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ حیرہ کے عیسائی معززین شہر حضرت خالد بن ولیدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ ان معززین کی وساطت سے ہر قلعے کے لوگوں سے ایک ایک کر کے ملے اور کہا۔ افسوس ہے تم پر اے لوگو! تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ اگر تم عرب ہو تو کیا تمہیں زیب دیتا ہے کہ تم اپنے ہی ہم قوم لوگوں کا مقابلہ کرو۔ آخر کیا وہ شے ہے جس نے تمہیں اس پر ابھارا ہے اور اگر تم عجمی ہو تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے مقابلے میں جیت جاؤ گے؟

اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے فرمایا۔ ہم تمہارے سامنے تین چیزیں رکھتے ہیں۔ اول یہ کہ تم اسلام قبول کر لو۔ دوم یہ کہ مسلمان ہونا منظور نہ ہو تو جزیہ دو۔ سوم یہ کہ اگر تمہیں یہ بھی منظور نہ ہو تو آؤ میدان جنگ میں نکل کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو۔ عیسائیوں نے یک زبان ہو کر کہا ہم صلح کی درخواست پیش کرتے ہیں اور ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ ادا کرنے کا اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اسے بہ طیب خاطر قبول کر لیا اور بڑے بڑے عیسائی سرداروں نے صلح نامہ لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ اس کے بعد عراق کے زمیندار آئے۔ مصالحت کی درخواست پیش کی۔ چنانچہ فلالیج سے ہرمز تک کے علاقے کے لئے بیس لاکھ درہم پر صلح ہو گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ ال کسریٰ کی تمام املاک مسلمانوں کی ملکیت ہو گی۔

خالد بن ولیدؓ نے عراق کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا اور دریائے فرات کے تمام مغربی ساحل کو دشمن کے وجود سے پاک کر دیا۔ حیرہ کو اسلامی مفتوحہ علاقوں کا دارالحکومت بنایا۔ اب یہ لازم تھا کہ مفتوحہ علاقوں کا جو نظام جنگ کے دنوں تباہ برباد ہوا۔ اسے پھر سے قائم کیا جائے۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے اس غرض کے لئے مختلف امراء مقرر کئے۔ خراج وصول کرنا' شہر کا نظم و نسق درست رکھنا اور

سرحدوں کی دیکھ بھال کرنا ان کا فرض منصبی ٹھہرایا۔

مفتوحہ علاقوں کے انتظامات سے فراغت پانے کے بعد حضرت خالدؓ حیرہ سے چل کر نلوجہ پہنچ گئے اور پھر وہاں سے انبار گئے' جو بغداد کے مغرب میں دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اہل انبار کو۔ جب خالد بن ولیدؓ کے آنے کا پتہ چلا تو انہوں نے شہر کے اردگرد خندقیں کھود کر قلعے کے دروازے بند کر لئے اور اپنے آپ کو مضبوط سمجھتے ہوئے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے حکم سے مجاہدین نے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کی لاشوں سے خندق کو پاٹ دیا اور اس سے پل کا کام لیتے ہوئے خندق کے پار ہو گئے۔ اب جونہی مجاہدین آگے بڑھے دشمن کے سپاہی پسپا ہو گئے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ عراق میں ایک سال دو مہینے تک رہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں انہوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے نئے نئے سازو سامان جنگ سے لیس لشکروں سے پندرہ لڑائیاں لڑیں اور باوجود سامان جنگ اور مجاہدین کی قلت ہونے کے سب لڑائیوں میں مظفرو منصور ہوئے۔

مختصراً یہ کہ حضرت خالد بن ولیدؓ تمام دن اور رات رومیوں سے مسلسل جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ رومیوں کے سالار اعظم کے خیمے تک پہنچ گئے اور یرموک فتح کر لیا۔ عمر فاروقؓ کی طرف سے معرکہ یرموک کے اختتام پر دمشق کے محاصرے کے دوران سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیے جانے کا حکم مل گیا اور آپ نے بے چون وچرا تسلیم کر لیا اور بال برابر بھی دل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ وہ پہلے جس جوش و خروش کے ساتھ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے داد شجاعت دیتے رہے' اب بھی اسی طرح سے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک سچے مسلمان سپاہی کی طرح دشمن سے نبرد آزما رہے۔

اصل میں بات اتنی تھی کہ خالد بن ولیدؓ کا طریقہ جنگ کچھ اتنا سخت تھا کہ اسے سیدنا عمر فاروقؓ پسند نہیں کرتے تھے اور ایک دو مرتبہ ان سے کچھ بے احتیاطی بھی ہو گئی۔ اس کے علاوہ ایک شاعر کو آپ نے ایک ہزار دینار عطا کر دیے تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو انہوں نے خیال کیا کہ رقم کہیں مسلمانوں کے مال سے نہ دی گئی ہو جو سب مسلمانوں کی امانت ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ سے وضاحت طلب کی لیکن ان کی جانب سے تاخیر ہوئی تو انہوں نے معزولی کا پروانہ بھیج دیا۔ پھر جب حضرت بلالؓ نے انہی کے عمامہ سے ان کے ہاتھ باندھ دیے تو حضرت خالدؓ نے عمر فاروقؓ سے کہا کہ میں نے وہ رقم صرف اپنی جیب خاص سے دی ہے۔ اس پر ان کا عذر تسلیم کر کے ان کے ہاتھ کھول دیے گئے۔

حضرت خالدؓ کے انتقال کے بارے میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مدینے میں فوت

ہوئے اور اکثر کہتے ہیں کہ آپؓ اپنی معزولی کے بعد حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے مدینے آئے اور پھر ان سے مل کر شام چلے گئے' جہاں حمص میں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی اور 21ھ بمطابق 645ء میں آپ کا وہیں انتقال ہوا۔

طارق بن زیادؒ

(اندازاً 680ء------ 725ء)

طارق بن زیاد شمالی افریقہ کے برابرہ کی نسل سے تھا۔ برابرہ کو مسلمانوں نے 650ء سے 705ء تک بڑی مشکلوں کے ساتھ مطیع کیا۔ انہی لوگوں میں سے ایک شخص زیاد تھا جو ایک مشہور اسلامی جرنیل اور عرب سردار موسیٰ بن نصیر کا خدمت گار تھا۔

زیاد نہایت جنگجو آدمی تھا۔ اس نے موسیٰ بن نصیر کے ہمراہ کوئی پندرہ سولہ جنگوں میں داد شجاعت دی اور کئی مرتبہ نازک موقعوں پر موسیٰ بن نصیر کی جان بچائی۔ جب زیاد ایک لڑائی میں سخت زخمی ہو گیا اور کافی عرصے تک بیمار رہ کر انتقال کر گیا تو اس کا نوجوان بیٹا اور اس کی ماں حلیمہ دونوں موسیٰ بن نصیر کی سرپرستی میں آ گئے اور موسیٰ بن نصیر ہی کے گھر میں رہنے لگے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اندلس کی اندرونی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ حکومت پر کلیسا کا اقتدار اور کلیسا کے اجارہ دار پادری تھے جن کے اشارہ چشم و ابرو کے اندلس کے تمام حکمران پابند چلے آتے تھے۔

اس زمانے میں اندلس کی حکومت گاتھ قوم کے بادشاہ رواوٹیز کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ رواوٹیز جسے اہل عرب غیطشہ کہتے تھے۔ ایک عیش پرست حکمران تھا تاہم اس نے اپنے زمانے میں کلیسا کی اجارہ داروں کی تھوڑی بہت اصلاح کی ان کی بڑھتی ہوئی بد عنوانیوں کو روکا۔ اس لیے پادریوں نے جب اسے اپنے خلاف پایا اور دیکھا کہ وہ ان کے اقتدار کو مٹی میں ملانے پر تلا ہوا ہے تو حکومت کے امراء اور عیسائی عوام کو ساتھ ملا لیا اور اسے بے دین قرار دیتے ہوئے تخت سے اتارنے کی جدوجہد شروع کی۔ اور حکومت ایک ایسے بڈھے تجربہ کار فوجی راڈرک کے ہاتھ میں دے دی جسے شاہی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا مگر وہ پادریوں کے مزاج کے مطابق تھا۔ گاتھ قوم کے حکمرانوں میں حکومت اور امراء کے درمیان تعلقات کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے سیاسی مصلحت کے تحت مدتوں

سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ اندلس کی حکومت کے رئیسوں' امیروں اور جاگیرداروں کے بچے شاہی محل میں بادشاہ وقت کی ملکہ کے زیر نگرانی پرورش و تعلیم پاتے تھے اس کے علاوہ بسا اوقات ان بچوں کی بیاہ شادیاں بھی ان کے ماں باپ کے بجائے خود شاہ کی طرف سے کر دی جاتی تھیں راڈرک جب حکومت کے تخت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے اسی دستور سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ موسیٰ بن نصیر نے اندلس کے اندرونی حالات اور ظالم راڈرک کی عیاشی کے واقعات سننے کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک کو دمشق خط لکھ کر اندلس پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی۔ طریف ابن مالک کی واپسی کے بعد موسیٰ بن نصیر نے 716ء میں طارق بن زیاد کو سات ہزار فوج دے کر کاونٹ جولین کے ہمراہ روانہ کیا۔ یہ فوج کشتیوں اور جہازوں میں سوار ہو کر اندلس پہنچ گئی اور پہاڑی مقام پر ڈیرے ڈال دیے جو بعد میں طارق ہی کے نام پر انگریزی میں جبرالٹر اور عربی میں جبل الطارق مشہور ہو گیا۔

راڈرک اس وقت بلبونہ میں ایک فوج لیے ملک کے اندرونی دشمنوں سے نبرد آزما تھا' اسے جونہی بیرونی دشمنوں (مسلمانوں) کے حملے کرنے کی اطلاع ملی وہ اس مہم کو وہیں چھوڑ کر چل دیا۔ ادھر طارق بن زیاد بھی پیش قدمی کرتا ہوا فارس کے شہر شذونہ تک پہنچ گیا تھا اسے جب معلوم ہوا کہ راڈرک ایک لاکھ کا لشکر لیے اس کے مقابلے پر آ رہا ہے تو اس نے ان جہازوں اور کشتیوں کو آگ لگا دی جن میں سوار ہو کر مجاہدین اسلام یہاں پہنچے تھے۔ پھر جب موسیٰ بن نصیر نے اس کی مدد کے لیے پانچ ہزار فوج اور بھیج دی تو بارہ ہزار فوج کو لے کر راڈرک کی ایک لاکھ سپاہ کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں نکل آیا۔

وادی لکہ یا بکہ میں دریائے گراڈلٹ کے کنارے پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ طارق بن زیاد نے جنگ شروع کرنے سے پہلے مجاہدین اسلام کے سامنے ایک جوش انگیز اور ولولہ خیز تقریر کی اور کہا: "اے مسلمانو! میدان جنگ سے بھاگنے کی اب کوئی صورت نہیں تمہارے آگے دشمن کا وسیع ملک ہے اور پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ خدا کی قسم صرف ثابت قدمی' پامردی اور استقلال ہی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

راڈرک کی فوج مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر بری طرح پسپا ہوئی' یہاں تک کہ راڈرک اپنی جان بچانے کے لیے میدان جنگ سے بھاگ نکلا اور بدحواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ بچے کھچے سپاہی بھاگ کر استجہ پہنچ گئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

اب طارق بن زیاد کی فوج کا زیادہ حصہ تو غرناطہ کی طرف بڑھا۔ دوسرا حصہ قرطبہ پر حملہ آور ہوا۔ تیسرے حصے نے مالقہ کی راہ لی اور چوتھا حصہ خود طارق بن زیاد اپنے ساتھ لے کر اندلس

کے پایہ تخت طلیطلہ کا رخ کیا۔ اہل طلیطلہ نے جب سنا کہ طارق بن زیاد ان پر چڑھائی کے ارادے سے چلا آرہا ہے تو تمام دولت اور نوادرات کو دوسرے مقاموں پر منتقل کر دیا اور خود شہر چھوڑ کر جبل شارات کی پشت پر دوسرے شہر چلے گئے۔ چنانچہ طارق بن زیاد جب یہاں پہنچا تو اس نے شہر کو خالی پایا۔ اس طرح بغیر جنگ وجدل کے طلیطلہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ موسیٰ بن نصیر نے کاؤنٹ جولین کی رہنمائی میں شذونہ کو پار کرتے ہوئے قرمونہ کا رخ کیا۔ یہ شہر اپنی مضبوطی اور استحکام کے لحاظ سے اندلس بھر میں لاجواب تھا اور اس کا فتح کرنا آسان نہ تھا۔ کاؤنٹ جولین کے ساتھیوں نے اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے ترکیب کی کہ اپنے آپ کو شکست خوردہ اسپین ظاہر کر کے اہل قرمونہ سے پناہ کی درخواست کی جائے جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ جب رات ہوئی' تاریکی ہر طرف پھیلنے لگی یہاں تک کہ تمام شہر کے لوگ سو گئے تو انہوں نے رات کے اندھیرے میں شہر کے پھاٹک کھول دیے۔ پھاٹک کھلتے ہی اسلامی فوج اندر آ گئی اور بغیر جنگ وجدل کے قرمونہ پر قبضہ کر لیا۔

اندلس کی حکومت کے پایہ تخت طلیطلہ کے بعد دوسرا اہم صوبہ قرطبہ تھا۔ اس کی مہم میں طارق بن زیاد نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک تجربے کار غلام مغیث رومی کو بھیجا تھا۔ مجاہدین اسلام رات کی تاریکی میں شہر کی طرف بڑھے۔ قدرت خدا جب وہ دریا کو پار کر کے فصیل تک پہنچے تو مینہ آ گیا۔ موسم سرد تھا پھر بارش ہونے لگی۔ شہر پناہ کے محافظ کونوں کھدروں میں جا کر سو گئے۔ مغیث نے بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ گھوم پھر کر شہر پناہ دیکھی مگر اسے کوئی راستہ نہ ملا۔ ابھی وہ کچھ سوچتا ہوا دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اسے اچانک ایک روزن دکھائی دیا اور اس کے پاس ایک اونچا سا درخت تھا۔ چند مسلمان پگڑیوں کی کمند بنا کر درخت کے سہارے اوپر پہنچ گئے اور نیچے اتر کر پہرہ داروں کو قتل کر دیا اور پھاٹک کھول دیے۔ باہر جو لشکر اسلام انتظار میں کھڑا تھا دروازہ کھلتے ہی ریلا کر کے اندر آ گیا اور سیدھا قصر حکومت کی طرف بڑھ گیا۔ صوبے دار مسلمانوں کو محل خالی کر کے شہر کے مغربی حصے میں کنسیہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ یہ کنسیہ نہایت مستحکم اور سنگین تھا گویا جائے خود ایک قلعہ تھا۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ طلیطلہ کی فتح میں مسلمانوں کو اتنا سونا' چاندی اور مختلف قسم کا دوسرا قیمتی سازوسامان ہاتھ آیا کہ شمار سے باہر ہے۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اندلس کے باقی حصوں پر چڑھائی کرنے کے انتظامات مکمل کیے۔ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں سپہ سالار آگے پیچھے روانہ ہوئے اور طلیطلہ سے سرقوسہ تک تمام علاقے فتح کر ڈالے۔

ہر چند ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک کو خلافت مل گئی' تاہم نئے خلیفہ کے دل میں ان امراء کے خلاف کدورت نہ گئی جنہوں نے ولید بن عبدالملک کی ہمنوائی کی تھی

چنانچہ محمد بن قاسم' موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد وغیرہ ایسے مدبر جرنیلوں کو سلیمان بن عبدالملک کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑا۔

موسیٰ بن نصیر پر روپے پیسے کی خرد برد کا الزام لگایا گیا۔ اسے دھوپ میں کھڑا کیا گیا اور کئی لاکھ روپے کا تاوان ادا کرنے کی سزا دی گئی جسے وہ ادا نہ کر سکا اور اسی صدمے میں دنیا سے چل بسا کچھ ایسا ہی معاملہ طارق بن زیاد سے بھی پیش آیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

(685ء-----725ء)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو جو اسلامی مملکت سلیمان بن عبدالملک سے ملی تھی اور جس مسلمان معاشرے کی نگہبانی اور رہنمائی کا کام انہیں سونپا گیا' دونوں اخلاقی' دینی اور معاشرتی و سیاسی بگاڑ کا شکار ہو چکے تھے۔ عمر نے اس بگاڑ کو دور کرنے کی جدو جہد کی اور امت کی اجتماعی زندگی کے ایک ایک شعبے میں انقلابی اصلاحی اقدامات کیے۔ ان کی یہ جدو جہد بار آور ثابت ہوئی' بجز اس کے کہ وہ اموی سلطنت کو خلافت علی منہاج النبوۃ میں نہ بدل سکے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ 685ء میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ حضرت [illegible] بنؓ خطاب کی پوتی اور اس خاتون کی صاحبزادی تھیں جنہیں حضرت عمرؓ نے ان کی دیانت داری اور خوف خدا سے متاثر ہو کر اپنی بہو بنا لیا تھا۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مدینہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک عورت کی آواز سنی جو اپنی بیٹی کو دودھ میں پانی ملانے کا کہہ رہی تھی۔ بیٹی نے جواب دیا: اماں امیر المومنین نے ایسا کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ ماں نے کہا: عمرؓ کون سا دیکھ رہا ہے۔ جواب میں بیٹی نے کہا: عمرؓ نہیں دیکھ رہے تو اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ عمرؓ بن خطاب نے اپنے بیٹے عاصم کی شادی اس دیانتدار لڑکی سے کر دی۔ عمر [illegible] عبدالعزیزؒ کی والدہ ام عاصم اسی خاتون کی نور جگر تھیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے وقت کے حکمران خاندان میں آنکھیں کھولیں' عیش و فراوانی کے گہوارے میں پرورش پائی اور ایسے عالم میں پروان چڑھے جب ملوکیت کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں اور ان کا خاندان قیصر و کسریٰ کے رنگ میں پوری طرح رنگ چکا تھا۔ عیش و نشاط اور اجرانہ زندگی کا دور دورہ تھا اور اس میں خود انہیں اپنے پورے خاندان پر فوقیت حاصل تھی۔ خود کہتے ہیں کہ جامہ زیبی میں میرا کوئی ہم سر نہ تھا۔ نفاست طبع کا یہ حال تھا کہ جس لباس کو ایک مرتبہ نگاہیں چھو

یقیناً اسے دوبارہ زیب تن نہ کرتے۔ مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے تو تیس اونٹوں پر صرف ان کا ذاتی سامان لادا گیا۔ لیکن پھر ایسا واقعہ رونما ہوا کہ ان کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ اس وقت وہ مدینہ کے گورنر تھے۔ ولید بن عبدالملک کے حکم پر انہوں نے عبداللہ بن زبیر کے صاحب زادے حبیب کو اپنے سامنے اس حال میں کوڑے لگوائے کہ ان کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں کا موسم تھا اور صبح کا وقت۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوڑے لگوانے پر ہی بس نہ کیا بلکہ ان کے جسم پر ٹھنڈا یخ پانی انڈیلنے کا حکم دیا اور پھر مسجد کے دروازے پر کھڑا رکھا۔ حبیب ان اذیتوں کی تاب نہ لا سکے۔ ان کی موت کی خبر سن کر عمر کو آخرت کی باز پرس کا خوف دامن گیر ہو گیا۔ جسم لرزنے لگا' لڑکھڑائے اور گر پڑے۔ اپنے کئے پر ندامت اور آخرت میں جوابدہی کا خوف و احساس عمر کے اعصاب و ذہن و قلب پر کچھ اس طرح مسلط ہوا کہ گورنری سے استعفیٰ دیدیا اور حکومت و خاندانی سیاست کے جھمیلوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ تاہم شہزادگی کی خو بو پھر بھی باقی رہی۔ تخت خلافت پر قدم رکھا تو اس دور کی باقیات تمام کی تمام جاتی رہیں اور ان کے شب و روز میں ایسا انقلاب آیا کہ بڑے بڑے راہبوں' عابدوں اور زاہدوں کی داستانیں گرد ہو جائیں۔ پہلے وہ عمر بن عبدالعزیز تھے لیکن اب عدل و انصاف اور طریق حکمرانی میں عمر بن الخطاب' زہد میں حسن بصری اور علم میں امام زہری بن جاتے ہیں۔ بیعت کے بعد شاہی سواریاں پیش کی گئیں تو یہ کہہ کر واپس لوٹا دیں کہ میرے لئے میرا خچر کافی ہے۔ باڈی گارڈز ہٹا دیئے اور خود کو عام مسلمانوں کے بھیس میں رکھا۔ قصر خلافت سے آپ نے عیش و عشرت کے تمام سامان اٹھوا دیئے جاہ و جلال کی علامت قیمتی اشیاء فروخت کر کے مستحقین میں دولت تقسیم کر دی۔

عمر بن عبدالعزیز نے بیت المال کو گویا اپنے اہل و عیال کے لئے حرام قرار دیدیا تھا۔ حتیٰ کہ مشاہرے کا بوجھ بھی بیت المال پر نہ ڈالا۔ ذاتی جائداد کی آمدنی ہی پر' جو وفات کے وقت دو سو دینار سالانہ رہ گئی تھی' تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ایک میلی سی قمیض بدن پر تھی۔ مسلمہ بن عبدالملک اپنی بہن اور ان کی بیوی فاطمہؓ سے کہا: "امیر المؤمنین کی قمیض دھو ڈالو' لوگ عیادت کو آتے ہیں" فاطمہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں: "بھائی اس کے سوا آپ کے پاس کوئی اور قمیض ہی نہیں ہے۔"

ان کا کارنامہ حیات وہ انقلاب ہے جو انہوں نے مملکت کی اجتماعی زندگی میں برپا کیا۔ بنو امیہ نے اسلام کے جمہوری و شورائی طرز حکومت ہی کو نہیں بدلا تھا' بلکہ ایک مرتبہ اس قلعے میں شگاف ڈالا تو وہ سارے مفاسد در آئے جو شخصی اقتدار اور ملوکیت کا خاصا ہوتے ہیں۔ حق و انصاف کی

جگہ قہرمانیت اور استبداد نے لے لی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عنان خلافت سنبھالنے کے بعد مملکت کے پورے قالب کو بدلنے کا عزم کر لیا۔ آپ سلیمان عبدالملک کے بعد خلیفہ بنے تھے۔ انتخاب عام کے بعد آپ نے جو تقریر کی وہ گویا اس پالیسی کا اعلان تھا جو ان کی حکومت اختیار کرنے والی تھی۔ انہوں نے تمام بے راہرویوں اور بے زینیوں کو کالعدم قرار دے کر صاف صاف کہہ دیا کہ "اللہ نے جو چیز حلال یا حرام کر دی وہ قیامت تک کے لئے حلال یا حرام ہی رہے گی۔ میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں بلکہ میرا کام احکام الٰہی کو نافذ کرنا ہے...... میرے اور تمہارے درمیان اگر کوئی فرق و امتیاز ہے تو صرف اتنا کہ اللہ نے مجھ پر (خلافت کی) بھاری ذمہ داری عائد کی ہے...... اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں" آپ نے وہ تمام اموال و املاک واپس کر دیں جو پیش رو خلفا' ان کے گورنروں' اعلیٰ فوجی افسروں اور ان کے بالیوں موالیوں نے جبراً غصب کر لی تھیں۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے املاک کے تمام وثائق پرزے پرزے کر دیئے۔ صبح کے وقت شروع ہونے والا یہ سلسلہ ظہر کی اذان تک جاری رہا۔ پھر گورنروں کو احکام جاری کئے کہ امیر معاویہؓ کے عہد سے لے کر اب تک جو اموال و جائیدادیں غصب کی گئی ہیں ان کے اصل مالک اگر زندہ ہیں تو انہیں لوٹا دی جائیں ورنہ ان کے ورثاء کے حوالے کر دی جائیں۔ عراق میں اس کثرت سے مال واپس کیا گیا کہ صوبائی حکومت کا خزانہ خالی ہو گیا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کو وہاں کے اخراجات کے لئے روپیہ دمشق سے بھیجنا پڑا۔ املاک کی واپسی کا یہ سلسلہ آپ کی وفات تک جاری رہا۔ عمر نے دوسرا اہم قدم یہ اٹھایا کہ سابق خلفاء کے مقرر کردہ ان تمام ظالم و جابر گورنروں کو برطرف کر دیا جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے آلودہ تھے اور جو بد عنوان تھے۔ تیسری ضرب عمر نے بنو امیہ کے شاہی امتیازات اور قانونی بالادستی اور زعم برتری پر لگائی۔ عمال اور قضاۃ کے نام فرمان جاری کیا کہ دربار عام میں کسی شخص کو ترجیح نہ دی جائے' چاہے اس کا تعلق خاندان خلافت سے ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ نے دیگر امور و معاملات پر توجہ دی۔ ناجائز آمدنیاں بند کر دیں' غیر مسلموں سے جزیہ لینے کی ممانعت کی۔ آپ کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا' خراج وصول کرنے والا نہیں۔ آپ نے تمام ٹیکس بھی منسوخ کر دیئے اور گورنروں کو ہدایت کی کہ بیت المال میں صرف جائز آمدنی داخل کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناجائز مصارف کو روکا۔ امت کی دینی و اخلاقی زندگی کی اصلاح و تربیت اور اسے اجتماعی زندگی کی روح رواں بنانے کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کو ملکیت کا فریضہ اور نصب العین قرار دیا' نماز باجماعت کو ملازمت اور ترقی کی لازمی بنیادی شرط گردانا' ایک ایک فکری اور عملی گمراہی کے انسداد کی

کوشش کی' دینی علوم کی تدوین اور احادیث کی جمع اور تدوین کے اہتمام پر خصوصی توجہ دی۔ آپ کے پند و نصائح عمیق نظری اور دینی سوجھ بوجھ کے آئینہ دار ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ: "ہر شخص کے لئے رزق کی ایک خاص مقدار مقرر ہو چکی ہے جس کا جتنا مقسوم ہے وہ ضرور اسے مل کر رہے گا...... قناعت خود ایک بڑی دولت ہے جسے میسر ہو اسے کسی اور شئے کی ضرورت نہیں رہتی" ایک اور موقع پر نصیحت کی "دنیا میں خوشی کی مقدار بہت تھوڑی ہے اور مومن کی جائے بازگشت صبر ہے اور اگر اللہ نے کسی شخص کو کوئی نعمت عطا فرمائی اور پھر اسے واپس لے لیا مگر اس کے معاوضہ میں اسے صبر دیدیا تو یہ صبر اس شئے سے بہتر اس کا معاوضہ ہے" آپ نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ کسی ایسے گرجا' یا یہودیوں کی خانقاہ کو منہدم نہ کرنا جس کے قائم رکھے جانے کا عہد نامہ صلح میں وعدہ کیا گیا"

آپ کے ساتھ بنو امیہ کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ تند و تلخ باتوں میں بلند آہنگی آتی گئی اور خاندانی دباؤ بڑھتا گیا۔ مگر عمر کسی بات کو خاطر میں نہ لاتے۔ دباؤ بہت زیادہ بڑھنے لگا تو صاف صاف کہہ دیا کہ تم لوگ میرے کام میں مداخلت نہ کرو ورنہ میں یہ امانت کسی اور اہل شخص کے حوالے کر کے مدینہ چلا جاؤں گا۔ بنو امیہ نے محسوس کیا کہ اگر عمر کو زندگی کی مہلت دیدی گئی تو وہ خلافت کو ان کے خاندان سے نکال کر عام مسلمانوں کے حوالے کر دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہیں زہر دیدیا گیا۔ عمر بیس دن بیمار رہے اور پھر بنو امیہ کے دل سے وہ کانٹا نکل گیا جس نے ان کی عیش و عشرت میں زہر گھول دیا تھا۔

آپ نے 40 برس کی عمر میں 725ء میں دار فانی سے کوچ کیا۔ آپ کو صرف دو سال اور پانچ ماہ حکومت کرنے کی مہلت ملی۔ یہ مدت کسی قوم کی زندگی میں تغیر لانے کے لئے بہت تھوڑی ہے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے کو حکم دیا تھا کہ میرے لئے قبر کی زمین بھی خریدی جائے۔ چنانچہ ایک راہب سے زمین خریدی گئی۔ آپ نے اموی خلافت' جو کہ مطلق العنان بادشاہت اور ملوکیت کا روپ دھار رہی تھی' کو خلفائے راشدین کے راستے پر چلایا اور مورخین سے پانچویں خلیفہ راشد کا خطاب حاصل کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی

(1156ء------1213ء)

سلطان صلاح الدین کے نسب سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن کثیر کا خیال ہے کہ وہ کرد نسل سے تھا۔ تاہم سلطان کا باپ نجم الدین آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ وہ جوانی میں بغداد سے چلا آیا' جہاں اپنی ذہنی صلاحیت اور جسمانی قابلیت سے اسے قلعہ تکریت ... کا منصب مل گیا۔ لیکن اسے قلعہ داری چھوڑنی پڑی اور وہ مصیبت اور پریشانی کے عالم میں اپنے چھوٹے بھائی اسد الدین شیر کوہ کو ساتھ لے کر موصل کے حاکم اتابک شہید زنگی کے پاس چلا گیا۔

اتابک کے معنی اتالیق کے ہیں۔ اصل میں حکومت ان غلاموں کی تھی جنہیں سلجوقیوں نے اپنی وسیع وعریض سلطنت کے دور دراز علاقوں میں فوج کے مختلف مناصب پر مقرر کرنے کے لیے خریدا تھا۔ جب سلاطین سلاجقہ کمزور ہو گئے اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں اور یہی غلام جنہیں اتابک کہا جاتا ہے' شہزادگان سلاجقہ کے سیاسی اتالیق بن گئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کے مالک بن گئے۔

سلطان صلاح الدین تکریت نامی ایک شہر میں' جو بغداد اور موصل کے درمیان دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد ہے' 1156ء میں پیدا ہوا جس زمانے میں اس کے باپ نجم الدین کو قلعہ داری سونپی گئی اس کی عمر گیارہ سال کی تھی۔

یہ زمانہ مصر میں فاطمیوں کی خلافت اور بغداد میں عباسیوں کی خلافت کا تھا۔ 1182ء میں مصر کے وزیر شاور اور مصر کے سابق وزیر ضرغام کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی جس میں شاور نے شکست کھائی اور وہ بجائے مصر کے پھر دمشق کے حاکم عماد الدین کے بیٹے نور الدین زنگی کے پاس چلا گیا۔ نور الدین زنگی نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور اس کی مدد کے لیے اسد الدین شیر کوہ کو فوج دے کر مصر کی طرف روانہ کر دیا۔ اس لڑائی کے بعد اسد الدین شیر کوہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کے ہمراہ

1183ء میں دمشق واپس آگیا اور شادر نہایت شان و شوکت سے مصر میں وزارت کا کام پھر سے کرنے لگا۔ شادر نے سلطان نور الدین زنگی سے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی میں کامیاب ہونے پر فوج کشی کا خرچ اور مصر کی آمدنی کا تیسرا حصہ اسد الدین شیر کوہ کو پیش کرے گا لیکن اب وہ اپنے وعدے کو بھول گیا اور فرانس کو اپنا دوست بنالیا۔ جب سلطان کو شادر کی بد عہدی اور فرانس کے عیسائیوں سے دوستی کا پتہ چلا تو اس نے اسد الدین شیر کوہ اور اس کے ساتھ اس کے بہادر بھتیجے صلاح الدین کو فوجیں دے کر مصر کی طرف روانہ کر دیا اور خود فرانس کی طرف چل پڑا۔ اسد الدین شیر کوہ اور صلاح الدین نے مصر اور فرانس کی فوجوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتی کہ سب کو مار بھگایا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اسد الدین نے سکندریہ کا رخ کیا اور اسے فتح کر کے صلاح الدین کو وہیں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گیا اور شہر صعید میں جا کر ٹھہر گیا۔

دو مہینے بعد شادر نے اسکندریہ کے عیسائیوں سے مل ملا کر اور شیر کوہ کے خلاف سازش کر کے سکندریہ پر چڑھائی کر دی۔ شیر کوہ کو جب اس کاروائی کا پتہ چلا وہ صعید سے اس کے مقابلے کو آگیا۔ آخر کار فیصلہ اس پر ہوا کہ سکندریہ کو پچاس ہزار دینار پر واپس کر دیا جائے۔ پھر شیر کوہ اور صلاح الدین سکندریہ چھوڑ کر دمشق واپس چلے گئے۔ جب فاطمی خلیفہ عاضد الدین اللہ نے مصر کے اندرونی حالات کا یہ نقشہ دیکھا اور مصر کی بیرونی حالت یہ تھی کہ شہر سے باہر عیسائیوں کی فوجیں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں تو اس نے سلطان نور الدین کے نام ایک خط لکھا کہ عیسائیوں نے مصر کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور چاہتے ہیں کہ مصر پر قبضہ ہو جائے۔ ایسے نازک موقع پر جبکہ خلافت سخت خطرے میں ہے میں آپ سے دینی حمیت پر مدد چاہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مصیبت مصر سے ٹل گئی تو سلطنت کا تیسرا حصہ مدد کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شیر کوہ کو مصری افواج کا افسر اعلیٰ مقرر کیا جائے گا۔

عیسائیوں نے جب اپنے مخبروں کی زبانی سنا کہ شیر کوہ اور اس کا بھتیجا صلاح الدین لشکر لیے مصر کی طرف آ رہے ہیں تو وہ مصر چھوڑ کر بھاگ نکلے اور صلاح الدین ساٹھ ہزار کا لشکر لیے فاتحانہ شان سے مصر میں داخل ہو گئے۔ مگر شیر کوہ کو وزارت پر فائز ہونے کے بعد کچھ دن تک جینے کا موقع نصیب ہو سکا۔ وہ 1188ء میں دنیا سے چلا گیا' مگر جاتے ہوئے اپنی غیر معمولی شجاعت اور تدبر کی دھاک ضرور دلوں پر بٹھاتا گیا۔ فاطمی خلیفہ عاضد نے تمام دعویداروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مصر کی خلافت کا قلمدان صرف صلاح الدین ہی کے سپرد کر دیا اور ملک الناصر کا خطاب دیا۔

اس زمانے میں جب صلاح الدین کو مصر کی خلافت ملی ان کی عمر بتیس برس تھی۔ صلاح

الدین نے وزارت کی مسند پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے چچا شیر کوہ نے جس قدر دولت جمع کی ہوئی تھی سب کی سب شام کے لشکر میں تقسیم کر دی اور مصر کے خزانے سے بھی مصر کی فوج کی تالیف قلوب کے لیے مال و دولت اور جاگیریں عطا کیں۔ اس کے علاوہ فوجی افسروں کے عہدوں میں بھی ترقیاں کیں۔

صلاح الدین کی وزارت میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا گیا وہ یہ تھا کہ رعیت کی جان و مال کی حفاظت اور ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا گیا۔ ان پر عدالت کے دروازے ہمہ وقت کھول دیے ان کاموں سے عوام کے دلوں میں صلاح الدین کی محبت نے گھر کر لیا۔

مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی کے سبب جو علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے' جب ان کے واپس لینے کی آرزوئیں صلاح الدین کے دل میں چٹکیاں لینے لگیں تو 1190ء میں صلاح الدین ایک فوجی منتظم اور سپہ سالار کی حیثیت سے بڑھا اور ایک ایک کر کے وہ تمام علاقے لیتا چلا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ صلاح الدین نے سب سے پہلے عسقلان کا رخ کیا۔ کچھ ہی فاصلے پر شاہ فرانس اور مختلف عیسائی گروہوں کے لشکروں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ شاہ فرانس اور عیسائی لشکر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا اور صلاح الدین فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا ہوا عسقلان کی مہم کو یہیں چھوڑ کر ایلہ پر حملہ کی تیاری کرنے کے لیے مصر واپس چلا گیا۔ ایلہ 1190ء میں صلاح الدین کے قبضے میں آ گیا۔ ایلہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد صلاح الدین نے دو برس مصر کے اندرونی نظم و نسق کا جائزہ لینے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے میں صرف کیے۔ بحری اور بری فوجوں کو درست کیا اور ایک حد تک مالیات کے صیغے کی بھی اصلاح کی۔ اس کے بعد 1192ء میں شام کی جانب شہر کرک پر چڑھائی کی۔ مگر بعض ملکی معاملات کی پیچیدگیوں کے سبب اسے محاصرہ اٹھانا اور مصر واپس آنا پڑا۔

صلاح الدین 1194ء میں دمشق جا پہنچا۔ ایسے موقعے پر جبکہ مسلمانوں میں تخت نشینی کے مسئلہ پر سخت نزاع برپا ہو رہا تھا' صلاح الدین کی آمد مسلمانوں کے لیے عید سے کم نہ تھی۔ عیسائیوں کے ساتھ سلطان کے مجاہدات کا آغاز 1198ء میں ہوا جب عیسائیوں نے ایک لشکر جرار لے کر دمشق کا رخ کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے انہیں روکنے کے لیے اپنے بہادر بھتیجے فرخ شاہ کو ایک لشکر دے کر بھیج دیا اور پھر خود بھی لشکر لے کر عیسائیوں کے حملے کا جواب دینے کے لیے کسی دوسرے راستے سے چل دیا۔ تاہم' عیسائی سلطان کے پرجوش حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا 1203ء میں سلطان نے بیسان پر چڑھائی کی۔ یہاں کے عیسائی شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے اور وہیں سے تیر پھینکنے لگے۔ چار پانچ دن اسی حالت میں گزر گئے۔

بالاخر مسلمانوں نے بیسان پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد سلطان جالوت نام کے ایک شہر کی سرحد میں داخل ہوا۔ جس روز سلطان اپنے لشکر کو لے کر پہنچا تھا اس کے آنے کا عیسائیوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ تمام دن خیموں میں پڑے رہے اور خوف کے مارے باہر نہ نکل سکے' اور دوسرے دن لڑائی سے طرح دے کر اپنے اپنے مقامات کی طرف نکل بھاگے۔ 1206ء تک سلطان نے عیسائیوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی عداوت اور مخالفت کو روکنے کے لیے متعدد شہروں کو فتح کیا۔ 1207ء میں سلطان ایک بہت بڑے معرکے کے لیے تیار ہوا۔ اپنے بیٹے ملک الافضل کو سپہ سالار مقرر کیا۔ فوج کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے کر اسلامی لشکر کو عکا کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور خود بصرے کی طرف چل پڑا۔ پرنس آرنلڈ والئی ارناط نہایت بد عہد تھا۔ وہ اکثر حاجیوں کے قافلے لوٹ لیتا۔ اس راستے سے چونکہ مسلمانوں کا ایک قافلہ نکلنے والا تھا اس لیے سلطان کے بروقت پہنچ جانے سے پرنس آرنلڈ کے ہوش و حواس درست ہو گئے اور قافلہ صحیح و سلامت وہاں سے گزر گیا۔

اب سلطان صلاح الدین جو دمشق اور مصر سے بیت المقدس تک کے تمام راستوں اور اس کے شہروں پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھا ہے تو بیت المقدس کے غربی جانب جا پہنچا۔ اس وقت عیسائیوں کا بیت القدس پر نہایت مضبوط اور مستحکم قبضہ تھا اور شہر میں ایک لاکھ عیسائی موجود تھے۔ سلطان نے پانچ روز تک خود چل کر فصیل کا معائنہ کیا۔ مگر فصیل کو ہر جگہ سے مضبوط اور مستحکم پایا۔ آخر کار شمالی جانب ایک مقام پر تجویز کیا گیا جس کے بالکل سامنے کلیسائے صیحون واقع تھا' اور نہایت چپکے چپکے رات کی تاریکی میں مورچے قائم اور منجنیق نصب کر لیے۔ صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے منجنیق سے پتھر پھینکنے شروع کر دیے تین دن اسی طرح گذر گئے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کا خوب مقابلہ کیا۔ لیکن بالاخر انہیں مسلمانوں سے صلح کرتے ہی بنی۔ چنانچہ انہوں نے صلح کی درخواست دے کر اپنے ایک سفیر کو سلطان کی بارگاہ میں روانہ کیا' جہاں اس نے حاضر ہو کر سلطان کی خدمت میں صلح کی درخواست پیش کی۔ اس موقع پر سلطان نے عفوو درگذر کرنے کو انتقام لینے پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ فی مرد دس دینار' فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دو دینار فدیے کے طور پر لے کر بیت المقدس کے تمام عیسائیوں کو رہائی دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہونا چاہے وہ اسلام قبول کر کے ہمارا بھائی بن سکتا ہے۔ اس کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں۔ اس کے بعد سلطان دمشق واپس آ گیا۔ اور دمشق اسے کچھ ایسا پسند آیا کہ پھر کبھی مصر جانے کا خیال بھی نہ کیا۔ 1213ء میں ستاون برس کی عمر میں سلطان اللہ کو پیارا ہو گیا۔

رضیہ سلطانہ

(1235ء-----1261ء)

ایشیائی تاریخ کے مرقع میں رضیہ سلطانہ وہ دلچسپ اور خوشنما تصویر ہے۔ جس کو ملکہ ہند کی اولیت کا تمغہ مل چکا ہے۔ یہ نوجوان حسین ملکہ بلاشرکت غیرے محض اپنی خداداد قابلیت حسن تدبیر اور زور بازو سے تخت ہند پر نہایت جاہ و جلال سے جلوہ گر ہوئی۔ اس سلطانہ کے سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اناث میں بھی بعض بیگمات دلیری' عزم ثبات' جہانبانی' رائے' تدبیر میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہوئیں۔

رضیہ سلطانہ 1258ء میں تخت ہند پر بمقام دہلی اپنے بھائی کی جگہ متمکن ہوئی باپ کا نام سلطان شمس الدین التمش تھا۔ یہ علاوہ حسن وجمال ظاہری کے اکثر علوم میں دستگاہ رکھتی تھی' اپنے مذہب کی بےحد پابند تھی۔

شاعری سے بھی ذوق تھا۔ شعر بھی کہتی۔ تخت سلطنت پر مردانہ لباس مین بے نقاب بیٹھتی۔ خود مقدمات فیصل کرتی۔ تمام فرامین اس کے قلم سے جاری ہوتے۔ سلطنت کی جزو کل کی نگرانی کرتی۔ میدان جنگ میں اپنی فوج کی سپہ سالار بنتی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے قسمت کی اچھی نہ تھی۔ اس سے ایک غلطی ہوگئی جس کے طفیل میں اس کو سلطنت کے ساتھ اپنی جان عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

جب یہ تخت سلطنت پر بیٹھی ہے تو نظام سلطنت میں سخت ابتری تھی۔ ارکان سلطنت خود سر تھے' قواعد و ضوابط کا دیباچہ الٹ چکا تھا۔ مگر اس نے اپنی خداداد قابلیت اور حسن تدبیر سے تمام خرابیوں کی بیخ کنی کر کے فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کردیا۔

سلطان شمس الدین التمش نے جب گوالیار کو فتح کر کے دہلی کی طرف مراجعت فرمائی تھی' تو رضیہ کو اپنا ولی عہد کیا تھا۔ امراء دربار نے عرض کیا کہ شاہزادوں کے ہوتے لڑکی کے ولی عہد کرنے

میں کیا حکمت ہے۔ تو سلطان نے جواب دیا کہ میرے فرزند لہو ولعب اور لغویات میں مبتلا ہیں وہ سلطنت کی قابلیت نہیں رکھتے۔ رضیہ اگرچہ عورت ہے لیکن حقیقت میں مرد ہے۔

یہ اپنے باپ کے وقت میں مہمات ملکی کو انجام دیتی تھی۔ بادشاہ اس کی صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا تو 1258ء میں بعض اراکین سلطنت کے اغوا سے فیروز شاہ تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ اور تخت پر بیٹھتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس کو بھانڈوں اور مسخروں سے فرصت نہیں تھی سلطنت کے کام کو کون سنبھالتا' تمام خزانہ بیہودہ لوگوں میں صرف کر دیا اور سلطنت کے کاروبار کو اپنی ماں کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ وہ بیحد سنگدل اور ظالم تھی۔ اس نے قابو پاتے ہی سلطان شمس الدین کی تمام بیواؤں کو نہایت عذاب سے قتل کیا۔ حتیٰ کہ سلطان کے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو بھی مار ڈالا۔

آخر کار ان بے گناہوں کا خون رنگ لایا اور چھوٹے بڑے سب فیروز شاہ سے ناراض ہو گئے۔ شاہزادہ غیاث الدین نے بغاوت کر کے خزانہ شاہی کو لوٹ لیا۔ اور نامی نامی سرداروں سے سازش کر کے دہلی کا قصد کیا۔ فیروز شاہ نے بھی فوج لے کر چڑھائی کی۔ سردار چونکہ فیروز شاہ سے بددل تھے' سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن رضیہ کب چوکنے والی تھی امراء کو متفق کر کے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ 1258ء کو فریقین میں ایک سخت معرکہ ہوا۔ فیروز شاہ گرفتار ہو کر جیل خانہ میں گیا اور چند دن کے بعد فوت ہو گیا۔

جن سرداروں نے اس کو تخت سلطنت پر بٹھایا تھا اب وہ دوسرے شاہزادہ کی تخت نشینی کے درپے ہوئے۔ ایسی حالت میں ایک کمسن عورت کا تخت ہند پر بیٹھ کر سلطنت کو سنبھال لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بہادر ملکہ نے اپنی حکمت عملیوں سے سب کو زیر کر کے رعب وداب کا سکہ سب کے دلوں پر جما دیا۔

1261ء میں ملک اعزالدین حاکم لاہور نے بغاوت کی' جس کی سرکوبی کے لیے خود ملکہ نے فوج کشی کی اور اس فوج کی خود سپہ سالار بنی۔ اس کا ارادہ تھا کہ باغی کو مقہور کر کے سلطنت کا دورہ بھی کر لوں گی اور جو خرابیاں کہ سلطنت میں باقی رہ گئی ہیں ان کا تدارک بھی قرار واقعی ہو جائے گا۔ جب ملکہ حدود لاہور میں پہنچی۔ حاکم لاہور بجز اطاعت کے چارہ کار نہ دیکھ کر حاضر ہو گیا۔ اس کی خطا بخشی کی اور ملتان کا صوبہ بھی اس کی گورنری میں شامل کر دیا۔ ہنوز کامل طور سے ملک کو اس خدشہ سے نجات نہیں ملی تھی کہ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے یاقوت حبشی (جس کو اس کی حسن خدمات کے صلے میں امیر الامراء کا خطاب ملکہ نے دیا تھا) کی زیادتیوں سے تنگ آ کر بغاوت کر دی۔ ملکہ نے اس کی سرکوبی کے

واسطے بھی خود سپہ سالار ہو کر بے شمار فوج کے ساتھ چڑھائی کی۔ سرداران فوج نے' جو کہ یاقوت حبشی کے امیر الامراء کے عہدہ سے ناراض تھے' موقع پا کر یاقوت حبشی کو قتل کر کے ملکہ کو قلعہ بھٹنڈہ میں نظر بند کر دیا اور دہلی جا کر معزالدین بہرام شاہ کو تخت نشین کیا۔

رضیہ سلطانہ قید کی حالت میں بھی نچلی نہ بیٹھی۔ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ سے عقد کر کے دہلی کے تخت کے واسطے پھر قسمت آزمائی کی۔ مگر تقدیر پلٹ چکی تھی کچھ پیش نہ گئی۔ دوبارہ پھر مقابلہ کو نہایت زور شور سے اٹھی' چند امرائے دربار کو گانٹھ لیا اور جاٹوں کا لشکر لے کر مقابلہ کیا۔ بہرام شاہ کی طرف سے اعزالدین بلبینی جو سلطان شمس الدین التمش کا داماد اور جس کا خطاب الف خان تھا' مقابل ہوا۔ نواح کیتھل میں ایک سخت خونریز لڑائی کے بعد ملکہ کو شکست ہوئی۔ اگرچہ ملکہ مع اپنے شوہر کے فوج کے ہمراہ تھی' اور جان توڑ کر مقابلہ بھی کیا' مگر کچھ بس نہ چلا۔ شکست فاش کھائی اور بھاگتے وقت گرفتار ہو کر مع اپنے شوہر کے قتل کر دی گئی۔

مدت سلطنت 3 سال 6 ماہ اور 6 روز ہے۔ وہ نئی دہلی کے محلہ بلبلی خانے میں منشی شیر علی خان اور جناب مولوی رشید الدین خان کے مکانات کے ایک سنگین احاطہ میں دفن ہے۔ اس احاطہ میں دو قبریں ہیں' ایک رضیہ سلطانہ کی اور دوسری حبشہ بیگم کی۔ عوام الناس اس کو رجی سجی کی درگاہ بھی کہتے ہیں۔ مکان بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور قبروں کے تعویذ بھی دستبرد زمانہ سے ثابت نہیں۔

امیر تیمور

(1336ء —— 1405ء)

اب سے کوئی 600 سال پہلے ایک شخص پیدا ہوا جس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھانا تھا۔ اور بعد کی تاریخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ اس نے جس طرف رخ کیا فتح و ظفر نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے۔ اس کا نام تیمور تھا۔ تیمور کے معنی "فولاد" کے ہیں۔ جب تک وہ سیستان کی لڑائی کے دوران پاؤں میں تیر لگنے کی وجہ سے لنگڑا نہیں ہوا تھا اس وقت تک تیمور ہی کہلاتا تھا مگر بعد ازاں جو اس کی تحقیر کرنا چاہتے تھے وہ اسے تیمور لنگ یا تمر لنگ کہنے لگے۔ مغربی اہل قلم اور مورخین نے اسے ٹمرلین یا ٹمرلین لکھا۔

دریائے آمو کے پار شمال کی طرف توران واقع ہے۔ شمال کی طرف واقع سرزمین کو ماورا نہر یعنی دریا پار کا علاقہ کہتے ہیں۔ سمرقند جانے والے مسافر باب الحدید سے گذرتے تھے۔ یہ درہ پار کر کے پہلی سرائے شہر سبز میں تھی۔ 8 اپریل 1336ء میں اسی شہر سبز میں تیمور پیدا ہوا اور اسے اس سے بے حد انس تھا۔ اس کا گھر لکڑی اور کچی اینٹوں کا تھا۔ یہاں کھلے عباؤں میں ملبوس لوگ برابر آتے رہتے تھے۔ وہ اپنے غالیچے بچھا کر ان پر دراز ہو جاتے اور قافلوں کی آمدورفت اور دیگر اہم واقعات کے ذکر اذکار کرتے۔ جنگ کا ذکر تو ہمیشہ ہی کرتے کیونکہ جدال و قتال کا سایہ اس شہر پر ہر وقت پڑتا رہتا تھا۔ تیمور اپنے بچپن میں یہ فقرہ اکثر سنتا: "مرد کے سامنے ایک ہی راستہ ہوا کرتا ہے۔" اسے اس عمر میں اور باتوں کی تو زیادہ سمجھ نہیں آتی تھی' البتہ بزرگوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے لیے قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ مگر نوجوان بڑوں کے الفاظ سے زیادہ ان کے ہتھیاروں کی طرف توجہ دیتے تھے۔ تیمور اور اس کے ہمجولی گھوڑوں کے ساتھ پل کر جوان ہوئے۔ سمرقند کی سڑک کے کنارے جہاں کہیں بھی کھلی جگہ نظر آجاتی' شہسواری کے مقابلے کرنے لگتے۔ تیمور ہمیشہ سردار بنتا اور یہ کھیل ہنسی مذاق کی بجائے نہایت سنجیدگی سے کھیلتا۔ جب یہ لڑکے' تنی عمر کو پہنچ گئے

کہ انہیں شکار کے لئے سچ مچ کی تلواریں دی گئیں تو تیمور ان تلواروں کے استعمال کے معاملہ میں بھی سب کا استاد بن گیا۔ اس کی سنجیدگی کا باعث شاید اس کی تقریباً تنہا زندگی ہو۔ ماں کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ باپ جو قبیلہ برلاس کا سردار تھا اپنا وقت ان سبز پوش بزرگوں کی محبت میں گذارتا جو بیت اللہ کا حج یا مقدس مقامات کی زیارت کر کے واپس آتے تھے۔ زندگی میں تنہا ہونے کے باوجود تیمور کبھی تنہا ہوتا نہ بیکار رہتا۔ اس کے گھوڑے' باز اور کتے اس کے ہمجولی تھے۔ یہ سب کچھ تو تھا مگر امارت نہ تھی۔ گھر میں صرف دو نوکر تھے اور گھوڑے اتنے بھی نہ تھے کہ ان سے آدھا اصطبل ہی بھر جاتا۔ اس کا باپ اپنے قبیلے کے سرداروں میں شمار ہوتا تھا مگر صاحب حکومت نہ تھا۔ اس کم مائیگی کے باوجود تیمور نے اپنی ہیبت خیز فتوحات سے دنیا میں تہلکہ مچا کر ثابت کر دیا کہ وہ تاریخ عالم کے عظیم ترین فاتحین میں سے ایک ہے۔ سکندر ایک بادشاہ کا بیٹا تھا جسے باپ سے فوج ورثے میں ملی۔ چنگیز خان ایک قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا جس کے ساتھ منگولوں کے ٹڈی دل کے قبائل تھے۔ قدرت نے تیمور کو اس قسم کے اسباب کامرانی سے محروم رکھا مگر اس نے اپنی ہمت اور ذہانت سے ایک ایسی قوم پیدا کر لی جس کا مرکز اس کی ذات تھی اور یہ انبوہ کثیر اس کی قیادت میں آندھی کی طرح سارے ایشیا پر چھا گیا۔

تیمور کا قبیلہ "برلاس" مختلف ناموں سے مشہور تھا۔ کوئی اس کے افراد کو دیوہتا تا' کوئی قوی ہیکل جنگجو کہتا۔ مگر بالعموم لوگ انہیں تاتاری کہتے تھے۔ یہ شمالی ایشیاء کے باشندے تھے جو پہلے استھیز اور کبھی کبھی ترک بھی کہلا چکے تھے۔ منگول سیلاب کی رو میں بہتے ہوئے شمال سے اس زرخیز پہاڑی علاقے میں وارد ہو کر یہیں بس گئے تھے۔ لہذا برلاس جوانوں کے قد اونچے' جثے مضبوط اور چوڑے' چہرے تمازت آفتاب سے جھلسے ہوئے اور چہروں پر داڑھیاں تھیں۔ ان کی قبائلی زندگی کا آغاز خیموں کے رہن سہن سے ہوا تھا اور اب یہ طرز زندگی ان کے خون میں رچ چکا تھا۔ ان کے ہاں مثل مشہور تھی کہ صرف بزدل چھپ کر رہنے کے لیے قلعے اور مینار بناتا ہے۔ کوئی سردار نہ ہونے کی وجہ سے قبیلہ برلاس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ تیمور کا باپ طراغائی ایک زمانے میں اس کا سردار ہوا کرتا تھا۔ مگر اسلام کا صوفیانہ رنگ اس پر چڑھ گیا اور وہ گوشہ گیر ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس نے تیمور سے کہا: "یہ دنیا اس سنہری پیالے کی مانند ہے جس میں سانپ اور بچھو بھرے پڑے ہوں۔ میں اس سے بیزار ہو چکا ہوں۔" مگر اس نے بیٹے کو اپنے آباؤ اجداد کی عظمت سے بے خبر نہ رہنے دیا۔ طراغائی نے تیمور کو اپنی دنیا خود بنانے کی آزادی دے دی تھی۔ ایک بزرگ نے تیمور کو قرآن پڑھتے دیکھ کر اسلام کا تحفظ کرتے رہنے کی ہدایت کی تھی۔ تیمور پر بزرگ کی بات کا اتنا اثر ہوا کہ [illegible] عرصہ تک

چوگان اور شطرنج سے بھی تائب رہا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے پہلا پارہ حفظ کر لیا۔ ان دنوں جو شخص قبیلہ برلاس کا سردار مانا جاتا تھا وہ تیمور کا حقیقی چچا حاجی برلاس تھا۔ اسے تیمور میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور یوں بھی وہ رعونت پسند' شکی مزاج اور مردہ دل آدمی تھا۔ چنانچہ قبیلے کے اکثر امرا اور جنگجو بہادر امیر قزغن کے دربار میں چلے گئے۔ ان دنوں تیمور ایک ایسا شریف زادہ تھا جو کوئی کام دھندا نہ کرتا۔ وہ کشادہ سینے' مضبوط اعضاء اور صحت مند بدن کا قوی ہیکل نوجوان تھا۔ اس کا سر بڑا تھا اور یہ سر اسے اونچا رکھنا بھی آتا تھا۔ پیشانی کشادہ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں۔ وہ کم کم ہی بات کرتا۔ بے مصرف باتوں اور ہنسی مذاق سے اسے چڑ تھی۔ تمام عمر کبھی کسی لطیفے کی داد نہ دی۔ تاتاری بڑے زبردست جہاں گرد تھے۔ تیمور سمرقند سے خراسان تک جہاں چاہتا جاتا اور جس جگہ چاہتا قیام کرتا۔ ہر جگہ اس کی مدارات ہوتی۔ پہاڑوں کی دشوار گزار پگڈنڈیاں' میلوں لمبے رہگزار اور سرسبز و شاداب وادیاں سب اس کی جولانگاہ تھیں۔ اس کا سامان بہت مختصر ہوتا' صرف ایک تلوار اور ایک ہلکی شکاری کمان۔ کارروانوں کے عرب سردار برلاس قبیلے کے سردار کے بیٹے سے بات کرنا باعث عزت سمجھتے تھے۔ انہیں سرداروں میں سے ایک نے ایک مرتبہ تیمور سے کہا: "سالی سرائے کے بادشاہ گر نے قزغن آپ کو یاد فرمایا ہے۔" تیمور نے بہترین گھوڑوں کا ایک دستہ ایک خانہ زاد لڑکا عبداللہ ساتھ لیا اور جنوب کی طرف دریائے آمو کا رخ کیا۔ اتنا اہم سفر اتنی بے سرو سامانی کے ساتھ کسی شہزادے نے شاید ہی کیا ہوگا۔ سالی سرائے میں اس کے جوہر پرکھنے والے لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اسے دربار کے حلقوں میں اس لیے بھی اہمیت دی گئی کہ وہ طراغائی سردار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس وقت سالی سرائے میں کم از کم دو ہزار تاتاری سردار' سپہ گر اور جوانان قوم ایک جنگل میں خیمہ زن تھے مگر کسے پڑی تھی کہ تیمور کو کچھ سکھاتا۔ اسے سب کچھ اپنی ذہانت اور محنت سے ہی سیکھنا تھا اور وہ یہ کام کر کے رہا۔ ایک دن خبر ملی کہ سرحد پار سے حملہ آور آئے ہیں۔ قزغن نے تیمور کو طلب کر کے حملہ آوروں سے گھوڑے واپس چھین لانے کی ہدایت کی۔ اس مہم میں زبردست کامیابی سے بادشاہ گر قزغن کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھی۔ قزغن نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ تیمور نے "بہادروں" کا دل موہ لیا ہے اور وہ خطرے میں کود پڑنے کا ہر وقت مشتاق رہتا ہے۔ تیمور کو اپنے اوپر بھروسا اور اپنی طاقت پر ناز تھا' چنانچہ اس نے ایک دن قزغن سے اپنے منتشر الوجود برلاس قبیلے کی قیادت سنبھالنے کی اجازت چاہی' لیکن وہ نہ مانا۔ کچھ عرصہ بعد قزغن نے اپنی پوتی الجائی خاتون آغا۔ جو ایک اور برسر اقتدار قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی' سے تیمور کی نسبت کر دی۔

بیس سے چوبیس سال کی عمر تک تیمور کے لیے زندگی نہایت پر لطف رہی۔ امیر قزغن

نے اسے ایک ہزار سواروں کا کمانڈر بنایا اور اپنی فوج کا مقدمتہ الجیش بننے کی اجازت دیدی۔ تیمور کی مدد سے اور اس کی دلاوری کے بل پر قزغن نے مغربی صحرا اور جنوبی وادیوں میں نئی فتوحات حاصل کیں، مگر امراء کے درمیان نزاع کے نتیجہ میں قزغن کو قتل کر دیا گیا۔ قبیلے منتشر ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اسی اثنا میں تیمور کے باپ نے بھی وفات پائی۔ تیمور کے پاس صرف چند سو سوار تھے۔ بلاد شمال کا خان اعظم پہلے تو کہسار کی بلندیوں سے یہ حالات چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر جب اس نے حقیقت حال کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو حرکت میں آیا اور سمر قند کا رخ کیا۔ حاجی برلاس نے پوری قوم کو لے کر جنوب میں ہرات چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر تیمور شہر سبز کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے چچا سے کہا کہ آپ جہاں چاہیں جائیں میں تو سیدھا خان اعظم کے پاس جاؤں گا۔ شہر سبز کے لوگوں نے جب دیکھا کہ تیمور میں ذرا بھی خوف و ہراس نہیں ہے تو اس کے پاس پہنچ گئے اور اسے اپنی اطاعت گذاری کا یقین دلانے لگے۔ مگر تیمور کا قول یہ تھا کہ ضرورت کے وقت دوست بننے والے لوگ قابل اعتماد نہیں ہوتے۔ اگر وہ ایسے لوگوں کی بھیڑ اکٹھی بھی کر لیتا تو خان اعظم کو حملے اور لوٹ مار کا بہترین بہانہ مل جاتا۔ تیمور نے خان اعظم کے دربار میں حاضری دینے کا ارادہ کیا۔ ملاقات ہونے پر تیمور کی شخصیت ۔ [illegible]ن اعظم کو متاثر کیا۔ تیمور نے بھی ذرا بیباک ہو کر کہا "خان اعظم میں آپ کی خدمت میں اور بھی تحائف پیش کرتا اگر آپ کے امرا میں شامل تین کتے اپنی حرص کی آگ میرے زر و مال سے نہ بجھا چکے ہوتے۔" خان اعظم امراء پر سخت ناراض ہوا اور تیمور اس کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ ان امراء نے خان کے خلاف لشکر ترتیب دینے کی تیاری شروع کی تو اس نے تیمور سے مشورہ کیا اور وطن واپسی سے پہلے اسے دس ہزار فوج کا کمانڈر بنا کر ان علاقوں کا حکمران مقرر کر دیا۔

لیکن تاتاری تیمور کو اپنا سردار ماننے پر تیار نہ تھے۔ خان اعظم کی واپسی کے بعد قبائل واپس آنے لگے۔ حاجی برلاس اور بایزید نے متحد ہو کر تیمور کے قتل کی سازش کی، مگر ناکام رہے۔ حاجی برلاس کے ساتھ لڑائی میں تیمور کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس کا سالا امیر حسین افغان قبائل کو ساتھ لے کر تیمور سے آملا۔ قبائل کی یہ جنگ ایک عرصہ تک جاری رہی۔ موجودہ زمانے کے نقشے کے مطابق ایران کے تمام شمالی اضلاع، بخارا کا تمام علاقہ، ماوراء نہر اور روسی ترکستان کے متعدد حصے، افغانستان کا کابل سے شمال کی جانب کا تمام حصہ تاتاریوں کی مملکت میں شامل تھے اور اس میں کم و بیش ایک لاکھ انسان ہتھیار بند تھے۔ تیمور 1360ء سے 1369ء تک اس خانہ جنگی میں الجھا رہا۔ بالآخر خان اعظم شمالی مہم سے فارغ ہو کر اس جنگ میں آکودا اور تاتاری پھر بکھر گئے۔ بایزید اور حاجی

برلاس دونوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ خان اعظم نے اپنے بیٹے الیاس خواجہ خاں کو تاتاری ممالک کا حکمراں بنایا اور تیمور کو سمرقند کا مقامی سردار مقرر کیا مگر الیاس اور بیک جک کے ماتحت کر دیا۔ تیمور کو یہ انتظام پسند نہ آیا اور اس نے اہل شمال کا محکوم بنائے جانے پر شدید احتجاج کیا۔ خان اعظم نے اس موقع پر خاندان کے دو بزرگوں کے معاہدے کی طرف اس کی توجہ دلائی : "قبل خان کی اولاد حکومت کرے گی' قاجولی خان کا خاندان اس کے ماتحت رہے گا" تیمور بزرگوں کے معاہدے کے احترام میں خاموش رہا اور اپنے علاقے کے حالات بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

شہزادہ الیاس اور اس کے سپہ سالار نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا تو تیمور اپنے آدمی اکٹھے کر کے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ خان اعظم نے تیمور کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ اب وطن میں تیمور کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس نے سیاست پر لعنت بھیجی اور گھوڑے پہ سوار ہو کر صحرا کا رخ کیا۔ الجائی' نیز بیس کے قریب بے لوث وفادار ساتھی اس کے ہمراہ تھے۔ زائد ہتھیار اور دیگر سامان گھوڑوں پر لدا تھا۔ کچھ ہیرے جواہرات بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک مقام پر امیر حسین اپنی بیوی دلشاد کے ہمراہ ان سے آن ملا۔ مشوروں کے بعد الجائی' تیمور' امیر حسین اور دلشاد چاروں نے فیصلہ کیا کہ خیرہ خوارزم کا رخ کیا جائے جسے آج کل خیرہ اورال کہتے ہیں۔

تیمور اپنے چھوٹے سے قافلے کو لیے ہوئے خیوہ پہنچا مگر حاکم شہر نے انہیں پہچان کر جتہ مغل خان کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تاکہ انعام حاصل کر سکے۔ چنانچہ وہ کئی سو سوار لے کر ان کے تعاقب میں نکلا۔ تیمور اپنے ساتھیوں کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر لے گیا اور پیچھے سے آنے والے سواروں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ خیوہ کو تیمور نے خود مارا۔ زبردست لڑائی میں وقفہ آنے پر تیمور نے دیکھا کہ اس کے صرف سات ساتھی زندہ بچے ہیں۔ خیوہ والے پھر اکٹھے ہونے لگے۔ تیمور نے کوچ کا حکم دیا۔ رات ڈھلنے لگی تھی اس لئے تعاقب کرنے والے انہیں ڈھونڈ نہ سکے۔ راستے میں تین سپاہی دوبارہ آ ملے' مگر رات کو جب امیر حسین اور تیمور سو رہے تھے تو وہ تین گھوڑے لے کر فرار ہو گئے۔ خوراک کم ہو جانے پر تیمور اور ساتھی شمال کی جانب ترکمان کے جھونپڑوں کی طرف گئے۔ تیمور نے ایک جھونپڑے میں داخل ہو کر ابھی سامان رکھا ہی تھا کہ ترکمانوں نے انہیں ڈاکو سمجھ کر حملہ کر دیا۔ ان کے پاس تیر ختم ہو چکے تھے۔ لاچار تیمور تلوار سونت کر مقابلے کو آیا تو ترکمان سردار نے اسے پہچان لیا اور اپنے رویہ کی معافی مانگی۔ اگلے دن تیمور نے اسے ایک قیمتی لعل اور موتی جڑے دو جوڑے بطور تحائف پیش کیے۔ بدلے میں سردار نے تیمور کو تین گھوڑے اور ایک رہبر دیا۔ انہوں نے بارہ دن میں صحرا عبور کیا۔ وہ خراسان کی سڑک تلاش کر رہے تھے۔ ایک گاؤں میں

ٹھہرے تو قبیلے کے لوگ انہیں قید کر کے سردار علی بیگ کے پاس لے گئے۔ علی بیگ نے تمام مال اسباب چھین کر تیمور اور اس کی بیوی کو کیڑے مکوڑوں سے بھرے ایک متعفن جھونپڑے میں قید کر دیا۔ باسٹھ دن تک وہ اس مکان میں قید رہے۔ رہائی ملنے پر اس نے قسم کھائی کہ کبھی کسی آدمی کو اس طرح قید میں نہ ڈالے گا۔ علی بیگ نے انہیں ایک لاغر گھوڑا اور مریل سا اونٹ دے کر چھوڑ دیا۔

دریائے آمو کے پار امیر حسین تیمور کا منتظر تھا لیکن وہ اسے اس حالت میں ملنا نہیں چاہتا تھا۔ دریائے آمو کے قریب تیمور نے ایک دوست سے چند گھوڑے اور پندرہ سوار لیے۔ سمرقند کے قریب پہنچ کر اس نے الجائی کو ایک گاؤں میں چھپا دیا اور خود مغرب کے وقت رفیقوں سمیت سمرقند میں داخل ہو گیا۔ مغل اس کی تلاش میں تھے۔ اس کے باوجود تیمور 38 دن تک وہاں دندناتا رہا۔ رات کو کارواں سراؤں میں جا بیٹھتا اور یک لخت علم بغاوت بلند کرنے کے لیے دوستوں سے مشورے بھی کیے۔ مگر یہ جسارت بے ثمر رہی۔ تیمور کو خبر ملی کہ مغلوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسے ایک مرتبہ پھر گھوڑے پہ سوار ہو کر رات کی تاریکی میں گم ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ چند سر پھرے ترکمان اور بلند ہمت عرب بھی تھے۔ شہر سبز پہنچ کر انہوں نے سفید مرمریں گنبد کے سامنے چراگاہ کی بلندیوں پر ڈیرے ڈالے۔ امیر قزغن کے دربار کے پرانے جنگ آزماؤں نے کئی مرتبہ تیمور کے ساتھ بادہ نوشی کی۔ خریف کے اختتام پر تیمور دو برلاس جنگجوؤں کے ہمراہ امیر حسین سے ملاقات کرنے روانہ ہوا۔ پانچ سو میل طویل راستہ فلک بوس چوٹیوں کے درمیان سے چکر کاٹتا اور افغانستان کے کوہستانوں سے گذرتا چلا گیا۔ ہندوکش کی برفانی چوٹیوں سے آگے اور بھی بلند پہاڑ تھے جن سے آگے برف پوش سطح مرتفع تھی۔ سفر دن کے وقت ہی ممکن تھا۔ وہ گول خیمے نصب کر کے شدید سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے رات گذارتے۔ کئی بار ان پر افغانوں نے حملہ بھی کیا۔ ہر حملے کے بعد تیمور اور اس کے ساتھیوں کے پاس سامان بڑھتا جاتا۔ انہوں نے کوہ ہندوکش کا بارہ ہزار فٹ بلند درہ عبور کیا اور گرتے پڑتے وادی کابل پہنچے۔

مگر شہر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا چنانچہ وہ سامان خرید کر باہر باہر سے ہی قندھار روانہ ہوئے۔ امیر حسین وعدے کے مطابق لشکر سمیت مقام ملاقات پر موجود تھا۔ موسم سرما میں انہوں نے آرام کیا۔ موسم کا اختتام پر قریبی سیستانی پہاڑیوں کے ایک حاکم کا ایلچی تحائف لے کر آیا کہ رعایا کی بغاوت کے باعث کئی علاقے ہاتھ سے نکل گئے ہیں لہٰذا اس کی مدد کی جائے۔ اس نے مزید تحائف کا وعدہ بھی کیا۔ تیمور تو ایسے ہی موقعوں کا منتظر رہتا تھا۔ وہ بہت جلد بیشتر قلعوں پر قابض ہونے لگے۔ اس کارنامے کے عوض انہیں یقیناً بڑا زرومال ملتا مگر امیر حسین کی طمع

نے کام بگاڑ دیا جس سے سیستانی ناراض ہو گئے۔ باغیوں کو تاتاریوں کے حلیفوں میں انتشار پھیلانے کا موقع ملا اور انہوں نے حاکم کو وفاداری کا پیغام بھی بھیجا۔ حاکم سیستان ایک رات کو متحدہ لشکر سے چپ چاپ جا ملا اور تیمور پر حملہ کیا جسے اس نے روک لیا اور دوبارہ حملہ کیا۔ ایک تیر سے اس کے بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور پاؤں زخمی ہو گیا۔ سیستانیوں کی شکست سے تیمور اور امیر حسین کو مزید ساتھی اور دولت ملی۔ امیر حسین لشکر لے کر شمال کی جانب روانہ ہوا۔ تیمور اور الجائی خیمے میں لیٹے رہتے اور ننھا جہانگیر ہر وقت ان سے چمٹا رہتا۔ زخم بھرنے پر تیمور لنگڑا کر چلنے لگا۔ مکمل صحت یاب ہو کر اس نے ہتھیار طلب کیے۔

تیمور راستے میں شکار سے دل بہلاتا ہوا شمال میں امیر حسین کی مدد کو چلا۔ اس نے دریائے آمو کے قریب خیمے نصب کر رکھے تھے۔ تیمور نے خیموں کے قریب ایک پہاڑی پر چاندنی میں نماز ادا کی۔ فارغ ہو کر دیکھا کہ بلخ کی جانب سے چند سوار آ رہے ہیں۔ تیمور تنہا ہی ان کے مقابلہ پر روانہ ہوا۔ اور قریب پہنچ کر پوچھا: "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہو؟" ایک نے جواب دیا: "ہم امیر تیمور کے سپاہی ہیں' انہیں ڈھونڈنے آئے ہیں" تیمور نے کہا "میں بھی ان کا سپاہی ہوں اور تمہیں ان تک پہنچا سکتا ہوں۔ وہ روانہ ہوئے لیکن تینوں سوار دراصل قبیلہ برلاس کے تین سردار تھے جنہوں نے تیمور کو پہچان لیا۔ تیمور نے ایک آدمی کو دریا پار بھیج کر معلومات حاصل کیں کہ بیس ہزار کا جتہ لشکر شہر سبز کی سمت سے بستیوں کو جلاتا ہو آ رہا ہے۔

تیمور کا لشکر مغلوں کے مقابلے میں ایک چوتھائی تھا۔ سنگین پل پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مغل دریا پار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا جرنیل بیک جک تمام دن خاموش بیٹھا رہا۔ تیمور نے اپنے فوجیوں کو پہاڑیوں پر پھیلا دیا اور مغلوں کے تین طرف آگ روشن کی۔ مغل صبح سے پہلے پہلے ہی حملہ آور ہوئے اور شکست کھائی۔ تیمور نے ان کا تعاقب شروع کیا تو خوف سے چھپے ہوئے تاتاری قبائل بھی آ شامل ہوئے۔ تیمور کو سونے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ اسے اپنی نئی فوج کے کماندار مقرر کرنا تھے' پرانی قبائلی دشمنیاں ختم کرانا تھیں اور تعاقب بھی جاری رکھنا تھا۔ تاتاریوں کے بے پناہ ہلے نے مغلوں کے قدم اکھیڑ دیئے چنانچہ انہوں نے دریائے آمو اور دریائے سیر کے درمیان سارا علاقہ خالی کر دیا۔ شہزادہ الیاس اپنے شہر المالیق واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ تیمور ماوراالنہر کا نیا بادشاہ بن کر چھا گیا۔ اس نے مغل سپہ سالاروں کو تحائف دے کر رہا کر دیا۔ پھر اس نے شہر سبز فتح کیا۔

جتہ مغلوں سے تاتاریوں کی جان چھوٹ گئی' مگر بے چین تاتاریوں پر جنگ کی نسبت

امن کا زمانہ زیادہ بھاری ہوتا تھا۔ تیمور اور امیر حسین دونوں تھک کر بیمار پڑ گئے۔ الیاس خواجہ خان کا پلٹ کر آنا لازمی تھا۔ اس کے لشکر کی تعداد کم مگر جنگی صلاحیت زبردست تھی۔ امیر حسین نے کوہستانی قبائل کو بھی جمع کیا۔ اتنے زیادہ تاتاری تاریخ میں پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے۔ تیمور نے اپنی فوج میمنہ ' قلب اور میسرہ پر ترتیب دے رکھی تھی۔ اسے اپنی فتح کا پورا یقین تھا مگر اچانک بارش شروع ہو گئی۔ نرم مٹی میں کیچڑ اور دلدل بن گئی۔ گھوڑوں کے پیر دھنسنے لگے۔ جتہ مغلوں نے نالیاں کھود کر اس صورتحال کا تدارک کر لیا تھا۔ لڑائی کے آغاز میں تیمور کو کافی نقصان پہنچا۔ بارش کے باعث کمانیں بیکار ہو چکی تھیں ' دلدل نے نظم و ضبط خراب کر دیا۔ لہذا تیمور خود جتہ فوج کے علم کی طرف بڑھا اور کماندار کا کام تمام کر دیا۔ مغلوں کا علم سرنگوں ہو گیا۔ ان میں بددلی پھیلنے لگی۔ تیمور نے بھرپور حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن امیر حسین کے اختلاف کی وجہ سے عملدرآمد نہ کر سکا۔ رات کے وقت جنگ رک گئی۔ تیمور نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ حسین کے ساتھ مشترک کمان میں کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ اگلے دن پھر بارش ہوئی۔ تیمور نے تنہا مقابلہ کیا اور پسپائی پر مجبور ہوا۔ میدان جنگ میں پڑی تاتاریوں کی لاشوں نے اسے غمگین کر دیا۔ اسے شکست فاش ہوئی۔ امیر حسین سے علیحدہ ہو کر وہ سمرقند کی جانب گیا اور محاصرے کے انتظامات کر کے وادی کا رخ کیا تاکہ نئی فوج تیار کرے۔ مگر شہر سبز پہنچ کر پتہ چلا کہ الجائی ابدی نیند سو چکی ہے۔ تنہائی پسند تیمور اب حقیقت میں تنہا رہ گیا۔

امیر حسین سے اب اس کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے جہانگیر کو ساتھ لیا اور دریائے آمو کے جنوب میں اسی مقام پر جا پہنچا جہاں پچھلے برس الجائی کے ساتھ قیام کیا تھا۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتا' مسجد میں وعظ بھی سنتا۔ رات کے وقت گھنٹوں شطرنج کھیلتا اور ہمیشہ جیتتا۔ اس کھیل میں تکمیل مہارت کے لیے اس نے ایک نئی بساط اختراع کی تھی جس میں خانوں اور مہروں کی تعداد دوگنی تھی۔ پانچ سالہ جہانگیر اس کے پاس بیٹھا ان عجیب سے کھلونوں کو دیکھتا رہتا۔ تیمور اس قسم کے مشاغل میں کھویا ہوا تھا کہ سمرقند کے علماء کا ایک وفد آیا اور بتایا کہ بخارا کے مفتی نے سمرقند پہنچ کر مسلمانوں کو دفاع پر آمادہ کر لیا ہے۔ ان کے بعد تیمور کے افسروں نے بھی آکر بتایا کہ مغلوں کے گھوڑوں میں شدید وباء پھیلی تھی اور بے شمار گھوڑے مر گئے۔ وہاں امیر حسین نے فتح پالی تھی۔ اب تیمور اور امیر حسین ہندوستان کی سرحد سے لے کر بحیرہ ارال تک تمام علاقے کے مالک تھے۔ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ تیمور کو امیر حسین سے کمتر درجہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے ذمے صرف زمین کی تقسیم' مالیہ اور دیگر واجبات کی وصولی اور دیوانی مقدمات فیصل کرنے کے کام تھے۔ اس کا

رویہ بڑا باوقار تھا۔ کسی کو شکایت نہ ہوتی۔ جب امیر حسین نے قبیلہ برلاس پر ایک بھاری محصول لگایا تو تیمور نے احتجاج کیا اور غصے میں آ کر الجائی کے عروسی زیورات امیر حسین کو دے دیئے۔ امیر حسین کی پالیسیوں کے باعث جلد ہی خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ تیمور کی دلیری' پامردی' بے خوفی اور فراخدلی کے چرچے ہونے لگے۔

تیمور نے قرشی میں ایک نہایت مضبوط پختہ قلعہ تعمیر کروالیا تھا۔ وہاں کا نقاب پوش "پیغمبر" مر چکا تھا اور قلعہ امیر حسین کی فوجوں کے قبضے میں تھا۔ امیر موسیٰ شہر کا حاکم تھا۔ تیمور کے پاس صرف 240 سوار تھے۔ شدید گرمی میں اس نے قرشی پر حملے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ حیران رہ گئے اور پس و پیش دکھائی۔ تیمور کا اٹل ارادہ دیکھ کر وہ مان گئے مگر حملے کا فیصلہ اسے خود بھی دانشمندانہ محسوس نہ ہوا۔ والی ہرات نے تیمور کو بلوا بھیجا تو اس نے شمال کی طرف روانگی کی تیاری کی۔ لیکن اگلی ہی منزل پر رک کر واپس قرشی کی جانب چلا۔ امیر موسیٰ اس کی ہرات روانگی کی خبر سن کر بے خوف ہو چکا تھا۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں نے قرشی کے مضافات میں پہنچ کر کمندیں بنائیں۔ تیمور صرف دو جوانوں کو ساتھ لے کر قلعے کی جانب گیا۔ ایک جوان کو گھوڑوں کے پاس چھوڑ کر اس نے خندق پار کی اور کافی محنت کے بعد ایسی جگہ ڈھونڈلی جہاں فصیل کا بالائی حصہ شکستہ تھا۔ عبداللہ کو جگہ ذہن نشین کروا کر وہ واپس گھوڑوں کے پاس آیا۔ باقی آدمی بھی پہنچ چکے تھے۔ اس نے 45 آدمیوں کو گھوڑوں کی حفاظت کے لئے چھوڑا اور باقی ایک سو کو ساتھ لے کر دوبارہ قلعے کا رخ کیا۔ موسیٰ کے سب سنتری سو رہے تھے۔ حصار پر تھوڑی سی لڑائی ہوئی۔ تیمور نے سب سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور طلوع آفتاب کے قریب نگل جوائے۔ بیشتر باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ صرف موسیٰ کے بیٹے نے مقابلہ کیا جس کی تیمور نے تعریف کی۔ مگر اس شہر کو فتح کرنے کے بعد قبضہ میں رکھنا بھی تیمور کا کمال تھا۔

بہت سے سردار امیر حسین سے بیزار ہو کر تیمور کے علم تلے آ گئے۔ وہ وسیع مملکت جو تاریخ میں مملکت تیمور کے نام سے موسوم ہے' اس کی بنیاد ایسے ہی جانبازوں کی وفادار نیز تیمور کی بے مثل قیادت پر رکھی ہوئی ہے۔ کئی بار ان تاتاری سرداروں نے تیمور کی جان بھی بچائی۔ جب موسیٰ کی قوم کے لوگ' جو جلایر کہلاتے تھے' تیمور سے آن ملے تو اس کی بالادستی میں کوئی کلام ہی نہ رہا۔ جلا یر نیم مغل تھے۔ اتنی بڑی فوج اور تیمور جیسے کمان دار کے سامنے امیر حسین کیا تاب لاتا۔ اس کی طاقت زائل ہو گئی۔ پہلے تو اسے دریائے آموکی طرف بھاگنا پڑا' پھر بلخ میں محصور ہو گیا۔ مگر یہ شہر نہایت آسانی سے فتح ہوا۔ امیر حسین کھنڈروں میں جا چھپا اور درخواست کی کہ اگر اسے حج پر جانے

دیا جائے تو پھر کبھی ملک میں واپس نہیں آئے گا۔ اس کے بعد امیر حسین کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بارے میں مورخوں میں اختلاف ہے۔

تیمور قصداً کچھ دن تک بلخ میں رکا رہا۔ لوگ اس شہر کو عروس البلاد کہتے تھے۔ سکندر اعظم اسے باکتریا کے نام سے جانتا تھا مگر اب یہ قبتہ الاسلام کہلاتا تھا۔ چنگیز خان کے سپاہی اسے مٹی اور پتھروں کا ڈھیر بنا گئے تھے۔ تیمور نے اسے نئے سرے سے تعمیر کر کے بارونق شکل دی۔ امیر حسین کی موت کے بعد تاتاریوں کو اپنا ایک نیا خان منتخب کرنے کی ضرورت تھی۔ 1369ء میں فوجی افسر' علما' صوفی اور قبائلی سردار غور و خوض کے لئے اکٹھے ہوئے۔ تیمور کا نام زیر غور تھا' لیکن وہ خود اس تمام کارروائی سے لاتعلق رہا۔ بالآخر ارباب شریعت نے مخالفت کے باوجود اسے ماوراء النہر اور ممالک توران کا بھی حکمران تسلیم کیا۔ اگلے روز تمام مجلس مشاورت نے تیمور کی اطاعت کا اعلان کیا۔ اب اسے سپہ سالار امیر تیمور کہا جانے لگا۔ تیمور نے جی کھول کر تحائف بانٹے اور مال و دولت سرداروں میں تقسیم کیا۔ سادات اس داد و دہش پر معترض ہوئے تو اس نے کہا "اگر میں بادشاہ ہوں تو سب کی دولت میری دولت ہے۔ اگر میں بادشاہ نہیں تو پھر یہ دولت جو میرے پاس ہے میرے کس کام کی۔"

ایک بات شروع ہی سے ظاہر تھی کہ کوئی امیر تیمور کے ارادوں اور احکام میں دخل دینے کا مجاز نہ تھا۔ وہ مخالفت کا قلع قمع کرنے میں پوری تندی اور تن دہی سے کام لیتا۔ اس دور میں دریائے سیر اور ہندوستان کے درمیانی خطے میں تیمور کے زیر اقتدار ایک نیا نظام تشکیل پذیر تھا اور وہ اپنی فوجوں میں انضباط کا ایک انوکھا تصور پیدا کر رہا تھا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے: "امیر تیمور عادل اور مردم شناس ہے اور مستحق آدمی کو بھر مٹھی انعام دیتا ہے" کچھ فراغت کے بعد اس نے خوارزم کو ایک صوبہ بنا کر اپنے بڑے لڑکے کو وہاں حاکم بنایا۔ قزغن کی مملکت کو مغرب اور شمال کی جانب وسعت دی گئی۔ پھر تیمور نے جنوب کی جانب دریا پار کر کے والئی ہرات کی فوج بلہ بولا۔ باب الحدید میں کم از کم پچاس ہزار سپاہیوں کے قدموں کی آواز گونجی۔ ہرات پر قبضے سے تیمور کی مملکت میں ایک عظیم شہر کا اضافہ ہوا۔ ایک وقائع نگار لکھتا ہے کہ اڑھائی لاکھ آبادی' سینکڑوں مدرسوں' تین ہزار حمام اور تقریباً 10 ہزار دکانوں والے اس شہر کی فتح کے بعد تیموری مملکت اس قدر محفوظ ہوئی کہ عیش و عشرت کے سوا کوئی اس کا دشمن نہ ہو سکتا تھا۔

حالات کا تقاضا تھا کہ اب تیمور اپنا دربار سمرقند لے جائے۔ یہیں سکندر اعظم نے کلائی توس کا کام تمام کیا تھا اور ڈیڑھ سو سال قبل چنگیز خاں کے لشکروں نے بھی یہیں قیام کیا۔ اہالیان شہر

تیمور کی پذیرائی کے لئے جوق در جوق آئے اور اسے شیر نیستاں' کشور کشا اور اقبال مند کے لقب دیئے۔ اس نے شہر پناہ کے تمام شگاف اپنی آنکھوں کے سامنے بند کروائے اور شہر کے دروازوں سے وسط شہر کے بازار تک کشادہ سڑکیں بنوائیں۔ شہر سے دریا تک سڑکوں کا جال بچھایا' متعدد باغ لگوائے۔ نیلا رنگ تاتاریوں کا محبوب اور مرغوب رنگ تھا جس کے باعث عمارتوں میں پرانی مٹیالے رنگ کی اینٹوں کی بجائے کاشی کی نیلی اینٹیں لگانے کا حکم دیا۔ اسی لئے سمرقند کے لوگ اسے گوگ کنڈ (نیلا شہر) کہنے لگے۔ جہانگیر کی دلہن جہاں زادہ کا یہاں عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ تیمور نے خود بھی امیر حسین کی بیوہ سرائے خانم سے شادی کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس کا عزیز ترین بیٹا جہانگیر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

اس زمانے میں مغل سلطنتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ٹوٹ چکی تھی۔ جنوب مغرب میں ایل خانی بیت المقدس سے لے کر ہندوستان تک حکم چلاتے آ رہے تھے۔ خطا کا مغل خاقان بھی چینیوں کے حملوں کی وجہ سے چین چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ مغلوں کی سب سے چھوٹی شاخ جتہ مغلوں کی تھی۔ یہ چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی کی اولاد تھے۔ امیر قزغن نے ان سے ان کی مملکت کا شمالی حصہ 'جو سمرقند کے اردگرد تھا' چھین لیا۔ اب 1375ء میں امیر تیمور نے انہیں ان کے وطن یعنی المالیق کے گرد پہاڑوں سے بھی نکال دیا۔ 1370ء تا 1380ء کے عشرے میں مغل مملکت کا تین چوتھائی حصہ نقشے سے غائب ہو چکا تھا مگر ایک چوتھائی حصہ اب بھی بہت محکم تھا۔ اسی کو سنہری غول کا علاقہ کہتے تھے اور یہ تیموری قلمرو سے شمال اور مشرق کی جانب واقع تھا۔ تیمور کی پیدائش کے وقت سنہری غول کی قوت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی تھی۔ ان میں صرف حکمران خاندان مغل تھے۔ ان لوگوں میں خانہ بدوشوں کے علاوہ کچھ آرمینی اور روسیوں کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ ترک اور تاتاری بھی شامل تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سنہری غول کا ایک شہزادہ توقتمش' جو کریمیا کا حکمران تھا اپنی قوم سے خفا ہو کر تیمور کے پاس پناہ لینے آیا۔ تیمور نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ توقتمش کیل کانٹے سے لیس ہو کر شمال کی جانب بڑھا مگر سنہری غول سے شکست کھائی۔ پھر ارس خان مر گیا تو توقتمش نے سنہری غول کی سرداری کا دعویٰ کر دیا۔ تیمور کی اعانت سے اس نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ روسی والیان ریاست کو شکست دے کر ماسکو فتح کرنے کے بعد توقتمش سنہری غول کا خاقان بن چکا تھا۔ اب اس نے تیمور پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹھانی۔ تیمور توقتمش سے پہلے ہی سمرقند پہنچا۔ گنج صوفی اور جتہ مغل قبیلے بھی لوٹ مار میں مشغول ہوئے۔ اب وہ دور شروع ہو چکا تھا جس میں امیر تیمور اور مغل خاقان کے درمیان حصول اقتدار کی آخری کشمکش ہونا تھی۔ تیمور نے توقتمش سے ٹکر لینے کا فیصلہ

کیا۔ اس وقت اس کے پاس فوج کا صرف ایک حصہ موجود تھا۔ برفباری اور بارشوں کے باوجود وہ بڑھتا چلا گیا اور سنہری غول کی بیرونی چوکیوں تک پہنچ کر ان پر حملہ کیا۔ اس نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجائی' عمارات کو زمیں بوس کیا اور کھنڈر چھوڑ کر واپس سمرقند آیا۔ اب وہ جتہ مغل قبائل کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں مارتے مارتے المالیق تک پہنچا دیا۔ ان دو دشمنوں کو تہس نہس کرنے کے بعد اس نے توقتمش سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔

توقتمش کی فوج تیموری فوج سے بہت زیادہ تھی۔ تیز موسمی حالات کے پیش نظر وہاں لڑنا آسان نہ تھا۔ بعد ازاں پنولین اور پیٹر اعظم کی شکست انہی علاقوں میں ہوئی تھی۔ تیمور شکست اور موت کو دعوت دے رہا تھا مگر اس کے باوجود اس کا اقدام بالکل درست تھا۔ وہ مغلوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ توقتمش کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تیمور وہاں پہنچ کر لڑے گا۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ تیمور زندگی بھر تین اصولوں پر عمل پیرا رہا: (1) اپنے ملک کو کبھی میدان جنگ نہ بنایا جائے' (2) دفاعی جنگ سے احتراز کیا جائے' (3) تیز ترین حملہ کیا جائے۔

تیمور کی سرعت رفتار سے دشمن پریشان ہو گیا۔ اسے اپنی فوجوں کو تیمور کے لشکروں کے متوازی حرکت میں رکھنا پڑا تا کہ تیموری فوج اور اپنے ملک کے درمیان حائل رہے اور مشرق بعید کی سطح مرتفع نیز والگا اور بحیرہ اسود کے قبائل کے جمع ہونے تک انہیں روکے رہے۔ توقتمش کی پوری طاقت جمع ہو جانے کے بعد اس کی فوج تیموری فوج سے دگنی ہو گئی۔ تیمور خطرات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ چھ دن تک بہ حد امکان تیز رفتار سے مغرب کی طرف بڑھتا رہا اور آخر کار یورال کے کنارے پر جا پہنچا۔ پوری فوج دریا پار کر کے مغربی کنارے پر پہنچی جن جنگلوں سے یہ دونوں فوجیں اب گذر رہی تھیں ان سے آگے مرطوب ٹنڈرا کا علاقہ تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ بارش شروع ہو گئی اور برف بھی گرنے لگی۔ برفباری رکتے ہی سب سے پہلے تیمور خیمے سے باہر نکلا۔ عمر شیخ کے بیس ہزار جوان مغل سواروں کے پہریداروں کو قتل کر کے آگے بڑھے۔ ساتویں دن سنہری غول کے قرنی علم اور خیمے نظر آنے لگے۔ اس نے فوراً ٹوٹ پڑنے کی بجائے سپاہ کو حکم دیا کہ سارا سامان پکا کر خوب سیر ہو کر کھائیں۔ اٹھارہ ہفتے بعد اٹھارہ سو میل کا سفر ختم ہوا تھا۔ دونوں فوجیں اب لڑے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ صبح ہوتے ہی تیمور نے حملہ کیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ تیمور نے توقتمش کے بازو پر حملہ کیا۔ اسے موت سامنے کھڑی نظر آئے۔ وہ اپنے قریبی امیروں کو ساتھ لے کر بھاگا اور اس کے بھاگتے ہی سنہری غول کے علم سرنگوں ہو گئے۔ تین سال بعد توقتمش دوبارہ حملہ آور ہوا۔ مگر اس لڑائی میں سنہری غول کا خاتمہ ہو گیا۔ تیمور نے والگا کے کنارے مغلوں کا مشہور شہر تاراج کیا

اور دیگر شہر بھی تباہ کر ڈالے۔

جب تیمور کے علم دریائے ڈان کے کنارے کنارے آگے بڑھے تو ماسکو میں ہلچل مچ گئی۔ مگر تیمور نامعلوم وجوہ کی بنا پر ماسکو سے لوٹ آیا۔ لیکن ماسکو کی یہ جاں بخشی یورپ کی ان بستیوں کے لیے مصیبت بن گئی جو بحیرہ آزاف کے کنارے آباد تھیں۔ وینس، جینوا، قیطالونیا اور بسکنش کی فوجوں کو تاتاریوں نے شکست دی اور ان کی بندرگاہیں نذر آتش کر دیں۔ مغل خانوں کے پاس اب صحرائے گوبی اور شمالی ٹنڈرا کے سوا کچھ نہ رہا۔ بلاد شمال سے واپسی میں تیمور نے چکر کاٹ کر بحیرہ خزر کے مغرب سے وطن آنے کا فیصلہ کیا تاکہ کوہستان قفقاز سے ایک شاہراہ نکالی جا سکے۔ سارا موسم سرما اسی کام میں صرف ہو گیا۔ قریب ہی نہایت دشوار گزار پہاڑوں میں ایک کوہستانی قبیلہ مقابلے پر آمادہ ہوا۔ عمودی چٹانوں پر واقع ان کے قلعے تک تیر بھی نہ پہنچتے تھے۔ مگر تیمور اس شاہراہ پر کوئی ایسا مقام نہ دیکھنا چاہتا تھا جو مطیع نہ ہو۔ اس نے 300 فٹ اونچی ایک چٹان پر سیڑھیاں لگا کر انہیں چٹان سے باندھ دیا اور سپاہی اس چٹان پر پہنچ گئے۔ اب انہوں نے سیڑھیاں اوپر کھینچ کر ایک اور چٹان پر لگائیں اور یوں اوپر چڑھتے گئے۔ قلعے والے اوپر سے پتھر پھینک رہے تھے مگر تیروں کی بوچھاڑ کے باعث انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ کوہستان کے متعدد قلعے ایک ایک کر کے فتح ہوئے۔ دوسرا قلعہ تکریت تھا جسے فتح کرنے میں مشکل ہوئی۔ یہ اونچی چٹان پر واقع تھا۔ تیموری فوج نے پہاڑ میں سرنگیں کھود کر ان میں آگ لگا دی جس کے باعث قلعے کے حصے گرنے لگے۔ تاتاریوں نے تمام قلعے والوں کے سروں کے دو کلہ مینار دریا کی ریت سے تعمیر کر کے کتبہ لگایا: "ڈاکوؤں اور باغیوں کا یہ یہی حشر ہوتا ہے۔" لیکن شاید کتبہ یوں ہونا چاہئے تھا: "امیر تیمور کی اطاعت نہ کرنے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔" تکریت کا قلعہ سر کرنے میں 17 دن صرف ہوئے۔ اب اس کی مملکت میں بلاد شمال بحیرۂ خوارزم، بحیرۂ خزر ایران اور کوہستان قفقاز بھی شامل ہو گئے تھے۔ خراسان کی تاریخی شاہراہ دو ہزار دو سو میل تک اس کی مملکت میں سے گزرتی تھی۔ نیشاپور سے المالیق تک چودہ شہر اسے خراج دے رہے تھے۔ لیکن اس تازہ مہم میں اس کا دوسرا بیٹا عمر شیخ بھی ہلاک ہو گیا۔ تیمور راستے میں کچھ دن آق سرائے میں آرام کیا۔ شہر سبز میں اس نے جہانگیر کی قبر پر گنبد بنوایا تھا۔ اسے کشادہ کروا کے عمر شیخ کو بھی دفن کرایا۔ اب اس کے سابق مشاغل ختم ہو چکے تھے اور وہ دور دراز علاقوں پر حملوں کے منصوبے بنانے لگا۔

اس وقت تک تاتاری فاتح نے جنوب کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ ایران کے بادشاہ نے اپنے آخری ایام میں تیمور کو خط لکھ کر اپنی اطاعت کی تصدیق کی۔ کچھ عرصہ بعد شاہ شجاع فوت ہوا تو

دس شہزادے تخت کی خاطر لڑنے لگے 1386ء میں تیمور شمال سے ایران میں داخل ہوا۔ اصفہان کے امرا نے اس کا استقبال کیا۔ فوجیوں نے عرصہ بعد کسی آباد شہر میں قدم رکھا تھا۔ وہ بے پروا ہونے لگے جس کا فائدہ اٹھا کر لوگوں کے غول ان پر حملہ آور ہوئے اور بہت سوں کو مار ڈالا۔ انہوں نے تقریباً تین ہزار تاتاریوں کو قتل کر کے شہر کے دروازے بند کر لئے۔ تیمور غصے سے کانپ اٹھا۔ فوراً حکم دے کر دروازے تڑوائے اور قتل عام شروع کر دیا۔ ایرانیوں کے سر شہر کی دیواروں میں چن دیئے گئے' پھر شاہراہوں پر ان سے کلہ مینار تعمیر کیے گئے۔ اس انتہائی سنگدلانہ اور غضبناک انتقام میں اصفہان کے تقریباً 70 ہزار باشندے قتل ہوئے۔

تیمور ایران کے کئی مطربوں کو سمرقند لے گیا۔ مگر بعد میں ان نااہل ندیموں کو ساتھ لانے پر پچھتایا۔ اس کا منجھلا بیٹا میراں شاہ ان کی ہم نشینی میں شراب کا دلدادہ ہو گیا۔ اس کے برسوں بعد تیمور نے بحیرۂ خزر کے علاقے کی حکومت میراں شاہ کے حوالے کی تو ہندوستان میں ایک سال کی مہم کی بعد واپس آ کر سنا کہ وہ نیم پاگل ہو چکا ہے۔ افسروں نے اس کی شکایات تیمور سے کیں۔ جہانگیر کی بیوہ بھی فریادی بن کر پہنچی۔ تیمور نے میراں شاہ کی بدنظمیوں کی تحقیق کر کے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ بعد ازاں امراء کی سفارش پر اس کی جاں بخشی تو کر دی مگر اختیارات و مناصب چھین لیے۔

1388ء تک 53 سال کی عمر میں تیمور وسطی ایشیاء اور ایران کا مسلمہ مالک بن گیا۔ وہ ہر لحاظ سے شہنشاہ تھا مگر اس کے نام کے ساتھ لفظ شہنشاہ نہیں لکھا جاتا تھا اور وہ صرف امیر تیمور گورگاں کہلایا۔ "گورگاں" کے معنی داماد شاہاں یا شاہوں کا قرابت دار ہیں۔ 1369ء میں محمود خان چنگیز کے منجھلے بیٹے چغتائی کے وارث سیر غمش کا جانشین ہوا تھا۔ چونکہ تاتاری قانون کے مطابق شاہی خاندان کا فرد ہی بادشاہ بن سکتا تھا اس لیے تیمور نے محمود کو بادشاہ بنا دیا اور خود حکمرانی کرتا رہا۔ اس نے یہ کارروائی سلطان امیر حسین کو ہلاک کروانے کے بعد 1370ء میں کی تھی۔ تیمور نے محمود کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ دمشق میں جب تیمور اور مشہور مورخ ابن خلدون کی ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو تیمور نے کہا: "میں محض تخت کا نمائندہ ہوں بادشاہ وہ ہے" اور محمود کی طرف اشارہ کیا۔ فی الحقیقت تیمور "بادشاہ" یا "صاحب التخت" نہیں تھا حالانکہ اس کا نام تمام ممالک کے خطبے میں پڑھا جاتا تھا۔ وہ خود قانون بن گیا اور اپنی مملکت کی نئی اقوام اور قبائل پر احکام نافذ کرنے لگا۔ اس نے ہندوستان جانے کے دو راستے صاف کر دیئے تھے۔ ایک کابل سے آگے درہ خیبر کا راستہ' دوسرا وہ جو قندھار سے شروع ہو کر دریائے سندھ تک جاتا تھا۔ اس زمانے میں اسے اس پرانی کہاوت کا اچھی

طرح تجربہ ہوا کہ "جو کوئی رکاب میں پاؤں رکھتا ہے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر سواری بھی کرنا پڑتی ہے۔" اب وہ سمرقند میں شاذونادر ہی قیام کرتا۔

اب تیمور کے خلاف بادشاہوں کا اتحاد ناگزیر تھا۔ سلطان مصر' جو دمشق اور بیت المقدس کا حکمراں بھی تھا اور سلطان بغداد نے مل کر اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور تیاری شروع کر دی۔ تیمور بھی چند سو منتخب سوار اور بہترین گھوڑے ساتھ لے کر بغیر رکے 81 میل کا سفر کر کے بغداد کے مضافات میں پہنچا اور سلطان احمد کو بھگا دیا۔ فتح بغداد کے بعد وہ مغربی سلطنتوں کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ مملوکوں کو یہ بات ناگوار گذری۔ مصری فوج کے لشکر دجلہ کے راستے بغداد پہنچے۔ مگر تیمور واپس جا چکا تھا۔ دس برس تک سمرقند کو جنگ تو کجا جنگ کی ہوا تک نہ لگی اور تیمور کے بے پناہ ولولوں کے باعث اس نے بڑی ترقی کی۔

1398ء کے موسم بہار کے آغاز میں تیمور ہندوستان گیا مگر سمرقند سے رابطہ بحال رکھا۔ کوہستان قفقاز میں بغاوت پھیل چکی تھی اور سلطان بغداد نے عراق پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ روانگی سے قبل تیمور نے اپنے بوڑھے امیر سیف الدین کے بیٹی کی پسندیدہ نہایت خوبرو ایرانی حسینہ کو اپنی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا تھا لیکن وہ بھاگ گئی۔ اب تیمور نے ہندوستان سے اس حسینہ شادی ملک کے قتل کا فرمان بھیجا۔ سرائے خانم نے جب شادی ملک سے سنا کہ وہ حاملہ ہے تو تیمور کی واپسی تک اسے اپنی حفاظت میں رکھ لیا۔

تیمور کی ہندوستان میں مہم مختصر سی تھی۔ وہ دہلی کا محاصرہ نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اپنی فوج کو کھلے میدان میں رکھا اور خود کو کمزور ظاہر کرنے کے لیے خندقیں کھودلیں۔ سلطان دہلی اس کے دھوکے میں آ گیا اور کھلے میدان میں جنگ کرنے نکل آیا۔ تیمور کی فوج نے ایک لاکھ کے قریب ہندوستانی سپاہی ہلاک کر کے فتح حاصل کی' دہلی کو نہایت اطمینان سے لوٹا اور پھر جنوب کے شہروں کی جانب بڑھا۔ سمرقند میں فتح کی خبر پہنچی تو زبردست جشن منایا گیا۔ شمالی ہندوستان تیموری سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔ ایشیاء کے خزانے کا دروازہ تیمور پر کھل گیا' ہندو راجا پہاڑوں میں فرار ہو چکے تھے۔ اگلے موسم بہار میں فوج شہر سبز اور تخت قراچہ کے راستے سمرقند واپس آئی۔ لوگ جواہرات کے ڈھیر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اس شان سے تیمور آٹھویں بار بحیثیت فاتح سمرقند میں داخل ہوا۔ وہ یہاں ایک یادگار مسجد تعمیر کرنے کے لیے دہلی کی جامع مسجد کا نقشہ اور دو سو معمار بھی ساتھ لایا تھا۔ اس منصوبے کے علاوہ اس کے ذہن میں اور کوئی بات نہ تھی۔ واپسی کے آٹھویں دن ہی تعمیر شروع ہوئی تین ماہ بعد مسجد کے منبر سے امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

سلطنت کے مغرب سے بدامنی کی خبریں آنے لگیں۔ تیمور کی بیگمات نے بھی اپنے اپنے بیٹوں کو جانشین بنانے کے لئے سازشیں شروع کیں۔ تیمور 64 سال کا ہو چکا تھا۔ دو چار مرتبہ بیمار بھی ہوا۔ اس کی عالیشان جامع مسجد پر علماء کا کوئی اثر نہ تھا۔ دراصل ساری زندگی اس کا دین اور تاتاری فطرت باہم تصادم کی حالت میں رہے۔ قاہرہ کا خلیفہ' سلطان بغداد اور شہنشاہ ترکی کی نظر میں وہ تاتاری وحشی اور ملحد تھا۔ سلطنت کے حالات اب یہ تھے کہ اس کی حفاظت اور پناہ میں آئے ہوئے سرداروں کو ایشیائے کوچک سے باہر نکال دیا گیا' اس کے بیٹے کی مملکت پر حملہ کیا جا چکا تھا اور بغداد اس کے متعین کردہ حاکم سے چھین لیا گیا۔ یہ سب کارروائیاں عمر رسیدہ تیمور کے لیے دعوت جنگ تھیں۔ وہ مئی 1399ء میں سمرقند پہنچا تھا' ستمبر میں ایک بار پھر فوج لے کر نکل گیا اور تین سال تک سمرقند نہ آیا۔ 1400ء کے موسم گرما تک اس نے سیواس تک تمام شہر فتح کئے۔ پھر شام کی طرف روانہ ہوا۔ حلب کے قریب سلطان مصر کی فوجوں سے سامنا ہوا۔ مگر ابھی تاتاریوں کے حملے کا زور بھی نہ بندھا تھا کہ شامی اور مصری بھاگ کھڑے ہوئے حلب فتح کر کے تاتاری جنوری 1401ء میں دمشق کی طرف بڑھے اور وہاں خوفناک لوٹ مار کر کے شہر کو آگ لگا دی۔ شعلوں میں گھرے ہوئے دمشق کی ایک مسجد کا گنبد تیمور کو اتنا پسند آیا کہ فوراً اس کا نقشہ تیار کروایا۔ بعد ازاں تیمور اور اس کی اولاد نے جتنی عمارتیں تعمیر کیں ان پر اس جیسا گنبد ضرور بنایا۔ صدہا سال بعد یہ ہندوستان میں تاج محل' نیز مغل بادشاہوں کے محلات کا تاج زینت بنا۔ روس میں ہر گرجے کا گنبد بھی ایسا ہی ہے۔

1401ء میں تاتاری فوجوں نے واپس آتے ہوئے فرات کے کنارے کچھ دن شکار بازی میں گذارے۔ ایک قاصد بغداد سے گڑبڑ کی خبریں لایا تو تیمور کو جنوبی شاہراہ پر روانہ ہونا پڑا۔ اس کی فوجیں آرام کئے بغیر دو سال سے جنگیں لڑتی آ رہی تھیں۔ ان دنوں شدید گرمی کے باعث وادی دجلہ تنور بنی ہوئی تھی۔ تیمور بغداد سے نمٹ کر فوراً تبریز جانا چاہتا تھا۔ اس نے بغداد کا محاصرہ کر کے مضافات کو تباہ کیا۔ گرمی کے پیش نظر طویل محاصرہ کرنا دشوار تھا۔ سات روز بعد تیمور نے کڑی دوپہر میں ہلہ بولنے کا حکم دیا۔ اچانک حملے سے شہر فتح ہو گیا اور مظالم کا خوفناک سلسلہ شروع ہوا۔ دارالاسلام بغداد جہنم کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ تیمور نے تمام عبادت گاہوں کو گرانے کا حکم دیا۔ ترکوں کے خلاف پیشقدمی موسم کے لحاظ سے قرین مصلحت نہ تھی' چنانچہ تاتاریوں نے لڑائی اگلے سال پر ملتوی کی۔

1402ء کا موسم گرما شروع ہوتے ہی مشرقی یورپ کے فاتح بایزید یلدرم نے فاتح ایشیا

تیمور کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج مجتمع کی۔ تیمور ترکوں کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ سیواس میں پہنچا تو یلدرم نے ساٹھ میل دور انقرہ میں مستقر قائم کیا۔ آٹھویں دن خبر ملی کہ تاتاری اس کے جنوب میں پہنچ چکے ہیں اور اب تیزی سے انقرہ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ تیمور ایک سو میل کا فاصلہ صرف تین دن میں طے کر کے انقرہ پہنچ گیا۔ یلدرم بارہ میل پیچھے ہٹ کر منتظر تھا۔ تیمور نے پانی کے تمام چشمے اور دریا کا راستہ بند کرا دیا۔ تھکی ماندی اور بھوکی پیاسی ترک فوج تلواریں نیاموں سے نکلنے سے پہلے ہی ہار چکی تھی۔ تیمور نے اپنے پوتے کو سربیا پر حملے کرنے بھیجا۔ بادشاہ پیٹر ہلاک ہوا۔ بایزید یلدرم کی طاقت اور کم ہو گئی۔ اس کی فوجوں میں انتشار پھیل گیا۔ کہتے ہیں جب یلدرم کو پکڑ کر تیمور کے پاس لایا گیا تو وہ اپنے خیمے میں شاہ رخ کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ تیمور نے اس سے بہت اچھا سلوک کیا۔ مگر اس کے سامنے اس کی کنیزوں کو بے پیراہن کر کے محفل رقص و سرود سجائی۔ ان کنیزوں میں بادشاہ پیٹر کی بہن بھی شامل تھی جسے یلدرم نے مذہب تبدیل کرائے بغیر ہی نور نظر بنا رکھا تھا۔ اس بے عزتی اور تضحیک کے باعث یلدرم چند ماہ بعد ہی مر گیا۔

ترکوں نے پہلی لڑائی میں ہی زبردست شکست کے بعد دوبارہ مقابلہ نہ کیا۔ انقرہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بروصہ نیقیہ پر تاتاریوں نے قبضہ کر لیا۔ ترک شہزادے یورپ میں پناہ گزین ہوئے۔ ایک مہینے کے اندر اندر ایشیا میں ایک بھی ہتھیار بند نہ رہا۔ یورپ کے بادشاہ یلدرم کی شکست سے خوش بھی تھے اور خوفزدہ بھی ہنری ہشتم اور فرانس کے شہنشاہ چارلز ششم نے تیمور کو مبارکباد کے خطوط اور تحائف روانہ کیے۔ شہنشاہ قسطنطنیہ نے اطاعت نامہ بھیجا۔ جینوآ نے بھی تیموری علم لہرا دیا۔ تیمور نے یورپ میں داخل ہونے کی کوشش ہی نہ کی۔ شاہزادہ محمد کی موت نے اسے شدید صدمہ پہنچایا۔

بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں تیمور کے ذہن میں زندہ تھیں۔ چنانچہ اس نے منصوبہ بنایا کہ صحرائے گوبی میں داخل ہو گا اور دیوار چین سے گذر کر دنیا کی آخری طاقت کو زیر کرے گا۔ مگر سالہا سال کی جنگوں نے حکومتی انتظامات اور سپاہیوں کا برا حال کر دیا تھا۔ لہٰذا موسم بہار میں وہ سمرقند روانہ ہوا۔ واپس پہنچ کر اس نے انتظامی امور میں دلچسپی لی۔ مگر وہ 70 سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ بینائی کمزور ہونے لگی۔ اپنا خاتمہ قریب دیکھ کر اس نے دو ماہ تک جشن منانے کا حکم دیا۔ پیرانہ سال فاتح نے ایک معسکر' ایک باغ اور شہر تیتوں کو ملا کر جو جنت بنائی تھی اس میں شاندار طریقے سے جشن منایا گیا۔ جشن کے اختتام پر تیمور نے شہزادوں کی مجلس مشاورت طلب کر کے چین فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ برفباری زوروں پر تھی مگر تیمور کہاں رکنے والا تھا۔

تاتاری فوج نے جب سمرقند کا دریا عبور کیا تو تیمور نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے شہر کی طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولا۔ شاید نظر کمزور ہونے کی وجہ سے اسے سمرقند کے مینار اور گنبد نظر نہ آئے تھے۔ نومبر کے مہینے میں شمالی سطح مرتفع کی دنیا سفید ہو چکی تھی۔ دریائے سیر پر تین فٹ موٹی برف کی تہہ جمی تھی۔ اترار اور خطا کی شاہراہ پر انہوں نے موسم سرما گذارا اور تیمور کے حکم پر ماہ مارچ 1405ء میں فوج پھر حرکت میں آگئی۔ نقارے پر چوٹ پڑی' نفیریاں بجنے لگیں۔ مگر یہ سلامی مردے کو دی جا رہی تھی۔ مرنے سے پہلے تیمور نے نور الدین اور شاہ ملک کو بلوایا اور اپنے پوتے پیر محمد کو جانشین مقرر کیا۔ وقائع نگار نے لکھا ہے کہ آخری سانسوں میں اس نے یہ الفاظ ادا کئے: "اب اس کے سوا اور کوئی تمنا نہیں کہ شاہ رخ کی صورت ایک بار پھر دیکھ لیتا۔ مگر یہ ناممکن ہے۔" ناممکن کا لفظ شاید زندگی میں پہلی بار اس کی زبان پر آیا تھا۔

امیر تیمور کے مر جانے سے تاتاری اپنا شہنشاہ ہی نہیں بلکہ سب کچھ کھو بیٹھے۔ تیمور کے بعد اب تک کسی اور انسان نے دنیا پر غلبے کی کوشش نہیں کی۔ وہ دنیا کا آخری فاتح تھا۔

سلطان محمد فاتح

(1455ء-----1510ء)

سلطان محمد 1455ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ سلطان مراد خاں نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی اور اس کے لیے بڑے بڑے لائق فائق علما کو مقرر کیا گیا۔ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمد فاتح اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ عربی' فارسی' لاطینی' عبرانی اور یونانی وغیرہ زبانوں میں پوری مہارت رکھتا تھا۔

ابھی سلطان محمد کی عمر بمشکل چودہ برس کی تھی کہ اس کے بڑے بھائی علاء الدین کی حکومت کے صدمے نے اس کے باپ سلطان مراد خاں کو دنیا سے دل برداشتہ کر دیا اور وہ سلطان محمد کو تخت پر بٹھا کر گوشہ نشین ہو گیا' لیکن ابھی چند ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ عیسائیوں نے یہ دیکھ کہ مراد خاں ایسے بہادر' نڈر اور عقلمند سلطان کی بجائے ایک چودہ سالہ بچہ حکومت کے تخت پر بیٹھا ہے' سلطنت عثمانیہ پر قبضہ کرنے کے ارادے قائم کر لیے۔

چنانچہ شاہ ہنگری نے پوپ کے اشارے پر کہ مسلمانوں کے ساتھ بد عہدی کرنے میں کوئی گناہ نہیں' عہد و پیمان کا لحاظ کیے بغیر عثمانی مقبوضات میں بلغاریہ پر حملہ کر دیا۔ شاہ ہنگری نے انجیل لے کر قسمیں کھائی تھیں اور دس برس کے لیے صلح کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اس وعدے کی پابندی بطور مذہبی فریضہ کے کرے گا۔ سلطان مراد کو گوشہ خلوت سے نکلنا پڑا۔ ابتداء میں عیسائیوں کا پلہ بھاری رہا لیکن عین اس وقت جب عیسائیوں کا جوش و خروش غضبناک صورت اختیار کر گیا' ترکوں نے کمال ہمت سے کام لے کر ان کے سرغنہ کا سر کاٹ لیا۔ ترکوں کے علم کی دوسری شاخ پر جب عیسائیوں نے شاہ ہنگری کا کٹا ہوا سر دیکھا تو ان کے سارے ولولے اور حوصلے ماند پڑ گئے اور لشکر میں آپا دھاپی پڑ گئی۔ پھر جب کسی نے موقع پایا وہ جان بچا کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ سلطان مراد خاں نے دوسری مرتبہ پھر سلطان محمد کو تخت پر بٹھا دیا اور گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن سلطنت ہنگری کے ایک جنرل جان ہونیاد نے

کئی مغربی امراء کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کر دی جس سے سلطان مراد خاں کو پھر گوشہ خلوت سے مجبوراً نکلنا پڑا۔ تین دن زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ آخر کار چوتھے روز جنرل جان ہونیاد حسب سابق میدان جنگ سے پھر بھاگ نکلا۔

دو برس بعد سکندریہ نامی ایک نو مسلم کی بیٹی سے سلطان محمد کی شادی ہو گئی۔ اس دوران سلطان محمد ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے مختلف شعبوں میں چھ سال تک تجربات حاصل کرتا رہا حتیٰ کہ وہ ساعت بھی آ پہنچی کہ دو مرتبہ کی تخت نشینی و معزولی کے بعد اکیس برس کی عمر میں مستقل طور پر تخت نشین ہو گیا۔ سلطان محمد فاتح اپنے باپ سلطان مراد خاں کے انتقال کے بعد 1479ء میں تیسری مرتبہ مستقل طور سے تخت نشین ہوا۔ تمام ہمسایہ سلطنتوں کے سفیر مبارک باد دینے کے لیے آئے مگر اناطولیا کے امراء نے اب بھی اسے ایک چودہ سالہ بچہ ہی خیال کیا اور اس ارادے سے کہ ترکان عثمانیہ نے ان کے جن مقبوضات کو فتح کر لیا ہے انہیں ترکوں سے چھین لیا جائے میدان کارزار گرم کر دیا۔ اگرچہ اس کے اور ترکوں کے درمیان کئی معرکے ہوئے تاہم سلطان محمد فاتح ہی ان پر غالب آیا۔

سلطان محمد فاتح کی فتوحات میں قسطنطنیہ سر فہرست ہے۔ جب وسیع پیمانے پر سامان جنگ مکمل کر لیا تو چیدہ چیدہ سپہ سالار' توپ خانہ اور زبردست بحری بیڑا لے کر 1481ء میں ایڈریانوپل سے قسطنطنیہ کے محاصرے کے لیے نکل پڑا۔ جہازوں کا بیڑا جو تین سو بحری جہازوں اور بہت سی باربردار کشتیوں پر مشتمل تھا گیلی پول میں تیار ہوا بحری و بری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ رومیوں نے مسلمانوں کے حملے سے بچنے کے لیے بڑے بڑے چودہ جہاز خلیج گولڈن ہارن کے دہانے پر کھڑے کر دیئے جس کے سبب مسلمانوں کو حملہ کرنے میں دشواری پیش آئی۔ سلطان نے یہ دیکھ کر بحری راستے کی بجائے بری راہ اختیار کی۔ سلطان محمد نے آبنائے باسفورس اور خلیج گولڈن ہار کے دوسرے سرے تک درمیانی پتھریلی زمین پر چھ میل تک لکڑی کے تختے ڈال کر روغن سے چکنا کر دیا اور پھر ان کے ذریعے راتوں رات خلیج گولڈن ہار سے اسی کشتیاں گزار کر انہیں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے پہنچا دیا۔ سلطان محمد کی فوج صبح ہوتے ہی فصیل کی طرف بڑھی۔ سلطان نے شہر کے کنارے کنارے پر فوج کو پھیلا دیا اور اپنا خاص جھنڈا سینٹ روما کے عین سامنے نصب کر کے فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کے دارالحکومت ایڈریانوپل میں جو ایک بڑی توپ تیار کرائی تھی وہ بارہ من وزنی پتھر کا گولہ ایک میل کے فاصلے پر پھینک سکتی تھی۔ اس توپ کو ایڈریانوپل سے یہاں تک لانے کے لیے پانسو جوڑیاں مضبوط اور توانا بیلوں کی لگی ہوئی تھیں اور تین ہزار سپاہی اس کی حفاظت پر مقرر تھے۔

اس توپ کے گولوں سے فصیل ٹوٹ گئی اور ترکوں کو کشتیوں سے نکل کر اس میں داخل ہونے کی امید پیدا ہو گئی۔ شہر پناہ کے گرد سو فٹ گہری خندق تھی جسے پاٹ کر ترکوں نے ایک اچھا خاصا راستہ بنا لیا اور پھر یہ سوچ کر کہ اب شام ہو گئی۔ صبح کو شہر میں داخل ہوں گے' رات کو وہیں پڑ رہے۔ لیکن رومیوں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر راتوں رات فصیل کی شکستہ دیواروں میں جتنے روزن اور رخنے پڑ گئے تھے ان سب کو پھر سے درست کر دیا اور خندق کی حالت بھی ویسی ہی کر ڈالی۔ اس کے علاوہ ٹوٹے پھوٹے برج بھی تیار کر دیے۔ دوسرے دن پھر معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔

پونے دو مہینے کی ناکام کوشش کے بعد اب ترکوں نے مغربی شہر پناہ کا رخ کیا۔ بری توپ خانے نے دھواں دھار گولہ باری کر کے رومیوں کے چار بڑے بڑے مورچوں اور برجوں کو ڈھا دیا۔ اسی طرح سینٹ روماس میں بھی بڑے بڑے رخنے اور شگاف پڑ گئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں فصیل کا بہت سا حصہ گر گیا اور وہ گہری خندقیں جو ترکوں اور شہر کے لوگوں کے درمیان حائل تھیں انہی برباد شدہ دیواروں سے پٹ گئیں اور ترکوں کے لیے پھر شہر میں داخل ہونے کا راستہ قطعی طور پر صاف ہو گیا۔

سلطان نے اس کے بعد دو مرتبہ پھر مصالحت کے لیے قاصد بھیجا اور کوشش کی کہ قیصر بغیر کشت و خون کے شہر ہمارے حوالے کر دے' لیکن اس نے دونوں بار نہایت سختی سے جواب دیا۔ اب سلطان نے مجبور ہو کر فوج کو عام ہلے کا حکم دے دیا اور اپنی فوج میں منادی کرا دی کہ شاہی عمارات کے سوا تمام مال غنیمت فوج کا حصہ ہے۔ عین اس وقت کہ جب بری فوج قسطنطنیہ کے شہر میں داخل ہو رہی تھی ترکوں کی بحری فوج نے خاص قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یونانی و رومی مقابلے پر آموجود ہوئے اور ایک آخری خوں ریز معرکہ ہوا۔ جس میں آخری فرماں روائے روم قیصر یازدہم مارا گیا اور قسطنطنیہ کے قدیمی اور تاریخی شہر پر اسلام کا علم بلند ہوا۔

کہتے ہیں فتح قسطنطنیہ کے موقع پر سلطان محمد فاتح صرف 26 سال کا تھا یعنی سکندر اعظم سے اس موقع پر جب اس نے گرانیکولس کی مہم سر کی ہے تین سال بڑا تھا اور نپولین لول سے جب اس نے معرکہ لودی میں کامیابی حاصل کی تین سال چھوٹا تھا۔ 1484ء میں عیسائی حکومتیں خم ٹھونک کر ترکوں کے مقابلے پر آ گئیں اور سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوئیں۔ سلطان محمد فاتح ڈیڑھ لاکھ فوج اور دو سو جنگی جہاز لے کر عیسائی حکومتوں کا مزاج بحال کرنے کے لیے مقابلے پر آ گیا اور سربیا کے دارالسلطنت بلغراد کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ دارالسلطنت کو فتح کر لے کہ ہنگری کا مشہور سپہ سالار ہونیا پھر کمک لے کر آ پہنچا۔ اس جنگ کے بعد سلطان نے 1487ء میں محمود پاشا صدر اعظم پھر تسخیر سربیا کے لیے

روانہ کیا اور اس نے آتے ہی سربیا کے تمام مقبوضات فتح کر کے دولت عثمانیہ میں شامل کر لیے۔ صرف ایک شہر بلغراد اس کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا کیونکہ اس نے سلطنت ہنگری میں شمولیت کر لی۔ تھی باقی تمام مقبوضات سلطنت عثمانیہ میں آچکے تھے۔1510ء میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ نے وفات پائی۔ شاہی مقبرے کے لیے جو زمین قسطنطنیہ میں اس نے پہلے سے مخصوص کی ہوئی تھی اسی میں دفن ہوا۔ اس کے زمانے میں حکومت کے تمام فوجی اور ملکی انتظامات نئے سرے سے ترتیب دیے گئے اور نئے نئے قوانین بھی وضع ہوئے مگر تعزیرات میں بجائے شرعی حدود کے جرمانے رکھے گئے۔

سلیمان عالیشان

(1494ء-----1566ء)

عثمان ترکوں کا سلطان سلیمان عالیشان 16ویں صدی کی طاقتور ترین شخصیات میں سے ایک تھا۔ وہ سلطنت عثمانیہ کا دسواں حکمران تھا۔ سلیمان عالیشان کی پیدائش 6نومبر 1494ء میں ترابی زوند (Trebizond) کے مقام پر ہوئی جہاں اس کا باپ (مستقبل کا سلطان سلیم اول) صوبائی گورنر تھا۔ اگرچہ ہمیں سلیمان عالیشان کے بچپن کے متعلق زیادہ کچھ معلوم نہیں لیکن سلطان سلیم اول کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ سلیم نہایت منہ زور قابل اور خطرناک آدمی تھا۔ سلطان بایزید دوم (سلیمان کا دادا) کے پانچ بیٹوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ترکی میں ولی عہد سب سے بڑے بیٹے کو بنانا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ خدایا باپ کی نظروں میں قابل بیٹا ہی جانشینی حاصل کرتا۔ بایزید کے خیال میں سلیم سب سے قابل تھا' جس نے باپ کا خیال درست ثابت کرنے کے لیے اس کے مرنے کا انتظار بھی نہ کیا اور تخت و تاج کا مطالبہ کرنے لگا۔ 1511ء میں جب سلطان مشرقی اناطولیہ میں ایک بغاوت کو فرو کرنے میں مصروف تھا تو سلیم نے بغاوت کر دی۔ باپ بیٹے کے مابین جنگ ہوئی جس میں باپ فاتح رہا۔ سلیم اپنے گھوڑے "کالا بادل" کی بے پناہ رفتار کے باعث جاں بچا کر بھاگ نکلا اور کریمیا کے تاتاریوں کے خان (اپنے سسر) کے پاس پناہ لی۔ وہاں وہ دوبارہ فوج اکٹھی کرنے لگا۔ سلطان کے باقی چار بیٹوں میں سے دو مر چکے تھے اور باقی دو امن پسند تھے۔ دارالحکومت قسطنطنیہ میں موجود افواج سلیم کو ہی سلطان بنانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ لڑائی کے کچھ ماہ بعد ہی سلطان بایزید سلیم کو کریمیا سے واپس بلانے پر مجبور ہو گیا۔ شدید جاڑوں کے موسم میں سلیم کو اپنے باپ کا خط موصول ہوا اور وہ تین ہزار سواروں کے ہمراہ دارالحکومت کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ باپ بیٹے کے حق میں دستبردار ہونے کے تین دن بعد ہی مر گیا۔ سلیم نے باقی دو بھائیوں کو گونگے بہرے افراد کے ایک گروہ سے قتل کروا دیا۔ اس کے بعد اپنے پانچ یتیم بھتیجوں کو ہلاک کروایا۔ سلیم نے اپنے آپ

اور ریاست کو محفوظ کرنے کے بعد مشرقی اناطولیہ میں چھاپہ مار کر چالیس ہزار شیعوں کو قتل کیا۔ عوام نے اسے "سلیم منصف" کا خطاب دیا۔ سلطان سلیم کا ظلم ترک زبان میں ضرب المثل بن گیا۔

اس قسم کے باپ کی نگرانی میں سلیمان کا بچپن آسان اور عام بچوں جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کہانیوں میں کوئی صداقت نہیں کہ وہ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔ دراصل سلطان سلیم میدان جنگ اور مختلف معرکوں میں اس قدر مصروف رہا کہ اپنے بیوی بچوں کو وقت نہ دے سکتا تھا اور سلیمان کی پرورش لازماً ماں نے کی ہو گی جس کا نام حفصہ یا حفیفہ خاتون تھا۔ جب سلیمان کا باپ سلطان بنا تو وہ بھی ایک دم گوشہ گمنامی سے نکل کر منظر عام پر آ گیا۔ بلوغت کے ابتدائی سالوں میں (جب سلطان سلیم اہل فارس کے خلاف جنگ اور مصر کے مملوکوں کو مفتوح کر رہا تھا) اسے ایڈریانوپل کا گورنر بنایا گیا۔ سلیم کی واپسی پر باپ بیٹے نے قسطنطنیہ میں پورا دن ساتھ گزارا' اور اگلے دن ہی سلیمان منیسا (Manisa) کی گورنری سنبھالنے روانہ ہوا جو ایشیائے کوچک میں واقع ہے۔ لیکن یہ عہدہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ رہا کیونکہ سلطان سلیم ترکی کے لئے عرصہ سے باعث پریشانی جزیرہ روڈز (Rhodes) پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا' لیکن 21 ستمبر 1520ء کو 54 سال کی عمر میں کینسر کے باعث مر گیا۔ اپنے نو سالہ دور میں اس نے شام اور مصر میں فتوحات کے ذریعہ ترک سلطنت کو بہت وسیع کر دیا تھا' اور عثمانی سلطانوں میں سب سے بڑا غارتگر اور قاتل ثابت ہوا۔

سلطان سلیم کی موت کو روایت کے مطابق خفیہ رکھا گیا۔ بالآخر یہ خبر اس وقت عام ہوئی جب آٹھ روز بعد یعنی 30 ستمبر 1520ء کو سلیمان قسطنطنیہ پہنچا اور عنان اقتدار سنبھالا۔ عوام اور فوج دونوں نے اسے قبول کر لیا کیونکہ اپنے ظالم باپ کی نسبت وہ کافی بہتر تھا۔ اس کے سلطان بننے کے کچھ دن بعد قسطنطنیہ میں رہنے والے ایک وینی ٹین نے اپنے ایک خط میں اس کے متعلق یوں بیان کیا: "وہ 24 سال کا اونچا لمبا لیکن دبلا اور زرد رنگت کا جوان ہے۔ اس کی گردن تھوڑی سے لمبی' چہرہ پتلا اور ناک عقابی ہے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں چھوٹی سی داڑھی اور ایک خوشگوار تاثر ہے۔ اسے عقلمند اور علم و فضل کا شوقین حکمران بتایا جاتا ہے۔ سب لوگوں کو اس کی حکومت سے اچھائی کی توقع ہے"

سلیمان کے ابتدائی اقدامات ان امیدوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نے عسکری رسالوں میں رقوم تقسیم کیں' 600 مصری قیدیوں کو آزاد کیا' تاجروں کے ساتھ اپنے باپ کے روا رکھے ہوئے برے سلوک کا خاتمہ کیا۔ اس نے مبینہ سفاک اور رشوت خور فوجی افسروں کے خلاف مقدمہ چلایا' فیصلہ کیا اور ان کی گردن ماری۔ ہر کوئی سلطان میں اسی نرمی اور سختی کا امتزاج دیکھنے کا

خواہاں تھا۔ لیکن اگر ان اصولوں نے ترک ریاست کی اندرونی زندگی کو نظم دیا تو اس کی خارجہ پالیسی پر مقدس جنگ کا تصور غالب تھا۔ ریاست کے وجود کا مقصد یہ تھا کہ نا قابل بھروسہ پڑوسیوں کے ساتھ جنگ وجدل کی جائے' انہیں تباہ کرنے کی بجائے اسلام میں شامل کرنے کی خاطر۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ سلیمان کا محل ان غلاموں سے بھرا ہوا تھا۔

سلیمان علیشان کو باپ سے ورثہ میں ملنے والی سلطنت دانیوب سے لے کر فرات تک پھیلی ہوئی تھی جس میں شمالی افریقہ کا مراکش تک کا علاقہ بھی شامل تھا۔ سلیمان عالیشان کی پہلی بڑی مہم 1521ء میں ہنگری کے بادشاہ لوئس دوم کے خلاف تھی جس کے نتیجہ میں بلغراد اس کے زیر نگیں آگیا۔ اگلے سال اس سینٹ جان کے نائٹس کو روڈز سے پرے دھکیل کر مشرقی میڈی ٹرینین کے تجارتی راستوں کو ان سے چھین لیا۔ 1526ء کے اوائل میں سلیمان نے فرانسیسی بادشاہ فرانس اول کے ساتھ ہیبس برگ کے شہنشاہ چارلس پنجم کے خلاف اتحاد کیا جس کے نتیجہ میں اسی سال ہنگری پر سلطنت عثمانیہ نے ایک اور دھاوا بولا۔ 29 اگست 1526ء کو موہاکس کے میدانوں میں ہونے والی جنگ میں بادشاہ لوئس زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ ترکوں نے کچھ عرصہ تک بوڈاپسٹ پر قبضہ رکھا لیکن یہ سلطنت میں اس وقت شامل ہوا جب 1529ء میں آسٹریا کے خلاف مہم کے دوران ویانا پر محاصرہ غیر کامیاب رہا۔ 1532ء میں ہیبس برگ کے علاقوں میں ایک اور یلغار کے بعد سلیمان عالیشان نے آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کا اصل مقصد یہ تھا کہ سلیمان عالیشان کو مشرقی صوبوں میں مسائل سے نمٹنے کا موقع مل جائے۔

سلطان سلیم اول نے اپنے دور میں اناطولیہ میں جن مخالف دین جاگیردارانہ عسکری عناصر کو دبایا تھا وہ سلیمان عالیشان کو یورپ کے ساتھ الجھا دیکھ کر عثمانیوں کے خلاف پھر سر اٹھانے لگے۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ مقامی مذہبی بغاوتوں میں حصہ لیا اور فارس کی صفوی طاقت کی حمایت کی۔ 1534ء میں سلیمان عالیشان کی فوجوں نے زبردست قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اناطولیہ کو پار کیا۔ فوج آذربائیجان میں داخل ہو کر جنوب کی جانب مڑی اور دسمبر کے آغاز میں بغداد میں داخل ہو گئی۔ گردونواح کی تمام آبادیوں سمیت بغداد باقاعدہ طور پر سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ یہ کامیابی شاندار تھی لیکن اس سے مشرقی صوبوں کی بنیادی بے اطمینانی کا خاتمہ نہ ہوا 1549ء میں تبریز میں اور پھر 1555ء 1553ء میں Nakhichevan کے خلاف مہم بھیجنا پڑی۔ دونوں موقعوں پر صفویوں نے جنگ کی اور بالآخر 1555ء میں قائم ہونے والے امن کے بعد بھی بیشتر بنیادی مسائل غیر حل شدہ رہے۔

تاہم مدیترانہ (Mediterranean) میں عثمانی بحری طاقت نے مشہور ایڈمرل باربروسا(خیر الدین' گورنر آف الجیریا) کی سرکردگی میں مسلسل آویزش کے ساتھ سپین' وینس اور جینوا کا تسلط ختم کر دیا۔ سلطان کی حفاظت میں جہازرانی کرنے والے ڈاکو جہازوں کے شمالی افریقی ساحل پر لگے ہوئے جھرمٹ اب دوبارہ شاہی مقاصد کے لیے روایتی قزاقی کرنے لگے۔ قزاق اب کہیں زیادہ بے خوفی دکھا سکتے تھے کیونکہ فوجی رسالے ان کی بندرگاہوں اور ساحلی علاقوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگرچہ 1535ء میں تیونس چارلس پنجم کے ہاتھ میں چلا گیا تھا لیکن 1538ء میں جزیرہ آیونیا میں اس کے مشہور ایڈمرل اینڈریاڈوریا کی شکست نے سمندری طاقت کو اسقدر مضبوطی کے ساتھ عثمانی ہاتھوں میں دے دیا کہ 1540ء میں قیام امن کے لیے وینس کو نرم رویہ اختیار کرنا پڑا۔ مدیترانہ کو ایک عثمانی جھیل میں تبدیل کرنے کی کوشش میں سلیمان عالیشان کو جس واحد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا وہ 1565ء میں مالٹا پر قبضہ میں ناکامی تھی۔ 1538ء میں ہندوستان میں پرتگیز کے خلاف بھیجی گئی بحری مہم نے ناکامیاب رہنے کے باوجود بحیرہ احمر اور سعودی عرب کی بندرگاہوں میں عثمانی طاقت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا تھا۔

دانیوبی طاقت کی حیثیت میں ہی سلیمان عالیشان کو سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہوا۔ اور 1541ء میں سارے وسطی ہنگری کو سلطنت میں شامل کرنے کے بعد ہی اس کی کامیابیاں یورپ کے لیے نتیجہ خیز رہیں۔ ان علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہیبس برگ کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ 1547ء میں ہیبس برگز نے ان علاقوں سے دستبرداری کے معاہدے پر دستخط کر دیئے لیکن پھر بھی ان کی سازشوں نے سرحدی خطوں کو مسلسل افراتفری کا شکار رکھا۔ اگرچہ 1562ء میں ایک نئے معاہدے کے تحت ان سے دوبارہ پہلے والی شرائط منوائی گئیں' لیکن ہیبس برگز عثمانی سلطنت کی توجہ دوسرے علاقوں کی طرف ہوتے ہی گٹھ جوڑ کرنے لگتے اور درحقیقت Szi-getvar کے خلاف ایک تادیبی مہم کی قیادت کرتے ہوئے ہی سلیمان عالیشان 7 ستمبر 1566ء کو دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلیم دوم سلطان بنا۔

قابل وزراء اور تربیت یافتہ بیوروکریسی کی مدد سے سلیمان عالیشان نے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی سلطنت کو جسمانی اتحاد دیا۔ فتوحات کے نتیجہ میں حاصل کردہ دولت نے ثقافتی شگفتگی کو فروغ دیا۔ ترک آرٹ' ادب اور فن تعمیر کے بہت سے بڑے بڑے نام اسی ثقافت سے وابستہ ہیں۔ سلیمان کے معمار سنان نے استنبول میں سلیمانیہ مسجد بنائی جو دنیا بھر کی مذہبی عمارتوں میں پرشکوہ ترین مثال ہے۔ سلیمان خود بھی اسی مسجد میں دفن ہوا۔ اس سے منسلک یونیورسٹی علم سے محبت کا

ایک اپنا تاثر رکھتی تھی۔

سلیمان عالیشان مناسب قابلیت کا حامل شاعر بھی تھا۔ اس نے جس شاعری کو فروغ دیا وہ عثمانی شاعری کا کلاسیکل انداز بن گئی۔ اس کے دور میں تاریخی تصنیفات بھی زبردست ترقی کے مرحلے سے گذریں اور نثر کے نئے معیار قائم ہوئے۔ اس کی پسندیدہ کنیز Hurrem اپنے بیٹے سلیم کو ولی عہد بنانا چاہتی تھی' اس لئے اس نے سلیمان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے دوسرے دو بیٹوں کو مارنے کا حکم دے۔

محمد علی جناح

(1876ء------1948ء)

دنیا میں چند لوگ ہی تاریخ کا دھارا موڑ سکے۔ اکا دکا افراد نے ہی دنیا کے نقشے میں تبدیلی پیدا کی۔ اور شاید ہی ایسا کوئی شخص ہو جس نے قومی ریاست قائم کی ہو۔ بانی پاکستان محمد علی جناح ان تینوں خوبیوں کے حامل تھے جو تاریخ پس منظر میں بے مثال بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی۔ ان کے بنائے ہوئے ملک کے باسی ہونے کے باوجود سرکاری طور پر ہمیں صرف ان کی تاریخ پیدائش' تاریخ وفات اور تعلیمی اسناد حاصل کرنے کی دیگر تاریخوں کے علاوہ مشکل ہی کچھ اور بتایا جاتا ہے۔ سیکولر سیاست میں ان کی کرشماتی شخصیت کا اثر آج بھی نظر سے اوجھل ہے۔

محمد علی جناح کی پیدائش کھوجوں (خواجوں) کے ایک خاندان میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1876ء ہے' تاہم امریکی مصنف سٹینلے وولپرٹ نے اپنی کتاب "جناح" میں لکھا ہے کہ کراچی میں جناح نے جس پہلے سکول (سندھ مدرستہ الاسلام) میں داخلہ لیا وہاں ان کی تاریخ پیدائش 20 اکتوبر 1875ء جبکہ پورا نام محمد علی جناح بھائی درج ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ جناح کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی اور وہاں کی میونسپلٹی نے پیدائش اور موت کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا سلسلہ 1879ء کے بعد شروع کیا۔ پیدائش کے وقت وزن کم ہونے کے باعث بچپن اور جوانی میں جناح کی صحت بہت کمزور رہی' اسی لئے انھیں "جناح" کہا جانے لگا (عربی زبان میں جناح کا مطلب "پر" ہے)

محمد علی جناح کے والد جناح بھائی پونجا شادی کے بعد گجرات کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ کھوجوں کے موروثی کاروبار یعنی تجارت نے انہیں بہت جلد ممتاز ترین روسا کی صف میں لا کھڑا کیا۔ محمد علی جناح چھ سال کے تھے جب ٹیوٹر انہیں پڑھانے کے لیے گھر پر آنے لگا۔ 1887ء میں ان کی پھپھو ملنے آئیں تو انہیں اپنے ساتھ بمبئی لے گئیں۔ نوجوانی کا زیادہ عرصہ انہوں

نے بمبئی میں ہی گذارا۔ جناح کو روایتی انداز میں رٹا لگا کر سبق یاد کرنے سے چڑ تھی۔ لہذا اسکول کی پڑھائی میں ان کا دل نہ لگا۔ ماں کو ان کی بہت فکر تھی۔ ان کا نام 23 دسمبر 1887ء تک سندھ کے مدرسہ کے رجسٹر میں درج رہا لیکن قلیل حاضریوں کی وجہ سے کاٹ دیا گیا۔ جناح کو ریاضی سے زیادہ گھڑ سواری کرنے اور شاعری پڑھنے کا شوق تھا۔ والدین نے انہیں گھر کے نزدیک ہی لارنس روڈ پر کرسچن مشن ہائی سکول میں داخل کروادیا۔ وہاں بھی انہوں نے چندماہ ہی گذارے۔ 1890ء تک جناح بھائی پونجا کا کاروبار اس قدر چمک چکا تھا کہ انہوں نے کئی بگھیاں اور اصطبل خرید لیا۔ ان کی فرم کراچی میں برطانیہ کی سرکردہ مینجنگ ایجنسی ڈگلس گراہم اینڈ کمپنی کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ تھی۔ اسی کمپنی کے جنرل مینجر سر فریڈرک کروفٹ نے محمد علی جناح کو بہت ذہن اور فطین پایا تو لندن میں اپنے مرکزی دفتر کو 1892ء میں ان کی اپرنٹس شپ کے لیے لکھ بھیجا۔ کراچی کے بڑے بڑے روساَ اپنی اولاد کی سفارش کے لیے سر فریڈرک کی منتیں کرتے رہے تھے لیکن جناح کی ذہانت نے انہیں بہ آسانی قائل کر لیا۔ والدہ مٹھی بائی نے اس پروگرام کی مخالفت کی۔ لیکن سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہو گئیں، مگر صرف اس شرط پر کہ انگلینڈ جانے سے پہلے جناح کی شادی کر دی جائے۔ کھوجہ برداری میں ہی پنیلی گاؤں کی ایک چودہ سالہ لڑکی ایمی بائی کا رشتہ دیکھا گیا۔ جناح کی عمر اس وقت بمشکل سولہ برس تھی۔ 1893ء میں شادی کے کچھ روز بعد ہی وہ اپنی کم سن بیوی کی زندگی سے نکل کر انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ واپسی سے پہلے ہی جناح کی بیوی اور والدہ دونوں وفات پا چکی تھیں۔

جناح کے والد نے ایک برطانوی بنک میں ان کے نام اتنی رقم جمع کروادی تھی کہ لندن میں تین سالہ قیام کے لیے ان کی ضروریات بہ آسانی پوری ہو سکیں۔ لندن میں ہوٹل کے کمرے میں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد وہ کنگسٹن میں 35 رسل روڈ پر تین منزلہ مکان میں منتقل ہو گئے۔ آج اس عمارت پر تختی لگی ہے: "بانی پاکستان نے 1895ء میں یہاں نام کیا" یہاں آکر جناح اپنا نام "ایم۔ اے جناح" لکھنے لگے۔ لیکن بعد ازاں لنکز ان کی ایک دیوار پر لفظ "محمد" لکھ کر رسول پاکؐ سے وابستگی کا ثبوت دیا جو آج بھی موجود ہے۔

انگلینڈ میں سیاست کی رنگا رنگ دنیا نے جناح کو مسحور کیا۔ 1893ء میں ہاؤس آف کامن میں دادا بھائی نوروجی کی پہلی تقریر سن کر وہ جوش سے بھر گئے۔ انہیں احساس ہوا کہ اگر ہندوستانی میں قابلیت ہو تو وہ برطانوی حکومت کے سامنے کھڑے ہو کر بھی انصاف کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ دادا بھائی کی تحریک انگیز مثال ہی کے باعث وہ وطن واپسی کے بعد آزادی پسند قومی تحریک میں جوش و خروش کے ساتھ داخل ہوئے۔ لندن میں قیام کے زمانے میں ہی وہ تھیٹر کے شوق میں مبتلا

ہوئے۔ 11 مئی 1896ء کو انگریز معاشرہ کے ایک بیرسٹر کی حیثیت سے انہوں نے لنکنز ان کے بنچرز کو بار کی ممبر شپ کے لیے درخواست دی۔ اب وہ برطانوی ہند میں کسی بھی عدالت کی بار میں شمولیت اختیار کر سکتے تھے۔ 16 جولائی 1896ء کو وہ واپس ہندوستان روانہ ہوئے اور بمبئی میں آئندہ پچاس سال کے لیے سکونت اختیار کی۔

اسی سال یعنی 1896ء میں بمبئی طاعون کی وباء کا شکار بھی ہوا تھا جس میں لاکھوں ہندوستانی اپنی زندگی کھو بیٹھے۔ جناح بمبئی ہائیکورٹ میں بطور بیرسٹر پریکٹس کرنے لگے۔ تین سال بعد ان کو اپنے پیشے میں کمال شہرت حاصل ہو گئی۔ سر چارلس نے انہیں 1500 روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنا ملازم بنانا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو مسترد کر دیا کہ میں جلد ہی اتنی رقم روزانہ کمانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ ان کی یہ بات درست ثابت ہوئی۔

سیاست کے میدان میں دادابھائی نوروجی اور بمبئی کی پارسی برادری کے ایک اور لیڈر فیروز شاہ مہتہ جناح کے لیے چراغ راہ تھے۔ دادابھائی نوروجی ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ نوجوان جناح بھی اسی انداز میں سوچنے لگے' جبکہ فیروز شاہ کے چیمبر میں انہوں نے بطور شاگرد کام کیا تھا۔ انہی کے توسط سے وہ کانگریسی سیاست میں متعارف ہوئے۔ سیاست اور لبرل ازم ان کی زندگی کا جزو بن گئے۔ وہ ایک بڑے پارلیمنٹرین بننا چاہتے تھے۔ انہیں قانون کی ہر شاخ پر زبردست عبور حاصل تھا۔ جب وہ امپیریل قانون ساز کونسل کے رکن بنے تو اس کے سب سے موثر غیر سرکاری رکن گوکھلے تھے۔ نوجوان جناح گوکھلے کے پرستار بن گئے۔ دونوں کونسل میں طاقتور اپوزیشن کا کردار ادا کرتے رہے۔ مسز سروجنی نائیڈو کے مطابق جناح اکثر کہا کرتے تھے کہ اس دور میں ان کی زندگی کا مقصد گوکھلے کے نقش پا پر چلنا تھا۔ 1910ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جناح نے بلدیاتی اداروں میں مذہبی بنیادوں پر جداگانہ طرز انتخاب متعارف کرانے کی سرکاری کوشش کی شدید مخالفت کی۔ 1913ء میں وہ اپنے ہم مذہبوں کے شدید اصرار پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اپنی شمولیت کے فوراً بعد ہی انہوں نے ایک قرارداد میں کہا: "آل انڈیا مسلم لیگ کا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے عوام کی ترقی کا انحصار باہمی تعاون پر ہے جس کے لیے انہیں فرقہ وارانہ اختلافات کو پس پشت ڈالنا ہو گا۔" اب مسلم لیگ اور کانگریس میں کشیدگی زائل ہونے لگی۔ 1915ء میں دونوں جماعتوں نے بمبئی میں اپنے علیحدہ علیحدہ اجلاس منعقد کیے اور زبردست ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا۔ اگلے برس لکھنو میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جناح نے کہا "ہندوستان کی ترقی کا راز ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد میں پنہاں ہے۔" اسی سال کانگریس اور لیگ میں معاہدہ "میثاق

لکھنو'' بھی ہوا جس نے ہندو مسلم اتحاد کی قوی امید پیدا کر دی۔ اس سے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی وہ خلیج بھی پر ہو گئی جو 1907ء میں پیدا ہوئی تھی۔

1917ء میں جناح نے اینی بسانت کی ہوم رول لیگ کی قیادت سنبھالی۔ اس دور میں گاندھی کی شہرت عروج پر تھی۔ انہوں نے لیگ کا نام بدل کر سوراجیہ سبھا رکھنے کے لیے جنرل اجلاس طلب کیا۔ جناح اور چند دیگر بانی ارکان نے ان کی مخالفت کی اور احتجاجاً استعفے دے دیے۔ مسز بسانت اور جناح نے تاعمر گاندھی کو ہوم رول لیگ کی تباہی اور اس کے مقصد کو خاک میں ملاتے جیسے ناقابل تلافی جرم پر معاف نہ کیا۔ 1919ء کے دسمبر میں کانگریس کے اجلاس میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری قوم اور رہنما سب کچھ بھلا دینے اور معاف کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ عدم تعاون جیسی غیر دانشمندانہ تحریک شروع کر کے حکومت کو دوبارہ بدل کیا جائے۔ لیکن لارڈ کیننگ کے الفاظ میں "ایک انسانی ہاتھ سے بھی چھوٹا بادل تحریک خلافت کی صورت میں نمودار ہوا۔" گاندھی بھی اس تحریک میں کود پڑے جس کے نتیجہ میں ہندوستان پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹے جن کے اثرات سے وہ نکل نہیں پایا۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور جناح نے اب بھی ان کی مخالفت کی۔ گاندھی نے یکم اگست 1920ء کو تحریک عدم تعاون کا اعلان کیا تو کانگریس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن انہوں نے ستمبر کے اجلاس میں 2728 ووٹوں میں سے 1855 ووٹ حاصل کر لیے۔ جناح کے سوا تمام مسلم شرکاء نے گاندھی کے حق میں ووٹ دیئے۔ لیکن جناح کو ان کے آئینی راستے سے کوئی نہ ہٹا سکا۔ ہم مذہبوں میں عدم مقبولیت کا خوف بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ جب انہوں نے اپنی تقریر میں مسٹر گاندھی اور مسٹر محمد علی جیسے الفاظ استعمال کیے تو مجمع میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ مطالبے کے باوجود انہوں نے مہاتما اور جوہر کے الفاظ نہ بولے۔ گاندھی نے جناح سے بھی تحریک عدم تعاون کی حمایت کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے جواب دیا: "میں آپ کا لائحہ عمل قبول نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے ہر منصوبے کے لیے ناکامی کا باعث بن سکتا ہوں" اپنی مخالفت کے باوجود جناح حکومت کے جال میں نہیں پھنسے۔ جنوری 1922ء میں انہوں نے بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کی۔ سب نے حکومت اور کانگریس کو اعتدال پسندانہ رویہ اپنانے کا مشورہ دیا' لیکن بے سود۔ 1923ء میں جناح مرکزی مجلس قانون ساز اسمبلی میں بطور آزاد امیدوار منتخب ہو گئے۔ انہوں نے فوج میں ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ بھرتی پر زور دینے کے لیے مجلس میں اپنا کام جاری رکھا۔

نومبر 1927ء میں سائمن کمشن کا اعلان کیا گیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے اس موقع پر ہاؤس

آف کامن میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی سیاستدانوں کو چیلنج کیا کہ اگر انہیں کوئی برطانوی فارمولہ پسند نہیں تو اپنے ملک کے لیے کوئی متفقہ آئین تیار کر کے لائیں۔ اسی سال دسمبر میں کانگریس نے اپنے اجلاس میں اس کام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے کر نہرو کو سربراہ بنایا۔ نہرو کی رپورٹ کی تدوین کے وقت جناح یورپ میں تھے اس لیے اس پر بحث میں شرکت نہ کر سکے، مگر کنونشن میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کی ترقی ایسے ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے جس کی بنیاد سیاسی اور سماجی انصاف پر ہو۔ سائمن کمیشن کے سلسلہ میں مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ جناح کی زیر قیادت دھڑا کانگریس کی حمایت میں کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا علمبردار تھا جس سے لارڈ برکن ہیڈ اس قدر سیخ پا ہوا کہ اس نے لارڈ ریڈنگ اور سر جان سائمن کو ایسے حربے آزمانے کی ہدایت کی کہ جناح کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے اور وہ بالکل تنہا رہ جائیں۔ آل انڈیا نیشنل کنونشن میں جناح نے ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کرتے ہوئے کہا: ”میں مسلمانوں کو ہندوستانی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ میری خواہش یہی ہے کہ سات کروڑ مسلمان شانہ بشانہ ہو کر آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔“

مارچ 1929ء میں نہرو رپورٹ پر بحث کے لیے مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا جس میں شدید اختلاف دیکھنے میں آیا۔ جناح نے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو اکٹھا کر کے اپنے معروف چودہ نکات پیش کیے۔ 19 جون کو جناح نے اپنے پرانے دوست اور نئے وزیر اعظم رامسے میکڈونلڈ کو لکھا ”موجودہ ڈیڈ لاک کی صورتحال اگر جاری رہی تو میرے نکتہ نظر سے یہ ہندوستان اور برطانیہ دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔“ چنانچہ انہوں نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اپنی تجاویز پیش کیں جن کے نتیجے میں لندن میں تین اہم گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ جناح نے ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں شروع کیں اور گاندھی، نہرو، سپرو اور پٹیل کے ہمراہ 23 دسمبر کو نیو دہلی میں وائسرائے کے گھر گئے۔ ہندوستان کو خود مختار حیثیت دینے کے حوالے سے گاندھی اور جناح کی رائے ایک جیسی نہیں تھی۔ گاندھی نے ایک دم مکمل آزادی کے نعرے لگائے اور کہا کہ کانفرنس سے پہلے ہی اس کا وعدہ کیا جائے۔ جناح کا خیال تھا کہ جب کانفرنس کا انعقاد ہی اس سلسلے میں ہو رہا ہے تو وہاں بات کرنی چاہئے لیکن گاندھی اور نہرو ان کا نکتہ نظر تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ دراصل وہ یہ ماننے پر تیار نہ تھے کہ کوئی مسلم مسئلہ موجود بھی ہے۔ مسلم لیگ میں جناح کا حامی گروپ بھی اب خاموش بیٹھا ہوا تھا جبکہ کانگریس کا پلیٹ فارم بھی قابل رسائی نہ رہا۔ کانگرس نے 26 جنوری 1930ء کو ”پورن سوراج“ دن منایا۔ جناح کو مالابار پر اپنے گھر میں بیٹھے یہ سب

دیکھتے رہے۔ ان کے خیال میں گاندھی "اچانک سیاسی ہسٹریا میں مبتلا ہو گئے تھے" ہندوؤں کے ساتھ ساتھ انہیں مسلمانوں پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے تضادات اور غیر مختتم دلائل بازیوں نے انہیں تھکا دیا۔ 4 اکتوبر کو بمبئی سے لندن روانہ ہو گئے۔

1931ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وفد کی سربراہی آغا خان نے کی۔ جناح نے کانفرنس کی فضا کو اپنے مزاج کے موافق نہ پاتے ہوئے اس میں کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا۔ علاوہ ازیں وہ کسی کے "نمبر دو" ہونے کا کردار ادا کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ اپنی بیوی رتی کی وفات اور ہندوستان کے سیاسی واقعات پر بحد ناخوش تھے چنانچہ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے لندن ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے ہمپسٹڈ میں ایک گھر خرید لیا اور پریوی کونسل میں وکالت کرنے لگے۔ بعد ازاں گاندھی اور کانگریس کی ہائی کمان سے دلبرداشتہ ہونے کے بعد انہوں نے کہا: "گول میز کانفرنس کی نشستوں نے مجھے شدید دھچکا پہنچایا--- میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں رہی مجھے اپنے ملک (ہندوستان) کے متعلق شدید مایوسی ہوئی۔ حالات نہایت خراب تھے۔ مسلمان تو نو میز لینڈ کے باشندوں کی طرح رہ رہے تھے۔ ان کی قیادت برطانوی حکومت کے کمتر اور سطحی سیاستدان یا کانگریس کے حلقہ بگوش رہنما کر رہے تھے...... مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میں ہندوستان کی مدد کر سکتا ہوں نہ ہندوؤں کی ذہنیت بدل سکتا ہوں۔ خود کو بے بس محسوس کرنے کی وجہ سے ہی لندن میں رہنے کا فیصلہ کیا۔" گول میز کانفرنس کے موقع پر وہ ایک درمیانی راستے کے خواہش مند تھے لیکن ان کی کوششوں کو خود مسلمان رہنماؤں نے' جنہیں وہ نااہل اور خوشامدی کہتے تھے' اور مذہبی جنونی ہندو لیڈروں نے ناکامی سے دوچار کر دیا۔ 1934ء کے اختتام پر جب وہ انگلینڈ میں ہی مقیم تھے' انہیں بمبئی کے ایک مسلم حلقے سے ہندوستانی قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ اسمبلی کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے جنوری 1935ء میں ہندوستان آئے۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں انہوں نے کہا: "ذاتی طور پر میں کیمونل ایوارڈ سے ہرگز مطمئن نہیں اور دوبارہ ایک فرد کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ جب تک ہم خود اپنے لیے کوئی منصوبہ نہ تیار کر لیں اس وقت تک میری عزت نفس کو اطمینان حاصل نہ ہو گا۔" جناح کی صلح جو تقریر سے اسمبلی کے تمام فریقوں میں باہمی گفت و شنید کی امید پیدا ہوئی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک مخصوص طبقہ ان کی قوم پرستی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر کڑی تنقید کے باعث انگریز بھی انہیں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ مارچ 1936ء میں شہید گنج کی ایک عبادت گاہ پر قبضہ کے لیے ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو

گئی۔ جناح نے اس موقع پر لاہور میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم ہر مسئلے کا حل آئینی اور پرامن ذرائع سے حل کریں گے...... ہمارے سامنے متعدد راستے کھلے ہیں۔ اپنے برادر مذہبی گروپ کو دھمکانے یا خوفزدہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... ایک آبرومندانہ معاہدے سے بڑھ کر ہمارے لیے کیا بات خوش کن ہوگی......" علامہ محمد اقبال' راجہ نریندر ناتھ' سردار بوٹا سنگھ اور دیگر رہنماؤں کی مصالحتی کمیٹی نے یہ جھگڑا حل کر دیا۔ گورنر پنجاب نے اس پر جناح کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ 38-1937ء کے دوران جناح نے گاندھی سے ذاتی رابطے کی بھرپور کوشش کی تاکہ کانگریس اور لیگ کے جھگڑے طے کیے جاسکیں۔ لیکن ان کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر بیان جاری کیا: " میں مسلمانوں اور قوم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ماضی کے واقعات سے رتی بھر بھی متاثر نہیں ہوا اور ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان کسی آبرومندانہ معاہدے کا مجھ سے بڑھ کر کوئی خیر مقدم نہیں کرے گا" جناح صرف اس وقت ترش ہوئے جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی مصالحتی کوششوں کو حقارت سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ تاہم ابھی ہندو اور مسلمان دو الگ سیاسی دھڑوں کی صورت میں ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں آئے تھے۔ 1937ء کے انتخابات میں کانگریس نے بنگال' سندھ اور پنجاب کے سوا 7 صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی۔ پنجاب میں بھی مسلم لیگ کی بجائے یونینسٹ پارٹی نے مسلم نشستوں کی اکثریت جیتی۔ بنگال کی کل 485 نشستوں میں سے بھی مسلم لیگ کو صرف 108 حاصل ہوسکیں۔ اس کامیابی نے نہرو کو مغرور بنا دیا اور وہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر کوئی اہمیت نہ دینے لگے۔ انہوں نے جب کہا کہ "ہندوستان کے سیاسی ارتقاء میں صرف دو فریق ہیں--- کانگریس اور انگریز" تو جناح نے فوراً جواب دیا: " ایک تیسری جماعت بھی ہے---- مسلمانوں کی' جسے نظر انداز کرنا کانگریس کے لیے خطرے اور تباہی کا باعث بن سکتا ہے" مسلمانوں کو بھی اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کانگریس کے دست نگر ہو گئے ہیں۔ بعض مجالس قانون ساز میں کارروائی کا آغاز بندے ماترم سے ہونے لگا تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ گاندھی نے خصوصی سکولوں کا نام ودیا مندر رکھا تو ان کے مذہبی جذبات مشتعل ہوئے۔ مسلمانوں کو انتظامی اور معاشی میدانوں میں دبانے کے ساتھ ساتھ اردو کا گلا گھونٹ کر فروغ ہندی کی کوششیں شروع کی گئیں تو یوپی کے مسلمانوں نے کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ 7 اکتوبر 1937ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جناح نے کہا: " اسقدر معمولی اختیارات ملنے پر ہی اکثریتی فرقے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔"

جناح اب ذہن بنا چکے تھے کہ مسلم اقلیت کو ہندوؤں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑیں

گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دو قومی نظریے کو حتمی شکل دینا شروع کی جو کچھ عرصہ سے ان کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ مارچ 1940ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس عام منعقدہ لاہور میں انہوں نے اپنے جو خیالات پیش کیے وہی پاکستان کی اساس بنے: "ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو یکسر علیحدہ مذہبی فلسفوں' سماجی رسومات اور ادب سے ہے۔ ان کا اور ہمارا طرز حیات قطعی مختلف ہے۔" انہوں نے مسلم اکثریتی علاقوں کو "آزاد ریاستیں" بنانے کا خیال پیش کیا۔ وہ اب جنگ کے راستے پر چل نکلے تھے۔ جناح ایسا آئین چاہتے تھے جو مسلم ہندوستان کی بنیادی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کے حق خود ارادی کی ضمانت دیتا ہو۔

جنگ عظیم دوم نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان پر اپنا نو آبادیاتی تسلط ختم کر دے۔ چنانچہ 22 مارچ 1942ء کو سر سٹیفورڈ کرپس حکومت برطانیہ کی جانب سے ایک قرارداد لے کر آئے کہ وہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے' لیکن جنگ کے جاری رہنے تک حکومت ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ گاندھی کے پر غرور رویے کے باعث کرپس مشن 11 اپریل 1942ء کو واپس چلا گیا۔ گاندھی نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ میں پھنسے ہوئے برطانیہ کو مجبور کر کے اپنی شرائط پر سوراج حاصل کر لیں۔ 14 جولائی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی حمایت میں قرارداد پیش کی تو جناح نے اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا: "یہ مسٹر گاندھی اور ان کی انگریزوں کو بلیک میل کرنے والی ہندو کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کا نکتہ عروج ہے۔ کانگریس انہیں مجبور کرنا چاہتی ہے کہ وہ اسے ایک نظام حکومت تشکیل دینے کی اجازت دیں اور اقتدار اس حکومت کو منتقل کر دیں جو فوراً ملک میں ایک ہندو راج قائم کر دے گی اور مسلمانوں و دیگر اقلیتوں کے مفادات کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گی۔"

اب حالات کی باگ دوڑ کافی حد تک جناح کے ہاتھوں میں آنے لگی تھی۔ گاندھی نے ان سے مذاکرات کی کوششیں شروع کیں اور گجراتی زبان میں خط لکھ کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جناح نے مغروری نہ دکھائی۔ تاہم 1944ء میں 18 دن جاری رہنے والی طویل گاندھی جناح بات چیت 27 ستمبر کو کانگریس کے لیے کسی سود مند نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی' جبکہ دوسری طرف جناح کے لیے یہ ایک واضح فتح تھی کیونکہ انہوں نے پاکستان کی جنگ آغاز ہی آدھی سے زیادہ جیت لی تھی۔ اس سے جناح کی پوزیشن اور وقار میں اضافہ ہوا اور مسلم لیگ کی کاز بے حد مضبوط ہو گئی۔ بنگال اور پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے محسوس کیا کہ ممکنہ تقسیم سے وہ تباہ ہو جائیں گے۔

جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے بعد لیگ اور کانگریس کے درمیان متفقہ آئینی معاہدہ کے لیے ایک اور کوشش کی گئی۔ شملہ کانفرنس نے اپنی کارروائی کا آغاز 25 جون 1945ء کو کیا۔ ایک رائے کے مطابق جناح چاہتے تو فرقہ وارانہ مسئلے کا خوشگوار حل نکل سکتا تھا۔ لیکن وہ گذشتہ 25 سال سے گاندھی اور نہرو کی پالیسیاں اور رویہ دیکھتے آئے تھے۔ وائسرائے کی جانب سے جناح کے مطالبات کو اعتدال پسند مسلمان سیاستدانوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دینا مسلمانوں کو اشارہ تھا کہ صرف اور صرف جناح ان کے ایماء پر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی جناح کی عظیم فتح تھی۔ تقسیم کے حامی مسلمانوں کو اتنی تقویت ملی کہ یونینسٹ پارٹی کی سیاست بھی گہنا گئی۔ جناح پہلی مرتبہ پنجاب کی سیاست میں بلند ترین مقام پر پہنچے۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی ہر شعبے میں حیران کن تھی۔ جناح نے 1937ء میں نہرو کو جس خطرے سے متنبہ کیا تھا وہ 1946ء میں ایک واضح اور اٹل حقیقت بن گیا۔ پاکستان کے تصور نے بالائی طبقے کے مسلمانوں اور مسلم عوام کو ایک قابل فخر مواد فراہم کیا۔ اب ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ جناح کے ہاتھ میں تھا۔

اگرچہ کابینہ مشن نے لیگ کی پوزیشن کا اندازہ کر لیا تھا لیکن وہ ابھی آزاد پاکستان کی تخلیق کے لیے پوری اور حتمی طور پر تیار نہ تھا۔ مشن کے اراکین نے متحدہ ہندوستان کے اندر ہی مسلم اکثریتی علاقوں کو خود مختاری دینے کا منصوبہ پیش کیا جس پر جناح نے شدید تنقید کی۔ قبل ازیں 6 جولائی کو کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نئے صدر نہرو نے ایک نہایت غیر دانشمندانہ اور اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ پھر 10 جولائی کو پریس کانفرنس میں بیان دیا کہ آئین ساز اسمبلی برطانوی پالیسی بیان کے باوجود ایک خود مختار ادارہ ہو گی۔ یہ کسی بھی شرط کی پابند نہیں ہو گی اور غالب امکان ہے کہ یونین آف انڈیا کی تشکیل کے بعد صوبوں کی کوئی "گروہ بندی" نہیں ہو گی۔ مسلم لیگ کے کیمپ میں اس بیان سے اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا اور "راست اقدام" کے لیے 16 اگست کی تاریخ مقرر کی۔ کلکتہ میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ 16، 17 اور 18 اگست کو کلکتہ میں بھیانک قتل عام کی صورت میں راست اقدام اپنے عروج کو پہنچا۔

پاکستان کے قیام کا مطلب گاندھی کے خوابوں کا خاتمہ تھا۔ انہوں نے منصوبہ سازی کر کے کابینہ مشن کو سبوتاژ کرانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ بالآخر 22 مارچ 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے ہند کی حیثیت سے دہلی پہنچے۔ سردار پٹیل اور پنڈت نہرو فوراً ہی ماؤنٹ بیٹن کے آدمی بن گئے جس کے نتیجہ میں گاندھی کی سیاست کا سورج ڈوب گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے

تقسیم ہند کا منصوبہ مکمل کر کے برطانوی کابینہ سے پوری حمایت حاصل کر لی۔ جناح کو یقین تھا کہ انگریز انہیں ایک طاقتور پاکستان دینے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں' چنانچہ انہوں نے دباؤ بڑھانے کی خاطر مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملانے کے لیے 800 میل طویل راہداری کا مطالبہ کیا۔ گاندھی اور نہرو سمیت کانگریس کے تمام رہنما اپنی جنگ ہار چکے تھے۔ ہندوستان کا صرف ایک رہنما جناح اپنے خوابوں کے حصول کی جانب بڑھ رہا تھا۔ 14 اگست 1947ء میں پاکستان کی شکل میں یہ خواب مجسم حقیقت بن گئے۔

تاریخ اسلام میں یہ اعزاز محمد علی جناح ہی کو حاصل ہوا کہ انہوں نے ایک طویل آئینی' سیاسی اور نظریاتی تحریک کے سربراہ کی حیثیت میں برصغیر میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیے' جو باہم دگر نہ صرف غیر منظم تھے بلکہ ملک بھر میں بکھرے ہوئے تھے' ایک علیحدہ قوم کی حیثیت میں حق خود ارادیت تسلیم کروا کر پاکستان کی شکل میں ایک نئی ریاست دنیا کے نقشے پر تخلیق کی۔ یہ ریاست آبادی کے لحاظ سے دنیا کی پانچویں اور مسلم ممالک میں سب سے بڑی ریاست بن کر ابھری۔ پاکستان کا قیام دور حاضر کی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جناح کے ہم مذہبوں نے جس قدر اعتماد ان کی ذات پر کیا اس سے پہلے کسی سیاستدان کو یہ منصب حاصل نہ ہوا۔

جناح کی نظر میں حصول پاکستان بذات خود مقصد نہ تھا بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ منزل کی جانب اہم قدم تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کے ذریعہ اسلام کا نظام عدل معاشرہ میں نافذ کیا جاسکے۔ انہوں نے لاہور میں اپنی تقریر کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ اسلام اور پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے ابھی مزید قربانیوں کی ضرورت ہے اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مساوات' حریت اور بردباری کے اسلامی اصولوں کا کئی بار ذکر کیا۔ غیر مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے بھی قائد نے پیغام ربانی کی روح کو پیش نظر رکھا۔

جناح نے 11 اگست 1947ء کو بطور نامزد گورنر جنرل' معمار پاکستان' صدر مسلم لیگ اور آئین ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت میں منتخب دستوری ایوان کے روبرو اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے پیروکار برابر کے شہری ہوں گے۔ یہ تصور سب سے پہلے حضورؐ نے میثاق مدینہ تحریر و تکمیل کرتے وقت پیش کیا تھا کہ ریاست میں مسلم اور غیر مسلم ایک امت یعنی سیاسی وحدت تصور کیے جائیں گے۔ اسلامی معاشرتی و سیاسی قوانین کو سامنے رکھنے کے باوجود قائداعظم محمد علی جناح نے کبھی بھی پاکستان کو تھیوکریٹک ریاست بنانے کی بات نہ کی۔ تھیوکریسی

ریاست کی وہ قسم ہے جس میں حکومت کے قوانین احکام خداوندی سے منسوب کیے جاتے ہوں یا جہاں حاکم اعلیٰ خدا یا خدا کا اوتار یا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ فروری 1948ء کو اپنی ایک تقریر میں انہوں نے کہا : "بہر صورت پاکستان تھیوکریٹک ریاست نہیں ہونے والا جہاں ملاؤں کی حکومت ہو، جن کا خیال ہے کہ ان کو الوہی فریضہ سونپ دیا گیا ہے۔" ان ملاؤں نے دسمبر 1947ء میں ہی وزراء پر تنقید شروع کر دی تھی تاکہ اپنی اہمیت جتا سکیں۔ قائداعظم نے انہیں بس یہی کہا کہ پاکستان کی عمر ابھی صرف چند ماہ ہے۔ لیکن تاریخ عالم میں اپنی طرح کے اس واحد لیڈر کو قیام پاکستان اور اپنی وفات کے دورانیے میں ابھی شاید بہت کچھ بکھرتے دیکھنا تھا۔ 21 مارچ 1948ء کو انہوں نے ڈھاکہ میں تین لاکھ افراد کے مجمع سے خطاب کیا۔ یہ ان کا آخری بڑا عوامی خطاب تھا جو انہوں نے انگریزی میں دیا۔ انہوں نے بنگالی بولنے والے سامعین کو صاف الفاظ میں بتایا کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اور صرف اردو ہو گی۔ انہیں زندگی نے اس بات کی مہلت نہ دی کہ وہ دوبارہ مشرقی پاکستان آ کر یہ دیکھ سکیں کہ اپنی زبان چھن جانے پر بنگالیوں کے جذبات کیا ہو گئے تھے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں قریبی ساتھیوں کے ساتھ جناح کے تعلقات میں تیزی سے انتشار پیدا ہونے لگا۔ وہ اپنے احکامات پر عملدرآمد نہ ہوتے دیکھ کر بہت ناراض ہوتے تھے۔ انہیں آرزو تھی کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی اپنی تخلیق کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھ سکیں ۔ وزیراعظم لیاقت علی کا کام کے انداز ان کی نظر میں تسلی بخش نہ تھا۔ وزیراعلیٰ پنجاب نواب ممدوٹ بھی قائد کو مطمئن نہ کر پائے کیونکہ وہ مہاجرین پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ملک کے لیے دن رات تن تنہا محنت نے ان کی طبیعت پر منفی اثرات مرتب کیے۔ جون 1948ء میں قائداعظم اور فاطمہ جناح زیارت کوئٹہ چلے گئے جہاں پر فضا ماحول نے انہیں کچھ راحت دی۔ 14 جون کو کوئٹہ سٹاف کالج کے آفیسرز سے خطاب کرتے ہوئے یقیناً قائداعظم کی بگڑتی ہوئی صحت اور حکومتی رہنماؤں سے ناراضگی کے اسباب ہی ظاہر ہوئے تھے : " پاکستان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو ہی فی الحال بطور آئین اپنایا ہے جس کے مطابق ایگزیکٹو اتھارٹی کا مرکز حکومت پاکستان کے سربراہ یعنی گورنر جنرل ہیں۔ چنانچہ آپ کی طرف آنے والا کوئی بھی حکم ایگزیکٹو سربراہ کی منظوری کے بغیر نہیں آسکتا۔"

زیارت کا لفظی مطلب "مدفن" ہے۔ قائداعظم اس الگ تھلگ علاقے میں واقع زیارت میں پھیپھڑوں کے کینسر کے باعث اذیت ناک دن گذارتے رہے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے مرض کی تشخیص کے بعد اپنے لاہور میں واقع ہسپتال کو تار بھیج کر پورٹیبل ایکسرے مشین اور تین بہترین

سپیشلسٹ منگوائے۔ لیاقت علی خان نے آکر ان کے پاس آدھا گھنٹہ گزارا۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب " قائد کے آخری ایام" کے صفحہ 6 پر لکھا ہے کہ لیاقت علی خان کے جانے کے بعد قائد اعظم نے کہا تھا "جانتے ہو یہ کیوں آیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کتنی دیر تک زندہ رہوں گا۔" زیارت کی آب و ہوا قائد اعظم کے کمزور ہوتے ہوئے دل اور گردوں کے لیے بہت منفی اثرات کا باعث بنی۔ کورامائین کے انجکشن اور الٹراوائلٹ تھراپی بے فائدہ رہی' کرشماتی دوا سٹرپٹومائی سین بھی ناممکن کو ممکن نہ کر سکی۔ 14 اگست کو پہلے یوم آزادی کے موقع پر ڈاکٹر بخش نے انہیں کوئٹہ شہر جانے کا مشورہ دیا' لیکن محترم گورنر جنرل نے جواب دیا: " یہ ناممکن ہے"

15 اگست کی صبح پاکستانی شہریوں کے نام قائد اعظم کی طرف سے اخبارات میں جو بیان شائع ہوا اس کا آخری فقرہ تھا: " میں آپ سب کو مبارک دیتا ہوں جو وزیر اعظم کی زیر قیادت کام کر رہے ہیں" سٹینلے وولپرٹ کے خیال میں یہ "پیغام" زیارت کی بجائے کراچی سے جاری ہوا تھا۔ اگست کے تیسرے ہفتے میں قائد اعظم کو کچھ کھانے کی طلب محسوس ہونے لگی اور انہوں نے حلوہ پوریاں کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر انہیں روزانہ کچھ دیر سہارا دے کر چلایا کرتے تھے' لیکن قائد اعظم انہیں وقت کی پابندی نہ کرنے پر ڈانٹتے۔ انہوں نے ساری زندگی ہمیشہ وقت کی پابندی کی تھی۔ اس دوران ان کا وزن گھٹتے گھٹتے صرف 80 پونڈ رہ گیا۔ ان کے پاس موجود ہر شخص کو اندازہ تھا کہ انہیں مزید زندہ رکھنے کے لیے فوری طور پر دارالحکومت لے جانا لازمی ہے۔ قائد اعظم نے ڈاکٹر سے تمباکو نوشی کرنے کی اجازت مانگی۔ وہ گزشتہ 30 سال سے روزانہ تقریباً Craven A 50 سگریٹ پیتے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے روزانہ صرف ایک سگریٹ پینے کی اجازت دی' وہ بھی اس شرط پر کہ دھواں پھیپھڑوں میں نہیں لے کر جائیں گے۔ ڈاکٹر الہی بخش نے اپنی کتاب " قائد اعظم کے ساتھ زندگی کے آخری چند دن" میں لکھا ہے کہ " سگریٹ نوشی سے انہیں لطف اندوز ہوتے دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی' لیکن اگلی صبح ان کے بستر کے پاس پڑی ایش ٹرے میں چار سگریٹوں کے جلے ہوئے باقی حصے پڑے تھے...... پوچھنے پر قائد نے کہا: لیکن آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ دھواں اندر لیجانا نقصان دہ ہو گا۔ ان کے اس شاہانہ مزاج کی بحالی کو ہم ان کی بحالی صحت کی علامت خیال کر کے خوش ہوئے۔" سگریٹوں کا دھواں ان کے پھیپھڑوں کو ٹھیک تو نہ کر سکا' تاہم ڈاکٹر نے انہیں واپس کراچی جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن قائد اعظم "معذور" بن کر وہاں نہیں جانا چاہتے تھے۔ "مجھے کار سے سٹریچر پر اپنے دفتر میں جانے سے نفرت ہے۔"

28 اگست کے بعد انہوں نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا۔ زندگی کے باقی دن انہوں نے کافی اور چائے پی کر گزارے تاکہ گولیاں کھا سکیں۔ ستمبر میں قائد اعظم کو تپ دق اور پھیپھڑوں کے کینسر کے ساتھ ساتھ نمونیہ بھی ہو گیا۔ قائد اعظم کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر ایم اے ایچ

اصفہانی کو تار بھیجی گئی کہ وہ منی سوٹا میں میو کلینک کے ڈاکٹر ہنشا کو کوئٹہ بھجوانے کا بندوبست کریں۔ ڈاکٹر بخش نے کراچی سے ڈاکٹر ایم اے مستری کو بھی بلا بھیجا۔ 9 ستمبر کی صبح کو مستری زیارت پہنچے جنہوں نے معائنے کے بعد کہا کہ اب کسی امریکی ڈاکٹر کے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ ڈاکٹر بخش کے مطابق اس روز قائداعظم یہ کہتے ہوئے نڈھال ہو کر بستر پر گرے کہ ...... "کشمیر کمشن کی آج میرے ساتھ اپائنٹمنٹ تھی' انہوں نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ وہ کہاں ہیں؟" 11 ستمبر 1948ء کی دوپہر کے وقت گورنر جنرل کی Viking اور دو ڈکوٹا ہوائی جہاز ان کے سٹاف اور سامان کو لینے کوئٹہ پہنچے۔ قائداعظم کو جب سٹریچر پر ڈال کر گاڑی میں لیجایا جارہا تھا تو پائلٹ اور عملے نے لائن میں کھڑے ہو کر انہیں سلیوٹ کیا جس کا جواب انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دیا۔ دو گھنٹے کی پرواز کے بعد وہ موری پور ایئر فورس بیس پر اترے لیکن وہاں ان کا استقبال کرنے کو کوئی موجود نہ تھا۔ صرف ایک سال قبل جب وہ پاکستان کو ایک عظیم قوم بنانے کی امیدیں لیے یہاں آئے تھے تو ہزاروں افراد نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ قائداعظم کو ایمبولینس میں کراچی کی طرف لیجایا گیا جبکہ ڈاکٹر حضرات ان کی نئی کیڈیلک لیموزین میں بیٹھے۔ "میرا بھائی جناح" میں محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ "ابھی ہم نے چار یا پانچ میل کا سفر طے کیا تھا کہ ایمبولینس تھرتھرا کر اچانک رک گئی۔ باہر نکلی تو مجھے بتایا گیا کہ پٹرول ختم ہو گیا ہے' لیکن ڈرائیور انجن کے ساتھ الجھا ہوا تھا...... ہوا بند تھی اور مرطوب گرمی سانس بند کیے دے رہی تھی...... جناح کے لیے مکھیوں نے نئی مصیبت پیدا کر دی اور ان میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ انہیں اڑا سکتے...... نرس اور میں دوسری ایمبولینس کے انتظار میں ان پر سے مکھیاں اڑاتے رہے...... ایک ایک لمحہ اذیت ناک تھا۔ انہیں کیڈیلک میں بھی منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ سٹریچر اس میں پورا نہ آتا (فاطمہ جناح نے ملٹری سیکرٹری کو ایمبولینس لانے بھیجا) میں نے جناح کی نبض دیکھی تو اسے بہت کمزور اور سست پایا...... قریب ہی مہاجرین کی سینکڑوں جھونپڑیاں موجود تھیں۔ مہاجرین اپنے کاموں میں مصروف رہے اور یہ نہ جانتے تھے کہ ان کو وطن بنا کر دینے والا قائد ان کے درمیان ہی بیار و مددگار پڑا ہے۔ کاریں اور بسیں پاس سے گذرتی رہیں۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ تک انتظار کیا۔"

آخر کار شام کو چھ بجے وہ گورنر جنرل کے ہاؤس میں پہنچے۔ قائداعظم دو گھنٹے سوئے۔ آخر کار آنکھیں کھولیں اور بولے "فاطی......" پھر ان کا سر دائیں جانب کو جھک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں' پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ وفات کے وقت ان کا وزن صرف 70 پونڈ رہ گیا تھا۔ اگلے ہی دن انہیں کراچی میں دفن کر دیا گیا۔ آج قائداعظم کے سنگ مرمر کے مقبرے پر باوردی جوان پہرہ دے رہے ہوتے ہیں۔

امام روح اللہ خمینی

(1902ء-----1989ء)

امام خمینی دنیائے اسلام کے عظیم دانشوروں کی صف میں ایسے مفکر ہیں کہ اسلامی حکومت کے قیام کے سلسلے میں ان کا بنیادی نظریہ ولائت فقیہ ان کی زندگی میں ہی زیر عمل آیا۔ انہیں یہ مقام پندرہ سال تک ایک نظریاتی تحریک کی قیادت کے بعد حاصل ہوا۔ اسلامی حکومت کے بارے میں امام خمینی کا نظریہ اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی جان ہے۔ دنیا بھر نے اس نظریئے پر مبنی آئین کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔

اسلامی انقلاب کا ایک دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ اب اسلام کا مسئلہ دنیا بھر کے سیاستدانوں اور دانش وروں کے سامنے آگیا ہے۔ گذشتہ دو سو سال تک اسلام کو زوال و انحطاط سے منسلک کر دیا گیا تھا مگر اب صورتحال اس کے برعکس تبدیل ہو چکی ہے۔ اسلام بطور ضابطہ حیات بھی قبول کیا جا رہا ہے اور ثابت ہو رہا ہے کہ اسلام کسی بھی عہد کے مسائل سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

امام کہتے ہیں کہ قرآن میں نوے فیصد احکامات معاشرتی زندگی سے متعلق جبکہ باقی احکام عبادات و مناجات اور اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان رشتے کے بارے میں ہیں۔ بعض احکامات اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ باقی سب کچھ انسان کی معاشرتی زندگی' معاشیات' سیاسیات اور انسانی حقوق کے بارے میں ہیں۔

اسلام میں انسان کی مہد سے لحد تک کی زندگی کے بارے میں مخصوص قانون اور ضابطہ موجود ہے۔ یہ تمام ضابطے محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ امام خمینی یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ ہم نے بادشاہت' شہنشاہیت اور تخت نشینی کے ضابطے کہاں سے حاصل کئے ہیں؟ یہ سب کچھ ان کے نزدیک اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ بلکہ اسلام نے صدیوں پیشتر ان کو موقوف کر دیا تھا۔ ایران'

مشرقی روم 'مصر' چین اور دوسرے ملکوں میں انہیں نابود کر دیا گیا تھا۔ رسول اکرمؐ نے قیصر و کسریٰ کو جو خط لکھے تھے ان میں انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ شہنشاہیت ختم کریں' لوگوں سے زبردستی اپنی پرستش کرانا بند کریں اور انہیں اللہ کی عبادت پر راغب کریں۔

امام خمینی کے نزدیک خلیفہ کا واحد منصب یہ ہے کہ وہ قانون بنائے۔ اس کا فرض ہے کہ تمام قوانین نافذ کرائے اور اس مقصد کے لئے حکومت کا وجود ضروری ہے۔ اسلامی قوانین کا فروغ اور معاشرے کو ان کے ثمرات سے نوازنا تمہارا فرض ہے۔ اس ذمہ داری کا احساس دلا کر امام کہتے ہیں مت بھولو کہ اسلامی حکومت کا قیام آپ پر فرض ہے۔ آیئے خالی ہاتھ سہی مگر کام کا آغاز کرتے ہیں' مغرب زدہ لوگوں اور سامراج کے گماشتوں سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔

امام کے نزدیک قانون کا کوئی بھی پلندہ خود بخود معاشرتی اصلاح نہیں کر سکتا۔ قانون کو نافذ کرنے والی طاقت معاشرتی تبدیلی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ امام کہتے ہیں کہ حضورؐ کے وصال کے بعد خلیفہ کا انتخاب بہت ہی ضروری تھا کیونکہ اگر خلیفہ منتخب نہ کیا جاتا تو رسول کریم کا مشن نامکمل رہ جاتا۔ اس لئے کہ رسول کریمؐ کے رحلت کر جانے کے بعد مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ایمان اور عقیدے کو زندہ رکھنے کے لئے اسلامی قوانین نافذ کرتا۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے بہترین دلیل اور جواز خود رسول اکرم کا اسوہ حسنہ ہے۔

امام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی قوانین کسی خاص عہد یا علاقے کے لئے مخصوص نہیں۔ ان کا نفاذ تو ابد تک ہونا ہے۔ اور اگر رسول اکرمؐ کے بعد وہ اب بھی قابل نفاذ ہیں تو پھر انہیں نافذ کرنے کے لئے اسلامی حکومت کا قیام ضروری ہے۔ اگر ایسی حکومت قائم نہ کی گئی تو پھر لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے میں معاشرتی' اخلاقی اور معاشی خلفشار پیدا ہوگا۔

امام نے یہ موقف اختیار کیا کہ اسلامی قوانین کے مزاج کا فطری تقاضا ہے کہ حکومت بنائی جائے۔ یہ قوانین اپنے منہ سے بولتے ہیں کہ حکومت کے بغیر موزوں سماجی اور سیاسی ادارے بنائے بغیر وہ نافذ ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ قوانین انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہیں اور اسے تنظیم دیتے ہیں۔ قرآن ہر شے کو آئینہ کی طرح روشن اور واضح کر دیتا ہے۔

ریاست کے مالی امور کے متعلق امام کہتے ہیں کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی سال بھر کی بچت کا پانچواں حصہ اسلامی حاکم کو ادا کرے تاکہ یہ سرمایہ سرکاری خزانہ میں جمع ہو۔ اس بہت بڑی رقم سے سیدوں یا مولویوں کو وظائف دینا مقصود نہیں بلکہ اس آمدن سے حکومتی اخراجات پورے کیے جائیں گے۔

عقل اور شریعت کا تقاضا ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں کو مسلط رہنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس لئے کہ غیر اسلامی سیاسی نظام کا وجود اسلامی نظام کو معطل کر دیتا ہے۔ ہر غیر اسلامی سیاسی نظام اپنے وجود و نفاذ کے باعث اسلام سے نافرمانی یا سرتابی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو مسلط کر کے ہم شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

امام کہتے ہیں کہ ہر چند عثمانی حکمران نااہل تھے (ان میں سے بعض عیاش بھی تھے) لیکن دشمنان اسلام کے لئے وہ بھی ناقابل برداشت تھے کیونکہ انہیں یہ خدشہ رہتا کہ مبادا اہل اور وفادار لوگ نہ سامنے آجائیں جو ملت کو متحد کر لیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کو دس پندرہ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا اور ان کے سربراہ ایسے پتلے بنا دیئے گئے جو دشمنان اسلام کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہے۔ معصومہ عالم کے خطبے کا حوالہ دیتے ہوئے امام خمینی کہتے ہیں کہ امامت کا منصب اسلامی نظام کا ضامن اور اتحاد عالم اسلام کا تحفظ فراہم کرتا تھا۔

اسلام کا طریق حکمرانی آج کے حکمرانی کے نظام سے مختلف ہے۔ اسلامی نظام ایسی مطلق العنانی پر مبنی نہیں جس میں حاکم کو لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو عوام کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے اور جو چاہے خرچ کرنے میں آزاد ہے۔ وہ جسے چاہے قتل کر دے جسے چاہے نواز دے' من مرضی سے کسی کو زمین کا تحفہ دے دے اور اپنی مرضی سے سرکاری خزانے لٹا دے۔ اسلامی حکومت یک رخی نہیں بلکہ قرآن کے ضوابط کی پابند ہوتی ہے اور اسے ہر صورت حدیث اور اسلامی قوانین کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ اسلام میں حکومت کا مطلب ہے قرآن کی تقلید اور وابستگی۔ اسلامی معاشرہ میں قانون حاکم ہوتا ہے۔ رسول کریمؐ اور ان کے خلفاء کو ملنے والے اختیارات عطیہ ربانی تھے۔ اگر اس قسم کی حکومت قائم رہتی تو لوگوں کو اپنی زندگی اور اپنی جائیداد گروی نہ رکھنا پڑتی' یہاں کوئی فقیر نہ ہوتا۔

وہ پھر کہتے ہیں "ایک خسیس مسلمانوں پر حکومت نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایک بے خبر (قانون سے) کیونکہ وہ اپنی بے خبری کے باعث لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ اسی طرح حاکم ترش رو اور سخت نہیں ہونا چاہیے وہ لوگوں کو ناراض کرے گا۔ حاکم کو دوسری حکومتوں سے خائف بھی نہیں ہونا چاہئے ورنہ اس طرح ایک سے دوستی کرے گا اور دوسرے کی ناراضگی مول لے گا۔ حاکم بدعنوان بھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ لوگوں کے حقوق غصب کرے گا اور کسی بھی شخص کو اس کا جائز حق نہیں لینے دے گا۔ حاکم شریعت اور اسلامی قوانین کو معطل کرنے والا بھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ امت کو گمراہ کرے گا۔ امام یاد دلاتے ہیں کہ حکمرانی اور قیادت کے لیے علم اور انصاف ضروری

صفات ہیں۔

امام خمینی کا موقف ہے کہ قاضی صرف اور صرف اسلامی احکام کے تحت فیصلہ کرے۔ حاکم اللہ رسولؐ اور اماموں کے تابع فرمان رہیں۔ جب بھی کوئی تنازعہ پیدا ہو تو خواہ یہ دیوانی نوعیت کا ہے یا فوجداری' ایک فرد یا گروہ کے حقوق دوسرے فرد یا گروہ کے ہاتھوں غصب ہونے کا' اسے ہر صورت قاضی کے سپرد کیا جائے۔ تنازعات کے فیصلوں کے بارے میں قرآن میں جو احکامات ہیں ان کے مطابق عدلیہ اور انتظامیہ کے ادارے ہونے چاہیں۔

امام خمینی کے انداز فکر کے مطابق نبی اور رسولؐ میں فرق ہے۔ رسولؐ اپنا پیغام نشر کرتا ہے جبکہ نبی مخصوص پیغامات کی تشریح اور تعبیر کرتا ہے۔ علماء نبی کے جانشین ہوتے ہیں اور نبی کو حکمرانی کا حق حاصل ہے' چنانچہ علماء کو بھی ان کے مرتبے کے مطابق حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ مگر چند کلمے پڑھنے سے تو علما کو یہ استحقاق حاصل نہیں ہو جاتا۔ ان کے فرائض اور بھی ہیں اور وہ بہت مشکل ہیں۔

امام خمینی رسول کریمؐ سے منسوب ایک قول سے دلیل لاتے ہیں کہ علماء عوام پر حکمرانی کے مجاز ہیں۔ حضرت امام حسینؓ حضرت علیؓ کے اس قول کے راوی ہیں کہ حکومت فقہا کی ہونی چاہیے جو عدم مساوات پر مبنی تمام قوانین منسوخ کریں' عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کریں تاکہ وہ (عوام) اسلامی حکومت قائم کرنے میں مدد دیں۔ شریعت کے خلاف جانے والے تمام اقدامات روکے جائیں۔

بعض علماء نے شاہ ایران پر اس کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں اسے جل جلالہ کا خطاب دیا۔ یہ لوگ فقیہ نہیں ہیں۔ امام خمینی کہتے ہیں کہ ہمیں ایسے علماء سے اپنے ایمان کی پناہ مانگنی چاہیے ورنہ یہ ہمارا ایمان بھی برباد کر دیں گے۔ ان کی حقیقت بے نقاب کی جائے اور ان کا تمسخر اڑایا جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم عہد حاضر کے امام اور اسلام دونوں کے لئے بدنامی کمائیں گے۔
امام خمینی 1989ء میں فوت ہوئے۔

جن کتب سے مدد لی گئی

کتاب	مصنف
سیرت النبیؐ	ابن ہشام
سیرت النبیؐ	علامہ شبلی نعمانی
تاریخ طبری	علامہ ابن جریر الطبری
تاریخ ابن خلدون	علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون
تاریخ ابن کثیر	علامہ حافظ ابن کثیر دمشقی
فلسفہ اسلام	ٹ۔ج دوبوئر
ابن رشد	موسیو رینان
دس ولی	سعدی سنگروری
دس فاتح	بشیر احمد سعدی
نامور مسلمان خواتین	علامہ اسلم جیراجپوری
تذکرۃ الاولیاء	فرید الدین عطار
معروف مسلمان سائنسدان	اردو سائنس بورڈ
مشرق کے عظیم مفکر	لیان پی۔ مک گریل
اسلامی افکار و شخصیات	قرۃ العین عابدی
ولایت فقیہہ امام خمینی	سید افضل حیدر
پاکستان کی صوفیانہ تحریکیں	عبدالمجید سندھی
حضرت عمرؓ بن الخطاب	سید عمر تلسمانی
حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ	ڈاکٹر طٰہٰ حسین
حضرت عثمانؓ	ایضاً
حضرت علیؓ	ایضاً
اسلام منزل بمنزل	ایضاً
فجر الاسلام	احمد امین مصری
مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان	علامہ عبدالوحید خان

عرب	ول ڈیورانٹ
سیرت عائشہؓ	سید سلیمان ندوی
دیوان شمس تبریز	ریانلڈ نکلسن
مسائل فلسفہ	برٹرینڈ رسل
جناح	شیٹلے والپرٹ
جناح اور گاندھی	ایس کے موجمدار
واقعات دارالحکومت دہلی	بشیر الدین احمد
غالب خصوصی مطالعہ	پروفیسر جمیل احمد انجم
دیوان غالب	اسد اللہ غالب
تحقیقات چشتی	نور احمد چشتی
ہیر	وارث شاہ
رباعیات سرمد	سرمد
کلام شاہ حسین	شاہ حسین
دنیا کے عظیم سائنسدان	مرتب: رقیہ جعفری، سرفراز احمد
وحدت الوجود تے پنجابی شاعری	علی عباس جلالپوری
مقامات وارث شاہ	ایضاً
سائیں بلھے شاہ	جے آر پوری
دیوان	منصور حلاج
BAUDELAIRE	ژاں پال سارتر
امیر تیمور	ہیرلڈ لیم
تزک تیموری	امیر تیمور
وجودیت اور انسان دوستی	ژاں پال سارتر
سید حال	نجم حسین سید
ساراں	ایضاً
سچ سدلبادی کرناے	ایضاً
نہج البلاغہ (خطبات)	حضرت علی کرم اللہ وجہہ

اسلامی کتب

سیرت مصطفیٰ	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی	۱۴۰/
تفسیر مظہری (اعلیٰ)	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی پانی پتی	۱۸۰۰/
رسول اکرمؐ اور ان کے خلفاء (طلباء کے لیے)	ادارہ	۸۰/-
تذکرہ غوثیہ	مولانا شاہ گل حسنؒ	۱۳۵/
حدائق بخشش	حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی	۶۰/
حصن حصین کلاں (بڑی)	امام محمد بن محمد الجزریؒ	۹۰/
حصن حصین خورد (چھوٹی)	امام محمد بن الجزریؒ	۷۸/
جنتی زیور	حضرت شیخ الحدیث علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۱۲۰/
عجائب القرآن	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
غرائب القرآن	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
عجائب القرآن وغرائب القرآن		۱۰۰/
کرامات صحابہ	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/-
انوارالحدیث	مولانا جلال الدین احمد مجددیؒ	۱۱۰/-
سفیران محمدؐ	مسعود مفتی	۲۰۰/-
سفیران خدا	مسعود مفتی	۲۰۰/-
سب لکیریں ہاتھ کی	مطیع الرحمٰن خان	۳۰۰/-
روزہ اور میڈیکل سائنس	حکیم جاوید اصغر	۱۸۰/-
حیات حضور پاکؐ	ارشد محمود	۸۱/-
حضرت عائشہ (ہماری اچھی مائیں)	حکیم شرافت حسین	۲۷/-
اقوال زریں	آصف رضا	۳۶/
سوانح بابا فرید گنج شکرؒ (خورد)	شبیر حسن چشتی نظامی	۳۶/-
سوانح بابا فرید گنج شکرؒ (کلاں)	شبیر حسن چشتی نظامی	۴۵/-
درود وسلام کا حسین مجموعہ		۳۰/-
پاکستان کی اسلامی اساس اور جدید تقاضے	کے۔ ایم۔ اعظم	۳۰۰/-
گر تو برا نہ مانے	امیر نواز خاں نیازی	۱۰۰/-

کلمہ حق	محمد نواز خاں میرانی	۲۰/-
عرفان الٰہی	ڈاکٹر غلام حسین قادری	۵۰/-
حضرت محمدؐ اور خلفائے راشدین	حکیم اشرف حسین رحیم آبادی	۵۰/-
لبیک (سفرنامہ حرمین شریفین)	ممتاز مفتی	۱۱۰/
حکایات شیریں	مدیر آئینہ	۳۶/
شرکائے احد	آغا اشرف	۳۶/-
سلطان ٹیپو شہید		۲۱/-
شیر شاہ سوری	مقصود ایاز	۲۱/-
سلطان محمود غزنوی	مقصود ایاز	۲۱/-
سلطان صلاح الدین ایوبی		۲۱/-
محمد بن قاسم		۲۱/-
خالد بن ولید	مقصود ایاز	۳۹/-
طارق بن زیاد	آغا اشرف	۳۹/-
پتھروں کے اثرات		۵۰/-
شہد غذا بھی اور علاج بھی	آغا اشرف	۳۳/-
سوانح خواجہ غریب نواز	شبیر حسن چشتی نظامی	۳۶/
سوانح خواجہ قطب الدین بختیار کاکی	شبیر حسن چشتی نظامی	۳۶/-
مثالی نظام تعلیم	مسز طاہرہ منہاس	۱۵۰/-
روح تصوف	شبیر حسن چشتی نظامی	۳۹/-
حیات علامہ اقبال	آغا اشرف	۳۶/-
حیات قائداعظم	امین نواز	۳۶/-
ام الکتاب (صورت فاتحہ)	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۳۵/-
غبار خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۵۰/-
لالہ زار	علامہ ارشد القادری	۸۱/-
موت کا منظر (انگلش)	خواجہ محمد اسلام	۹۰/-
المنجد عربی و اردو ڈکشنری		۴۵۰/-
المنجد (اعلیٰ)		۴۸۰/-

مصباح اللغات (مکمل عربی اردو ڈکشنری)		۳۰۰/-
مصباح اللغات مکمل عربی اردو ڈکشنری (مجلد ذاتی ادارہ)		۳۳۰/-
قادری اوراد و وظائف (نقشبندی)	حامد سلطان قادری	۱۶۰/-

حکیم محمد طارق محمود عبقری مجذوبی چغتائی کی کتب

ماں کا تقدس	حکیم محمد طارق محمود	۱۱۰/-
باپ کا تقدس	حکیم محمد طارق محمود	۱۱۰/-
غلطیوں کی اصلاح نبوی طریقہ اور جدید سائنس	حکیم محمد طارق محمود	۱۳۰-
کامیاب شادی کے سترہ اصول نبوی طریقے اور جدید سائنس	حکیم محمد طارق محمود	۱۳۰/-

وظائف / طب و حکمت

وظائف عملیات رحمانی	صوفی محمد اشفاق صابری چشتی	۳۶/
عملیات و تعویزات سبحانی	صوفی پیر مصائب علی حنفی چشتی	۳۶/
مجموعہ اوراد و وظائف	مولانا شاب قادری	۹۰/-
زیتون کی ڈالی (طب نبویؐ کی روشنی میں)	ڈاکٹر عائشہ درانی	۱۵۰/-
جڑی بوٹیوں سے علاج	راشدہ مہ گل	۴۰/-
برگ شفا - درختوں سے علاج	راشدہ مہ گل	۴۰/-
سورج سے علاج	قمر تسکین	۲۵/-
حاذق اطفال	حکیم جمیل اصغر	۱۲۰/-
عورتوں کے جنسی مسائل اور ان کا حل	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ (انڈیا)	۳۹/-
جنس اور ستارے	آغا اشرف	۲۸/-
ہاتھ میں کیا ہے (دست شناسی پر ایک جامع کتاب)	ایچ محمد آدم آدم	۴۵/-
مسمریزم (مسمریزم پر جامع کتاب)	آغا اشرف	۳۶/-
کیرو کی پامسٹری	آغا اشرف	۳۹/-
پتھروں کے اسرار	شاہد محمود	۵۰/-
آپ کی شخصیت ستار	راشدہ مہ گل	۴۲/-
بیوٹی کوئیکشن	ثمینہ شاہ	۱۲۰/-
گھریلو ٹوٹکے	ثمینہ شاہ	۱۳۰/-

بیکری کا انسائیکلوپیڈیا	روبینہ شاہ	۱۵۰/-
۲۰۰ مچھلی کے ذائقے دو چائینز کھانے	روبینہ شاہ	۱۸۰/-
خزینہ مشکل کشا		۲۰۰/-
پاکستان لوٹنے میں کس کا کتنا ہاتھ		۲۰۰/-
الصلوٰۃ الرسولؐ		۲۰۰/-
کتاب الشفاء		۶۰/-
کلمہ طیبہ سے دین و دنیاوی بیماریوں کا علاج		۶۰/-
آیۃ الکرسی سے دین و دنیاوی بیماریوں کا علاج		۶۰/-
چہار قل سے دین و دنیاوی بیماریوں کا علاج		۶۰/-
منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں		۱۵۰/-
فی میل ناول	علی نواز شاہ	۱۲۰/-
دہشت زدہ گرد	علی نواز شاہ	۱۲۰/-
سو عظیم مسلمان	یاسر جواد	۲۵۰/-

تقریریں/خطبات

نورانی تقریریں	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
حقانی تقریریں	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
عرفانی تقریریں	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
قرآنی تقریریں	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
ایمانی تقریریں	حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ	۶۰/
شان خطابت (اول و دوم)	مولانا عبدالستار رسول چشتی	۲۲۵/-
اسرار خطابت (اول و دوم)		۲۴۰/-
خطبات سید ہاشمی میاں	صاحبزادہ محمد توصیف حیدر	۸۰/-
اوکاڑوی کی تقریریں	صاحبزادہ محمد توصیف حیدر	۱۲۰/-
ربانی کی تقریریں	صاحبزادہ محمد توصیف حیدر	۸۰/-
سید ہاشمی میاں کی تقریریں	صاحبزادہ محمد لطیف ساجد	۹۰ -
صاحبزادہ افتخار الحسن کی تقریریں	صاحبزادہ محمد لطیف ساجد	۸۰/-

اکرم رضوی کی تقریریں	مرزہ محمد لطیف	-/۸۰
تبلیغی تقریریں	صاحبزادہ محمد شفیق مجاہد	-/۱۲۰
سید فدا حسین شاہ کی تقریریں	محمد شفیق مجاہد	-/۸۰
حضرت جی کی یادگار تقریریں	رئیس التبلیغ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف	-/۱۹،۵۰
ملفوظات اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی		-/۱۶۰
المدد یا رسول اللہ	علامہ صائم چشتی	-/۱۲۰
زیتون کی ڈالی	عائشہ درانی	-/۱۵۰
تاریخ فرشتہ (۲ جلدیں)	محمد قاسم فرشتہ	-/۷۰۰
نفیس تقریریں	آصف رضا	-/۸۰
لاثانی تقریریں	آصف رضا	-/۸۰
خزینہ فن تقریر	آصف رضا	-/۳۶
خزینہ لازوال تقریریں	آصف رضا	-/۴۰
خزینہ بے مثال تقریریں	آصف رضا	-/۴۰
فن تقریر و گفتگو	مسعود مفتی	-/۱۲۰

بچوں کے اسلامی ناموں کی کتب

پیارے بچے پیارے نام (مکمل انسائیکلو پیڈیا۔ انگریزی اسپیلنگ کے ساتھ)	ارشد محمود / خالد علیم	-/۱۰۰
مسلمان بچوں اور بچیوں کے اسلامی نام	حامد سلطان قادری	-/۲۴
بچوں کے اسلامی نام (قرآن وحدیث کی روشنی میں)	حامد سلطان قادری	-/۳۶
بچوں کے اسلامی نام (مکمل انسائیکلو پیڈیا)	ارشد محمود (پیپر بیک)	-/۸۵
بچوں کے اسلامی نام (مکمل انسائیکلو پیڈیا)	ارشد محمود (مجلد)	-/۱۰۰
پیارے بچوں کے پیارے نام	نجمہ فاروقی	-/۶۰
(۵۰۰۷ سے زائد اردو، عربی، فارسی، عراقی، ترکی، روسی ناموں کی لغت)		-/۶۰
نام سنوارے کا۔ (انگلش سپیلنگ کے ساتھ)	آصف رضا (نظر ثانی) زاہد حسین انجم	-/۱۱۰
بچوں کے خوبصورت نام (انگلش سپیلنگ کے ساتھ)	آصف رضا	-/۷۰

☆☆☆

حضرت عمر فاروق	محمد علی چراغ	-/۷۰

غبارِ خاطر

ابوالکلام آزاد

خزینۂ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور [illegible]